فتاوی

اصحاب الحدیث

تالیف

فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

مکتبہ اسلامیہ

فتاویٰ

اصحاب الحدیث

تالیف

فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

مکتبہ اسلامیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب ---------------- فتاویٰ اصحاب الحدیث

جلد ---------------- چہارم

تالیف ---------------- فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------- 2015ء

قیمت ----------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

لاہور: غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور 042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد 041-2631204 - 2641204

Email: maktabaislamiapk@gmail.com, Visit on Facebook page: maktabaislamiapk

فہرست

توحید و عقیدہ

طہارت و وضو

اذان و نماز

جُمُعہ وعیدین

جنائز و زیارت قبور

زکوٰۃ و صدقات

حج وعُمرہ

روزہ و اعتکاف

خرید وفروخت

وصیت و وراثت

نکاح وطلاق

عقیقہ وقربانی

آداب واخلاق

متفرقات

مُقدّمۃ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و علیٰ آلہ و اصحابہ و اتباعہ و اخوانہ اجمعین و بعد:

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر خود سوال کیا ہے پھر خود ہی اس کا قطعی جواب دیا ہے۔ قرآن کریم میں بیان کردہ اس قسم کے جوابات کو ہم فتاویٰ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ فتویٰ کی عظمت، شان اور اس کی قدر ومنزلت کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فتویٰ کی نسبت اپنی طرف کی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ﴾

''لوگ آپ سے عورتوں کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔'' [1]

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾

''لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ اللہ تمہیں کلالہ کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔'' [2]

لغوی اعتبار سے لفظ فتویٰ ''الفتوۃ'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنی کرم وسخاوت اور طاقت وزور آوری ہے، چونکہ مفتی اپنے وقت و علم کی سخاوت کرتے ہوئے اپنی عالمانہ قوت کو کام میں لا کر فتویٰ دیتا ہے، اس لیے اس کے جواب کو فتویٰ کہا جاتا ہے۔ کچھ اہل لغت کا کہنا ہے کہ فتویٰ دراصل ''الفتی'' سے مشتق ہے جس کے معنی مضبوط اور قوی کے ہیں، چونکہ مفتی پیش آمدہ مسئلے کے جواب میں اپنے دلائل سے دینی مسائل کو قوت مہیا کرتا ہے، اس لیے مفتی کے جواب کو فتویٰ کا نام دیا جاتا ہے۔

شرعی طور پر کتاب وسنت کے دلائل کے ساتھ کسی مسئلے کو بیان کرنا فتویٰ کہلاتا ہے اور فتویٰ دینے والے کو مفتی کہا جاتا ہے۔

علامہ شاطبی مفتی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مفتی، امت میں رسول اللہ کا نائب اور قائم مقام ہے کیونکہ علماء، انبیاء کے وارث ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنے ترکہ میں درہم ودینار نہیں چھوڑے بلکہ ورثے میں علم وحکمت کو چھوڑا ہے۔'' [3]

---

[1] النساء: ١٢٧۔ [2] النساء: ١٧٦۔ [3] الموافقات: ص ٢٤٤، ج ٤۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''افتاء ایک عظیم الشان، جلیل القدر اور بہت ہی عز وشرف کا حامل عمل ہے، کیونکہ مفتی درحقیقت انبیاء کرام کا وارث ہوتا ہے اور فرض کفایہ کو سر انجام دیتا ہے، یہ ایک الگ بات ہے کہ اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔'' [1]

مفتیان کرام کا مقام بہت اونچا اور عظیم الشان ہے، اس کے ساتھ ساتھ انہیں شدید ترین ذمہ داری اور سخت ترین امتحان سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ مفتی کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآنی احکام ومسائل کا عالم ہو اور ذخیرہ احادیث پر بھی اس کی گہری نظر ہو، اس کے علاوہ وہ مجتہدانہ بصیرت کا بھی حامل ہوتا کہ ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کر سکے۔ اگر اسے کسی سوال کا جواب دینے کے لیے کوئی نص صریح نہ مل سکے تو قرآن وحدیث کے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے جواز وعدم جواز اور اس کی حلت وحرمت کا فیصلہ کر سکے۔ ہمارے سامنے آج نئے نئے مسائل ہیں ایسے مسائل میں وہ عوام کی سہولت کو بھی مد نظر رکھے، اسے دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے فتوی میں اوفق بالاسلام اور ارفق بالناس کا اہتمام کرے۔ اس سلسلہ میں امیر المحدثین، سید الفقہاء، امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ ان کا اپنی مایہ ناز تصنیف صحیح بخاری میں ایک طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ مصالح عباد پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نصوص کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے چنانچہ انھوں نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''جو کہتا ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' [2]

امام بخاری کی یہ عادت ہے کہ جو حدیث ان کے قائم کردہ معیارِ صحت پر پوری نہیں اترتی لیکن اس کا معنی اور مضمون صحیح ہوتا ہے تو اسے عنوان میں رکھ کر دیگر احادیث سے اس معنی کی تائید کرتے ہیں مذکورہ بالا عنوان بھی ایک حدیث ہے جسے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' [3]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایسا نکاح باطل اور بے بنیاد ہے جو ولی کی اجازت کے بغیر ہو۔'' [4]

تیسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ عورت بدکار ہے جو اپنا نکاح خود کرے۔'' [5]

امام بخاری نے مذکورہ بالا عنوان کے بعد ایک دوسرا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''باپ، دادا وغیرہ کسی عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہ کریں۔'' [6]

ان دونوں ابواب کا تقاضا ہے کہ عورت نہ تو اتنی مطلق العنان ہے کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے اپنی شادی خود رچا لے اور نہ

---

[1] المجموع: ص ۴۰، ج ۱۔ [2] بخاری، النکاح، باب نمبر ۵۷۔ [3] ابو داؤد، النکاح: ۲۰۸۵۔

[4] مسند امام احمد، ص ۴۷، ج ۶۔ [5] ابن ماجہ، النکاح: ۱۸۸۲۔ [6] بخاری، النکاح، باب ۴۲۔

ہی وہ اس قدر مجبور ہے کہ اس کا سرپرست جب چاہے جہاں چاہے اس کا عقد کردے اور وہ مجبور ہو کر خاموش رہے۔ اس امر کی وضاحت کے لیے ایک تیسرا عنوان بایں طور قائم کیا ہے:

''جب کوئی اپنی بیٹی کا زبردستی نکاح کردے تو ایسا نکاح مردود ہے۔'' ❶

پھر اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث لائے ہیں:

''خنساء بنت خدام کا نکاح اس کے باپ نے اس کی مرضی کے بغیر کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس نکاح کو مسترد کر دیا۔'' ❷

دراصل شریعت کا منشا یہ ہے کہ لوگوں کو سہولت دیتے وقت اعتدال کو قائم رکھا جائے۔ اب ہمارے مجتہدین کرام کو دیکھیے کہ ایک طرف تو انھوں نے بالغہ لڑکی کو مطلق العنان کر دیا کہ وہ جس سے چاہے، جب چاہے اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کر لے تو یہ حضرات اس قسم کے نکاح کو تحفظ دیتے ہیں اور دوسری طرف یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص دھوکہ اور فریب سے ایجاب و قبول کے الفاظ کہلوا لے جنھیں عورت نہ سمجھتی ہو تو بھی وہ قید نکاح میں آ کر بے اختیار ہو جاتی ہے۔

بہر حال مفتی کو چاہیے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے لوگوں کو جس قدر سہولت کی گنجائش ہو اپنے فتویٰ میں اس کا ضرور اہتمام کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو تبلیغ کے لیے بھیجتے وقت فرمایا تھا:

''لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا اور انھیں تنگی سے دوچار نہ کرنا۔'' ❸

مفتی کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام نہ لے بلکہ طویل بحث تمحیص، تلاش و جستجو اور مکمل جدوجہد کے بعد اطمینان ہونے پر فتویٰ دے۔ رسول اللہ ﷺ جو اعلم الناس ہیں، انھوں نے بھی متعدد سوالات کا جواب دینے میں طویل سکوت اختیار فرمایا اور وحی الٰہی کا انتظار کیا جو امت کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ امام بخاری نے اس سلسلہ میں اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ سے جب کسی چیز کے متعلق سوال کیا جاتا، جس کے متعلق وحی نہ اتری ہوتی تو آپ فرماتے: میں نہیں جانتا یا وحی اترنے تک خاموش رہتے اور کچھ جواب نہ دیتے۔'' ❹

اس موضوع پر ہم نے فتاویٰ اصحاب الحدیث کی تیسری جلد کے مقدمے میں تفصیل سے لکھا ہے، امثلہ اور شواہد سے امام بخاری کے بیان کردہ موقف کو ثابت کیا ہے۔ اس لیے اس بحث کا وہاں ضرور مطالعہ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام بھی اسی منہج پر کاربند تھے کہ وہ فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفے میں مقیم ہیں، اُن کے پاس ایک استفتاء آیا کہ ایک شخص نے کسی خاتون سے نکاح کیا ہے، ابھی

---

❶ بخاري، النكاح: باب ٤٣۔ ❷ بخاري، النكاح: ٥١٣٨۔ ❸ بخاري، الادب: ٦١٢٤۔
❹ بخاري، الاعتصام، باب ٨۔

رخصتی نہیں ہوئی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ عورت کا مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ:

① اس عورت کو حق مہر ملے گا یا نہیں اگر ملے گا تو کتنا؟

② وہ عورت عدت وفات گزارنے کی پابند ہے یا نہیں؟

③ اس عورت کو خاوند کے ترکہ سے حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جوابات دینے سے گریز کر رہے ہیں، اس کے لیے انھوں نے ایک ماہ کی مہلت طلب کی۔ لوگ ایک ماہ تک بتکرار ان کے پاس آتے رہے اور باصرار پوچھتے رہے بالآخر بایں الفاظ جواب دیا:

① اس عورت کو باقی خاندان کی عورتوں کی طرح مہر ملے گا، نہ اس سے کم اور نہ زیادہ۔

② یہ عورت اپنے خاوند کی وفات پر عدت وفات گذارنے کی بھی پابند ہے۔

③ اس عورت کو خاوند کے ترکہ سے حق وراثت بھی ملے گا۔

آپ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''اگر یہ فتویٰ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔''

فتویٰ دینے کے بعد وہ مدینہ آئے، مسجد نبوی میں ارباب حل و عقد سے اس کے متعلق دریافت کیا تو حضرت ابو سنان اشجعی رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے کچھ دوسرے افراد نے کھڑے ہو کر گواہی دی کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں حضرت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر نامدار حضرت ہلال بن مرہ اشجعی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہی صورت حال پیش آئی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے یہی فیصلہ دیا تھا جو آپ نے دیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اپنا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے موافق پا کر بہت خوشی ہوئی۔ [1]

مفتیانِ کرام کو اس منہج کی پابندی کرنا چاہیے لیکن افسوس کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں جاہل مفتیان منصب افتا پر فائز ہیں بلکہ بعض حضرات تو سائل کا سوال سمجھنے سے بھی قاصر ہیں لیکن انہیں مفتی کہلانے کا شوق بے چین کیے جا رہا ہے، اس سلسلہ میں اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات شائع ہوتے ہیں ان میں ''فتاویٰ آن لائن'' کے ساتھ جلی حروف میں یہ لکھا ہوتا ہے ''فون کریں اور مسئلہ پوچھیں''۔ چنانچہ سودی معیشت کو فروغ دینے کے لیے اس قسم کے مفتیانِ سوء کے فتاویٰ پیش کیے جاتے ہیں، اس کے علاوہ نام نہاد ''اسلامی بنکوں'' سودی اداروں اور تکافل کمپنیوں کا راس المال بھی اس قسم کے فتاویٰ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے غالباً اسی قسم کی صورت کے متعلق پیش گوئی کے طور پر فرمایا تھا:

> ''اللہ تعالیٰ لوگوں کے سینوں سے علم سلب نہیں کرے گا بلکہ علماء کو فوت کر کے علم کو اٹھا لے گا حتی کہ جب کسی عالم کو زندہ نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے تو ان سے سوال کیے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر انہیں فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' [2]

---

[1] ابو داؤد، النکاح: ۲۱۱۶۔ [2] بخاری، العلم، ۱۰۰۔

مفتی کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ محنت، تلاش وجستجو اور طویل جدوجہد کے بعد پیش آمدہ مسائل کے متعلق اہل علم سے مشورہ کرے، مشورہ کرنے سے پیچیدہ مسائل میں راہنمائی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ کو صحابہ کرام کے ساتھ مشاورت کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''آپ ان سے درگذر کریں، ان کے لیے بخشش کی دعا کریں اور معاملات میں ان سے مشورہ لیا کریں۔'' ❶

اس حکم ربانی کے پیش نظر متعدد مواقع پر دینی، سیاسی اور اخلاقی معاملات میں اپنے صحابہ کرام سے مشاورت فرمائی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسیرانِ بدر کے متعلق اپنے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ اسی طرح غزوہ احد کے موقع پر بھی آپ نے اپنے جانثاروں سے مشاورت کی کہ شہر کے اندر رہتے ہوئے دفاع کیا جائے یا بیرون شہر جا کر انہیں روکا جائے، واقعہ افک کے وقت بھی رسول اللہ ﷺ کا حضرت اسامہ، حضرت علی اور دیگر صحابہ کرام سے مشاورت کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفا راشدین نے بھی دینی معاملات میں پیش آمدہ مسائل کے متعلق مشاورت کی روایت کو برقرار رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں ان کی تعریف فرمائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا، نماز کو قائم کیا اور ان کا ہر کام باہمی مشاورت سے ہوتا ہے۔'' ❷

اس آیت کریمہ میں اشارہ ہے کہ امت مسلمہ میں ایک مجلس مشاورت ہونی چاہیے۔ جس سے اہم معاملات میں مشورہ کیا جا سکے، اسے فقہی اصطلاح میں اشارۃ النص کہا جاتا ہے، امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس موضوع سے متعلق ایک عنوان قائم کر کے مانعین زکوۃ اور مرتدین کے خلاف قتال کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام سے مشاورت کا ذکر کیا ہے۔ ❸

قرآن مجید کی جمع وتدوین کے متعلق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے مابین مشاورت کا تذکرہ بھی کتب حدیث میں ملتا ہے۔ ❹

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو صغر سنی کے باوجود اپنی مجلسِ مشاورت میں شریک کیا تو کبار صحابہ نے اس پر اعتراض کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مجلس میں امتحان لے کر ان کے علمی تفوق کو ثابت کیا۔ ❺

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیش آمدہ پیچیدہ مسائل میں حضرات صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا اہتمام کرتے تھے جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔

☆ عورت کے پیٹ میں اگر کسی کی دست اندازی سے بچہ مر جائے تو اس کی دیت کیا ہے، اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے رائے طلب کی۔ ❻

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ جہادی سفر میں تھے کہ آپ کو شام کے علاقہ میں طاعون کے پھیل جانے کی اطلاع ملی تو آپ نے

---

❶ آل عمران: ۱۵۹۔ ❷ الشوریٰ: ۳۸۔ ❸ بخاری، الاعتصام باب نمبر ۲۸۔
❹ بخاری، فضائل القرآن: ٤٩٨٦۔ ❺ بخاری، التفسیر: ٤٩٧٠۔ ❻ بخاری، الدیات: ٦٩٠٤۔

مہاجرین اولین، انصار اور شیوخ قریش سے اس کے متعلق رائے طلب کی لیکن کسی بات پر اتفاق نہ ہو سکا بالآخر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے مطابق فیصلہ ہوا۔

☆ مشاورت کی اہمیت وضرورت واہمیت کے پیش نظر بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فقہاء صحابہ کو مدینہ طیبہ میں سکونت رکھنے کا پابند کیا تھا۔

☆ شراب نوشی کے متعلق جب لوگ حد سے تجاوز کرنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی روک تھام کے لیے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ اس کے لیے کیا سزا تجویز کی جائے۔ [1]

امام بخاری مجلس مشاورت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقویٰ شعار حکمران جائز اور مباح معاملات میں امانت دار اہل علم سے مشاورت کرتے تھے تاکہ ان میں سے آسان تر صورت پر عمل کیا جا سکے۔'' [2]

لیکن افسوس کہ دور حاضر میں اس اس خوبصورت روایت نے دم توڑ دیا ہے، آج ہمارے ہاں باہمی اختلافات نے ایک بھیانک شکل اختیار کر رکھی ہے۔ غیر ضروری اور نادر فتویٰ چھوڑ کر اپنا فضول شوق پورا کیا جاتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ذوالحجہ کے مہینے میں بھینس کی قربانی پر طبع آزمائی کی جاتی ہے تو محرم کے مہینے میں یزید کی شخصیت کو نزع استخواں بنایا جاتا ہے کہ وہ جنتی ہے یا جہنمی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک دردمندانہ اپیل

ایسے حالات میں ہمارے اکابر، ذمہ داران اور اہل علم کا فرض ہے کہ وہ اس گھمبیر صورت حال کا جائزہ لیں اور سلف صالحین کی طرح مشاورت کا احیاء کرتے ہوئے سعودی عرب کی طرز پر ''ھیئۃ کبار علماء'' تشکیل دیں، پھر اس کے ذریعے امت کی تنظیم نو اور توحید صفوف کی کوشش کی جائے، خاص طور پر ''دار الافتاء'' کو منظم کر کے اسکی حرمت وتقدیس کو بحال کریں، ہر کس وناکس کی فتویٰ نویسی پر اپنی نوازشات کی بارش کرنے کے بجائے ایسے ناپختہ افراد کی حوصلہ شکنی کریں اور جماعت کرنا اھل مفتیوں کے چنگل سے آزاد کرائیں۔ ایسا کرنے سے شریعت کا وقار دلوں میں بیٹھے گا اور فتویٰ کی عظمت رفتہ بحال ہوگی نیز لادین عناصر کے تمسخر واستھزاء سے بھی محفوظ ہوگا باذن اللہ تعالیٰ۔

قارئین کرام! ہم نے آپ کی دینی راہنمائی کے لیے اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے خود کو وقف کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود میں آب وگل سے بنا ہوا ایک انسان ہوں، میری دعوتی، گھریلو اور معاشرتی ضروریات ہیں اور مجھے جسمانی طور پر آرام کرنے کی بھی حاجت ہوتی ہے لہٰذا رابطہ قائم کرنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلہ میں میرے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اوقات کار کا خیال رکھیں۔ دوسری گزارش ہے کہ مسائل واحکام لکھنے اور زبانی طور پر سوالات کا جواب دینے کا مقصد اللہ تعالیٰ سے اجر حاصل کرنا ہے، الحمد للہ اس کے بدلے نہ دنیاوی مفاد کی مجھے کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی سے کچھ وصول کرتا ہوں۔

---

[1] ترمذی، الحدود، ١٤٤٣۔ [2] بخاری، الاعتصام: باب نمبر ٢٨۔

''ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکریہ کے روادار ہیں۔'' [1]

ہم نے کچھ حضرات کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے وگرنہ اس کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی ہم سوالات کا جواب دینے سے قبل خود سوالات کا جائزہ لیتے ہیں، آیا وہ مناسب وموزوں اور قابل جواب ہیں یا وہ نظر انداز کرنے کے لائق ہیں۔ ہم نے اپنے فتاویٰ کی پہلی تین جلدوں کے مقدمہ میں ایسے سوالات کی نشاندہی کی تھی جنہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے تاکہ سائلین آداب سوال سے آراستہ ہوں نیز حصول علم اور طلب حق کا سلیقہ اختیار کریں، اب ہم چند ایک ایسے سوالات کی اقسام تحریر کرتے ہیں جنہیں شریعت نے مستحسن قرار دیا ہے اور اچھی نظر سے دیکھا ہے، ہمیں قارئین سے امید ہے کہ وہ بھی اُسی قسم کے سوالات کرنے کی عادت اختیار کریں گے۔

☆..... **قرب الٰہی کا حصول:** اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے سوال کرنا بہت ہی مبارک عمل ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اگر مجھے لیلۃ القدر کا علم ہوجائے تو میں اس میں کیا دعا کروں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دعا پڑھا کرو۔

''اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی'' [2]

''اے اللہ! تو درگزر کرنے والا ہے اور درگزر کو پسند کرتا ہے، مجھے بھی معاف کردے۔''

☆..... **فہم قرآن:** قرآن کریم کی کسی آیت کا معنی سمجھنے کے لیے سوال کرنا بھی حصول علم کا عظیم ذریعہ ہے چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

''جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہ کیا تو انہیں قیامت کے دن امن ملے گا اور وہی راہ راست پر ہیں۔'' [3]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ظلم کا عام مطلب سمجھا جس سے وہ پریشان ہوگئے پھر انھوں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا ''ہم میں سے کون ایسا شخص ہے جس نے ظلم نہ کیا ہو۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اس سے وہ ظلم مراد نہیں جو تم سمجھ رہے ہو بلکہ اس سے مراد شرک ہے جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا ''یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔'' [4]

اس سے صحابہ کرام کو اطمینان ہوگیا۔ [5]

☆..... **فہم حدیث:** حدیث میں آنے والے کسی لفظ کا معنی سمجھنے کے لیے سوال کرنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے سوال کیا کہ حیض سے فراغت کے بعد غسل کیسے کیا جائے تو آپ نے فرمایا ''مشک لگا ہوا روئی کا ایک ٹکڑا لے کر اس کے ساتھ پاکی حاصل کرو، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس سے کیسے پاکی حاصل کروں، رسول اللہ ﷺ بار بار یہی کہتے رہے کہ اس سے پاکی کرو۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے حیا کی وجہ سے منہ دوسری طرف کرلیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ مشک

---

[1] الدھر: ۹۔ [2] مسند امام احمد، ص ۱۷۱، ج ٦۔ [3] الانعام: ۸۲۔
[4] لقمان: ۱۳۔ [5] بخاری، احادیث الانبیاء: ۳۳٦۰۔

لگا ہوا روئی کا ٹکڑا لے کر جہاں جہاں خون کے نشانات ہیں وہاں لگا دو تا کہ نا گواری کے اثرات ختم ہو جائیں۔ ❶

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اللہ کی عطا کردہ عقل سے ''توضئی'' کا معنی سمجھ لیا اور عورت کو اس کا مفہوم سمجھا دیا۔

☆..... **شرعی حکم میں مزید سہولت حاصل کرنا:** رسول اللہ ﷺ کسی کا حکم دیں پھر اس میں اگر مزید سہولت کی گنجائش ہو تو اس کے متعلق سوال کیا جائے جیسا کہ فتح خیبر کے موقع پر صحابہ کرام نے گھریلو گدھوں کا گوشت بنا کر اس کی دیگیں آگ پر رکھ دیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق دریافت کیا تو بتایا گیا کہ گھریلو گدھوں کا گوشت پکایا جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا گوشت کو ضائع کر دو اور تمام ہنڈیوں کو توڑ دو، صحابہ کرام نے مزید سہولت کے پیش نظر سوال کیا کہ ہم گوشت ضائع کر کے انہیں دھو لیتے ہیں تو آپ نے فرمایا ٹھیک ہے انہیں دھو کر صاف کر لو۔ ❷

☆..... **متضاد صورت حال سامنے آنے پر صحیح فیصلے تک رسائی:** حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ مسجد کے دروازے کے پاس ایک ریشمی جوڑا فروخت ہوتے دیکھا، عرض کیا یا رسول اللہ! اگر اسے آپ خرید لیں تو اچھا ہے تا کہ جمعہ کے دن اور سفیروں کی آمد کے وقت اسے زیب تن فرما لیا کریں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اسے تو وہ شخص پہنے گا جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔''

اس کے بعد کہیں سے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس قسم کے ریشمی جوڑے آ گئے، ان میں سے آپ نے ایک جوڑا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے مجھے یہ جوڑا عنایت فرمایا ہے حالانکہ آپ خود ہی حلہ عطارد کے متعلق کچھ فرما چکے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے تمہیں یہ جوڑا اس لیے نہیں دیا کہ تم خود اسے پہنو۔''

چنانچہ وہ جوڑا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مشرک بھائی کو پہنچا دیا جو مکہ میں رہائش پذیر تھا۔ ❸

☆..... **کوئی نئی صورت حال سامنے آئے تو صحت وصواب معلوم کرنے کے لیے سوال کرنا** جیسا کہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے شادی کی تو ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے عقبہ اور اس کی بیوی دونوں کو دودھ پلایا ہے، حضرت عقبہ نے کہا: مجھے تو علم نہیں کہ تو نے مجھے دودھ پلایا ہے اور نہ تو نے پہلے اس کی خبر دی ہے، چنانچہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سوار ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

''جب ایسی بات کہی گئی ہے تو وہ تیرے گھر کیسے رہ سکتی ہے۔''

آخر عقبہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا تو اس نے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لیا۔'' ❹

ایک چیز کے متعلق حلال اور حرام ہونے کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ سوال کے ذریعے اس کے ایک پہلو کی تعیین کی جاتی ہے۔ مثلاً ذبح شدہ بکری کے پیٹ جو مردہ بچہ برآمد ہوتا ہے وہ اس حیثیت سے تو حلال ہے کہ بکری کے گوشت کا ایک حصہ ہے لیکن اس کا

---

❶ بخاري، الحيض: ٣١٤_ ❷ بخاري، المظالم: ٢٤٧٧_

❸ بخاري، الجمعة: ٨٨٦_ ❹ بخاري، العلم: ٨٨_

وجود الگ ہے اور اسے ذبح نہیں کیا گیا اس لیے مردہ ہونے کی حیثیت سے وہ حرام ہے، رسول اللہ ﷺ سے جب اس کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

''بچے کے ذبح کے لیے اس کی ماں کا ذبح ہی کافی ہے۔'' ❶

رسول اللہ ﷺ نے اس مردہ بچے کو ماں کے گوشت کے ساتھ ملحق کر کے اسے حلال قرار دیا ہے تاہم اگر کسی کا دل اس کے کھانے پر آمادہ نہیں ہوتا تو اس کا تناول کرنا ضروری نہیں ہے۔

☆..... بعض دفعہ ذہنی الجھن کو سوال کے ذریعے دور کیا جاتا ہے اور وہ الجھن فرضی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ام سلیم ؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سوال کیا، یا رسول اللہ! جب عورت کو احتلام ہو جائے تو کیا اس پر غسل واجب ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں، جب وہ پانی دیکھے۔ ❷

عام طور پر مردوں کو احتلام ہوتا ہے، عورتیں اس کیفیت سے دوچار نہیں ہوتیں، لیکن کبھی کبھار عورت کو بھی احتلام ہو جاتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ حضرت ام سلمہ ؓ نے شرم کے مارے اس وقت اپنا منہ چھپا لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا ہاتھ خاک آلود ہو، ایسا کیوں نہیں ہو سکتا، آخر بچے کی صورت ماں سے کیونکر ملتی ہے۔ ❸

☆..... بعض دفعہ انسان ایک نئے مسئلے سے دوچار ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ سے ایک آدمی نے شکایت کی کہ میں دوران نماز میں توہمات وخیالات سے دوچار ہو جاتا ہوں۔ میرے پیٹ میں کوئی ہوا وغیرہ حرکت کرتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ میرا وضو ٹوٹ گیا ہے کیا ایسے حالات میں میں نماز کو ختم کر کے از سر نو وضو کروں، رسول اللہ ﷺ نے اس کے شک کو دور کرتے ہوئے فرمایا:

''وہ نماز پڑھتا رہے حتی کہ خروج ہوا کی آواز سنے یا اس کی بدبو محسوس کرے۔'' ❹

اس کا مطلب یہ ہے کہ وضو کی یقینی صورت کو محض شکوک وشبہات سے نہیں بدلا جا سکتا جب تک اس وضو کے ٹوٹنے کا یقین نہ ہو جائے پھر رسول اللہ ﷺ نے وضو ٹوٹنے کی دو علامتیں ذکر فرمائیں۔

☆......ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نیک سیرت انسان حصول جنت کے اسباب اور جہنم سے دور رہنے کی تدابیر کے متعلق سوال کرتا ہے چنانچہ ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے حصول جنت کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا، فرض نماز پڑھا کر، زکوۃ اور رمضان کے روزے رکھ اس طرح تم جنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ❺

ایک روایت میں جہنم سے دور رہنے کا ذکر ہے اور اس میں روزوں کے بجائے صلہ رحمی کا ذکر ہے۔ ❻

---

❶ مسند امام احمد، ص ۳۹، ج ۳۔ ❷ بخاری، الغسل: ۲۸۲۔ ❸ بخاری، العلم: ۱۳۰۔
❹ بخاری، الوضوء: ۱۳۷۔ ❺ بخاری، الزکوۃ: ۱۳۹۷۔ ❻ مسلم، الایمان: ۱٤۔

☆......ایسا بھی ہوتا ہے کہ سوال کا پس منظر فکر آخرت ہوتا ہے جیسا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا، رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کرنے لگی یا رسول اللہ! میرے شوہر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، گھر کے اخراجات کے متعلق ذرا تنگ دل واقع ہوئے ہیں۔ جو کچھ دیتے ہیں اس سے گھر کا نظام نہیں چلتا، میرے اور میرے بچوں کے اخراجات کے لیے وہ ناکافی ہے، کیا میرے لیے جائز ہے کہ اس کی لاعلمی میں خفیہ طور پر کچھ رقم لے لیا کروں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اس قدر لیا کرو جو دستور کے مطابق تیرے اور تیرے بچوں کے لیے کافی ہو۔'' [1]

حضرت ہند رضی اللہ عنہا کو ایک طرف بچوں کی پرورش کا فکر ہے کہ اگر ان کی نگہداشت نہ کی گئی تو قیامت کے دن باز پرس ہوگی پھر چوری رقم لینے میں بھی ضمیر مطمئن نہیں ہوتا مبادا قیامت کے دن اس کے متعلق سوال ہو جائے، اس لیے اس خلش کو دور کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں مطمئن کر دیا۔

ان سوالات سے معلوم ہوتا ہے کہ سائلین نے اخلاص اور حسن نیت کے ساتھ حصول علم اور اس پر عمل کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا ہے۔ اس طرح کے سوالات جن کا تعلق انسان کی عملی زندگی، آخرت سنوارنے، حصول جنت اور جہنم سے بچنے کے لیے ہو بہت ہی مبارک ہیں۔ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایسے ہی سوالات کرنے چاہئیں لیکن ہمیں جس قسم کے سوالات سے واسطہ پڑتا ہے ان کی نوعیت ان سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً

☆......میرے رشتے کے متعلق ایک جگہ بات چل رہی ہے، آپ حساب کر کے بتائیں کہ وہاں رشتہ کیسا رہے گا۔؟

☆......ہمارا کاروبار کسی نے باندھ دیا ہے کوئی وظیفہ بتائیں یا تعویذ دیں جس سے یہ بندھن کھل جائے۔

☆......مرنے کے بعد حساب کے وقت روح لوٹ آتی ہے، اسے ثابت کرنے کے لیے کسی قرآنی آیت کا حوالہ دیں؟

☆......وہ کونسی چیز ہے جسے عورت زندگی میں ایک مرتبہ اور مرد ہر روز پانچ مرتبہ استعمال کرتے ہیں، اس کا ذکر قرآن میں بھی آتا ہے؟

☆......ایک عورت نبی کی ماں، نبی کی بہن، نبی کی بیٹی اور نبی کی بیوی ہے اس عورت کا نام بتائیں؟

☆......ہمارے گھر میں پریشانی اور بیماری ہے استخارہ کر کے بتائیں کہ اس کی وجہ اور اس کا حل کیا ہے؟

جبکہ بیشتر حضرات اپنی عملی زندگی کے متعلق ہی سوالات کرتے جن کا قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کے لیے کام کرنے کی توفیق دے۔

کچھ اس جلد کے بارے میں:

فتاویٰ اصحاب الحدیث کی چوتھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کے متعلق ہم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ زیر ترتیب ہے اور جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کے زیر مطالعہ ہوگی۔ اب ہم نے اس وعدہ کو پورا کر دیا ہے، یہ دراصل ہفت روزہ اہل حدیث لاہور (سال ۲۰۱۱، ۲۰۱۲، ۲۰۱۳) میں مسلسل شائع ہونے والے سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے جو احکام و مسائل کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں، انہیں دختر م حامدہ حماد سلمہا اللہ نے بہت محنت اور عرق ریزی سے یکجا کیا، پھر فقہی ترتیب و

---

[1] بخاري، النفقات: ٥٣٦٤۔

تبویب سے مرتب کر کے قارئین تک پہنچایا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیٹی کی علمی جد و جہد کو شرف قبولیت سے نوازے اور اسے ان کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔

قارئین کرام! ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے فتاویٰ کی بنیاد قیل وقال اور آراء رجال پر نہ رکھیں بلکہ کتاب وسنت کو محور بنا کر سائلین کی راہنمائی کریں۔ ہم آپ سے امید رکھتے ہیں کہ دوران مطالعہ اگر کوئی کوتاہی اور سقم محسوس کریں تو آپ اس کی ضرور نشاندہی فرمائیں گے، کمال تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے ہم سب انسان خطا اور نسیان سے مرکب ہیں، اس جلد کی طباعت میں مکتبہ اسلامیہ لاہور/فیصل آباد کے مدیر عزیز مکرم جناب محمد سرور عاصم سلمہ اللہ نے گرانقدر حصہ ڈالا بلکہ یہ سب ان کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ ہے، وہ اسلامی کتب کی نشر واشاعت کے متعلق صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل اور خلوص بھری زندگی میں برکت فرمائے۔ انسانی عمر کے چار حصے ہوتے ہیں، سن طفولیت: جب تک وہ بالغ نہیں ہوتا۔ سن شباب: جب وہ جوان ہوتا ہے۔ سن کہولت: جب وہ ساٹھ برس کا ہو جائے۔ سن شیخوخت: جب ساٹھ سال سے اوپر چلا جائے، اس عمر میں انسان کی جسمانی اور فکری قوت کمزور پڑ جاتی ہے اور وہ انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ بندہ لاچار بھی عمر کے آخری حصے میں پہنچ چکا ہے اور عمر نبوت ۶۳ سال تک پہنچنے میں صرف چند ماہ باقی ہیں، میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسلام اور اہل اسلام کی خدمت میں لگائے رکھے اور خاتمہ ایمان پر کرے۔

آخر میں اللہ کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ مؤلف، مرتب، ناشر اور اس کی نشر واشاعت میں کسی بھی طرح حصہ لینے والوں کو قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی سفارش نصیب فرمائے، پھر ہم سب کو جنت فردوس میں اکٹھا کر دے۔

ایں دعا از من واز جملہ ''احباب'' آمین باد

طالب الدعوات

ابو محمد عبدالستار الحماد

مرکز الدراسات الاسلامیۃ

سلطان کالونی، میاں چنوں

تاریخ تحریر

۳۱ اکتوبر ۲۰۱۴ء

لیلۃ الجمعۃ المبارک

موبائل: 0300-4178626

توحید و عقیدہ

توحید وعقیدہ

سوال میرے بھائی نے نذر مانی تھی کہ اگر میرے ہاں بچہ پیدا ہوا تو میں مسجد کے نمازیوں کی سہولت کے لئے گرم پانی کا گیزر لگاؤں گا، اب وہ اپنی نذر کو پورا کرنا چاہتا ہے لیکن مسجد کی انتظامیہ گیزر لگانے پر آمادہ نہیں، ان کا کہنا ہے کہ مسجد میں کارپٹ بچھا دیا جائے، کیا نظر کی جہت تبدیل کرنا جائز ہے، کتاب وسنت کے حوالے سے جواب دیں؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں مشروط نذر ماننے کی ممانعت آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نذر، اللہ کی تقدیر کو ذرہ بھر بھی نہیں پھیر سکتی، البتہ اس کی وجہ سے بخیل آدمی سے کچھ مال برآمد ہو جاتا ہے۔ [1]

مشروط نذر کی ممانعت اس لئے ہے کہ کچھ لوگ بیمار ہونے، نقصان اٹھانے یا کسی بھی طرح کی کوئی تکلیف آنے پر صدقہ کرنے کی نذر مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نذر مانے بغیر نہ تو انہیں شفا دے گا اور نہ ان کا نقصان پورا کرے گا، اس بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندے کی نذر سے اپنے قضا وقدر کے فیصلے تبدیل نہیں کرتا، ہاں اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بخیل آدمی سے کچھ مال نکل آتا ہے، یعنی انسان اللہ تعالیٰ سے مقصد برآوری کا معاملہ کرتا ہے اور اس سے کچھ پیشگی لینے پر دینے کے لئے آمادہ ہوتا ہے، اس بناء پر مشروط نذر ماننے کے بجائے مطلق نذر مانی جائے، اگر اللہ کے فیصلے کے مطابق اسے کچھ ملنا ہے تو مل جائے گا البتہ انسان بخل کی تہمت سے بچ جائے گا۔

نذر کی جہت بدلنے کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے کہ جب انسان کسی چیز کی نذر مان لے اور پھر یہ سمجھے کہ اس نذر کے علاوہ کوئی اور چیز اس سے افضل اور لوگوں کے لئے زیادہ مفید ہے تو اس صورت میں نذر کی جہت تبدیل کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا: ''میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مکہ فتح کر دیا تو میں بیت المقدس میں نفل ادا کروں گا۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم بیت اللہ میں ہی نفل ادا کرلو، اس نے پھر وہی بات دھرائی تو آپ نے بھی وہی جواب دیا، اس نے پھر وہی بات کی تو آپ نے فرمایا: پھر جیسے تیری مرضی ہو اسی طرح کرلے۔ [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان ادنیٰ درجے کی نذر کو اعلیٰ درجے کی نذر سے بدل سکتا ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، صورت مسئولہ میں اس نے اپنے محلے کی مسجد میں نمازیوں کی سہولت کے لیے گیزر لگانے کی نذر مانی تھی لیکن مسجد کی انتظامیہ نے

---

[1] صحيح البخاري، القدر، ٦٦٠٨۔ [2] مسند أحمد ٣٦٣ ج ٣۔

گیس وغیرہ کے بل کی وجہ سے کہہ دیا ہوگا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، آپ مسجد میں کارپٹ بچھا دیں، اس صورت میں نذر کی جہت تبدیل کی جاسکتی ہے، آدمی کو چاہیے کہ وہ مسجد میں گیزر لگانے کے بجائے کارپٹ بچھانے کا اہتمام کردے۔ ایسا کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں بلکہ اس سے نمازیوں کو زیادہ فائدہ ہوگا، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ثواب بھی زیادہ عطا فرمائیں گے۔ (واللہ اعلم)

روحانی معالجوں کی حیثیت

سوال میرے والد گرامی ایک نفسیاتی مریض ہیں، ہم نے بہت علاج کرایا مگر افاقہ نہیں ہوا، ہمیں ایک عورت کے پاس جانے کا مشورہ دیا گیا ہے، جو اس قسم کے مریضوں کی تشخیص مریض اور اس کی والدہ کا نام پوچھ کر کرتی ہے، کیا ہمیں اس کے پاس جانا چاہیے؟

جواب انسان کو اپنی صحت سے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرنا چاہیے، سوال میں ذکر کردہ عورت کے پاس بغرض تشخیص یا علاج جانا اپنے ایمان کو خیر باد کہنا ہے کیونکہ اس کا تعلق ان کاہنوں سے ہے جو علم غیب کا دعویٰ کرتے ہیں اور علاج کرنے یا مرض بتانے کے لئے شیاطین سے کام لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے کاہنوں کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص کسی نجومی یا کاہن کے پاس آئے پھر اس کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرے تو اس نے اس شریعت کا انکار کیا جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔'' [1]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایسے شخص کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں کی جاتی۔ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ حسب ذیل ہیں: ''جو شخص کسی نجومی کے پاس آئے اور اس سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کرے تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔'' [2]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ایسے لوگوں کے پاس جانا شرعاً جائز نہیں بلکہ ناگواری اور انکار واجب ہے۔ اس قسم کے ''روحانی معالجوں'' کی بات ماننا اور ان کی تصدیق کرنا بھی ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

نذر کو پورا کرنا

سوال میری امی نے نذر مانی تھی کہ اگر میں ایف۔ اے کے امتحان میں پاس ہوگئی تو وہ ہفتہ بھر پوری رات کا قیام کریں گی، اب میں نے امتحان تو پاس کرلیا ہے لیکن وہ اپنی نذر پوری کرنے سے عاجز ہیں، اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب اس میں شک نہیں کہ نذر ایک عبادت ہے اور اسے پورا کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا﴾

''وہ لوگ نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی۔'' [3]

---

[1] سنن أبي داؤد، الكهانة: ٣٩٠٤۔ [2] صحيح مسلم، السلام: ٢٢٣٠۔ [3] الدهر: ٧۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جس نے اس کی نافرمانی اور معصیت کی نذر مانی وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔ (1)

صورت مسئولہ میں ہفتہ بھر پوری رات کے قیام کرنے کی نذر مانی گئی جو کہ معصیت ہے کیونکہ پوری رات کے قیام سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، ایسی نذر کو پورا نہیں کرنا چاہیے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر کسی نے مکروہ عبادت کی نذر مانی مثلاً یہ کہ وہ ہمیشہ رات بھر قیام کرے گا اور ہمیشہ دن کا روزہ رکھے گا تو ایسی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں۔'' (2)

ایسی نذر کا وہی کفارہ ہے جو قسم کا ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''نذر کا کفارہ، قسم کا کفارہ ہے۔'' (3)

قسم کا کفارہ دس مساکین کو کھانا کھلانا یا انہیں لباس دینا ہے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''قسم کا کفارہ دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو لباس دینا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جسے یہ میسر نہ ہوں، وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔'' (4)

ہمارے رجحان کے مطابق سائلہ کی امی کو چاہیے کہ وہ آئندہ اپنے حالات کو سامنے رکھ کر نذر مانا کرے، البتہ صورت مسئولہ میں وہ قسم کا کفارہ دے کر اس سے عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔

ماہ صفر کی نحوست

سوال ہمارے معاشرہ میں کچھ لوگ ماہ صفر کو منحوس خیال کرتے ہیں، خصوصاً اس کے ابتدائی تیرہ دنوں کو نحوست زدہ قرار دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان دنوں میں شادی بیاہ نہیں کرتے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا آیا ہے، وضاحت کریں؟

جواب قرآن وحدیث میں کہیں بھی ماہ صفر کو منحوس نہیں قرار دیا گیا اور نہ ہی اس مہینہ میں کسی نیک عمل کو کسی فضیلت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ اس بنا پر جو نیک اعمال عام دنوں میں کئے جاتے ہیں وہ اس ماہ میں بھی کئے جا سکتے ہیں، البتہ عام لوگوں میں ماہ صفر کے حوالے سے مختلف عقائد ونظریات پائے جاتے ہیں۔ لوگ اس مہینہ کو منحوس خیال کرتے ہیں، خاص طور پر ابتدائی تیرہ دنوں کو ''تیرہ تیزی'' کہا جاتا ہے، ان دنوں میں کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس ماہ مبارک کے متعلق واضح طور پر فرمایا ہے: ''ماہ صفر منحوس مہینہ نہیں۔'' (5)

شارحین حدیث نے اس حدیث کی وضاحت میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے، چنانچہ راوی حدیث محمد بن راشد کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت ماہ صفر کو منحوس سمجھتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی نفی فرما دی۔ (6)

بعض اہل علم کے نزدیک اس سے مراد پیٹ کا درد ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''صفر کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ پیٹ کا درد ہے۔'' (7)

---

(1) صحيح البخاري، الايمان والنذور: ٦٧٠٠۔ (2) مجموع الفتاویٰ ص ١٤٨ ج١٣۔ (3) صحيح مسلم۔
(4) المائدة: ٨٩۔ (5) صحيح البخاري، الطب: ٥٧٥٧۔ (6) سنن أبي داؤد، الطب: ٣٩١٦۔
(7) صحيح البخاري، الطب باب ٢٥۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ دور جاہلیت میں لوگ ماہ صفر کو ایک سال حلال قرار دے لیتے تھے اور ایک سال حرام ٹھہراتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ماہ صفر میں تبدیلی صحیح نہیں۔'' ❶

بہر حال ہمارے ہاں ماہ صفر سے متعلق جو عقائد ونظریات پائے جاتے ہیں، ان کی شریعت میں کوئی حقیقت نہیں بلکہ وہ سب خود ساختہ اور بناوٹی ہیں۔ اسلام ان کی پرزور تردید کرتا ہے، لہٰذا ہمیں معاشرتی توہمات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اس مہینے کو منحوس خیال کر کے کسی اہم کام سے باز رہنا چاہیے، بلکہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے ہر وہ کام کرنا چاہیے جو دیگر مہینوں میں کیا جاتا ہے، واضح رہے کہ ماہ صفر کے آخری بدھ کو ہمارے ہاں ''یوم غسل صحت'' منایا جاتا ہے اور شیرینی تقسیم کی جاتی ہے، شریعت میں اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ (واللہ اعلم)

تعویذ گنڈا سے علاج

سوال میری ہمشیرہ بیمار ہے، ہم نے اس کا بہت علاج معالجہ کرایا ہے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا، آخر ایک تعویذ گنڈا کرنے والے نے ہمیں کہا ہے کہ اسے کسی بکری کے خون میں غسل دیا جائے، ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب بیمار کا علاج معالجہ کرنا سنت ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ احتیاط کی جائے کہ علاج معالجہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے کیا جائے، سوال میں جس تعویذ گنڈا کرنے والے کا ذکر ہے ایسے لوگ شعبدہ باز اور کاہن ہوتے ہیں، ان کے پاس مسائل کا حل کرانا، ان سے کچھ دریافت کرنا یا ان کی بات ماننا ناجائز ہی نہیں بلکہ کبیرہ گناہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

'' جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس آئے، اس سے کچھ پوچھے تو اس کی چالیس رات تک کوئی نماز قبول نہیں ہوگی۔'' ❷

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس آئے پھر اس کی تصدیق کرے تو اس نے گویا ان تعلیمات کا انکار کر دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہیں۔ ❸

جہاں تک غسل کرنے کا تعلق ہے تو ذبح کرتے وقت حلال جانور کا جو خون نکلتا ہے یہ حرام ہے جیسا کہ نص قرآن سے ثابت ہے اور حرام چیزوں کا بطور دواء استعمال کرنا بھی ناجائز ہے جیسا کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بیماری اور اس کا علاج نازل کیا ہے اور ہر بیماری کے لئے اس کا علاج بھی پیدا کیا ہے لہٰذا بیماری کا علاج کیا کرو لیکن حرام چیزوں سے علاج نہ کرو۔'' ❹

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام اشیاء میں تمہارے لئے قطعاً کوئی شفا نہیں رکھی ہے۔ ❺

لوگوں نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے ساتھ علاج کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شراب دوا نہیں بلکہ بذات خود بیماری ہے۔ ❻

---

❶ سنن أبي داؤد، الطب: ٣٩١٤۔ ❷ مسند أحمد ص ٤٢٩ ج ٢۔ ❸ سنن أبي داؤد، الكهانة: ٣٩٠٤۔
❹ جامع الترمذي، الطب: ٢٠٣٨۔ ❺ صحيح البخاري، معلقا قبل حديث ٥٦١٤۔
❻ سنن أبي داؤد، الطب: ٣٨٧٣۔

ان دلائل کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ بیماری کا علاج کرنا اور کرانا سنت سے ثابت ہے لیکن حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے بکری کے خون سے غسل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ وہ حرام ہے اور حرام چیز کو بطور علاج استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

مشرک کے لئے دعائے مغفرت

سوال میرا باپ شرک کی حالت میں فوت ہوا ہے، کیا اس کے لئے مغفرت کی دعا کی جا سکتی ہے؟ قرآن وحدیث کے حوالے سے فتویٰ درکار ہے؟

جواب مشرک اگر زندہ ہو تو اس کی رشد و ہدایت کے لئے دعا کرنا سنت سے ثابت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ دوس کے لئے ہدایت کی دعا کی تھی جبکہ وہ اس وقت مشرک تھا۔ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''مشرکین کے لئے دعا کرنا۔'' [2]

لیکن مرنے کے بعد مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ)

''نبی اور اہل ایمان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا کریں اگرچہ وہ قرابت دار ہی ہوں جب کہ ان پر واضح ہو چکا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔'' [3]

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی ماں کے لئے بخشش کی دعا کرنے کی اجازت طلب کی تو اس نے مجھے اجازت نہ دی پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے ان کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی تو اس نے مجھے اجازت دے دی۔'' [4]

اس قرآنی آیت اور ارشادِ نبوی کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ مشرک والدین کے لئے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ سے ان کی رشد و ہدایت کے لئے دعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

نادِ علی کی حیثیت

سوال نادِ علی کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے؟ اکثر شیعہ حضرات اس لفظ کو استعمال کرتے نظر آتے ہیں؟

جواب روافض و شیعہ کا عقیدہ ہے کہ مصائب و آلام میں علی رضی اللہ عنہ کو پکارا جائے، وہ عجائب و غرائب کا مظہر ہیں اور مصیبتوں کے وقت مدد کرتے ہیں، ''نادِ علی'' کی یہی حقیقت ہے۔ یہ عقیدہ کتاب و سنت سے متصادم ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا، وہ اپنے قاتل کے منصوبے کو معلوم نہ کر سکے اور نہ ہی خود کو اس مصیبت سے بچا سکے۔ ایسے حالات میں اس عقیدہ کی کیا حیثیت ہے کہ وہ اپنی وفات کے بعد کسی دوسرے کی مشکلات کو دور کر سکتے ہیں، جب کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے علاوہ کوئی بھی اسے دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ آپ سے کوئی بھلائی کرنا چاہے تو اس کے

---

[1] صحيح البخاري، الدعوات: ٦٣٩٧۔ [2] صحيح البخاري، الدعوات باب ٥٩۔ [3] التوبة: ١١٣۔

[4] صحيح مسلم، الجنائز: ٢٢٥٨۔

فضل کو کوئی روکنے والا نہیں، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے کیونکہ وہ بخشنے والا، انتہائی مہربان ہے۔'' ❶

آیت میں مذکورہ خصوصیات اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں، جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ یہ خصوصیات کسی اور میں بھی ہیں اور اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی مصائب وآلام میں مدد کرسکتا ہے تو وہ مشرک ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام اور جہنم کو واجب کردیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کا عقیدہ رکھنا بھی شرک ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی کچھ لوگ آپ کو اپنا خالق اور رازق مانتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں بلا کر تین دن تک وعظ ونصیحت کرتے رہے، انہیں مشرکانہ عقیدہ سے توبہ کرنے کی تلقین کرتے رہے، جب وہ اپنے بدعقیدہ سے باز نہ آئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں آگ کے آلاؤ میں ڈال کر جلادیا۔'' ❷

بہرحال ''نادِ علی'' شیعہ حضرات کی ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشکل کشا ہونا مراد لیا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ یونس: ۱۰۷۔ ❷ فتح الباري ص ۳۳٤ ج ۱۲۔

طہارت و وضو

طہارت و وضو
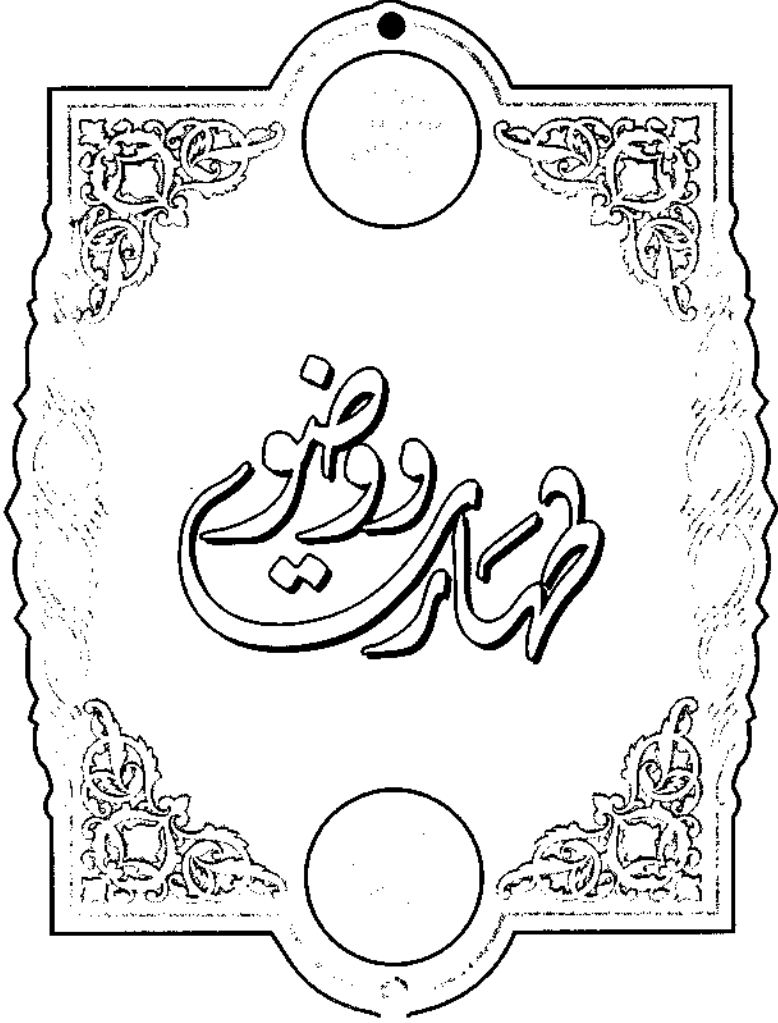
خون نکلنے سے وضو ٹوٹنا

سوال اگر وضو کرنے کے بعد جسم کے کسی حصہ سے خون نکل آئے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، بعض دفعہ دانتوں سے خون نکل آتا ہے یا کسی پھوڑے پھنسی سے خون بہنے لگتا ہے، ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے، قرآن و حدیث کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے؟

جواب وضو کرنے کے بعد اگر جسم کے کسی بھی حصہ سے خون نکل آئے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں چند ایک معلق آثار نقل کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خون نکل آنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ انہوں نے امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ ہمیشہ سے مسلمان اپنے زخموں میں نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں، لہٰذا خون ناقضِ وضو نہیں ہے۔ [1]

حدیث میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک انصاری آدمی پہرہ دے رہا تھا، اس نے نماز شروع کر دی، چنانچہ دشمن کے ایک آدمی نے تیر مارا تو اس نے دوران نماز تیر نکال کر اپنی نماز کو جاری رکھا، اسی طرح اس نے اپنی نماز کو مکمل کیا اس کے بعد اس نے اپنے ساتھی کو بیدار کیا۔ جب اس نے خون آلود حالت میں اپنے ساتھی کو دیکھا تو کہا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بیدار کیا، انصاری نے بتایا کہ میں ایک سورت کی تلاوت کر رہا تھا، میں نے درمیان میں اسے چھوڑنا پسند نہ کیا۔ [2]

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ انسان کا خون ناقض وضو نہیں ہے کیونکہ انصاری نے اسی حالت میں اپنی نماز کو جاری رکھا، یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیش آیا ہے۔ اگر خون ناقض وضو ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ضرور اس کی وضاحت فرماتے۔

(واللہ اعلم)

ایک اہم مسئلہ

سوال عام طور پر عورتیں حمل سے بچنے کے لئے رحم میں مانع حمل جھلی رکھ لیتی ہیں، کیا اس صورت میں ہم بستری کے بعد عورت کو غسل کرنا واجب ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب مرد، عورت جب ہم بستر ہوں تو محض دخول سے غسل واجب ہو جاتا ہے اگرچہ انزال نہ ہو جیسا کہ حدیث

---

[1] صحيح البخاري، الوضوء، باب ۳٤۔ [2] سنن أبي داود، الطهارة: ۱۹۸۔

میں ہے: ''جب آدمی نے عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھ کر دخول کیا تو اس پر غسل واجب ہو گیا اگر چہ انزال نہ ہوا ہو۔'' ❶

ایک دوسری حدیث میں مزید وضاحت ہے: ''جب مرد کی طرف سے موضع ختنہ عورت کے ختنہ کی جگہ سے تجاوز کر جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔'' ❷ رحم میں مانع حمل کوئی بھی چیز رکھنے کی صورت میں بھی غسل واجب ہو گا کیونکہ یہ چیزیں دخول اور انزال سے رکاوٹ نہیں بنتیں، وضوء صرف اس صورت میں ہو گا جب دخول کے بغیر لمس ہوا ہو، بہر حال صورت مسئولہ میں عورت کو غسل کرنا ہو گا، مصنوعی جھلی رکھنے سے غسل ساقط نہیں ہو گا بشرطیکہ دخول ہو چکا ہو۔

جمی ہوئی مٹی پر تیمم

سوال بارش کی وجہ سے اگر زمین کی مٹی جم گئی ہو اور وہاں غبار وغیرہ نہ ہو تو کیا اس پر تیمم کیا جا سکتا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب تیمم کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔'' ❸

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم کے لئے مٹی کا ہونا شرط ہے، اس پر غبار ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ جب بھی مٹی پر ہاتھ مار کر تیمم کر لیا جائے تو یہ کافی ہے۔ لہٰذا جب کسی زمین پر بارش پڑنے کی وجہ سے اس کی مٹی جم گئی ہو تو انسان کو چاہیے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دونوں ہاتھوں اور چہرے کا مسح کر لے، اس صورت میں تیمم صحیح ہے اگر دیوار پاک مٹی سے بنی ہوئی ہے تو اس کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے ہاں اگر دیوار پر لکڑی کا کام ہوا ہے یا اس پر ٹائل لگی ہے تو غبار ہونے کی صورت میں تیمم کیا جا سکتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے وہ زمین پر تیمم کر رہا ہے کیونکہ غبار مٹی کے مادے سے ہے اور اگر غبار نہ ہو تو اس پر تیمم جائز نہیں کیونکہ وہ مٹی سے تیمم نہیں کر رہا، اسی طرح اگر فرش وغیرہ پر غبار ہو تو اس پر ہاتھ مار کر تیمم کیا جا سکتا ہے اور اگر اس پر غبار نہ ہو تو اس پر تیمم نہیں ہو سکتا، بہر حال بارش کی وجہ سے جمی ہوئی مٹی پر تیمم ہو سکتا ہے اگر چہ اس پر غبار نہ ہو لیکن لکڑی اور فرش وغیرہ پر اگر غبار ہو تو تیمم جائز ہے بصورت دیگر اس سے تیمم نہیں کرنا چاہیے۔

چھوٹے بچے کا پیشاب

سوال چھوٹے بچے کا پیشاب اگر کپڑوں کو لگ جائے تو کیا اسے دھونا چاہیے یا اس پر پانی بہا دیا جائے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب پیشاب پلید ہے، اسے دھونا چاہیے، البتہ بچے کے پیشاب میں شریعت نے کچھ نرمی کی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''لڑکی کے پیشاب سے آلودہ کپڑا دھویا جائے البتہ لڑکے کے پیشاب سے آلودہ کپڑے پر چھینٹے مارے جائیں گے۔'' ❹

---

❶ صحیح البخاري، الغسل: ٢٩١۔ ❷ ابن ماجه، الطهارة: ٦١١۔

❸ المائدة: ٦۔ ❹ سنن أبي داؤد، الطهارة: ٣٧٦۔

لیکن یہ اس وقت جب بچہ دودھ پیتا ہو جیسا کہ ایک روایت میں اس کی وضاحت ہے چنانچہ حضرت ام قیس بنت محصن رضی اللہ عنہا اپنے چھوٹے بچے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئیں جو ابھی دودھ پیتا تھا، اس بچے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا، اس پر چھینٹے مارے لیکن اسے دھویا نہیں۔ [1]

البتہ اگر لڑکی کسی کے کپڑے پر پیشاب کر دے تو اسے دھونا چاہیے وہ صرف چھینٹے مارنے سے پاک نہیں ہو گا کیونکہ پیشاب ناپاک ہے خواہ بچی کا ہو یا بچے کا، البتہ بچے کے پیشاب کے لئے شریعت نے کچھ نرمی رکھی ہے کہ اسے دھونے کے بجائے کپڑے پر صرف چھینٹے مار دیئے جائیں۔ صورت مسئولہ میں اگر کپڑے پر کسی لڑکی کا پیشاب لگا ہے تو اسے دھو لیا جائے اور اگر شیر خوار بچے کا پیشاب ہے تو اس پر ویسے ہی پانی بہا دیا جائے، اسے دھونے کی ضرورت نہیں۔ (واللہ اعلم)

مریض کی طہارت

سوال اگر کوئی بیمار ہو اور طہارت حاصل کرنے سے معذور ہو تو کیا وہ حصول طہارت کے لئے نماز کو مؤخر کر دے یا اسی حالت میں نماز بروقت پڑھ لے، قرآن و حدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے؟؟

جواب مریض کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ طہارت سے معذوری کی وجہ سے نماز کو وقت سے مؤخر کرے بلکہ اسے چاہیے کہ اپنی نیت کے مطابق جس قدر طہارت حاصل کر سکتا ہے، اسے پورا کر کے نماز بروقت ادا کرے خواہ اس کے بدن، کپڑے یا جگہ پر نجاست لگی ہو جسے وہ دور نہیں کر سکتا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو، اس کے احکام سنو اور ان کی اطاعت کرو۔'' [2]

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جہاں میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کی بجا آوری کرو۔'' [3]

اس بنیادی قاعدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے معذور لوگوں سے ان کے عذر کے مطابق عبادات میں تخفیف کر دی ہے تا کہ وہ حرج اور مشقت میں پڑے بغیر اللہ کی عبادت کو بجا لائیں، اس سلسلہ میں کچھ شرعی ہدایات حسب ذیل ہیں:

① مریض کے لئے ضروری ہے کہ وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرے خواہ وہ وضو کی صورت میں ہو یا غسل کرنے کی صورت میں، اگر پانی سے طہارت حاصل کرنے سے عاجز ہو یا پانی کے استعمال سے مرض میں اضافے کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کرے، اگر وہ وضو یا تیمم نہ کر سکتا ہو تو کوئی بھی دوسرا شخص اسے وضو یا تیمم کرا سکتا ہے۔

② اگر کسی جگہ زخم ہو تو وہاں مسح بھی کیا جا سکتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ مریض اپنے ہاتھ کو پانی سے تر کرے اور اس گیلے ہاتھ کو زخم پر پھیر دے اگر ایسا کرنا نقصان دہ ہو تو اس زخم پر بھی تیمم کرے، اگر زخم پر پٹی بندھی ہے تو اسے دھونے کے بجائے پانی کے ساتھ مسح کر لیا جائے وہاں تیمم کی ضرورت نہیں کیونکہ عضو کو دھونے کے بجائے وہاں مسح کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] مستدرك حاكم ص ١٦٦ ج ١۔ [2] التغابن: ١٦۔ [3] صحيح البخاري، الاعتصام: ٧٢٨٨۔

باریک جرابوں پر مسح

سوال باریک جرابوں پر مسح کرنے کے متعلق شریعت کیا حکم دیتی ہے، قرآن وحدیث میں مسح کے متعلق کیا شرائط ہیں کہ وہ جرابیں کس طرح کی ہوں؟

جواب عام طور پر جرابوں کے دو فائدے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ سردی وغیرہ سے بچاؤ کا کام دیں اور دوسرے یہ کہ گرد وغبار سے پاؤں محفوظ رکھیں جب تک جراب اس طرح کے دو فائدے دیتی رہتی ہے تو اس پر مسح کیا جا سکتا ہے اور اگر جراب اس قدر پھٹی ہوئی ہے کہ اسے پہن کر نہ سردی کا بچاؤ ہوتا ہے اور نہ ہی گرد وغبار سے پاؤں محفوظ رہتا ہے تو ایسی جراب پر مسح نہیں کرنا چاہیے، اس کے موٹے ہونے کے متعلق فقہ کی کتابوں میں جو معیار قائم کیا گیا ہے وہ ایجاد شدہ اور خود ساختہ ہے، قرآن وحدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جرابوں پر مسح کرنا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا تو اپنے جوتوں اور جرابوں پر مسح کیا۔ [1]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں ایک جنگی دستہ روانہ کیا، انہیں دوران سفر سخت سردی کا سامنا کرنا پڑا، جب وہ واپس آئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے انہیں ایسی صورت حال کے پیش نظر پاؤں کے لفافوں یعنی موزوں اور جرابوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ [2]

کبار صحابہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے جرابوں پر مسح کرنا احادیث سے ثابت ہے، جب یہ عمل رسول اللہ ﷺ اور بلند مرتبہ صحابہ کرام سے ثابت ہے تو پھر جرابوں پر مسح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ واضح رہے کہ مقیم آدمی کے لئے ایک دن اور ایک رات جب کہ مسافر انسان کے لئے تین دن اور تین راتوں تک مسح کرنے کی اجازت ہے، اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد جرابوں کو پہنا جائے اور جب وضو ٹوٹ جائے تو مسح کی مدت کا آغاز ہو جاتا ہے یعنی وضو کرنے کے بعد پاؤں دھونے کے بجائے ان پر مسح کر لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

ایک حدیث کا حوالہ اور تحقیق

سوال اہل حدیث شمارہ نمبر ۳۹ میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو کرتے تو ہتھیلی میں پانی لے کر داڑھی میں ڈالتے اور ٹھوڑی کا خلال کیا کرتے تھے، اس حدیث کا حوالہ اور اس کے صحیح ہونے کے متعلق معلومات درکار ہیں، اولین فرصت میں آگاہ فرمائیں؟

جواب واضح رہے کہ وضو میں داڑھی کا خلال تاکیدی سنت ہے، البتہ غسل جنابت میں خلال سے کام نہیں چلے گا، بلکہ داڑھی کو دھونا ہوگا کیونکہ ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے، یہ ان کتب حدیث میں مروی ہے۔ [3]

اس حدیث کو دور حاضر کے بعض محققین نے ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے، علامہ البانی رحمۃ اللہ لکھتے

---

[1] سنن أبي داؤد، الطهارة: ١٥٩۔ [2] سنن أبي داؤد، الطهارة: ١٤٦۔

[3] سنن أبي داؤد، الطهارة: ١٤٥؛ سنن البيهقي ص ٥٤ ج١؛ مستدرك حاكم ص ١٤٩ ج١۔

ہیں کہ ولید بن زوران کے علاوہ اس حدیث کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں، ابن زوران سے بہت سے لوگوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے، امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے اپنی کتاب ''الثقات'' میں ذکر کیا ہے، اس طرح کی حدیث حسن کہلاتی ہے، خاص طور پر اس کے اور بھی طرق ہیں، امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس کی صحت کو برقرار رکھا ہے، ان سے پہلے ابن قطان بھی اسے صحیح قرار دے چکے ہیں اور اس حدیث کے بہت سے شواہد ہیں جن میں سے کچھ شواہد میں نے اپنی تالیف ''صحیح ابی داؤد'' میں ذکر کئے ہیں۔ [1]

ان شواہد کی بناء پر یہ حدیث درجہ صحت تک پہنچ جاتی ہے۔ [2]

بہر حال یہ حدیث قابل حجت ہے اور دوران وضوء داڑھی کا خلال مشروع ہے۔ (واللہ اعلم)

تیل لگا کر وضو کرنا

سوال سردی کے دنوں میں ہاتھ پاؤں اور چہرے کی خشکی دور کرنے کے لئے تیل یا کریم وغیرہ استعمال کی جاتی ہے، آیا وضو کرتے وقت صابن وغیرہ سے اس کے اثرات دور کرنا ضروری ہیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب وضوء کرتے وقت ہاتھ، منہ اور پاؤں کا دھونا ضروری ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولیا کرو، اپنے سر پر مسح اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔'' [3]

اس آیت کریمہ کا تقاضا ہے کہ وضوء کے لئے جن اعضاء کا دھونا ضروری ہے، ان سے ہر اس چیز کا ازالہ کرنا ضروری ہے جو پانی کو ان تک پہنچنے کے لئے رکاوٹ کا باعث ہو، کیونکہ اس کے باقی رہنے سے اعضاء وضو دھل نہیں سکیں گے، اس بناء پر اگر اعضاء وضو پر تیل یا کریم وغیرہ لگی ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں:

☆ تیل یا کریم وغیرہ جامد ہو، اس کے لگانے سے ایک مستقل تہہ بن جائے، اس صورت میں اس تیل یا کریم کا ازالہ ضروری ہے یعنی اسے صابن وغیرہ سے دھویا جائے پھر وضو کیا جائے تاکہ اعضاء وضوء تک پانی پہنچ سکے، ان کے باقی رہنے کی صورت میں پانی جسم تک نہیں پہنچے گا اور طہارت حاصل نہ ہو سکے گی۔

☆ دوسری صورت یہ ہے کہ تیل سیال ہے یا کریم لگانے سے بھی اس کی تہہ نہیں بنتی بلکہ وہ سیال شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس صورت میں اعضاء وضو کو پانی سے دھونے کے بعد ان پر اچھی طرح ہاتھ پھیر لیا جائے تاکہ تمام اعضاء پانی سے تر ہو جائیں اور کوئی جگہ بھی خشک نہ رہے۔

درج بالا وضاحت کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ اگر تیل یا کریم سیال ہے تو صابن استعمال کئے بغیر وضو کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ اس میں یہ احتیاط کر لی جائے کہ اعضاء وضوء کو دھوتے وقت انہیں اچھی طرح مل لیا جائے تاکہ پانی اوپر سے پھسل کر نہ گزر جائے، اس طرح اعضاء خشک نہ رہ جائیں اور اگر کوئی تہہ دار چیز استعمال کی ہے تو وضو سے قبل اس کا ازالہ ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] رقم: ۱۳۳۔ [2] ارواء الغلیل ص ۱۳۰ ج ۱۔ [3] المائدۃ: ٦۔

دوران حیض بچے کو دودھ پلانا

سوال اگر کوئی عورت ایام میں ہو تو کیا اس دوران اپنے شیر خوار بچے کو دودھ پلا سکتی ہے، نیز ایسی عورت کے ساتھ کھانا پینا شرعاً کیسا ہے؟

جواب سابقہ شریعتوں میں طہارت ونجاست کے کچھ مسائل بہت سخت تھے۔ چنانچہ یہودی، عورت کو مخصوص ایام میں سخت مشکلات سے دوچار کرتے تھے، اسے الگ کمرے یا خیمے میں رہنے کا حکم دیتے، جس بستر پر وہ بیٹھ جاتی جو کپڑا پہن لیتی یا کسی چیز کو ہاتھ لگا دیتی، وہ ان کے خیال کے مطابق ناپاک ہو جاتی۔ اسلام میں طہارت وصفائی کی بہت اہمیت ہے لیکن یہود جیسی سختی نہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ یہودی گھر میں حائضہ عورت کے پاس نہ بیٹھتے اور نہ اس کے ساتھ مل کر کھاتے پیتے تھے، اس کا ذکر جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی: ''آپ سے حیض کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیں وہ گندگی ہے، ان دنوں تم عورتوں سے الگ رہو۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم حائضہ عورت کے ساتھ جماع کے علاوہ سب کچھ کر سکتے ہو۔ [2]

اس آیت کے پیش نظر حیض کے ایام میں عورت سے مباشرت تو جائز نہیں لیکن عورت کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پیار کرنا حتیٰ کہ اس کے ساتھ لیٹنا جائز ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کا ایک اسوۂ مبارکہ پیش کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''میں ایام میں ہوتی تھی تو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ میں ہڈی والی بوٹی سے دانتوں کے ساتھ گوشت نوچتی تو رسول اللہ ﷺ اس بوٹی کو لے کر جہاں میں نے منہ لگایا ہوتا وہیں سے منہ لگا کر اس ہڈی سے گوشت نوچتے، میں برتن میں پانی پیتی تو رسول اللہ ﷺ وہیں منہ رکھ کر پانی پی لیتے جہاں میں نے منہ رکھا تھا۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حائضہ عورت کا بدن پاک ہوتا ہے اور حیض کی وجہ سے یہ نجاست حکمی ہے۔ ہاں خونِ حیض نجاست حسی ہے، حائضہ عورت کا منہ اور لعاب دھن پاک ہے، اس لئے اس کا پس انداز کیا ہوا پانی اور کھانا تناول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ گھر میں رہتے ہوئے روٹی پکا سکتی ہے، سالن تیار کر سکتی ہے حتیٰ کہ اپنے بچے کو دودھ بھی پلا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

غسل حیض کے لئے بالوں کو کھولنا

سوال کیا مرد اور عورت کے غسل جنابت میں کوئی فرق ہے، نیز بتائیں کہ غسل حیض کے لئے بالوں کو کھولنا ضروری ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب مرد اور عورت کے غسل جنابت میں کوئی فرق نہیں، پہلے زیریں جسم کو دھولیا جائے اور اگر کوئی آلائش وغیرہ لگی ہو تو دور کر لی جائے، اس کے بعد نماز والا وضو کر لیا جائے پھر باقی جسم پر پانی بہا لیا جائے۔ خواتین کو اجازت ہے کہ وہ غسل جنابت میں اگر بال گندھے ہوئے ہیں تو انہیں نہ کھولیں، ویسے سر پر تین لپ پانی ڈال کر انہیں خوب اچھی طرح ہلا لیں تاکہ پانی جڑوں تک پہنچ

---

[1] ۲/ البقرة: ۲۲۲۔ [2] صحيح مسلم، الحيض: ۳۰۲۔ [3] سنن أبي داود، الطهارة: ٦٤٣۔

جائے جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ہے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے سر کے بال سخت کر کے باندھتی ہوں، کیا غسل جنابت کے وقت انہیں کھولنا ہو گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر دونوں ہاتھ بھر کر تین بار پانی ڈال لے، اس کے بعد باقی جسم پر پانی بہالے، اس طرح تو پاک ہو جائے گی۔'' [1]

لیکن حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کیا میں غسل حیض اور غسل جنابت کے لئے اپنے گندھے ہوئے بالوں کو کھولوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں کھولنے کی ضرورت نہیں۔ [2]

اگرچہ بعض اہل علم نے روایت میں حیض کے الفاظ کو شاذ قرار دیا ہے۔ [3]

لیکن انہیں شاذ قرار دینے کے بجائے یہ موقف زیادہ قرین قیاس ہے کہ عورت پر غسل حیض کے وقت بال کھولنے کی پابندی نرم کر دی جائے، البتہ احتیاط اور افضل یہ ہے کہ عورت غسل حیض کرتے وقت اپنے بال کھول لے تاکہ مختلف احادیث میں تطبیق پیدا ہو جائے اور اختلاف سے بچنا بھی ممکن ہو سکے، یہ بھی یاد رہے کہ اگر مرد یا عورت کے سر پر مہندی لگی ہو اور اس کی وجہ سے پانی جسم تک نہ پہنچ سکتا ہو تو اس کا ازالہ ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

شیر خوار بچے اور بچی کا پیشاب

سوال شرعی طور پر شیر خوار بچے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جاتے ہیں جبکہ بچی کے پیشاب کو دھویا جاتا ہے، بچے اور بچی کے پیشاب میں اس فرق کی کیا حیثیت ہے؟ کیا بچی کے پیشاب میں زیادہ نجاست ہوتی ہے؟ بظاہر ایسا کرنا عدل و انصاف کے منافی معلوم ہوتا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس فرق کا کوئی معقول حل پیش کریں؟

جواب شیر خوار بچے اور بچی کے پیشاب کی طہارت کے متعلق اہل علم کے ہاں تین موقف حسب ذیل ہیں:

① شیر خوار بچے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں جبکہ بچی کا پیشاب اس عرصہ میں دھویا جائے۔

② بچے اور بچی دونوں کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں، بچی کے پیشاب کو دھونے کی ضرورت نہیں۔

③ بچے اور بچی کے پیشاب کو دھویا جائے، بچے کے پیشاب پر چھینٹے مارنے سے کام نہیں چلے گا۔

ہمارے رجحان کے مطابق پہلا موقف صحیح اور برحق ہے کیونکہ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت ام قیس بنت محصن رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ وہ اپنے بچے کو لے کر (جو ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اس بچے نے رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگوایا اور اس پر چھینٹے مارے لیکن اسے دھویا نہیں۔ [4]

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بچہ لایا گیا، اس نے آپ پر پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگوا کر اس پر چھینک دیا اور اسے دھویا نہیں۔ [5]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ لڑکے کے پیشاب سے آلودہ کپڑے پر چھینٹے مارے جائیں اور لڑکی کے پیشاب سے

---

[1] سنن أبي داؤد، الطهارة: ۲۵۱۔ [2] صحيح مسلم، الحيض: ۳۳۰۔ [3] الاحاديث الصحيحة: ۱۸۸۔
[4] صحيح البخاري، الوضوء: ۲۲۳۔ [5] صحيح مسلم، الطهارة: ۲۸۶۔

آلودہ کپڑے کو دھویا جائے گا۔ ❶

اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے گا، لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ شیر خوار بچے کا پیشاب پلید نہیں، بچی اور بچے کے پیشاب کی نجاست کے متعلق دو رائے نہیں ہیں۔ البتہ شریعت نے جس کپڑے کو پیشاب لگ جائے اس کے پاک کرنے کے متعلق بچے اور بچی کے پیشاب میں فرق ضرور رکھا ہے۔ جیسا کہ درج بالا احادیث میں اس امر کی صراحت ہے، لیکن اس تفریق میں کیا حکمت کارفرما ہے اس کے متعلق احادیث خاموش ہیں البتہ شارحین حدیث نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی حکمت بیان کی ہے، چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لڑکے کا پیشاب پانی اور مٹی سے ہے اور لڑکی کا پیشاب گوشت اور خون سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو انہیں پانی اور مٹی سے پیدا کیا اور حضرت حوا علیہا السلام ان کی چھوٹی پسلی سے پیدا ہوئی، گویا لڑکے کا پیشاب پانی اور مٹی سے وجود میں آیا جس سے آدم علیہ السلام بنے تھے اور لڑکی کا پیشاب خون اور گوشت سے پیدا ہوا جس سے حوا علیہا السلام کی تخلیق ہوئی تھی۔ ❷

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس کے تین اسباب بیان کئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

☆ بچے کا پیشاب ایک جگہ اکٹھا نہیں گرتا بلکہ وہ بکھر جاتا ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر زہریلا مواد زیادہ جگہ پر پھیلا دیا جائے تو اس کے زہریلے اثرات کم ہو جاتے ہیں جبکہ بچی کا پیشاب ایک ہی جگہ گرتا ہے اور وہ زہریلے اثرات کے اعتبار سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے لہٰذا اسے دھو کر اس کے مضر اثرات سے بچا جا سکتا ہے۔

☆ بچے کے پیشاب میں حرارت زیادہ اور بچی کے پیشاب میں رطوبت کی کثرت ہوتی ہے، حرارت کی وجہ سے بچے کے پیشاب کی بدبو کم ہوتی ہے لہٰذا اس پر چھینٹے مارے جاتے ہیں جبکہ رطوبت کی وجہ سے اس کی بدبو میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے اسے دھویا جاتا ہے۔ ❸

ہم ان اسباب ووجوہ پر تبصرہ کرنے کے بجائے جدید طب کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بچے اور بچی کی جسمانی ساخت اور جنسی اعضاء کی بناوٹ بہت مختلف ہے، اس بناء پر پیشاب کا نظام تولید اور اس کا نظام اخراج بھی مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم میں ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ وہ جو کچھ کھاتا پیتا ہے قدرتی طریقوں سے چھانا جاتا ہے پھر خوراک میں موجود مفید اجزاء کی ایک بڑی مقدار جزو بدن بن جاتی ہے اور غیر مفید یا نقصان دہ اجزاء الگ ہو کر باہر نکل جاتے ہیں، پھر نقصان دہ مائع اجزاء مثانے میں جمع ہو کر خارج ہوتے ہیں، طب جدید اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ مونث اپنے مثانے میں جمع شدہ مضر اجزاء کو پیشاب کی شکل میں ۷۵ فیصد حصہ خارج کرتی ہے اور خارج کر کے ایک ہی جگہ پر گرا دیتی ہے جس سے اس جگہ پر نقصان دہ خودرو جراثیم کی نشوونما کا مددگار ماحول پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے اسے غیر مددگار ماحول بنانے کے لئے دھونا ضروری ہو جاتا

---

❶ سنن أبي داوٗد، الطهارة: ٣٧٦۔ ❷ ابن ماجه، الطهارة تحت ح ٥٢٥۔

❸ اعلام الموقعين ص ٤٦ ج٢۔

ہے۔جبکہ مذکر اپنے مثانے میں جمع شدہ پیشاب کا کم حصہ خارج کرتا ہے اور وہ کم مقدار بھی زیادہ جگہ پر پھیل جاتی ہے اس لئے جراثیم کی افزائش کے لئے مددگار ماحول پیدا نہیں ہوتا، اسے مزید کمزور اور غیر مؤثر بنانے کے لئے متاثرہ مقام پر صرف چھینٹے مار دینے سے کام چل جاتا ہے۔اس کے علاوہ طب جدید اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ غذائی اجزاء کی توڑ پھوڑ کے نیچے کچھ زہریلے مرکبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔پھر شیر خوار بچے کے متحرک نظام کی بدولت پیشاب میں زہریلے مواد خطرناک حد تک جمع نہیں ہوتے، وہاں چھینٹے مار کر ان کے زہر کو ختم کر دیا جاتا ہے جبکہ بچی کے اندر پیدا کردہ نظام بہت سست ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پیشاب میں زہریلے مادوں کا ارتکاز بڑھ جاتا ہے۔ان کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے اسے دھونا پڑتا ہے۔غالباً خواتین میں جوڑوں اور ہڈیوں کا درد اسی زہریلے مواد کی بناء پر بکثرت پایا جاتا ہے، طب جدید نے جن سربستہ رازوں کو آج کھولا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان حق ترجمان سے آج سے چودہ سو سال قبل انکشاف کر دیا تھا کہ شیر خوار بچی کے پیشاب کو دھویا جائے اور بچے کے پیشاب پر چھینٹے مارنا ہی کافی ہے۔(واللہ اعلم)

تیمّم اور اس کا طریقہ

سوال ہمارے ہاں تیمم اور اس کی مشروعیت وطریقہ کے متعلق بہت سے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں، براہ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں اس کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب تیمم کا لغوی معنی قصد وارادہ ہے اور اصطلاحی معنی یہ ہے کہ چہرے اور ہاتھوں پر پاک مٹی سے مخصوص طریقہ کے ساتھ مسح کرنا۔شرعی عذر کے وقت تیمم وضوء کا بدل ہے اور اس سے ہر وہ کام لیا جا سکتا ہے جو وضوء سے لیا جاتا ہے۔تیمم امت محمدیہ کے لئے ایک خصوصی عطیہ ہے جو کسی دوسری امت کے حصہ میں نہیں آیا۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''میرے لئے زمین مسجد اور ذریعہ طہارت بنادی گی ہے۔''[1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زمین کی مٹی ہمارے لئے ذریعہ طہارت قرار دی گئی ہے۔''[2]

درج ذیل صورتوں میں تیمم مشروع ہے:

☆ سفر یا اقامت میں پانی نہ ہونا یا تلاش کے باوجود میسر نہ آنا۔

☆ جب کوئی بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے پانی کے استعمال میں اس قدر بے بس ہو کہ حرکت نہ کر سکتا ہو اور نہ کوئی وہاں وضوء کرانے والا ہو، نیز نماز کا وقت فوت ہونے کا اندیشہ ہو۔

☆ جب پانی شدید ٹھنڈا ہو اور اس کے گرم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، نیز ٹھنڈا پانی استعمال کرنے سے بیمار ہونے کا خدشہ ہو۔

☆ پانی اتنی قلیل مقدار میں ہو جس سے اعضاء وضوء نہ دھل سکتے ہوں۔حدیث میں ایک مد پانی سے وضوء کرنے کا ذکر ہے، اس سے کم پانی قلیل ہی شمار ہوگا۔

---

[1] صحیح البخاري، التیمم: ۳۳۵۔ [2] صحیح مسلم، المساجد: ۵۲۱۔

ایسے حالات میں اگر زمین کی سطح پر صاف مٹی ہو، ریتلی زمین اور شور کلر والی زمین بھی اس حکم میں ہے، سب سے تیمم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ''پاک مٹی سے تیمم کرو۔'' عام ہے، نیز رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام جس قسم کی زمین پر نماز ادا کرتے وہیں مٹی یا ریت پر ہاتھ مار کر تیمم کر لیا کرتے تھے، وہ اپنے ساتھ مٹی کے ڈھیلے رکھنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔

تیمم کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے نیت کرے اور بسم اللہ پڑھے پھر دونوں ہاتھ مٹی پر ایک بار مارے اور پھونک مار کر غبار کو اڑا دے، اس کے بعد دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر لے اور پھر ہتھیلیوں پر بھی مسح کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تجھے صرف اتنا ہی کافی تھا کہ تو اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر مارتا پھر ان میں پھونکتا، اس کے بعد ان کے ساتھ اپنے چہرے اور اپنی ہتھیلیوں کا مسح کرتا۔ [1]

اپنے ہاتھوں کو کہنیوں یا بغلوں تک پھیرنے کی ضرورت نہیں، اگرچہ بعض روایات میں کہنیوں اور بغلوں کے الفاظ بھی ہیں لیکن وہ قابل حجت نہیں۔''

صحیح کی روایت میں تیمم کے لئے ایک ہی مرتبہ زمین پر مارنے کا حکم ہے۔ [2]

لیکن یہ روایت علی بن ظبیان راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [3]

واضح رہے کہ اگرچہ تیمم کرنے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے پانی میسر آ جائے تو تیمم ختم ہو جاتا ہے اور وضوء کر کے نماز پڑھنا ہو گی۔ ہاں اگر نماز پڑھ لی ہے اور بعد میں پانی ملا ہے تو ادا کردہ نماز کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے: ''دو آدمی سفر میں نکلے اور جب نماز کا وقت ہوا تو ان کے پاس پانی نہیں تھا لہٰذا انہوں نے پاک مٹی سے تیمم کر لیا اور نماز ادا کر لی پھر انہیں نماز کے وقت میں ہی پانی مل گیا، ان میں سے ایک نے وضوء کر کے دوبارہ نماز پڑھ لی جبکہ دوسرے نے ایسا نہ کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا ماجرا بیان کیا تو جس شخص نے نماز دوبارہ نہ پڑھی تھی اسے آپ ﷺ فرمایا کہ تم نے سنت کو حاصل کر لیا اور تمہیں تمہاری نماز کافی ہو گئی اور دوسرے شخص سے فرمایا کہ تیرے لئے دوگنا اجر ہے۔ [4]

اگر کسی کو نماز کے وقت پانی نہ مل سکے اور نہ ہی مٹی دستیاب ہو تو وہ طہارت کے بغیر ہی نماز ادا کرے۔ اگرچہ ایسا امکان بہت کم ہوتا ہے تاہم امید ہے کہ ایسے حالات میں بغیر وضو کے نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی رجحان معلوم ہوتا ہے۔ [5]

پانی سے استنجا کرنا

سوال کیا احادیث میں پانی سے استنجاء کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ پینے کے لئے استعمال ہوتا ہے، کیا صحابہ کرام استنجاء کے لئے پانی کا استعمال نہیں کرتے تھے، اس سلسلہ کے متعلق قرآن وحدیث کے مطابق وضاحت کریں؟

---

[1] مسند أحمد ص ٢٦٥ ج ٤۔ [2] صحیح البخاري، التیمم : ٣٣٨۔ [3] تلخیص الحبیر ص ١٥١ ج ١۔
[4] سنن أبي داؤد، الطهارة : ٣٣٨۔ [5] صحیح البخاري، التیمم باب ٢۔

جواب قضاء حاجت کے بعد ڈھیلوں سے استنجاء کرنا جائز ہے جیسا کہ احادیث میں صراحت آئی ہے لیکن پانی کے ساتھ استنجاء کرنا افضل ہے کیونکہ اس سے نجاست اور اس کے اثرات مکمل طور پر زائل ہو جاتے ہیں جبکہ ڈھیلوں کے استعمال سے نجاست کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات طہارت کے لئے پانی استعمال کرتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے خواتین سے کہا: ''اپنے شوہروں کو پانی کے ساتھ استنجاء کرنے کا حکم دو کیونکہ میں ان سے حیا کرتی ہوں، بلاشبہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔'' [1]

اس کے علاوہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اس (بستی) میں ایسے آدمی ہیں جو خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ یہ آیت اہل قباء کے متعلق نازل ہوئی کیونکہ وہ پانی کے ساتھ استنجاء کرتے تھے۔ [3]

پانی کے ساتھ استنجا کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اظہار محبت کرنا اور اس آیت کریمہ کو نازل کرنا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ پانی سے استنجاء کرنا افضل ہے، اگرچہ بعض روایات میں کچھ صحابہ کرام سے پانی کے ساتھ استنجاء کرنے کی کراہت منقول ہے، جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے لیکن صحیح احادیث کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ (واللہ اعلم)

دوران وضو گفتگو کرنا

سوال بعض لوگ وضو کرتے وقت گپیں ہانکتے رہتے ہیں، اگر انہیں خاموشی سے وضو کرنے کے متعلق کہا جائے تو دلیل مانگتے ہیں، اس کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی کریں؟

جواب گپیں ہانکنا تو ویسے ہی منع ہے، ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے وہ فضول کاموں یا فضول باتوں میں اپنا وقت صرف کرے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیزوں کو ترک کردے۔'' [4]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو لایعنی کاموں اور فضول باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے، وضو کرتے وقت بھی اس قسم کی گفتگو سے اجتناب کیا جائے جو بے مقصد ہو، اگر کوئی بامقصد بات ہے تو اس میں چنداں حرج نہیں۔ جیسا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے موزے اتارنے کے لیے جھکا جبکہ آپ وضو کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: ''انہیں چھوڑ دو، میں نے جب انہیں پہنا تھا تو اس وقت بحالت وضو تھا۔'' پھر آپ نے ان پر مسح کیا۔ [5]

رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے یہ بات کہی تو آپ اس وقت وضو کر رہے تھے، آپ کا وضو ابھی مکمل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے بعد آپ نے مسح کر کے اسے مکمل کیا، اس سے ثابت ہوا کہ دوران وضو بامقصد گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] سنن الترمذي، الطهارة: ١٩۔ [2] التوبة: ١٠٨۔ [3] سنن أبي داوٗد، الطهارة: ٤٤۔
[4] سنن الترمذي، الادب: ٢٣١٧۔ [5] صحيح البخاري، الوضو: ٢٠٦۔ج

اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کرنا

سوال کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو کیوں؟ کتاب و سنت سے اس کی کوئی دلیل پیش کریں؟

جواب اگر انسان نے وضو کیا ہوا ہو، اس کے بعد وہ اونٹ کا گوشت کھالے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، اگر نماز پڑھنا ہے تو اسے دوبارہ وضو کرنا ہوگا، ایسے معاملات تعبدی ہوتے ہیں، عقل کے زور پر انہیں ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق اطلاع دی ہے اس لئے ہمیں یہ حکم بلا چوں چراں مان لینا چاہیے۔ ویسے محدثین کرام نے اس کے متعلق طویل بحثیں کی ہیں، بہر حال احادیث میں اونٹ کا گوشت تناول کرنے کو نواقض وضو میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ہم بھیڑ بکریوں کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں؟ آپ نے فرمایا: ''اگر چاہو تو وضو کرلو اور اگر چاہو تو نہ کرو۔'' اس نے پھر عرض کیا، آیا اونٹ کا گوشت استعمال کرنے کے بعد ہم وضو کریں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تم اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو۔'' [1]

کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کا حکم منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا آخری عمل آگ کی پکی ہوئی چیز کھا کر وضو نہ کرنا تھا۔ لیکن یہ حدیث عام ہے اور اونٹ کے گوشت کا ناقض وضو ہونا ہے۔ اس لئے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ لہٰذا اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا جائے اور دوسرے جانور کا گوشت کھانے کے بعد نیا وضو کیے بغیر نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ یہ موقف قرین قیاس اور مبنی برحق ہے۔ (واللہ اعلم)

ضروری غسل کیے بغیر روزہ رکھنا

سوال اگر کسی انسان نے غسل کرنا ہو لیکن سحری کا وقت اتنا تنگ ہو کہ غسل کرتے کرتے اس کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو کیا غسل کیے بغیر حالت جنابت میں روزہ رکھا جاسکتا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ دیں؟

جواب انسان کو چاہیے کہ وہ روزہ کے لئے بروقت تیاری کرے اور اپنی حاجاتِ لازمہ سے فارغ ہو کر روزہ رکھے لیکن اگر فجر صادق کی ابتدائی ساعات میں جنابت کی حالت میں روزے کی ابتداء کرے تو اس کی گنجائش ہے البتہ بروقت غسل کر کے نماز میں شریک ہو جائے مگر بلا عذر شرعی اسے معمول بنالینا اور اس کیفیت کو طول دینا مستحسن نہیں، بلکہ روزے میں اس انداز سے عیب آجاتا ہے۔ بہر حال حالتِ جنابت میں روزہ رکھا جاسکتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''روزہ دار جنابت کی حالت میں صبح کرتا ہے۔'' [2]

پھر انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث پیش کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات جنابت کی حالت میں صبح کرتے تو روزہ رکھ کر غسل کر لیتے تھے۔ [3]

---

[1] مسند أحمد ص ٨٦ ج٥۔ [2] صحيح البخاري، الصوم باب ٢٢۔

[3] صحيح البخاري، الصوم : ١٩٢٥۔

اس روایت کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے وعظ میں یہ بیان کیا کرتے تھے ''جو انسان صبح صادق جنابت کی حالت میں پائے وہ روزہ نہ رکھے۔'' راوی حدیث حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں نے اس بات کا تذکرہ اپنے باپ سے کیا تو انہوں نے اس بات کا انکار کیا پھر ہم مسئلہ کی تحقیق کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے تو ان دونوں نے بتایا کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کے وقت بیدار ہوتے تو انہیں غسل کی ضرورت ہوتی، آپ اسی حالت میں روزہ رکھ لیتے تھے، ہم یہ سن کر مروان کے پاس آئے اور انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہمیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تاکہ انہیں بھی اس سے آگاہی ہو جائے، جب ہم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس مسئلہ کے متعلق بتایا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست نہیں سنا تھا بلکہ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ بیان کیا جسے میں نے آگے بیان کرنا شروع کر دیا، اب چونکہ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے لہٰذا میں اپنے پہلے موقف سے رجوع کرتا ہوں۔ [1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حالتِ جنابت میں روزہ رکھا جا سکتا ہے لیکن نماز کے لئے اسے غسل کرنا ہوگا، کیونکہ نماز کے لئے طہارت بنیادی شرط ہے، لیکن اس طرح کی کیفیت کو معمول نہیں بنانا چاہیے۔ بلکہ انسان کو چاہیے کہ روزہ کے لئے صبح جلدی بیدا ہو تاکہ اپنی حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر تسلی سے روزہ رکھے۔ (واللہ اعلم)

غسل کب واجب ہوتا ہے؟

سوال کیا بیوی سے دل لگی اور بوس و کنار کرنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے، کتاب و سنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں تفصیل سے بیان کریں؟

جواب مرد کا اپنی بیوی سے دل لگی کرنا اور اس سے بوس و کنار کرنا یہ غسل کے اسباب سے نہیں، ہاں اگر اس دوران انزال ہو جائے تو غسل واجب ہوگا۔ یہ حکم اس صورت میں ہے، جب محض دل لگی اور بوس و کنار کی حد تک خوش طبعی کی جائے۔ اگر جماع کی صورت ہے تو اس میں مرد اور عورت دونوں پر غسل واجب ہے خواہ انزال نہ بھی ہو۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب آدمی عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھ جائے اور اس کے ساتھ جماع کی کوشش کرے تو اس سے غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال نہ ہو۔'' [2]

جماع کے علاوہ دیگر لطف اندوزی کی تمام صورتوں میں اس وقت غسل واجب ہو جاتا ہے جب انزال ہو، البتہ جماع کے لئے انزال کا ہونا ضروری نہیں۔ ہمارے ہاں اکثر مردوں اور عورتوں کو معلوم نہیں، ان کے ہاں ایسی صورت میں اس وقت غسل واجب ہوتا ہے جب انزال ہو، بصورت دیگر وہ غسل کو ضروری خیال نہیں کرتے حالانکہ یہ طرز عمل کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح مسلم، الصیام: ۲۵۸۹۔ [2] صحیح البخاري، الغسل: ۲۹۱۔

ولادت کا خون

سوال نفاس کے خون کی حد بندی کیا ہے، کتنے دنوں تک نماز نہ پڑھنے کی رخصت ہے، قرآن و حدیث کے مطابق وضاحت کریں؟

جواب اگر کسی عورت کی عادت پہلے سے ہی چالیس دن سے زائد ہے تو وہ آئندہ عادت کے مطابق عمل کرے گی اور اگر ایسا نہیں تو وہ چالیس دن پورے کرنے کے بعد غسل کر کے روزے رکھنا شروع کر دے اور نماز کی بھی ادائیگی کرے۔ جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''نفاس والی خواتین کے لئے عہد رسالت میں چالیس دن کی مدت تھی۔'' [1]

اگر چالیس دن سے پہلے خون رُک جائے تو اسے چاہیے کہ غسل کر کے عبادات کی ادائیگی کا اہتمام کرے، وہ مزید چالیس دن تک انتظار نہ کرے۔ بہرحال نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے الا یہ کہ عورت کی پہلے سے ہی چالیس دن سے زائد کی عادت ہو۔ (واللہ اعلم)

نجاست آلود احرام میں عمرہ

سوال میں نے عمرہ کیا، فراغت کے بعد مجھے علم ہوا کہ احرام کے کپڑے نجاست آلود تھے، میرے لئے اب کیا حکم ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب اگر کسی انسان نے عمرہ کیا اور طواف و سعی کر لینے کے بعد اسے پتہ چلا کہ احرام کی چادروں کو نجاست لگی ہوئی تھی تو اس کا عمرہ مکمل ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں عمرہ ہوا جبکہ اسے نجاست کا علم ہی نہ تھا یا اسے معلوم تھا مگر وہ اسے دھونا بھول گیا، ان دونوں صورتوں میں اس کا عمرہ صحیح ہے دوبارہ عمرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ارشادِ نبوی ہے:

''اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول ہو جائے یا ہم کسی خطا کے مرتکب ہوں تو اس پر ہمارا مؤاخذہ نہ کر۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صحابہ کرام کو نماز پڑھائی (اور آپ جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے تھے) اس دن آپ نے دوران نماز اپنے جوتوں کو اتار دیا، آپ کو دیکھ کر آپ کے صحابہ کرام نے بھی اپنے جوتوں کو اتار دیا۔ نماز مکمل کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے پوچھا کہ انہیں کیا ہوا تھا؟ صحابہ کرام نے جواب دیا: یا رسول اللہ! ہم نے دیکھا کہ آپ نے جوتے اتار دیئے ہیں تو ہم نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے، آپ نے فرمایا: ''میرے پاس تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے تھے اور انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے جوتوں کو نجاست لگی ہوئی ہے۔'' [3]

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے نماز کا کچھ حصہ نجاست آلود جوتوں میں ادا کیا لیکن آپ نے اس ادا شدہ نماز کا اعادہ نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص بھول جائے یا جہالت کی وجہ سے ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہے، اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح اگر نادانستہ یا جہالت کی وجہ سے نجاست آلود احرام میں عمرہ کر لیا تو علم ہونے کے بعد اسے

---

[1] سنن أبي داوٗد، الطھارۃ: ۳۰۴۔ [2] ۲/البقرۃ: ۲۸۶۔ [3] سنن أبي داوٗد، الصلوٰۃ: ۶۵۰۔

دوبارہ عمرہ کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا عمرہ صحیح ہے۔

خون سے غسل کرنا

سوال میری والدہ بیمار ہے، وہ کئی ہسپتالوں میں زیر علاج رہی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ہمیں ایک ''بزرگ'' نے بتایا ہے کہ اسے کسی جانور کے خون میں غسل دیا جائے، کیا ہم بغرض علاج ایسا کر سکتے ہیں؟

جواب خون سے غسل کرنا جائز نہیں کیونکہ ذبح کرتے وقت جو خون نکلتا ہے، اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم پر مردار اور خون حرام کر دیا گیا ہے۔'' ❶

دوسرے مقام پر یہ صراحت ہے کہ اس سے مراد ذبح کرتے وقت بہنے والا خون ہے جیسا کہ سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۵ میں ہے اور حرام چیزوں سے علاج کرنا ناجائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے بیماری اور علاج دونوں کو نازل کیا ہے اور ہر بیماری کا علاج بھی طے کیا ہے لہٰذا علاج کیا کرو لیکن حرام چیزوں سے علاج نہ کرو۔'' ❷

ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ نے حرام کردہ چیزوں میں قطعاً شفا نہیں رکھی۔ ❸

رسول اللہ ﷺ سے شراب سے علاج کرنے کے متعلق دریافت ہوا تو آپ نے فرمایا: یہ دوا نہیں بلکہ یہ تو بذات خود بیماری ہے۔ ❹

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال نہیں کرنا چاہیے اور جس ''بزرگ'' نے یہ علاج تجویز کیا ہے اسے بھی اللہ کے حضور توبہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ علاج جادو کی قسم معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

جنابت اور جمعہ کے لیے ایک غسل کرنا

سوال ایک انسان پر دو غسل واجب ہیں، مثلاً جنابت اور جمعہ کا غسل، تو کیا اس کے لئے دو غسل کرنا ہوں گے یا ایک ہی غسل سے کام چل جائے گا، کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے موقع پر ایک ہی غسل کافی ہوگا، کیونکہ مقصود طہارت ہے جو ایک غسل سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے موقع پر انسان کو دو علیحدہ علیحدہ غسل کرنا ہوں گے جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن ابی قتادہ بیان کرتے ہیں: ''ایک دفعہ میرے پاس میرے والد گرامی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو میں جمعہ کے دن غسل کر رہا تھا، انہوں نے دریافت فرمایا کہ یہ غسل جنابت کا ہے یا جمعہ کے لئے؟ میں نے عرض کیا: یہ جنابت کا غسل ہے تو انہوں نے فرمایا: اس کے بعد تمہیں غسل جمعہ بھی کرنا ہوگا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے جمعہ کے دن غسل کیا وہ دوسرے جمعہ تک طہارت میں رہے گا۔'' لہٰذا تم نے اس کے بعد دوسرا غسل کرنا ہے۔ ❺

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام آسانی کا دین ہے یہ بلاوجہ انسان کو مشقت میں نہیں ڈالتا۔ اگر ایک بار غسل کرنے

---

❶ المائدۃ: ٣۔ ❷ سنن أبي داؤد، الطب: ٣٨٧٤۔ ❸ الاحادیث الصحیحۃ: ١٦٣٣۔

❹ سنن أبي داؤد، الطب: ٣٨٧٣۔ ❺ مستدرک حاکم ص ٢٨٢ ج ١۔

سے مقصد پورا ہو جائے تو دوسرا غسل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امید ہے کہ اس صورت میں ایک ہی غسل کافی ہوگا۔

(واللہ اعلم)

جنبی کے لئے پانی دستیاب نہ ہو تو

سوال اگر کوئی انسان حالتِ جنابت میں ہو اور اسے پانی دستیاب نہ ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے، کیا ایسی حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب جب انسان جنبی ہو تو اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہیں جنابت لاحق ہو تو غسل کر کے پاک ہو جایا کرو۔'' [1]

اگر پانی دستیاب نہ ہو یا اس کے استعمال سے کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو تیمم سے کام چلایا جاسکتا ہے، قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضاء حاجت سے فارغ ہوا ہو یا تم اپنی عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرلو یعنی تیمم کرلو۔'' [2]

تیمم کرنے سے انسان جنابت سے پاک ہو جاتا ہے اور اس وقت تک پاک رہے گا جب تک اسے پانی نہیں ملتا اور جب اسے پانی مل جائے گا تو اس سے غسل کرنا ضروری ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو الگ تھلگ دیکھا جس نے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا نہیں کی تھی، رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت کیا کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی؟ اس نے عرض کیا میں جنابت کی حالت میں ہوں اور یہاں پانی موجود نہیں تو آپ نے اسے فرمایا: ''مٹی کو استعمال کرلو، تمہارے لیے یہی کافی ہے۔'' اس کے بعد پانی مل گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے پانی دیتے ہوئے فرمایا: ''جاؤ اور اسے اپنے اوپر ڈال لو۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تیمم کرنے والے کو جب پانی مل جائے تو اس کے لئے پانی سے طہارت حاصل کرنا ضروری ہے خواہ اس نے جنابت کی وجہ سے تیمم کیا ہو۔ جنابت سے تیمم کرنے والا اس وقت تک پاک ہے جب تک وہ دوبارہ جنبی نہیں ہوتا یا اسے پانی نہیں ملتا۔ اگر اسے پانی مل جائے تو اس وقت پانی سے طہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور تیمم سے جو عبادات کی ہیں انہیں دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔

ٹخنوں کے نیچے ازار ہونے سے وضو ٹوٹ جانا

سوال ایک دن ہمارے عالم دین نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ اگر انسان باوضو ہو اور اس کی چادر یا شلوار ٹخنوں سے نیچے ہو جائے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے، کیا واقعی اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، شرعی حکم سے آگاہ کریں؟

جواب اپنی چادر یا شلوار کو ٹخنوں سے نیچے کرنا بہت سنگین جرم ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

---

[1] المائدۃ: ٦۔ [2] المائدۃ: ٦۔ [3] صحيح البخاري، التيمم: ٣٤٤۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا جس نے تکبر سے اپنی چادر کو لٹکایا۔'' ❶

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں سے ہم کلام نہیں ہوں گے اور نہ ان کی طرف نظر رحمت کریں گے اور نہ ہی انہیں پاکیزہ قرار دیں گے بلکہ انہیں دردناک قسم کے عذاب سے دوچار کریں گے۔ ان میں وہ شخص بھی ہے جو اپنی شلوار یا چادر ٹخنوں سے نیچے کرتا ہے۔'' ❷

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اپنی چادر یا شلوار کو ٹخنوں سے نیچے کرنا بڑا گناہ ہے لیکن اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس سلسلہ میں درج ذیل روایت بیان کی جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی اپنا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا تو رسول اللہ نے اسے فرمایا: ''جاؤ اور وضو کرکے آ'' وہ گیا اور وضو کرکے آیا، پھر ایک آدمی کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا: ''یہ اپنا تہبند لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ ٹخنوں سے نیچے تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں کرتا۔'' ❸

لیکن محدثین کرام نے اس روایت کو قابل حجت قرار نہیں دیا۔ ❹

اس بناء پر ٹخنوں سے نیچے چادر یا شلوار لٹکانے والے کا وضو اور نماز تو صحیح ہے لیکن اس ممنوعہ فعل کی وجہ سے وہ سزا کا حقدار ہو گا۔ (واللہ اعلم)

مقدس اشیاء کو بیت الخلاء میں لے جانا

سوال میری جیب میں اذکار کا کتابچہ ہوتا ہے، میں اسی حالت میں طہارت کے لئے بیت الخلاء جاتا ہوں، کیا اسے باہر رکھ دیا کروں یا جیب میں رکھنا بھی جائز ہے؟

جواب جن اشیاء پر ذکر الٰہی، مسنون دعائیں یا مقدس نام ہوں انہیں قضاء حاجت کے مقام سے علیحدہ رکھنا چاہیے کیونکہ ان کی تعظیم وتقدس کا یہی تقاضا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو اپنی انگوٹھی اتار دیتے تھے۔ ❺

یہ روایت ابن جریج کی تدلیس کی وجہ سے اگرچہ ضعیف ہے تاہم ادب واحترام کا تقاضا ہے کہ ایسی اشیاء جن میں اللہ کا نام ہو، بیت الخلاء میں لے جانا مناسب نہیں۔

واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی پر ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ کندہ تھے، اس لئے بیت الخلاء جاتے وقت اسے اتارنے کا اہتمام کیا جاتا تھا، لیکن اگر کسی قیمتی چیز پر اللہ کا نام کندہ ہے اور باہر رکھنے میں چوری کا اندیشہ ہو تو کم از کم اسے اپنے لباس میں کہیں چھپا لینا چاہیے۔

ایسے معاملات کو حافظ قرآن پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سینے میں قرآن ہونے کے باوجود بیت الخلاء میں چلا جاتا ہے کیونکہ اس کے دل میں قرآن ہوتا ہے، ظاہری طور پر کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا۔

---

❶ صحيح البخاري، اللباس: ٥٧٨٧۔ ❷ صحيح مسلم، الصلوٰة: ٦٣٨۔ ❸ سنن أبي داوٗد، الصلوٰة: ٦٣٨۔
❹ نیل الاوطار ص ٥٩٩ ج ١۔ ❺ سنن أبي داوٗد، الطهارة: ١٩۔

بہر حال ادب و احترام کا تقاضا ہے کہ بیت الخلاء جاتے وقت ایسی اشیاء الگ کر دی جائیں جن پر اللہ کا نام، اذکار و ادعیہ اور قرآنی آیات لکھی ہوئی ہوں، اگر علیحدہ کرنے میں کوئی عذر مانع ہے تو کم از کم اسے لباس میں چھپا لینا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

غسل جنابت میں سر کا مسح

سوال غسل جنابت کے متعلق حدیث میں ہے کہ اس سے پہلے وضو کیا جائے، کیا اس وضو میں مسح بھی کرنا ہے کیونکہ غسل کرتے وقت سر کو دھویا جاتا ہے، اس کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب غسل جنابت کے متعلق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت کرتے تو پہلے نماز کے وضو جیسا وضو کرتے پھر غسل کرتے تھے۔ ❶

اس حدیث کا تقاضا ہے کہ غسل جنابت سے پہلے مکمل نماز کے وضو جیسا وضو کیا جائے جس میں سر کا مسح بھی شامل ہے، لیکن احادیث کے پیش نظر اس میں کچھ تفصیل ہے۔ مثلاً:

☆ اگر نیچے جگہ صاف نہیں تو غسل سے پہلے وضو کرتے وقت پاؤں نہ دھوئے جائیں بلکہ انہیں غسل سے فراغت کے بعد دھویا جائے۔ جیسا کہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں اس کی صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل سے پہلے نماز کے وضو جیسا وضو کیا لیکن پاؤں نہیں دھوئے، انہیں غسل سے فراغت کے بعد دھویا۔ ❷

☆ ایک دوسری حدیث میں یہ صراحت بھی ہے کہ غسل سے پہلے جو وضو کیا جائے، اس میں سر پر مسح نہ کیا جائے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل جنابت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے سر کا مسح نہیں کیا تھا۔ ❸

اس حدیث پر امام نسائی رحمہ اللہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''غسل جنابت کے وضو میں سر کا مسح چھوڑ دینا'' ❹

اس روایت کے پیش نظر ہمارا رجحان یہ ہے کہ غسل جنابت میں وضو کرتے وقت سر کا مسح نہ کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''غسل جنابت کے متعلق جتنی بھی احادیث مروی ہیں، ان میں کسی مقام پر یہ صراحت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح کیا ہو'' ❺

بلکہ نسائی کی مذکورہ بالا روایت میں سر پر مسح نہ کرنے کی صراحت ہے، اس لئے غسل جنابت کرتے وقت جو وضو کیا جاتا ہے، اس میں سر کا مسح نہ کیا جائے اور نہ ہی پاؤں دھوئے جائیں، چونکہ سر کو دھونا ہے اس لئے مسح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور مالکیہ کا بھی یہی موقف ہے کہ غسل جنابت سے پہلے جو وضو کیا جاتا ہے، اس میں سر کا مسح نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحيح البخاري، الغسل : ٢٧٢۔ ❷ صحيح البخاري ، الغسل : ٢٤٩۔

❸ سنن النسائي ، الغسل : ٤٢٢۔ ❹ سنن النسائي ، كتاب الغسل باب ٨١۔

❺ فتح الباري ص ٤٧٢ ج١۔

مسلمان ہونے کے لئے غسل کرنا

سوال میرا کلاس فیلو ایک عیسائی نوجوان مسلمان ہونا چاہتا ہے، کیا اسلام قبول کرنے سے پہلے غسل کرنا ضروری ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں راہنمائی کریں؟

جواب نومسلم کے لئے غسل کرنے کے متعلق اہل علم کے ہاں دو موقف ہیں:

☆ مطلق طور پر غسل کرنا ضروری ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضرت قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غسل کرنے کا حکم دیا تھا۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم وجوب کے لئے ہوتا ہے، حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نومسلم کے لئے غسل واجب ہے۔ چنانچہ امام ابوداود رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''نومسلم کو غسل کرنے کا حکم دیا جائے۔''

☆ دوسرا موقف یہ ہے کہ مطلق طور پر غسل ضروری نہیں، کیونکہ اسلام لانے سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جب اس کا معاملہ صاف ہو گیا تو غسل وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں۔

لیکن یہ موقف انتہائی محل نظر ہے کیوں کہ اسلام لانے سے قرض اور دیگر حقوق العباد تو معاف نہیں ہوتے۔ اس لئے اسلام لانے والے کو غسل کرایا جائے تاکہ وہ اندرونی اور بیرونی طور پر دونوں طرح کی نجاست اور میل کچیل سے پاک ہو جائے۔ پھر کافر عام طور پر غسل جنابت نہیں کرتے، اگر کر بھی لیں تو صحیح نہیں کرتے، اس لئے وہ جنبی ہی رہتے ہیں اس لئے بھی انہیں پاک ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اس موقف کی تائید کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تھا کہ اسے فلاں باغ میں لے جاؤ اور غسل کرنے کا کہو۔ [2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ وہ خود ہی مسجد کے قریب ایک جمع شدہ پانی کی طرف گئے اور وہاں غسل کیا پھر مسجد میں آئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ [3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ جب مسلمان ہوئیں تو اس وقت اسلام لانے سے قبل انہوں نے بھی غسل کیا اور پھر اسلام قبول کیا۔ [4]

نومسلم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی حجامت بھی بنوائے اور ختنہ بھی کرائے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا تھا: ''اپنے کفر کے بال دور کرو اور ختنہ کراؤ۔'' [5]

بلکہ اس کے کپڑے بھی تبدیل کر دیے جائیں تاکہ اسے مکمل طور پر تبدیلی کا احساس ہو اور وہ اپنے آپ کو کفر کی آلودگی سے پاک محسوس کرے، نیز میل کچیل بھی دور ہو جائے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] سنن ابی داوٗد، الطہارۃ: ۱۸۹۔ [2] مسند أحمد ص ۲۰٤ ج۲۔ [3] سنن النسائي، الطهارة: ۱۸۹۔

[4] صحیح مسلم، فضائل الصحابة: ٦۳۹٦۔ [5] سنن أبي داوٗد، الطهارة بـ۳٥٦۔

نیند سے وضو ٹوٹنا

سوال کیا نیند آنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نماز عشاء کا اتنا انتظار کرتے کہ غلبۂ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے مگر وہ از سر نو وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیتے تھے۔ وضاحت کریں؟

جواب نیند آنے سے از سر نو وضو کرنے کے متعلق علماء امت میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ نیند آنے سے وضو نہیں ٹوٹتا جبکہ اکثریت کا موقف یہ ہے کہ نیند مطلق طور پر ناقضِ وضو ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق نیند آنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ نیند اس قدر گہری ہو کہ انسان کے شعور کو زائل کر دے۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے کہ نیند آنے کے باوجود آپ کا وضو قائم رہتا تھا۔ مطلق نیند سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آنکھیں دُبر کا تسمہ ہیں، لہٰذا جو سو جائے وہ وضو کرے۔''[1]

② سیدنا صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنابت کی وجہ سے موزے اتارے جائیں لیکن بول و براز اور نیند کی وجہ سے اتارنے کی ضرورت نہیں۔''[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نیند احداث میں سے ہے، خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے بول و براز کے ساتھ ذکر کرنا، نیند کے ناقض ہونے کا قطعی ثبوت ہے۔ البتہ نیند اور اونگھ میں فرق ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے، جو حسب ذیل ہے:

نیند ایسا ثقیل پردہ ہے جس کا دل پر اچانک آ جانا اسے ظاہری امور کی معرفت سے کاٹ دیتا ہے جبکہ اونگھ میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایسا ثقیل ہے جو انسان کو باطنی احوال کی معرفت سے کاٹ دیتا ہے۔ سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام نیند کی وجہ سے وضو نہیں کرتے تھے اس سے مراد اونگھ ہے حقیقی نیند نہیں۔ لہٰذا اگر ایسی نیند آ جائے جس سے انسان کا شعور باقی نہ رہے تو اس قسم کی نیند سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس امر کی صراحت موجود ہے۔ (واللہ اعلم)

زمین کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال اگر زمین نجاست آلود ہو تو اسے کس طرح پاک کیا جاتا ہے، کیا زمین کا اتنا حصہ کھودنا ضروری ہے، جہاں نجاست ہو، وضاحت کریں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو پاک قرار دیا ہے بلکہ ایک حدیث میں اسے مسجد بھی کہا گیا ہے اگر کسی جگہ پر نجاست پڑی ہو تو نجاست آلود ہونے کی بناء پر وہ جگہ ناپاک ہے اور اس جگہ کو پاک کرنا ضروری ہے۔ احادیث میں اس کے دو طریقے بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اس پر پانی بہا دیا جائے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے مسجد کے کونے میں پیشاب کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ پر پانی کا ڈول بہا دیا۔[3]

---

[1] ابن ماجه، الطهارة: ٤٧٧۔ [2] مسند أحمد ص ٢٣٩ ج ٤۔ [3] صحيح البخاري، الوضوء: ٢٢١۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محض پانی بہا دینے سے زمین پاک ہو جاتی ہے اسے کھودنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ اگر زمین سخت ہو تو وہاں پانی بہا دیا جائے اور اگر نرم ہو تو نجاست کی جگہ کو کھودنا ضروری ہے، لیکن یہ محض تکلف ہے۔ جن احادیث میں زمین کھودنے کا ذکر ہے وہ سخت ضعیف ہیں، جیسا کہ ماہرین حدیث نے اس کی صراحت کی ہے۔ [1]

نجاست آلود زمین کے پاک ہونے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ خطہ سورج یا ہوا کی وجہ سے خشک ہو جائے حتیٰ کہ نجاست کا اثر ختم ہو جائے، اس طرح بھی زمین پاک ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں وہ مسجد میں ہی رات گزارتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ کتے مسجد میں آتے اور پیشاب کر جاتے تھے لیکن صحابہ کرام وہاں کچھ چھینٹے وغیرہ نہیں مارتے تھے۔ [2]

امام ابوداود نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''زمین خشک ہونے سے پاک ہو جاتی ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ زمین خشک ہونے سے پاک ہو جاتی ہے کیونکہ اگر زمین خشک ہو جانے سے پاک نہ ہوتی تو صحابہ کرام اسے یونہی نہ چھوڑتے۔ [3]

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق زمین کو پاک کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہاں پانی بہا دیا جائے لیکن اگر پانی نہ بہایا جائے اور زمین خشک ہو جائے اور نجاست کے اثرات بھی ختم ہو جائیں تو وہ زمین پاک ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس امر کی صراحت موجود ہے۔ (واللہ اعلم)

جرابوں پر مسح

سوال آپ نے اپنے فتاویٰ اصحاب الحدیث میں لکھا ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے لیکن فیصل آباد سے شائع ہونے والے ایک رسالہ ''پیغام حق'' میں اسے غلط ثابت کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ متقدم محدثین جرابوں پر مسح کرنے کے قائل نہیں ہیں، آپ سے گزارش ہے کہ اصل حقیقت سے آگاہ فرمائیں؟

جواب ہم نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا تھا کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے اور احادیث سے اس کا ثبوت بھی دیا تھا۔ [4]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے اور احناف میں قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی بھی جرابوں پر مسح کرنے کے قائل ہیں جیسا کہ ان کی معتبر کتابوں میں صراحت ہے۔ [5]

بلکہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا، لہٰذا جرابوں پر مسح کرنے کے عدم جواز کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین کا ایک دستہ کسی مہم کے لئے روانہ کیا، انہوں نے سردی کا شکوہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ پگڑیوں اور پاؤں کو گرم کرنے والی اشیاء (جرابوں اور

---

[1] نصب الراية ص ٢١٢ ج ١۔ [2] سنن أبي داؤد، الطهارة: ٣٨٢۔ [3] فتح الباري ص ٢٧٩ ج ١۔

[4] فتاویٰ اصحاب الحدیث ص ٦٧ ج ١۔ [5] ہدایہ ص ٦١ ج ١۔

موزوں) پر مسح کرلیں۔ ❶

اس حدیث کوامام ابوداود رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے، آخر میں لکھا ہے: ''حضرت علیؓ بن ابی طالب، ابومسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابوامامہ، سہل بن سعد اور عمرو بن حریث نے جرابوں پر مسح کیا، نیز حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جرابوں پر مسح کرنا مروی ہے۔'' ❷

امام ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام نے جرابوں پر مسح کیا ہے اور ان کے زمانے میں ان کا کوئی مخالف نہیں ہوا، لہٰذا اس پر اجماع ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا صحیح ہے۔ ❸

اس سلسلہ میں چند ایک صحابہ کرام کے عمل کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے جرابوں پر مسح کیا۔ ❹

☆ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی مسح کرنا ثابت ہے۔ ❺

☆ سیدنا عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے بھی جرابوں پر مسح کیا۔ ❻

☆ سیدنا سہل بن سعد سے بھی یہ عمل مروی ہے۔ ❼

صحابہ میں اس کا کوئی مخالف نہیں۔

آخر میں ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ایک فیصل کن فتویٰ نقل کرتے ہیں: ''حضرت ازرق بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ بے وضو ہوئے تو انہوں نے وضو کرتے ہوئے ہاتھ اور منہ دھویا اور پھر اون کی جرابوں پر مسح کیا، ہم نے عرض کیا کہ ان پر مسح کرنا جائز ہے؟ انہوں نے فرمایا: کیوں نہیں! یہ بھی موزے ہی ہیں لیکن اون کے ہیں۔ ❽

اس مسئلہ کی تفصیل محلی ابن حزم ص ۸۵ ج ۲ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

عورت کے لیے سر کا مسح

سوال عورتوں کے سر کے بال لمبے ہوتے ہیں، اس صورت میں وہ سر کا مسح کیسے کریں گی، جبکہ مردوں کے بال چھوٹے ہوتے ہیں انہیں مسح کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، کتاب وسنت میں اس کا کیا طریقہ بیان ہوا ہے؟

جواب عورت کے لیے مردوں کی طرح مکمل سر کا مسح کرنا ضروری ہے البتہ جو بال سر کے نیچے تک لٹک رہے ہوتے ہیں، ان کا مسح ضروری نہیں، دینی احکام میں مرد اور عورتیں برابر کے شریک ہیں۔ مسح کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تم اپنے سروں کا مسح کرو۔'' ❾

---

❶ مسند أحمد ص ۲۷۷ ج۵۔ ❷ سنن أبي داؤد، الطهارة: ۱۵۹۔ ❸ مغنى ص ۱۸۱ ج۱۔
❹ مصنف ابن أبي شيبة ص ۱۸۹ ج۱۔ ❺ مصنف ابن أبي شيبة ص ۱۸۹ ج۱۔
❻ مصنف ابن أبي شيبة ص ۱۸۹ ج۱۔ ❼ مصنف ابن أبي شيبة ص ۱۸۹ ج۱۔
❽ الكنى والاسماء للدولابي ص ۱۸ ج۱۔ ❾ المائدة: ٦۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کے پیش نظر اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''تمام سر کا مسح کرنا۔'' [1]

مسح کرنے میں مرد اور عورتیں سب برابر ہیں، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ اس حکم میں مرد خواتین برابر ہیں، عورت بھی اپنے تمام سر کا مسح کرے گی۔ اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ سے جب مسئلہ پوچھا گیا کہ آیا عورت کو سر کے کچھ حصے کا مسح کافی ہوگا تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے دلیل پکڑی کہ عورت کو بھی پورے سر کا مسح کرنا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے کہا کہ آپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بتائیں تو انہوں نے عملی طور پر وضو کر کے دکھایا، اس حدیث میں مسح کا طریقہ بایں الفاظ ہے: ''پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کا مسح کیا، دونوں ہاتھوں کو سر کے آگے اور پیچھے لے گئے، پیشانی سے شروع کیا یہاں تک کہ انہیں گدی تک لے گئے پھر اس جگہ تک واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔'' [2]

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام سر کا مسح کرنا چاہیے، کچھ اہل علم حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے یہ مسئلہ کشید کرتے ہیں کہ چوتھائی سر کا مسح فرض ہے کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے ان بالوں کا مسح کیا جن کا رخ پیشانی کی طرف تھا، لیکن اسی حدیث میں ہے کہ سر کے باقی حصے پر پگڑی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پگڑی پر مسح کر لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ سر کا جو حصہ ننگا تھا اس پر محسوس کر لیا اور باقی پگڑی پر مسح کیا، حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث میں کوئی تضاد نہیں۔ بہر حال مسح کرنے میں عورت، مردوں کی طرح ہے، اسے بھی تمام سر کا مسح کرنا ہوگا، البتہ جو بال نیچے کی طرف لٹک رہے ہوتے ہیں ان پر مسح کرنا ضروری نہیں۔ (واللہ اعلم)

میت کے غسل کا طریقہ

سوال میت کو غسل کیسے دیا جاتا ہے، کتاب و سنت کے مطابق وضاحت سے تحریر کریں کیونکہ ہم میں سے اکثر اس کا طریقہ نہیں جانتے؟

جواب میت کو غسل دینا ضروری ہے اور غسل کے لئے کسی ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو با اعتماد اور مسائل غسل سے واقف ہو کیونکہ غسل دینا ایک شرعی حکم ہے اور اس کا ایک خاص طریقہ ہے لہٰذا اسے وہی شخص صحیح طور پر انجام دے سکتا ہے جسے اس سلسلہ میں احکام شرعیہ سے واقفیت ہو۔ میت کو غسل دینے کے لئے حسب ذیل اقدامات ملحوظ رکھنے چاہئیں۔

۱۔ میت کو غسل دینے کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ ہو، مکان کی چھت کی نیچے یا کپڑے سے اوٹ کر لی جائے۔

۲۔ اسے غسل کے تختہ پر اس طرح لٹایا جائے کہ پاؤں کی طرف سے کچھ نیچے ہو، تاکہ جسم کی میل کچیل اور استعمال شدہ پانی پاؤں کی طرف سے نیچے بہہ جائے۔

۳۔ غسل کے مقام پر غسل دینے والا اور اس کے معاون حضرات ہی موجود ہوں وہاں زائد افراد کی موجودگی درست نہیں ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، الوضو، باب ۳۸۔ [2] صحیح البخاري، الوضو: ۱۸۵۔

۴۔ غسل سے پہلے اگر ناخن یا زیر ناف بال بڑھے ہوں تو انہیں کاٹ دیا جائے، اسی طرح مونچھیں اگر حد سے زیادہ بڑھ گئی ہوں تو انہیں تراش دیا جائے۔

۵۔ غسل دینے والا میت کا سر اس قدر اٹھائے کہ وہ بیٹھنے کی حالت کے قریب ہو جائے پھر اس کے پیٹ پر آہستہ آہستہ دبا کر ہاتھ پھیرے تاکہ نجاست نکل جائے پھر وہاں اچھی طرح پانی بہا دیا جائے تاکہ نجاست بہہ جائے۔

۶۔ غسل دینے والا ہاتھوں پر کپڑے کی تھیلیاں چڑھا کر میت کو استنجا کرائے، اگر ڈھیلے استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو انہیں بھی استعمال کرے۔

۷۔ اس کے بعد غسل کی نیت کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھے اور نماز کی طرح اسے وضو کرائے البتہ کلی کے لئے منہ میں اور اسی طرح ناک میں پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں بلکہ گیلے ہاتھوں یا کپڑے سے میت کی دانت، منہ اور ناک صاف کر لینا کافی ہے۔

۸۔ میت کا سر اور داڑھی صابن وغیرہ سے اچھی طرح دھوئے اور انہیں صاف کرے پھر جسم کی دائیں جانب سے غسل کا آغاز اس طرح کرے کہ گردن، کندھا، بازو اور ہاتھ دھوئے پھر دائیں پاؤں تک دھوئے پھر بائیں پہلو کو اٹھا کر اس کی پشت اور کمر کو دھوئے۔

۹۔ بائیں جانب بھی اسی طرح دھوئی جائے جس طرح دائیں پہلو کو دھویا تھا، غسل دیتے وقت صابن کا استعمال کیا جائے اور اچھی طرح میل کچیل اتاری جائے۔

۱۰۔ اگر صفائی ہو جائے تو ایک بار پانی کا بہانا کافی ہے البتہ بہتر اور مستحب ہے کہ تین تین بار پانی بہایا جائے، اگر اس سے صفائی حاصل نہ ہو تو سات بار تک اعضاء دھوئے جا سکتے ہیں۔

آخری بار پانی بہاتے وقت اس میں کافور شامل کر لیا جائے کیونکہ وہ میت کے جسم کو نرم، خوشبودار اور ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

۱۱۔ اس کے بعد میت کے جسم کو کپڑے سے خشک کر لیا جائے اگر میت عورت ہے تو اس کے سر کے بالوں کی تین لٹیں بنا کر انہیں پیچھے کی طرف ڈال دیا جائے۔

۱۲۔ اگر میت کو غسل دینے کے لئے پانی میسر نہ ہو یا پانی کے استعمال سے جسم کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو میت کو مٹی کے ساتھ تیمم کرا دیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ مسح کروانے والا میت کے چہرے اور ہاتھوں پہ مسح کرے۔

۱۳۔ بہتر ہے کہ غسل سے فراغت کے بعد غسل دینے والا خود غسل کر لے۔ ممکن ہے کہ اس کے جسم سے نکلنے والی نجاست وغیرہ اسے لگ گئی ہو، اگر اسے اپنی طہارت کا یقین ہے تو غسل کرنا ضروری نہیں۔ (واللہ اعلم)

ایام میں بیوی کے پاس جانا

سوال اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس حیض کی حالت میں جائے تو اس کا کفارہ کیا ہے، وہ شخص متعدد مرتبہ یہ کام کر چکا ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا حکم ہے؟

جواب حالت حیض میں بیوی کے پاس جانا شرعاً ممنوع ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''لوگ آپ سے حیض کے بارے

میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ وہ ایک گندگی ہے لہٰذا حیض کے دوران عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔'' ❶

''الگ رہو'' اور ''قریب نہ جاؤ'' ان سے مراد مجامعت کی ممانعت ہے، اگر کوئی اس حالت میں اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے تو وہ شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کی تلافی کفارہ ادا کرنے سے ہو سکتی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنی بیوی سے حیض کی حالت میں مجامعت کرتا ہے اسے ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرنا چاہیے۔'' ❷

امام ابوداود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح روایت ایسے ہی ہے کہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے یعنی اس میں اختیار دیا گیا ہے کہ ایک دینار دے یا نصف دینار دے، ممکن ہے کہ یہ اختیار کفارہ دینے والے کی مالی استطاعت کی وجہ سے ہو یعنی صاحب حیثیت ایک دینار اور کم حیثیت والا نصف دینار صدقہ کرے، اگرچہ بعض روایات میں اس کی تفصیل ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کے پاس خون حیض کے ابتدائی دنوں میں آئے تو ایک دینار دے اور اگر خون رک جانے کے ایام میں آئے تو نصف دینار دے۔ ❸
لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے، البتہ پہلی حدیث صحیح ہے جسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی صحیح کہا ہے۔ ❹

واضح رہے کہ دینار سے مراد کوئی سکہ نہیں ہے بلکہ شرعی دینار سونے کا وہ سکہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں رائج تھا، جس کا وزن چار ماشہ چار رتی ہے، جدید اعشاری نظام کے مطابق دینا کا وزن ۴ گرام ۳۷۴ ملی گرام ہے، خاوند جتنی مرتبہ بھی اس حالت میں اپنی بیوی کے پاس گیا ہے اسے اتنی مرتبہ یہ صدقہ کرنا ہوگا تا کہ اس گناہ کی تلافی ہو جائے قرآن کریم میں ہے: ''نیکیاں، گناہوں کا ازالہ کر دیتی ہیں۔'' ❺

نیک سیرت بیوی کو چاہیے کہ وہ ایسے موقع پر خاوند کو یاد دہانی کرائے اور اسے ''مالی صدقہ'' سے آگاہ کر دے۔ ممکن ہے کہ یاد دہانی کرانے سے وہ باز رہے اور یہ اقدام نہ کرے۔ واللہ اعلم

دوران وضو گفتگو کرنا

سوال بعض لوگ وضو کرتے وقت باتیں کرتے رہتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے، کتاب و سنت کے حوالے سے جواب دیا جائے؟

جواب وضو توجہ اور دھیان سے کرنا چاہیے، اگر انسان دوران وضو باتوں میں لگا رہے گا تو ممکن ہے کہ اس کے اعضاء وضو کا کوئی حصہ خشک رہ جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وضو کر رہے تھے اور جلدی میں ہاتھ گیلے کر کے پاؤں پر پھیرنے لگے جس سے پاؤں کا کچھ حصہ خشک رہ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باآواز بلند فرمایا: ''ایڑیوں کے جس حصہ کو پانی نہیں لگا اسے آگ چھوئے گی۔'' ❻

---

❶ ۲/البقرۃ: ۲۲۲۔ ❷ سنن أبي داؤد، الطهارة: ۲٦٤۔ ❸ سنن أبي داؤد، الطهارة: ۲٦٥۔
❹ ارواء الغليل ص ۲۱۸ ج۱۔ ❺ هود: ۱۱٤۔ ❻ صحيح البخاري، الوضو: ۱٦۳۔

اس حدیث کی بنا پر دوران وضو باتوں میں مصروف ہونے کے بجائے توجہ اور خیال سے وضو کرنا چاہیے۔ اگر ضرورت پڑے تو بات کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے جیسا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے موزے اتارنے کے لیے جھکا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انہیں چھوڑ دیں، میں نے انہیں جب پہنا تھا تو اس وقت وضو سے تھا۔'' ❶

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے کلام کیا تو اس وقت آپ کا ابھی وضو مکمل نہیں ہوا تھا بلکہ آپ نے موزوں پر مسح اس گفتگو کے بعد کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوران وضو گفتگو کرنے میں چنداں حرج نہیں، لیکن یہ گفتگو حسب ضرورت ہونی چاہیے، فضول باتوں اور بے فائدہ گپوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

وضو کے بعد شرمگاہ کو ہاتھ لگانا

سوال وضو کے بعد اگر آدمی اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے نیز کیا عورت کے لئے بھی یہی حکم ہے؟

جواب اگر آدمی نے وضو کیا ہے تو اس کے بعد اگر اس کا ہاتھ شرمگاہ کو لگ جاتا ہے تو اس سے وضو برقرار نہیں رہے گا بلکہ اسے نیا وضو کرنا ہوگا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اپنی شرمگاہ کو چھوا اسے چاہیے کہ وضو کرے۔ ❷

ناقص وضو کے اس حکم میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو کوئی مرد اپنی شرمگاہ کو چھوئے اسے چاہیے کہ وضو کرے اور جو کوئی عورت اپنی شرمگاہ کو چھوئے وہ بھی وضو کرے۔ ❸

لغت کے اعتبار سے لفظ فرج قُبل اور دُبر دونوں کو شامل ہے البتہ ایک دوسری حدیث بظاہر اس کے معارض معلوم ہوتی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایسے شخص کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس نے وضو کرنے کے بعد اپنی شرمگاہ کو چھو لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تو صرف اس کے جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔ ❹

محدثین کرام رحمہم اللہ نے ان دو احادیث کے دوران تطبیق بایں طور پر بیان کی ہے کہ شرمگاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ ہاتھ اور شرمگاہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو بلکہ براہ راست چھوا جائے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنی شرمگاہ کو کسی پردے کے بغیر چھوئے تو اس پر وضو واجب ہے۔'' ❺

بہر حال وضو کے بعد اگر کوئی مرد یا عورت کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر شرمگاہ کو چھوئے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ہاں اگر درمیان میں کوئی پردہ حائل ہو تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح البخاري، الوضوء: ۲۰۶۔ ❷ سنن أبي داؤد، الطهارة: ۱۸۱۔ ❸ مسند أحمد ص ۲۲۳ ج ۲۔
❹ ابن ماجه، الطهارة: ٤٨٣۔ ❺ مسند أحمد ص ۳۳۳ ج ۲۔

اذان و نماز

اذان ونماز

اذان سے پہلے صلوۃ وسلام پڑھنا

سوال میری ایک بریلوی عالم دین سے گفتگو ہوئی تو اس نے ابوداؤد کے حوالے سے بتایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان سے پہلے ایک دعا پڑھتے تھے، جب دعا پڑھی جاسکتی ہے توصلوٰۃ وسلام پڑھنے میں کیا حرج ہے، اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں اور ابوداؤد کی حدیث کا حوالہ دیں۔

جواب اذان سے پہلے الصلوٰۃ والسلام پڑھنا بدعت ہے، اس کا قرآن وحدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے، ہاں اذان کے بعد درود پڑھنے کا ذکر احادیث میں آتا ہے، سوال میں ابوداؤد کے حوالے سے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

''حضرت عروۃ بن زبیر، بنونجار کی ایک عورت سے بیان کرتے ہیں، اس نے کہا کہ میرا گھر مسجد کے اطراف کے گھروں سے اونچا تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ فجر کی اذان اسی گھر کی چھت پر دیا کرتے تھے، وہ سحر کے وقت آکر اس پر بیٹھ جاتے اور صبح صادق کو دیکھتے رہتے، جب صبح کو طلوع ہوتا دیکھتے تو انگڑائی لیتے اور یہ دعا پڑھتے۔ ''اے اللہ! میں تیری تعریف کرتا ہوں اور قریش پر تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں کہ وہ تیرے دین کو قائم کریں۔''

وہ خاتون بیان کرتی ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ یہ دعا پڑھنے کے بعد اذان کہتے، اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ بلال نے کسی رات بھی یہ کلمات چھوڑے ہوں۔ [1]

واضح رہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اذان سے پہلے دعائیہ کلمات کسی بھی طرح اذان کا حصہ نہ تھے بلکہ یہ ایک عام طرح کی دعا تھی جس میں وہ کافی دیر تک مشغول رہتے اور صبح صادق کا انتظار کر رہے ہوتے تھے، قریش کی ہدایت کے لیے دعا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس قبیلے کو عرب کے ہاں بڑی اہمیت حاصل تھی، جب اللہ تعالیٰ نے اس قبیلہ کو ہدایت سے نوازا تو اس کے بعد لوگ فوج در فوج حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ان دعائیہ کلمات سے اذان سے پہلے الصلوٰۃ والسلام کہنے کا مسئلہ کشید کرنا انتہائی محل نظر ہے کیونکہ اس کی اگر کوئی اہمیت ہوتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ ان کلمات کو ضرور کہتے، بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق دور حاضر میں اذان سے پہلے الصلوٰۃ والسلام کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابو داؤد، الصلوۃ:۵۱۹۔

نماز میں دیکھ کر قرآن پڑھنا

سوال جو آدمی سورۃ فاتحہ یا قرآن کی دیگر آیات زبانی نہ پڑھ سکتا ہو، اسے کیا کرنا چاہیے، کیا وہ قرآن دیکھ کر پڑھ سکتا ہے؟

جواب جو آدمی سورۃ فاتحہ زبانی نہ پڑھ سکتا ہو اسے چاہیے کہ وہ دوران نماز تسبیح وتہلیل کرتا رہے اور جب تک سورۃ فاتحہ یاد نہ ہو سکے وہ اسی پر اکتفا کرتا رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز سکھائی اور فرمایا کہ اگر تمہیں قرآن کا کچھ حصہ یاد ہے تو اسے نماز میں پڑھو بصورت دیگر الحمد للہ، اللہ اکبر، اور لا الہ الا اللہ پڑھتے رہو پھر رکوع میں چلے جاؤ۔ [1]

اسی طرح ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں ہے لہٰذا آپ مجھے وہ چیز سکھا دیں جو مجھے کافی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے رہو۔ [2] لیکن ہمیشہ کے لیے ان کلمات پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہے۔ ناخواندہ شخص کو چاہیے کہ وہ فاتحہ سیکھنا شروع کر دے جب تک یاد نہ ہو وہ ان کلمات کو دوران نماز پڑھتا رہے، اسی طرح اگر دیکھ کر قرآن پڑھ سکتا ہے تو دوران نماز قرآن دیکھ کر پڑھنا بھی جائز ہے لیکن اس پر دوام اختیار کرنا درست نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک غلام دیکھ کر قرآن پڑھتا اور امامت کراتا تھا۔

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال کیا مسجد میں نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا حکم ہے، تفصیل سے راہنمائی فرمائیں۔

جواب امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ”جنازگاہ اور مسجد دونوں جگہ نماز جنازہ ادا کرنا۔“ [4]

اگرچہ افضل یہ ہے کہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں نماز جنازہ پڑھی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اکثر وبیشتر ایسا ہوتا تھا البتہ مسجد میں جنازہ پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضا کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا کی تھی۔ [5]

روایات میں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ مسجد نبوی میں ادا کی گئی تھی۔

قرأت میں سورتوں کی ترتیب

سوال نماز میں قرأت کرتے وقت کیا سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی

---

[1] بیہقی، ص۱۰۲، ج۲۔ [2] ابو داؤد، الصلوۃ:۸۳۲۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب نمبر ۵۴۔
[4] صحیح بخاری، الجنائز، باب نمبر ۶۰۔ [5] صحیح مسلم، الجنائز:۹۷۳۔

فرمائیں، کیونکہ ہمارے ہاں کچھ لوگ اس کے متعلق بہت زور دیتے ہیں۔

جواب نماز میں قرأت کرتے وقت سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا نہ واجب اور نہ اسے سنت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ رات کی نماز میں پہلے سورۃ بقرۃ تلاوت کی اس کے بعد سورۃ النساء پھر سورۃ آل عمران پڑھی۔ [1] حالانکہ سورۃ نساء، سورۃ آل عمران کے بعد ہے، اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں طور قائم کیا ہے: ''دو سورتیں ایک رکعت میں پڑھنا، سورتوں کی آخری آیات یا سورتوں کو تقدیم و تاخیر سے پڑھنا یا سورتوں کی ابتدائی آیات پڑھنے کا بیان۔''

پھر اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے چند احادیث و آثار کا حوالہ دیا ہے جو اس مسئلہ کے اثبات کے لیے کافی ہے، طالبِ حق کو بخاری کے اس مقام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

دورانِ نماز سلام کا جواب

سوال کیا دورانِ نماز سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے؟ اس کی کتاب وسنت سے کوئی دلیل ہو تو ضرور ذکر کریں، پھر اگر جواب دینا جائز ہے تو کیسے دیا جائے؟

جواب اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے تو اس دوران باہر سے آنے والا شخص سلام کہے تو دوران نماز وعلیکم السلام کہنے کے بجائے وہ اپنے ہاتھ کے اشارے سے اس کا جواب دے گا، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ دوران نماز جب رسول اللہ ﷺ کو لوگ سلام کہتے تو کیا آپ انہیں جواب کہہ دیتے تھے؟ تو انھوں نے کہا ''اس طرح کرتے'' پھر انھوں نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ [2] دوران نماز باہر سے آنے والے کو چاہیے کہ اگر وہ سلام کہنا چاہتا ہے تو آواز بلند سلام کہنے کے بجائے اپنی آواز کو ذرا آہستہ کرے تاکہ دوسرے نمازی خلل اندازی کا شکار نہ ہوں اور نمازی کو چاہیے کہ وہ منہ سے وعلیکم السلام کہنے کے بجائے اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے اس کا جواب دے دے۔ (واللہ اعلم)

دورانِ نماز موذی چیز کو مارنا

سوال اگر دوران نماز بچھو وغیرہ نظر آجائے تو کیا اسے مارا جا سکتا ہے؟

جواب دوران نماز اگر کوئی بھی نقصان دہ چیز سامنے آئے تو اسے ختم کیا جا سکتا ہے مثلاً اگر دوران نماز موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہو جائے یا بجلی بند کرنے کی ضرورت پڑے اور بجلی کا بٹن سامنے ہو تو ایسے حالات میں موبائل یا بجلی بند کی جا سکتی ہے اگر بچھو نظر آئے تو اسے بھی دوران نماز مارا جا سکتا ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نماز میں دو سیاہ جانوروں یعنی سانپ اور بچھو کو مار دیا کرو۔'' [3]

اس حدیث کے پیش نظر دوران نماز کسی بھی نقصان دہ چیز کو ختم کیا جا سکتا ہے، اگر بچھو وغیرہ نظر آئے تو اسے بھی مارا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] مسند امام احمد، ص ۳۸۲، ج ۲۔ [2] ابو داؤد، الصلوۃ: ۹۲۷۔ [3] ترمذی، الصلوۃ: ۳۹۰۔

عورتوں کا مسجد میں نماز ادا کرنا

سوال کچھ عورتیں مسجد میں بڑے شوق سے نماز ادا کرتی ہیں، کیا عورتوں کا مسجد میں آنا جائز ہے، اگر وہ اپنے گھر نماز ادا کریں تو کیا اس کی اجازت ہے؟

جواب مرد حضرات کا مسجد میں با جماعت نماز ادا کرنا ضروری ہے، البتہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ مسجد میں آئیں اور نماز با جماعت ادا کریں بشرطیکہ مسجد میں پردے کا اہتمام ہو اور یہ خود بھی مسجد میں سادگی کے ساتھ آئیں، ممکن ہے کہ نماز با جماعت ادا کرنے سے انہیں اضافی ثواب مل جائے لیکن رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ عورتوں کا گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی عورتوں کو مسجد میں جانے سے مت روکو اگرچہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔'' [1] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت کی اپنے گھر کے اندر نماز صحن میں پڑھی جانے والی نماز سے افضل ہے اور گھر کے اندر اندرونی خاص کمرے میں نماز بیرونی کمرے میں ادا کی گئی نماز سے افضل ہے۔

بہر حال عورتوں کو اگر مسجد میں نماز پڑھنے کا شوق ہو تو سادگی کے ساتھ مسجد میں آئیں اور نماز با جماعت ادا کریں، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ خاوند کو اس جذبہ خیر کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاہم اگر عورت اپنے گھر میں نماز پڑھنے کا اہتمام کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)

امام سے سبقت کرنا

سوال اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب امام رکوع سے سر اٹھاتا ہے اور سجدہ کے لیے تیاری کرتا ہے تو کچھ نمازی امام سے پہلے ہی نیچے جھک جاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ مقتدی کی امام کے ساتھ چار حالتیں ممکن ہیں:

① مسابقت: نماز کے کسی رکن کو مقتدی اپنے امام سے پہلے ہی شروع کر لے، ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے، حدیث میں اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا امام سے پہلے سر اٹھانے والا اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر میں بدل دے یا اللہ تعالیٰ اس کی شکل وصورت کو گدھے کی شکل وصورت بنا دے۔'' [2]

② موافقت: مقتدی امام کے ساتھ چلے، جب امام رکوع کرے تو عین اسی وقت مقتدی رکوع میں چلا جائے۔ جب امام سجدہ میں جائے تو عین اسی وقت مقتدی بھی سجدہ میں چلا جائے، ایسا کرنا بھی جائز نہیں، صرف نماز میں دو ایسے مقامات ہیں جہاں امام کے ساتھ موافقت مطلوب ہے: ایک آمین کہنے میں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اس موافقت کی صورت میں مقتدی کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ [3]

---

[1] ابو داؤد، الصلوۃ:۵۶۷۔ [2] صحیح بخاری، الاذان:۶۹۱۔ [3] صحیح بخاری، الاذان:۷۸۲۔

دوسرے ربنا ولک الحمد کہتے وقت امام کی موافقت کی جائے، حدیث میں اس کی بھی فضیلت آئی ہے کہ ایسا کرنے سے بھی گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ❶

③ متابعت: تاخیر کے بغیر نماز کے تمام اعمال کو امام کے بعد سرانجام دیا جائے، دوران نماز ہمیں امام کی متابعت کرنے کا حکم ہے۔ حدیث میں ہے کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر ہو۔ ❷

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے، جب آپ سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی اپنی کمر نہیں جھکاتا تھا تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتے۔ ❸

④ مخالفت: اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی اپنے امام سے اس قدر پیچھے رہ جائے کہ اس کی اقتدا سے ہی خارج ہوجائے۔ مثلاً جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتا ہے تو مقتدی اس وقت رکوع میں جاتا ہے، نماز کا جو رکن امام کی مخالفت میں ادا ہو وہ سرے سے ادا ہوتا ہی نہیں، ایسا کرنے سے ساری نماز، خطرے میں پڑ جاتی ہے، صورت مسئولہ بھی امام کی متابعت کے خلاف ہے، ایسا ہونا چاہیے کہ جب امام اپنا سر سجدہ میں رکھ دے تو مقتدی حضرات کو سجدہ کے لیے اس وقت جھکنا چاہیے جیسا کہ متابعت کے بیان میں اس کی وضاحت ہوچکی ہے۔ (واللہ اعلم)

جلسۂ استراحت کی حیثیت

سوال جلسۂ استراحت کیا ہوتا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا یہ سنت سے ثابت ہے، بعض اہل علم اسے غیر مسنون عمل قرار دیتے ہیں، وضاحت فرمائیں۔

جواب جلسہ استراحت نماز میں پہلی رکعت کے بعد دوسری رکعت کے لیے اور تیسری رکعت کے بعد چوتھی رکعت کے لیے اٹھنے سے پہلے کچھ دیر اطمینان سے بیٹھنے کو کہتے ہیں یہ عمل سنت سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا، حضرت مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کو طاق رکعت پڑھتے تو کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوتے۔'' ❹

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''جو شخص دوران نماز طاق رکعت میں کچھ دیر اطمینان سے بیٹھ کر پھر کھڑا ہو۔'' ❺ اس حدیث کے پیش نظر امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ دورانِ نماز جلسہ استراحت مشروع اور مسنون ہے جبکہ دیگر ائمہ کا موقف ہے کہ یہ عمل مسنون نہیں ہے، ان کی دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اپنے دونوں قدموں کے پنجوں پر کھڑے ہوتے تھے۔ ❻

لیکن اس روایت کے متعلق خود امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک راوی خالد بن ایاس ہے جسے محدثین

---

❶ صحیح بخاری، الاذان:۷۹۶۔ ❷ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ:۱۱۱۴۔

❸ صحیح بخاری،الاذان:۸۱۱۔ ❹ صحیح بخاری، الاذان: ۸۲۳۔

❺ بخاری، الاذان، باب نمبر ۱۴۱۔ ❻ ترمذی، الصلوۃ:۲۸۸۔

نے ضعیف قرار دیا ہے، امام نسائی رحمہ اللہ نے اسے متروک کیا ہے۔ ❶ بہر حال یہ روایت ضعیف ہے۔ صاحب ہدایہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسہ استراحت کو بڑھاپے پر محمول کیا ہے جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مسترد کر دیا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ یہ تاویل کسی دلیل کی محتاج ہے۔ ❷ خود راوی حدیث حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نے اسے بڑھاپے پر محمول نہیں کیا ہے تو کسی دوسرے کا ایسا کہنا کیسے معتبر ہو سکتا ہے۔ بہر حال جلسہ استراحت سنت سے ثابت ہے اور اسے دوران نماز عمل میں لانا چاہیے، اس کے خلاف جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

صبح کی نماز کے بعد سونا

سوال صبح کی نماز پڑھ کر سونے کی شرعی حیثیت کیا ہے، مشہور ہے کہ صبح کی نماز کے بعد سونا رزق سے محرومی کا باعث ہے، اس سلسلہ میں کوئی حدیث مروی ہے یا نہیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب ایک انسان جب اللہ کی طرف سے عائد فریضہ نماز فجر کی ادائیگی کر لیتا ہے تو اس کے لیے نماز پڑھ کر سونا جائز ہے لیکن اسے عادت بنا لینا مستحسن عمل نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ کرام اور دیگر اسلاف نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک تلاوت قرآن اور وظائف کا اہتمام کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ نماز فجر کے بعد سونے کا جواز ہونے کے باوجود مسنون اذکار کا اہتمام کرنا افضل اور مستحب ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے، حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز فجر ادا کرتے تو اپنی جائے نماز پر بیٹھے رہتے یہاں تک کہ سورج اچھی طرح طلوع ہو جاتا۔ ❸

اس حدیث کی تفصیل دوسری روایت میں بیان ہوئی ہے، سماک بن حرب نے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا، کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، ہم نے کئی ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شرکت کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ اپنی اس جگہ سے جہاں نماز فجر ادا کرتے طلوع آفتاب سے پہلے نہ اٹھا کرتے تھے۔ جب سورج طلوع ہو جاتا تو وہاں سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ صحابہ کرام وہاں گپ شپ لگاتے، دور جاہلیت کے واقعات ایک دوسرے کو سناتے، خوب ہنستے انہیں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسکراتے۔ ❹ ان احادیث کے پیش نظر انسان کو چاہیے کہ نماز فجر پڑھ کر سونے کے بجائے ذکر و فکر اور تلاوت قرآن کو معمول بنائے۔ اس سہانے وقت کو نیند میں ضائع کرنے کی عادت سے گریز کرے۔ البتہ اس سلسلہ میں بیان کی جانے والی روایات انتہائی کمزور ہیں جن کے پیش نظر صبح کی نماز کے بعد سونا حرام قرار دیا جاتا ہے، ہم صرف ایک روایت کا حوالہ دیتے ہیں اور اس کی حیثیت سے قارئین کرام کو آگاہ کرتے ہیں، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''میں صبح کے وقت سوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے اور آپ نے مجھے پاؤں سے ہلایا پھر فرمایا: بیٹی، اٹھو! اپنے رب کی طرف سے رزق کی تقسیم میں شامل ہو جاؤ اور غفلت شعار لوگوں کی عادت اختیار نہ کرو، اللہ تعالیٰ طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک لوگوں کا رزق تقسیم کرتے ہیں۔ ❺

---

❶ میزان الاعتدال: ص ۴۰۷، ج ۲۔ ❷ الدرایہ، ص ۱۴۷، ج ۱۔ ❸ صحیح مسلم، المساجد: ۱۵۲۶۔
❹ صحیح مسلم، المساجد: ۱۵۳۵۔ ❺ شعب الایمان، ص ۳۰، ج ۹، حدیث نمبر ۴۴۰۵۔

یہ روایت خود ساختہ اور موضوع ہے کیونکہ اس کی سند میں عبد الملک بن ہارون بن عنترہ راوی کذاب اور جھوٹی احادیث بیان کرنے والا ہے، امام احمد رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے کذاب کہا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اسے متروک قرار دیا ہے، امام ابن حبان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ شخص احادیث گھڑتا تھا۔ [1] اس سلسلہ میں ایک دوسری حدیث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صبح کی نیند رزق سے رکاوٹ کا باعث ہے۔'' [2]

یہ روایت بھی انتہائی درجہ کی ضعیف ہے کیونکہ اس میں اسحاق بن ابی فروہ نامی ایک راوی ہے جسے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے متروک قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے الآلی الموضوعہ، ص ۱۵۷، ج ۲ کا مطالعہ کریں۔ اگرچہ یہ روایات موضوع اور ضعیف ہیں تاہم صبح کی نماز کے بعد سونے کی عادت اچھی نہیں ہے ہاں اگر نیند کا غلبہ اور تھکاوٹ یا بیماری ہے تو یہ ایک معقول عذر ہے، بلا عذر سونا اسلاف کی عادت نہیں ہے۔

جوتوں سمیت نماز پڑھنا

سوال جوتے پہن کر نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں، اس کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ وہ پاک ہوں، ان میں کسی قسم کی نجاست نہ لگی ہوئی ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتوں سمیت نماز پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ سعید بن یزید ازدی، جناب انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کرتے ہیں: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے تھے تو انھوں نے جواب دیا ''ہاں'' [3] امام بخاری نے اس حدیث پر ''جوتوں سمیت نماز پڑھنے'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو وہ دیکھ لے اگر اس کے جوتوں میں کوئی گندگی ہو تو اسے رگڑ کر صاف کر لے اور ان میں نماز پڑھ لے۔'' [4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جوتے نجاست آلود ہوں تو ان میں نماز نہیں ہوتی اگر ان کی نجاست دور کر دی جائے تو ان میں نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ہم اس مقام پر یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر مسجد میں قالین اور دریاں بچھی ہوئی ہوں تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنے جوتے اتار کر کسی مناسب جگہ پر رکھ دے پھر نماز ادا کرے، کیونکہ جوتوں میں نماز پڑھنا ضروری نہیں اور نہ ہی یہ کوئی مردہ سنت ہے جس کا زندہ کرنا ضروری ہے۔ خواہ مخواہ ضد اور ہٹ دھرمی سے ماحول کو خراب نہ کیا جائے، ایسے حالات میں موقع محل کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

فوت شدہ نمازیں

سوال اگر کوئی آدمی ہسپتال میں مسلسل دو دن بے ہوش رہا تو کیا ہوش آنے کے بعد اسے فوت شدہ نمازیں پڑھنا

---

[1] میزان الاعتدال، ص ٦٦٦، ج ٢۔　[2] شعب الایمان، ص ٢٧، ج ٩۔
[3] صحیح بخاری، الصلوۃ: ٣٨٦۔　[4] ابو داود، الصلوۃ: ٦٥٠۔

ہوں گی، قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

جواب شعور گم ہونے کی صورت میں انسان کے ذمے مالی حقوق ساقط نہیں ہوتے لیکن بدنی عبادات مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ ساقط ہو جاتا ہے البتہ ہوش آنے کے بعد رمضان کے روزوں کی قضا واجب ہو گی لیکن نمازوں کی ادائیگی اس کے ذمے نہیں ہے کیونکہ یہ سوئے ہوئے شخص کی طرح نہیں ہے کہ وہ جب بیدار ہو تو فوت شدہ نمازوں کو ادا کرے۔ اس لیے کہ سوئے ہوئے شخص میں ادراک ہوتا ہے اگر اسے بیدار کیا جائے تو وہ بیدار ہو سکتا ہے لیکن بے ہوشی میں مبتلا انسان کو اگر بیدار کیا جائے تو وہ بیدار نہیں ہو سکتا، بے ہوش انسان کی فوت شدہ نمازوں کے متعلق اہل علم کے دو اقوال ہیں:

① جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ بے ہوشی کے دوران رہ جانے والی نمازوں کی قضا اس کے ذمے نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ پر ایک رات بے ہوشی طاری رہی تو انھوں نے اس دوران فوت ہونے والی نمازوں کی قضا نہیں دی تھی۔ [1]

② کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ بے ہوش آدمی اپنی فوت شدہ نمازیں ادا کرنے کا پابند ہے وہ اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کرتے ہیں کہ ان پر ایک دن اور ایک رات بے ہوشی طاری رہی تو انھوں نے ہوش میں آنے کے بعد فوت ہونے والی نمازوں کی قضا دی تھی۔ [2] ہمارے رجحان کے مطابق جمہور اہلِ علم کا موقف صحیح ہے جس کی ہم نے پہلے ہی وضاحت کر دی ہے۔ (واللہ اعلم)

باجماعت نماز کی ادائیگی

سوال کیا نماز کی ادائیگی باجماعت ضروری ہے یا اسے گھر میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں واضح احکام کیا ہیں؟

جواب اگر کوئی شرعی عذر نہ ہو تو ہر اذان سننے والے مرد پر مسجد میں حاضر ہو کر نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے، اس کے وجوب کے متعلق کتاب وسنت میں متعدد دلائل موجود ہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔'' [3] (البقرۃ: ۴۳)

اس آیت میں رکوع ادا کرنے والوں کے ہمراہ نماز ادا کرنے کا حکم ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''باجماعت نماز کے وجوب کا بیان'' [4] پھر انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول پیش کیا ہے کہ ''اگر کسی کی والدہ اس پر شفقت کرتے ہوئے یا کسی خطرہ کے پیش نظر با جماعت نماز عشا پڑھنے سے روکے تو وہ اپنی والدہ کی بات نہ مانے۔'' اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں متعدد احادیث پیش کی ہیں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں نے ارادہ کیا کہ چند نوجوانوں کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں، پھر نماز کے لیے اذان دینے کا حکم دوں، اس

---

[1] مصنف عبد الرزاق، ص۴۷۹، ج۲۔ [2] مصنف عبد الرزاق: ص ۴۷۹، ج ۲۔ [3] البقرۃ:۴۳۔

[4] صحیح بخاری، الاذان باب نمبر ۲۹۔

کے بعد کسی کو نماز پڑھانے کے لیے تعینات کروں پھر خود ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں شریک نہیں ہوتے تا کہ انہیں ان کے گھروں سمیت جلا ڈالوں۔'' [1] ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان کے گھروں میں عورتیں اور بچے ہیں تو میں ان کے گھروں کو ضرور بھسم کر دیتا۔'' [2]

اس سلسلہ میں ایک دوسرے انداز سے بھی سخت وعید آئی ہے کہ ایسے شخص کی نماز نہیں ہوتی جو بلا وجہ گھر میں نماز پڑھتا ہے اور نماز با جماعت میں شریک نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اذان سنے پھر با جماعت نماز ادا نہ کرے تو اس کی کوئی نماز نہیں الا یہ کہ کوئی عذر رکاوٹ بن گیا ہو۔'' [3]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''یہ ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ با جماعت نماز سے صرف ایسا منافق ہی پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق واضح ہوتا تھا، حتی کہ اگر کوئی آدمی بیمار ہوتا تو وہ دو آدمیوں کے درمیان سہارا لے کر چلتا اور با جماعت نماز میں شریک ہوتا۔ [4] اور جن احادیث میں نماز با جماعت ادا کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے، ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اکیلے کی نماز صحیح ہے بلکہ واجب تو ہمیشہ غیر واجب سے اجر میں زیادہ ہی ہوتا ہے۔ البتہ عورتوں پر مسجد میں حاضر ہونا اور با جماعت نماز ادا کرنا فرض نہیں ہے بلکہ ان کا گھر میں نماز ادا کرنا ہی افضل ہے لیکن اگر وہ مسجد میں با جماعت نماز ادا کرنا چاہیں تو جائز ہے، اس لیے انہیں روکنا نہیں چاہیے۔ (واللہ اعلم)

صلوۃ کسوف میں قرأت

سوال جب سورج یا چاند گرہن لگتا ہے تو اس کی نماز میں قرأت آہستہ ہو یا باآواز بلند احادیث میں اس کے متعلق روایات ملتی ہیں، وضاحت فرمائیں؟

جواب نماز کسوف با جماعت ادا ہونی چاہیے اور اس میں باآواز بلند قرأت کی جائے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کسوف میں باآواز بلند قرأت فرمائی۔ [5] اس حدیث کے پیش نظر نماز کسوف میں اونچی آواز سے قرأت کی جائے۔ اگر چہ کچھ اہل علم بایں طور فرق کرتے ہیں کہ سورج گرہن کے موقع پر آہستہ اور چاند گرہن کے وقت جہری قرأت کی جائے لیکن یہ فرق احادیث سے ثابت نہیں، البتہ ایک حدیث میں اشارہ ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کسوف میں آہستہ قرأت کی تھی۔ چنانچہ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورج گرہن کے موقع پر ہمیں نماز پڑھائی تو ہمیں آپ کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ [6]

لیکن یہ حدیث اپنے مفہوم میں صریح نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے واقعی آہستہ قرأت کی تھی ممکن ہے دور کھڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی قرأت سنائی نہ دیتی ہو۔ پھر یہ روایت ہی ضعیف ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف ابی داؤد رقم ۲۵۳ میں درج کیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، الاذان، ٦٤٤۔ [2] مسند امام احمد، ص٦٧، ج٢۔ [3] ابن ماجہ، المساجد: ٧٩٣۔

[4] صحیح مسلم، المساجد: ٦٥٤۔ [5] صحیح بخاری الکسوف: ١٠٦٥۔ [6] ترمذی، کیف انوآء ۃ فی الکسوف: ٥٦٢۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ سورج گرہن لگنے پر نماز کسوف پڑھائی تھی اور بخاری کی روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے باآواز بلند قرأت کی تھی اوراس کے مقابلہ میں جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ ضعیف ہے اوراپنے مدعا میں وہ صریح بھی نہیں تو نتیجہ یہ نکلا کہ نماز کسوف میں قرأت بلند آواز سے کی جائے۔ (واللہ اعلم)

نماز تراویح کی تعداد

سوال نماز تراویح کی صحیح تعداد کیا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس قسم کی نفلی عبادت کی تعداد متعین نہیں ہے بلکہ انسان اپنی ہمت کے مطابق جس قدر چاہے پڑھ لے۔ کیا واقعی اس کی یہ بات درست ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ تہجد، قیام اللیل، قیام رمضان اور تراویح ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ قیام رمضان کے متعلق ایک عنوان قائم کرکے اس کے تحت مندرجہ ذیل حدیث لائے ہیں، حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں رات کے وقت کتنا قیام کرتے تھے تو آپ نے جواب دیا: ''رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ [1] بعض اوقات آپ تیرہ رکعات بھی پڑھتے تھے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعات نماز ادا فرماتے، ان میں پانچ وتر ہوتے تھے اور ان پانچ وتروں میں تشہد کے لیے صرف آخری رکعت میں بیٹھتے۔ [2]

بعض روایات میں وضاحت ہے کہ فجر کی دو سنت شامل کرکے تیرہ رکعات ہوتی تھیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رات کے وقت آپ دس رکعت پڑھتے تھے اور ان کے بعد ایک وتر پڑھتے، اس کے بعد فجر کی دو سنت ادا کرتے، یہ سب ملا کر کل تیرہ رکعات ہوئیں۔ [3]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو وتر اور فجر کی دو رکعات سمیت تیرہ رکعت نماز تہجد پڑھتے تھے (بخاری، التہجد، ۱۱۴۰) کچھ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ نماز تہجد شروع کرنے سے پہلے ہلکی پھلکی دو افتتاحی رکعات پڑھتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز تہجد کے لیے کھڑے ہوتے تو دو ہلکی رکعات سے اپنی نماز کا افتتاح کیا کرتے تھے۔ [4] بلکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی قیام کرے تو ہلکی رکعات سے آغاز کرے۔'' [5]

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رمضان کی نماز تراویح گیارہ رکعات سے زائد نہ ہوتی تھیں، بعض اوقات تیرہ رکعات پڑھ لیتے تھے۔ ان واضح روایات کے باوجود بعض لوگ بیس رکعات تراویح کے مسنون ہونے کے قائل وفاعل

---

[1] صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین: ۹۹۴۔ [2] مسلم، صلوۃ المسافرین: ۷۳۷۔

[3] مسلم، صلوۃ المسافرین: ۷۳۶۔ [4] مسلم، صلوۃ المسافرین: ۱۸۰۶۔

[5] صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین: ۱۸۰۷۔

ہیں۔وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعات نماز اور وتر پڑھا کرتے تھے [1] لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ [2]

کیونکہ اس کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان راوی ضعیف ہے جسے امام احمد رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔اس لیے ہمارے رجحان کے مطابق نماز تراویح کی مسنون تعداد گیارہ ہے۔ (واللہ اعلم)

محض شک سے وضو کرنا

سوال بعض اوقات دورانِ نماز وضو ٹوٹنے کا شک پڑ جاتا ہے، ایسی حالت میں نماز ختم کرکے دوبارہ وضو کرنا چاہیے یا اپنی نماز کو جاری رکھا جائے،قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کردیں۔

جواب جب طہارت کے متعلق یقین ہو جائے تو محض شک کی وجہ سے عدم طہارت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے تاوقتیکہ حدث کا یقین نہ ہو جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے متعلق سوال کیا گیا جو دوران نماز اپنے پیٹ میں کچھ محسوس کرتا ہے، آیا اس کا وضو باقی ہے یا نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ نماز سے نہ نکلے یہاں تک کہ خروج ریح کی آواز سنے یا بدبو پائے۔ [3] اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ طہارت حاصل کرنے کے بعد اصل طہارت اور پاکیزگی ہے تاوقتیکہ اس کا بے وضو ہونا یقینی طور پر ثابت ہو جائے۔شک کی صورت میں اس کی طہارت زائل نہیں ہوگی بلکہ باقی اور برقرار رہے گی لہٰذا محض شک پڑنے سے نماز ختم نہ کی جائے بلکہ اس صورت میں اس کا نماز میں مصروف رہنا صحیح اور درست ہے ہاں اگر اس کا بے وضو ہونا یقینی طور پر ثابت ہو جائے تو نماز ختم کرکے دوبارہ وضو کرے،رسول اللہ ﷺ نے یقینی طور پر بے وضو ہونے کی دو علامتیں بیان کی ہیں: نکلنے والی ہوا کی آواز سنے یا اس کی بدبو پائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے بغیر بھی بے وضو ہونے کا یقین ہو جائے تو بھی اسے دوبارہ وضو کرنا ہوگا،یقین ہو جانے کے بعد ہوا کی آواز یا اس کی بدبو کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔(واللہ اعلم)

فوت شدہ نمازوں کی ادائیگی کے لیے اذان دینا

سوال اگر کسی شخص یا گروہ کی متعدد نمازیں فوت ہو چکی ہوں تو کیا با جماعت ادائیگی کے لیے اذان دینا ضروری ہے یا اذان کے بغیر ہی ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب جس شخص یا گروہ کی کسی وجہ سے متعدد نمازیں فوت ہو جائیں تو با جماعت ادائیگی کے لیے اذان کا اہتمام کیا جائے پھر ہر نماز کے لیے اقامت کہی جائے جیسا کہ غزوہ احزاب کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی ظہر، عصر اور مغرب فوت ہو گئیں تو آپ نے پہلے اذان دلوائی پھر ہر نماز کے لیے اقامت کا اہتمام کیا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی پھر اقامت کہی تو آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی پھر انھوں نے اقامت کہی تو آپ نے نماز عصر پڑھائی، پھر اقامت کہی تو آپ نے مغرب پڑھائی اور پھر اقامت کہی تو آپ نے نماز عشا پڑھائی۔ [4]

---

[1] بیهقی، ص ٤٩٢، ج٢۔ [2] فتح الباری، ص٢٥٤، ج٤۔ [3] صحیح بخاری، الوضو، ١٣٧۔

[4] ترمذی، الصلوٰة:١٧٩۔

بہرحال اگر انسان ایسی جگہ ہو جہاں اذان نہ کہی گئی ہو تو اذان دینے کا اہتمام کیا جائے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اذان کہنا ضروری نہیں البتہ ہر نماز کے لیے اقامت ضرور کہی جائے۔ (واللہ اعلم)

وتر کے بعد دو رکعت پڑھنا

سوال ہم لوگ وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے ہیں، جب کہ حدیث میں ہے کہ قیام اللیل کی آخری نماز وتر ہونے چاہئیں، اس کے متعلق وضاحت کریں۔

جواب وتر کے بعد دو رکعت پڑھنا مسنون عمل ہے کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے اور آپ نے اپنے ارشاد گرامی سے بھی اس کی رغبت دلائی ہے بلکہ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''اس امر کی دلیل کہ وتر کے بعد دو رکعات پڑھنا مباح ہیں اور رسول اللہ ﷺ خود انہیں پڑھا کرتے تھے اور یہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ نہیں بلکہ تمام امت کے لیے مشروع ہیں۔'' پھر انھوں نے اس سلسلہ میں ایک حدیث بیان کی ہے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ رات کو بیدار ہونا بہت گراں اور مشکل ہے، اس لیے اگر وتر کے بعد دو رکعات پڑھ لی جائیں تو بہتر ہیں۔ اگر بیدار ہو جائے تو ٹھیک بصورت دیگر یہ دو رکعات اس کے لیے کافی ہیں۔ [2] رسول اللہ ﷺ نے یہ دو رکعات بیٹھ کر ادا کی ہیں، لیکن ہمیں کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئیں، کیونکہ نفلی نماز بیٹھ کر پڑھنے سے نصف ثواب ملتا ہے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ اس سے مستثنیٰ ہیں، انھوں نے اگر بیٹھ کر پڑھی تو ان کے لیے اس کا پورا ثواب ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز سے پہلے اور بعد کی سنتیں

سوال ہمارے ہاں دیکھا جاتا ہے کہ نماز ادا کرتے وقت صرف فرض پڑھنے کو کافی سمجھا جاتا ہے، سنتیں پڑھنے کی طرف توجہ بہت کم ہوتی ہے، نوجوان طبقہ تو اس سے بہت پہلو تہی کرتا ہے، ان سنتوں کی اہمیت واضح کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب دین اسلام میں نماز سے پہلے اور بعد والی سنتوں کی بہت اہمیت ہے، جیسا کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو دن اور رات میں بارہ رکعات پڑھتا ہے اس کے لیے جنت میں ایک گھر تیار کیا جاتا ہے۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے جب سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے تو میں نے انہیں کبھی ترک نہیں کیا۔ (صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین: ۱۷۲۸) ترمذی میں ان بارہ رکعات کی تفصیل اس طرح ہے کہ چار رکعت ظہر سے پہلے، دو رکعت ظہر کے بعد، دو رکعت مغرب کے بعد، دو رکعت عشا کے بعد اور دو رکعت نماز فجر سے پہلے۔ [3]

محدثین کی اصطلاح میں ان بارہ رکعات کو ''سنتِ مؤکدہ'' کہا جاتا ہے۔ ایک مسلمان کو ان کی ادائیگی میں سستی نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ جب مسلمان نماز پڑھتا ہے تو خشوع میں کمی بیشی کے اعتبار سے اس کی نماز دسواں، نواں،

---

[1] صحیح ابن خزیمہ ص ۱۵۹، ج ۲۔ [2] صحیح خزیمہ ص ۱۵۹، ج ۲۔

[3] ترمذی، الصلوٰۃ: ۴۱۵۔

آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھا، تیسرا، یا نصف حصہ لکھا جاتا ہے۔ ❶

نماز سے پہلے اور بعد والی سنتیں نماز کی مذکورہ کمی کو پورا کرتی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''قیامت کے دن لوگوں کے اعمال میں سے پہلے نماز کا حساب ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائے گا کہ میرے بندے کی نماز دیکھو، اس میں کس قدر کمی بیشی ہے، کیا اس نے پوری ادا کی تھی یا ناقص پڑھی تھی، اگر مکمل تھی تو پوری نماز کا ثواب لکھا جاتا ہے اور اگر اس میں کوئی کمی تھی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میرے اس بندے کی فرائض کے علاوہ کوئی دوسری تمام بھی ہے، اگر اس کی فرض کے علاوہ کوئی دوسری نماز ہوئی تو فرائض کی کمی کو اس سے پورا کیا جائے گا، اسی طریقہ کے مطابق دوسرے اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی۔ ❷

اس حدیث کے پیش نظر انسان کو فرائض کی ادائیگی میں کسی بھی تقصیر سے پرہیز کرنا چاہیے، نیز نوافل کا بھی اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ ان سے فرضوں کی کمی پوری کی جائے گی، خاص طور پر سنن راتبہ جن کا سوال میں ذکر ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت متواترہ ہیں، رسول اللہ ﷺ نے بعض اوقات تاخیر ہونے پر ان کی قضا بھی ادا کی ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق سنن ونوافل کی پابندی سے فرائض کی حافظت ہوتی ہے، جو شخص ان سنتوں میں کوتاہی کرتا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ فرائض کی ادائیگی میں غفلت کا شکار ہو جائے۔

حضرت ربیع بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ جنت میں آپ کی رفاقت کا طلب گار ہوں تو آپ نے اسے کثرت نوافل ادا کرنے کی تلقین فرمائی تھی۔ ❸ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ایسے عمل کا سوال کیا تھا جو جنت میں داخلے کا باعث ہو تو آپ نے انہیں بکثرت نوافل ادا کرنے کے متعلق کہا تھا۔ ❹ ان احادیث کے پیش نظر ایک نمازی کو چاہیے کہ وہ فرائض کے ساتھ سنتوں کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرے، اور ان میں کسی قسم کی کوتاہی کا شکار نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

سنتوں کی قضا

سوال اگر کوئی ظہر سے پہلے سنتیں نہیں پڑھ سکا تو کیا فرض نماز کے بعد انہیں ادا کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں ہماری قرآن وحدیث کے مطابق راہنمائی فرمائیں۔

جواب اگر بھول جائے یا سو جانے یا دیر سے آنے کی وجہ سے سنتیں رہ جائیں تو ان کی قضا ادا کی جا سکتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: ''جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا نماز کے وقت سو یا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے تو اس وقت پڑھ لے۔'' ❺

اس طرح اگر مصروفیت کی وجہ سے سنتیں رہ جائیں تو مصروفیت ختم ہونے کے بعد انھیں پڑھا جا سکتا ہے، چنانچہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا

---

❶ مسند امام احمد، ص۳۲۱، ج۴۔ ❷ ابو داؤد، الصلوٰۃ:۸٦٤۔
❸ مسند امام احمد، ص۵۹، ج۴۔ ❹ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۴۸۸۔
❺ صحیح بخاری، الصلوۃ:۵۹۷۔

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ مصروفیت کی وجہ سے ظہر کے بعد والی دوسنتیں نہیں پڑھ سکے تھے تو آپ ﷺ نے عصر کے بعد مصروفیت کے اختتام پر انہیں ادا کیا تھا۔ ❶ ان احادیث کی روشنی میں اگر نماز ظہر سے پہلے والی سنتیں رہ جائیں تو انہیں نماز کے بعد ادا کیا جا سکتا ہے لیکن پہلے نماز ظہر کے بعد والی دوسنتیں پڑھی جائیں پھر ان کے بعد پہلی چار سنتیں ادا کی جائیں۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز قرآنی آیات کا جواب

سوال احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دوران نماز آیت رحمت پڑھتے تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتے اور جب آیت عذاب پڑھتے تو جہنم سے پناہ مانگتے ،کیا اس حدیث کے پیش نظر ہم پر ضروری ہے کہ بعض قرآنی آیات کا جواب دیں جیسا کہ ہمارے ہاں نماز با جماعت میں امام جب **سبح اسم ربک الاعلیٰ** پڑھتا ہے تو مقتدی بآواز بلند **سبحان ربی الاعلیٰ** کہتے ہیں، اسی طرح کچھ دیگر آیات کا بھی مقتدی حضرات جواب دیتے ہیں۔قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل جواب تحریر کریں۔

جواب سوال میں رسول اللہ ﷺ کا جو معمول بیان ہوا ہے اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی تہجد کا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ دوران قرأت جب آپ تسبیح پر مشتمل آیات تلاوت کرتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے اور جب کبھی سوال کی آیت سے گزرتے تو رحمت کا سوال کرتے ،اسی طرح جب کبھی تعوذ پر مشتمل آیات پڑھتے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے۔'' ❷

رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول اگرچہ صلوٰۃ اللیل سے متعلق ہے تاہم محدثین کرام نے اسے عام رکھا ہے یعنی جب کوئی ایسی آیت کی تلاوت کرے جس میں اللہ کی تسبیح یا پناہ یا سوال کا ذکر ہو تو رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے اس وقت اللہ کی تسبیح کرے، اللہ تعالیٰ سے سوال کرے۔ نیز دینی اور دنیوی ضرر، نقصان اور خسران سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ دوران قرأت یہ ایک عام ہدایت ہے جس کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ ہدایت صرف قاری یعنی پڑھنے والے کے لیے ہے، سننے والے کے لیے نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع صرف اس معنی میں تمام افرادِ امت کے لیے عام ہے جب فردی حالت بھی وہی ہو جس حالت میں رسول اللہ ﷺ نے کوئی کام سرانجام دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس معمول کا مشاہدہ کیا اور بیان کر دیا۔ یہ کسی روایت میں نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس قسم کی آیات سن کر انھوں نے خود تسبیح یا سوال کیا ہو یا اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کی ہو۔ اس تمہید کی بعد ہم اصل سوال کی طرف آتے ہیں کہ ہمارے ہاں نماز با جماعت میں جب امام سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتا ہے تو مقتدی بلند آواز سے **سبحان ربی الاعلیٰ** پڑھتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نماز اور غیر نماز میں آیات کا جواب دینا ثابت ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، السہو، ۱۲۳۳۔ ❷ صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین: ۱۸۱٤۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتے تو سبحان ربی الاعلیٰ کہتے تھے۔ [1]

یہ تسبیح پر مشتمل آیت پڑھنے کے بعد تسبیح بیان کرنے کا عملی نمونہ ہے لیکن یہ حدیث صرف قاری کے لیے ہے، اس سے مقتدی یا سامع کا جواب دینا ثابت نہیں ہوتا، اس لیے مقتدی کے لیے بہتر ہے کہ وہ جواب دینے سے اجتناب کرے۔ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد امام ابوداؤد لکھتے ہیں: ''اس حدیث کے بیان کرنے میں حضرت وکیع کی دوسرے طرق سے مخالفت کی گئی ہے۔ اس حدیث کو حضرت ابو وکیع بن جراح اور ضرت شعبہ، ابو اسحاق سے بیان کرتے ہیں تو اسے مرفوع کے بجائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بیان کرتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔ اس کے علاوہ حضرت معمر نے بھی حضرت وکیع کی مخالفت کرتے ہوئے اسے موقوف ہی بیان کیا ہے۔ [2]

لیکن حضرت وکیع چونکہ ثقہ راوی ہیں، اس لیے ان کا مرفوع بیان کرنا ایک اضافہ ہے جسے محدثین کے اصول کے مطابق قبول کیا جانا چاہیے، اس لیے یہ روایت مرفوع ہوگی۔ حاکم نے یہ روایت اسی سند سے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''یہ حدیث شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ [3]

امام ذہبی رحمہ اللہ نے حاشیہ میں اسے برقرار رکھا ہے۔ (تلخیص المستدرک حوالہ مذکور) اگر یہ رویت موقوف بھی ہو، تو بھی اسے مرفوع کا حکم دیا جائے گا کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اجتہاد کو کوئی دخل نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ آیات کا جواب دینے کا یہ عمل صرف قاری یعنی پڑھنے والے کے لیے ہے خواہ دوران نماز ہو یا اس کے علاوہ خارج از نماز یہ عمل سامع اور مقتدی کے لیے نہیں ہے جیسا کہ ہمارے ہاں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہ کرام اس حدیث پر عمل پیرا ہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت میں ہے کہ انھوں نے جمعہ کی نماز میں سبح اسم ربك الاعلیٰ کے جواب میں سبحان ربی الاعلیٰ کہا۔ [4]

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی وضاحت ہے کہ انھوں نے دوران نماز ''سبح اسم ربك الاعلیٰ'' کے جواب میں ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کہا۔ [5]

ان احادیث و آثار کے پیش نظر اگر کوئی نماز میں ''سبح اسم ربك الاعلیٰ'' پڑھتا ہے تو اسے جواب میں ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کہنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ نمونہ ہے اور متعدد صحابہ کرام نے اس نمونے کو اختیار کیا ہے مگر اسے مقتدیوں کے لیے جواب دینے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث بیان کی جاتی ہے جس سے مقتدی حضرات کا جواب دینا ثابت کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے صحابہ کرام کے سامنے سورۃ ''الرحمٰن'' تلاوت فرمائی۔ صحابہ کرام ہمہ تن گوش ہو کر اسے سنتے رہے، آپ نے فرمایا: ''میں نے یہ سورت جنوں کے سامنے پڑھی تھی تو وہ جواب دینے

---

[1] ابوداؤد، الصلوٰۃ: ۸۸۳۔ [2] مصنف عبد الرزاق، ص۴۵۲، ج۲۔

[3] مستدرك حاكم: ص۲۶۷، ج۱) [4] سنن بیهقی، ص ۳۱۱، ج۲۔ [5] بیهقی: ص۳۱۱، ج۲۔

میں تم سے بڑھ کر تھے میں جب بھی "فبای آلاء ربکما تکذبٰن" پڑھتا تو وہ جواب میں "لا بشی من نعمك ربنا نکذبك ولك الحمد" کہتے ہیں۔ ❶

اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حوالہ سے اس حدیث کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔لیکن علامہ البانی رحمہ اللہ نے متعدد طرق کی بنا پر اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ (مشکوۃ تحقیق الالبانیؒ)

لیکن اس میں یہ صراحت نہیں کہ جنوں کا جواب دینا دوران نماز تھا بلکہ قرائن ایسے ملتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سورت نماز کے علاوہ کسی اور وقت تلاوت کی تھی کیونکہ صرف جنوں کی جماعت کرانا کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر سورۃ الغاشیہ کے اختتام پر "اللھم حاسبنی حسابا یسیرا" کے الفاظ بطور جواب امام اور مقتدی دونوں کی طرف سے بآواز بلند کہے جاتے ہیں حالانکہ کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الغاشیہ کے اختتام پر یہ کلمات کہے ہوں۔البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک بیان کتب حدیث میں موجود ہے کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی کسی نماز میں یہ کہتے ہوئے سنا: "اللھم حاسبنی حسابا یسیرا"۔ ❷

لیکن اس دعا کا تعلق سورۃ الغاشیہ کے اختتام سے نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات بطور جواب کہے ہوں بلکہ آپ تو ان کلمات کو بطور دعا پڑھتے تھے۔علامہ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس دعا کو تشہد میں سلام سے پہلے پڑھا جاسکتا ہے۔انھوں نے اس دعا کو ان دعاؤں میں ذکر کیا ہے جو بوقت تشہد قبل از سلام پڑھی جاتی ہیں۔ ❸

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "سبح اسم ربك الاعلیٰ" کی تلاوت کے وقت صرف امام کو "سبحان ربی الاعلیٰ" کہنے کی اجازت ہے کیونکہ یہ عمل متعدد صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ جب وہ اس آیت کی تلاوت کرتے تو سبحان ربی الاعلیٰ کہتے تھے لیکن سورۃ الغاشیہ کے اختتام پر "اللھم حاسبنی حسابا یسیرا" جیسے کلمات سے جواب دینا انتہائی محل نظر ہے۔(واللہ اعلم)

کیا نماز تراویح اچھی بدعت ہے؟

سوال کچھ لوگ بدعت کو تقسیم کرتے ہیں،ان کا کہنا ہے کہ کچھ بدعات اچھی ہوتی ہیں۔جبکہ کچھ دوسری بدعات بُری ہیں،دلیل کے طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے نماز تراویح کی جماعت کو اچھی بدعت قرار دیا تھا۔اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب بدعت کی تعریف یہ ہے کہ ہر وہ دینی کام جس کا ثبوت قرآن وحدیث میں موجود نہ ہو،ایسا کام اگر ثواب اور عبادت کی نیت سے کیا جائے تو اسے بدعت کہتے ہیں۔اس قسم کی تمام بدعات بُری اور نحوست ہیں،رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:"ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں جانے کا باعث ہے۔" ❹

---

❶ سنن ترمذی، التفسیر:٣٢٩١۔ ❷ مسند امام احمد،ص٤٨، ج٦۔

❸ صفة الصلوٰة١٠٢۔ ❹ مسلم، الاقضیہ:٤٤٩٢۔

جو حضرات بدعت کی تقسیم کرتے ہیں کہ کچھ بدعات اچھی اور کچھ بُری ہیں، ان کا یہ موقف انتہائی محل نظر ہے، بطور دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو قول پیش کیا جاتا ہے، اس سے اس موقف کے لیے دلیل لینا بھی صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا پس منظر حضرت عبدالرحمن بایں طور بیان کرتے ہیں کہ میں رمضان کی ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مسجد میں گیا، سب لوگ متفرق اور منتشر تھے، کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا تھا تو کوئی کسی کے پیچھے کھڑا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرے خیال کے مطابق اگر میں تمام لوگوں کو ایک قاری کی اقتدا میں جمع کردوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

چنانچہ انھوں نے اسی عزم وارادہ کے ساتھ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو ان کا امام مقرر کردیا۔ پھر ایک رات جب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلا تو دیکھا کہ لوگ اپنے امام کے پیچھے نماز تراویح پڑھ رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ صورت دیکھ کر فرمایا: ''یہ نیا طریقہ بہتر اور مناسب ہے اور رات کا وہ حصہ جس میں لوگ سو جاتے ہیں، اس حصے سے بہتر ہے جس میں یہ نماز پڑھ رہے ہیں۔'' آپ کی مراد رات کے آخری حصہ کی فضیلت بیان کرنا تھی کیونکہ یہ نماز تراویح رات کے پہلے حصہ میں ہی پڑھ لیتے تھے۔ [1]

واضح رہے کہ نماز تراویح باجماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی پڑھی گئی جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے، جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے، آپ فرماتی ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت گھر سے نکلے، آپ نے مسجد میں نماز ادا کی اور لوگوں نے بھی آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ دوسری رات آپ نے یہ نماز پڑھائی تو نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، تیسری یا چوتھی رات تو یہ تعداد ایک بڑے اجتماع کی صورت اختیار کرگئی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات نماز پڑھانے کے لیے تشریف نہ لائے، صبح کے وقت آپ نے فرمایا: مجھ پر آپ کا ذوق اور شوق مخفی نہیں تھا لیکن یہ خدشہ میرے باہر آنے کے لیے رکاوٹ بنا رہا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کردی جائے پھر تم اسے ادا کرنے سے قاصر رہو۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی لیکن معاملہ اسی طرح رہا۔ [2]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تراویح باجماعت مشروع ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس اندیشہ کے پیش نظر چوتھی رات جماعت سے گریز کیا کہ مبادا یہ نماز لوگوں پر فرض ہوجائے پھر لوگ اس کی پابندی نہ کرسکیں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو جس چیز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خائف تھے اس سے امن ہوگیا تو باجماعت نماز تراویح کا اہتمام کردیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سنت کو زندہ کرتے ہوئے اس نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نماز تراویح باجماعت ادا کی گئی اگرچہ تین دن تک ایسا ہوا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں لوگ باجماعت ادا کرتے تھے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بدعت کے نام سے موسوم کیوں کیا اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے لغوی طور پر اسے بدعت کہا ہے۔ شرعی اعتبار سے اسے بدعت نہیں کہا، کیونکہ ان کے دور حکومت میں اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا جبکہ پہلے اس قسم کا اہتمام نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ کام نیا تھا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوچکا تھا لیکن اس قدر اہتمام نہیں تھا۔ اسے بدعت کہنے کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بدعت کی مزعومہ تقسیم سے لوگوں کو مطلع کرنا

---

[1] صحیح بخاری، صلوٰۃ التراویح: ۲۰۱۰۔ [2] صحیح بخاری، التراویح: ۲۰۱۲۔

چاہتے تھے کہ بدعات دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک بدعت حسنہ اور ایک بدعت سیئہ جیسا کہ بعض حضرات کا موقف ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہر قسم کی بدعت گمراہی اور باعث نحوست ہے جیسا کہ حدیث کے حوالے سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

دراصل بدعت کی اس غلط تقسیم سے بہت ہی خرافات کو دین میں داخل کر دیا گیا ہے بلکہ بدعت حسنہ کے نام سے ان حضرات نے ایک نیا دین متعارف کروایا ہے جس میں قل خوانی، چہلم، میلاد اور گیارہویں وغیرہ برسرفہرست ہیں۔ بہرحال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فرمان کا ذکر کردہ بدعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد نبوی میں چالیس نمازیں

سوال جو حضرات حج کے لیے حرمین کا سفر کرتے ہیں، وہ مسجد نبوی میں چالیس نمازیں پڑھنے کا بہت اہتمام کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے۔ براہ کرم اس مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح کریں کہ مسجد نبوی میں چالیس نمازیں پڑھنے کا اہتمام کہاں تک درست ہے؟

جواب جو حضرات حج یا عمرہ کرنے کے لیے حرمین کا سفر کرتے ہیں، ان کا مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران مسجد نبوی میں چالیس نمازیں لازمی ادا کرنا یا انہیں حج یا عمرہ کا حصہ قرار دینا کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ صحابہ کرام اور ائمہ دین میں سے کسی نے یہ عمل نہیں کیا بلکہ ان حضرات کو جتنی بھی نمازیں مسجد نبوی میں پڑھنے کا موقع ملتا اسے غنیمت خیال کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کیں اور کوئی بھی نماز با جماعت فوت نہ ہونے دی تو اس کے لیے آگ سے برأت اور عذاب سے نجات لکھ دی جاتی ہے۔ نیز وہ نفاق سے بری ہو جاتا ہے۔'' [1]

یہ حدیث منکر اور اس لیے سند ضعیف ہے کیونکہ ان الفاظ کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا صرف نبیط بن عمرو راوی ہے جس کا اس حدیث کے علاوہ کسی بھی دوسری حدیث میں ذکر نہیں ملتا۔ محدث العصر علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے اور اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

یہ حدیث منکر اس لیے ہے کہ اس کے مقابلہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں کسی جگہ، علاقہ یا مسجد کی کوئی تخصیص نہیں اور اس میں چالیس نمازوں کے بجائے چالیس دن کی نمازوں کا ذکر ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

جس نے چالیس دن تک نمازیں با جماعت تکبیر اولیٰ کے ساتھ ادا کیں، اس کے لیے دو چیزوں سے برأت لکھ دی جاتی ہے: ''ایک جہنم کی آگ سے آزادی اور دوسرے نفاق سے برأت۔'' [3] اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے چالیس نمازیں مسجد میں با جماعت تکبیر اولیٰ کے ساتھ ادا کیں، اس کے لیے دو چیزوں سے برأت لکھ دی جاتی ہے:'' [4]

---

[1] مسند امام احمد، ص ۱۵۵، ج۳۔ [2] سلسلة الاحاديث الضعيفه ص ۵۴۰، ج۱، حديث رقم: ۳۶۴۔
[3] ترمذی، الصلوة: ۲۴۱۔ [4] ابن ماجه، اقامة الصلوة: ۷۹۸۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے اہتمام کے ساتھ مسجد نبوی میں چالیس نمازیں ادا کرنے کی پابندی خود ی فقہ ہے، اس سلسلہ میں جو حدیث پیش کی جاتی ہے اس کی استنادی حیثیت انتہائی مخدوش ہے۔ بہر حال حج یا عمرہ کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کو باعث سعادت خیال کرے کیونکہ وہاں ایک نماز ادا کرنے سے ایک ہزار نماز کے برابر اجر ملتا ہے۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کی صراحت ہے۔ لیکن آٹھ دن وہاں مسلسل رہنے کی پابندی کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

مقتدی کا سمع اللہ لمن حمدہ کہنا

سوال جب امام رکوع سے فراغت کے بعد سمع اللہ لمن حمدہ کہتا ہے تو کیا مقتدی کو بھی سمع اللہ لمن حمدہ کہنا چاہیے یا وہ صرف ربنا ولک الحمد پر اکتفا کرے گا، کتاب وسنت کی روشنی میں اس امر کی وضاحت کریں۔ ہمارے ہاں اہل علم کا کچھ اختلاف ہے، راجح موقف کی نشاندہی کر دیں۔

جواب محدثین کی اصطلاح میں سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کو تسمیع اور ربنا ولک الحمد کو تحمید کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نمازی کی تین حالتیں ہوتی ہیں: امام، مقتدی اور منفرد، محدثین کا موقف ہے کہ امام، مقتدی اور منفرد تینوں حضرات تسمیع اور تحمید میں شریک ہوں۔ احادیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔ علامہ شوکانی نے امام شافعی، امام مالک، عطا بن ابی رباح، ابو داؤد، ابو بردہ، محمد بن سیرین، اسحاق بن راھویہ اور امام داؤد رحمہم اللہ کا یہی موقف بیان کیا ہے۔ [1] امام بخاری رحمہ اللہ کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: امام اور مقتدی جب رکوع سے سر اٹھائیں تو کیا کہیں۔ [2]

پھر آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو **اللھم ربنا ولك الحمد** بھی کہتے۔ [3]

ایک حدیث میں مزید وضاحت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کہتے پھر جب رکوع کرتے تو اللہ اکبر کہتے، رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو جب سیدھے کھڑے ہو جاتے تو ربنا ولک الحمد کہتے۔ [4] البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا ولک الحمد کہو۔ [5] اس حدیث سے بعض حضرات نے استنباط کیا ہے کہ مقتدی کو سمع اللہ لمن حمدہ نہیں کہنا چاہیے، لیکن یہ استنباط کئی ایک اعتبار سے محل نظر ہے۔

اولاً: اس استنباط کا مطلب یہ ہے کہ امام کو ربنا ولک الحمد نہیں کہنا چاہیے، حالانکہ ایسا کرنا صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

ثانیاً: اس حدیث کا قطعاً یہ مقصد نہیں ہے کہ اس موقع پر امام اور مقتدی کو کیا کہنا چاہیے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مقتدی ربنا ولک الحمد کب کہے یعنی وہ امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد ربنا ولک الحمد کہے تا کہ یہ کلمات اس وقت کہنے سے گناہوں سے

---

[1] نیل الاوطار، ص ۲۷٦، ج۲۔ [2] بخاری، الاذان، باب ۱۲٤۔ [3] صحیح بخاری، الاذان: ۷۹۵۔
[4] بخاری، الاذان: ۷۸۹۔ [5] صحیح بخاری، الاذان: ۷۳۲۔

معافی کا اعزاز مل جائے کیونکہ اس وقت فرشتے بھی نمازیوں کے ساتھ یہ کلمات کہتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے ''جس کے یہ کلمات فرشتوں کے قول کے موافق ہو گئے اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ❶

ثالثاً: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث میں بیان شدہ معاملہ درج ذیل حدیث کی طرح ہے جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو گئی، اس کے سابقہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ❷

اس حدیث کا قطعاً یہ مقصد نہیں ہے کہ مقتدی ولا الضالین نہ پڑھے بلکہ صرف آمین کہے یا امام ولا الضالین پڑھے اور آمین نہ کہے، بلکہ اس حدیث میں آمین کہنے کا وقت اور محل متعین کیا گیا ہے۔ اس طرح درج بالا حدیث انس رضی اللہ عنہ کا مطلب ہے کہ مقتدی کو ربنا ولک الحمد اس وقت کہنا چاہیے جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہنے سے فارغ ہو جائے۔ اگرچہ امام ابوداؤد نے جناب عامر بن شرجیل کا موقف بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ لوگوں کو امام کے پیچھے سمع اللہ لمن حمدہ نہیں کہنا چاہیے بلکہ وہ صرف ربنا ولک الحمد کہیں ❸ لیکن ان شا اللہ پہلی بات ہی راجح اور عموم احادیث کے مطابق ہے۔ چنانچہ علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں اس بات کی دلیل نہیں کہ مقتدی، امام کے ساتھ سمع اللہ لمن حمدہ کہنے میں شریک نہ ہو، جیسا کہ اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ امام، مقتدی کے ساتھ ربنا ولک الحمد نہ کہے، کیونکہ یہ حدیث اس بات کو بیان کرنے کے لیے نہیں لائی گئی کہ اس موقع پر امام اور مقتدی کیا پڑھیں بلکہ حدیث کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مقتدی کا ربنا ولک الحمد کہنا امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ہونا چاہیے۔ اس بات کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام ہونے کے حالت میں بھی ربنا لک الحمد کہتے تھے۔ اس طرح حدیث ''صلو ا کما رأیتمو نی'' کا بھی تقاضا ہے کہ مقتدی بھی امام کی طرح سمع اللہ لمن حمدہ کہے۔ ❹ علامہ البانی رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے کہ جو اس مسئلہ میں زیادہ معلومات چاہتا ہے اسے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے رسالہ ''دفع التشنیع فی حکم التسمیع'' کا مطالعہ کرنا چاہیے جو الحاوی للفتاویٰ ص ۵۲۹، ج ۱ میں ہے۔ (واللہ اعلم)

ہم بطور تائید یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے جب آپ سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو مقتدی بھی سمع اللہ لمن حمدہ کہتے، اگرچہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ حدیث کے یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ ❺ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''صفۃ الصلوٰۃ'' میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ❻

دوران نماز سلام کا اشارہ سے جواب دینا

سوال ہمارے ہاں دوران نماز تکبیر تحریمہ کے بعد سلام پھیرنے تک آنے والے نمازیوں کی طرف سے سلام کہنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ایسی صورت حال کے پیش نظر نمازی کیا طریقہ اختیار کرے، کیا وہ پوری نماز میں مسلسل اشارے سے سلام کا جواب دینے میں لگا رہے، کیا اس سے نمازی کا خشوع متاثر نہیں ہوتا، کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کے متعلق ہماری راہنمائی فرمائیں۔

---

❶ صحیح بخاری، الاذان: ۷۹۶۔ ❷ بخاری، الاذان، ۷۸۲۔ ❸ ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۸۴۹۔
❹ حاشیہ صفۃ الصلوٰۃ، ص ۱۴۱۔ ❺ سنن دار قطنی، ص ۳۳۹، ج ۱۔ ❻ ص ۶۷۷، ج ۲۔

جواب جب کوئی انسان نماز پڑھ رہا ہوتو اسے سلام کہا جا سکتا ہے یا نہیں اور وہ جواب دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق فقہاو محدثین میں خاصا اختلاف ہے، دراصل جب دوران نماز بات چیت کرنے کی اجازت تھی تو سلام بھی کیا جاتا تھا اور اس کا جواب بھی زبان سے دیا جاتا تھا لیکن جب بات چیت کرنے کی ممانعت ہوگئی تو نمازی پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ نماز میں کسی دوسرے آدمی سے ہم کلام نہ ہو اور نہ ہی وہ کسی کو سلام کا جواب دے، اس کے لیے نماز کی مصروفیت ہی کافی ہے، اس لیے وہ پوری توجہ سے ادعیہ واذکار میں مصروف رہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم نماز میں ایک دوسرے کو سلام کرلیا کرتے تھے پھر ہمیں کہا گیا کہ نماز میں مصروفیت ہوتی ہے۔'' ❶

لیکن کچھ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی خود تو کسی کو سلام نہیں کر سکتا تاہم اسے سلام کیا جا سکتا ہے اور وہ اس سلام کا جواب زبان سے تو نہیں بلکہ اشارے سے دے سکتا ہے، چنانچہ صہیب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے اشارہ سے جواب دیا، راوی کا بیان ہے کہ آپ نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا۔ ❷ امام ابوداؤد نے اس حدیث پر یوں عنوان قائم کیا ہے: ''نماز کے دوران میں سلام کا جواب دینا'' ❸ اس حدیث پر امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی اس قسم کے عنوانات قائم کیے ہیں، جیسا کہ ذیل میں وضاحت ہے:

''دوران نماز میں اشارہ کرنا'' (ترمذی، الصلوۃ باب نمبر ۱۵۴) ''دورانِ نماز میں اشارہ کے ساتھ سلام کا جواب دینا'' ❹

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اس سلسلہ میں اپنا ایک اور مشاہدہ بیان کرتے ہیں: چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں نماز ادا کرنے کے لیے تشریف لائے، متعدد انصاری حضرات حاضر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کرنے لگے، میں نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے سے پوچھا، آپ اس موقع پر سلام کا جواب کس طرح دیتے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔ ❺

امام ابن ماجہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''نمازی سلام کا جواب کس طرح دے۔'' ❻

محدث ابن خزیمہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے اور اس پر یوں عنوان قائم کیا ہے: ''نمازی کو اگر دوران نماز سلام کیا جائے تو اسے اشارہ کے ساتھ سلام کا جواب دینے کی اجازت ہے۔'' ❼

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہی سوال حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے بھی کیا تھا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح جواب دیتے ہوئے دیکھا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ (انصار) آپ کو سلام کہتے تھے، انھوں نے کہا اس طرح اور اپنی ہتھیلی پھیلائی۔ ❽

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ دونوں سے اس قسم کا سوال

---

❶ ابو داؤد، الصلوٰۃ:۱۰۱۹۔ ❷ ابو داؤد،الصلوٰۃ،۹۲۵۔ ❸ ابو داؤد، الصلوٰۃ باب نمبر ۱۷۱۔

❹ نسائی، السھو:باب نمبر ٦۔ ❺ ابن ماجه، اقامة الصلوٰت:۱۰۱۷۔

❻ ابن ماجه ، اقامة الصلوٰت، باب نمبر ٥٩۔ ❼ ابن خزیمه،ص٤٩، ج٢۔ ❽ ابو داؤد، الصلوٰۃ:۹۲۷۔

کیا اور دونوں واقعات صحیح ہیں۔ ❶

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس اشارے کو جوابی سلام ہی سمجھا، اسے کسی دوسرے ردعمل پر محمول کرنا بعید از قیاس ہے۔ چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس سے گذرے جو نماز پڑھ رہا تھا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اسے سلام کہا تو اس نے سلام کا جواب زبان سے کہا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس کی طرف لوٹ کر آئے اور اسے فرمایا: ''جب دوران نماز کسی کو سلام کہا جائے تو اس کا جواب زبان سے نہ دے بلکہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کردے۔ ❷

''دوران نماز سلام کا جواب نہ دیا جائے۔'' ❸

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد عام متعارف الفاظ میں جواب نہ دیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ کسی دوسرے آدمی سے مخاطب ہوجاتا ہے جو نماز میں منع ہے۔ ❹ پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے تحت دو احادیث ذکر کی ہیں، ایک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جبکہ وہ حبشہ سے واپس آئے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا اور آپ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے اس کا جواب نہ دیا اور فرمایا کہ نماز میں مصروفیت ہوتی ہے۔ ❺

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے نہیں بلکہ اشارہ سے اس کا جواب دیا۔ ❻

چنانچہ آپ نے آئندہ ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''نماز میں اشارہ کرنا'' ❼

اس مقام پر متعدد احادیث پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوران نماز کسی وجہ سے اشارہ کیا جاسکتا ہے جب دیگر اغراض کے پیش نظر اشارہ کیا جاسکتا ہے تو جوابی سلام کے لیے بھی اشارہ ہوسکتا ہے اور ایسا کرنا نماز کی مصروفیت کے منافی نہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نماز میں مصروفیت والی حدیث ابن مسعود میں یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے: ''سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ ایسے موقع پر کیا کرتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ میں دل میں جواب دیتا ہوں۔'' ❽

جب دل میں جواب دینا نماز کی مصروفیت نہیں تو اشارہ سے جواب دینا کیوں منافی ہوسکتا ہے بہرحال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان قطعاً یہ نہیں کہ دوران نماز سرے سے سلام کا جواب نہ دیا جائے بلکہ زبان سے جواب دینے پر پابندی ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت سے لکھا ہے: یہ ضروری نہیں کہ سلام کا جواب دوران نماز اشارہ سے ہی دیا جائے۔ کیونکہ یہ تو ایک رخصت ہے اگر کوئی اس فرض کی ادائیگی کو سلام پھیرنے تک مؤخر کردے تو بھی جائز ہے، سلام پھیرنے کے بعد وہ زبان سے اس کا جواب دے دے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو سلام پھیرنے کے بعد جواب دیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں دوران

---

❶ ترمذی، الصلوٰۃ:٣٦٨۔
❷ الموطا، قصر الصلوٰۃ فی السفر، :٤٠٦۔
❸ صحیح بخاری، العمل فی الصلوٰۃ، باب نمبر ١٥۔
❹ فتح الباری، ص١١٣، ج٣۔
❺ صحیح بخاری، حدیث نمبر:١٢١٦۔
❻ فتح الباری، ص٩٥، ج٣۔
❼ صحیح بخاری، السھو، باب :٩۔
❽ بخاری، مناقب الانصار:٣٨٧٥۔

نماز بھی جواب دے سکتا تھا لیکن نماز کی ادائیگی (زبان سے جواب دینا) اس کے منافی تھی۔ [1]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور اہل علم کا یہی موقف بیان کیا ہے کہ دوران نماز اشارہ کے ساتھ سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ [2]

آخر میں ہم سلام کہنے والوں کو بھی یہ نصیحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ کڑک کر سلام کہنے کی بجائے نہایت شائستگی کے ساتھ آہستہ آواز میں سلام کہیں تاکہ دیگر نمازیوں کے لیے تشویش کا باعث نہ ہو۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے اس قسم کا سوال ہوا تو آپ نے درج ذیل جواب دیا:

''اگر کوئی نمازی اشارے سے سلام کا جواب اچھے طریقے سے دے سکتا ہے تو اسے سلام کہنے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہتے تھے اور آپ اشارہ سے اس کا جواب بھی دیتے تھے لیکن اگر وہ اچھے طریقے سے جواب نہیں دے سکتا بلکہ خدشہ ہے کہ وہ بول پڑے گا تو اسے اس حال سے دوچار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے یا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی یا اسے سلام کا جواب دینے کا فریضہ ترک کرنا پڑے گا۔ [3]

اس اندیشہ کے پیشِ نظر حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز پڑھ رہے ہوں تو میں انہیں سلام نہیں کہوں گا۔ [4]

امام ابویعلیٰ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ [5]

بہر حال زیر بحث مسئلہ میں افراط وتفریط سے اجتناب کرنا چاہیے، اگر کوئی شخص کسی نمازی کو سلام کہنا چاہتا ہے تو آہستگی کے ساتھ سلام کہہ دے تاکہ اس کا خشوع متاثر نہ ہو اور دوران نماز اس کا جواب اشارہ سے دے یا اسے سلام پھیرنے تک مؤخر کر کے بعد از فراغت جواب سلام کہہ دے۔ اس مسئلہ کے متعلق علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ [6]

نماز اشراق

سوال نماز چاشت اور نماز اشراق میں کیا فرق ہے، اس کا وقت اور رکعات کی تعداد بھی بتائیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب درکار ہے۔

جواب نماز چاشت اور نماز اشراق یہ دونوں نام ایک ہی نماز کے ہیں جو طلوع آفتاب کے بعد ادا کی جاتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کی وصیت کی تھی:

① ہر ماہ میں تین دن (ایام بیض یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ) کے روزے رکھنا ② چاشت کی دو رکعت پڑھنا۔ ③ سونے سے پہلے وتر پڑھ لینا۔ [7]

---

[1] صحیح بخاری، العمل فی الصلوۃ:۱۲۱۷۔ [2] نیل الاوطار، ص۳۶۳، ج۲۔

[3] مجموع الفتاویٰ، ص۶۲۵، ج۲۲۔ [4] بیہقی، ص۲۶۰، ج۲۔ [5] مسند ابی یعلیٰ:۲۳۱۷۔

[6] سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ، ص۳۶۰، ج۱۔ [7] صحیح البخاری، الصوم:۱۹۸۱۔

اسی طرح ایک حدیث قدسی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارا رب فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! تو دن کی ابتدا میں چار رکعت ادا کر، میں تجھے سارے دن کے لیے کافی ہو جاؤں گا۔ [1] ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انسان کے تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور ہر جوڑ پر صدقہ ہے، ان تمام صدقات سے نماز چاشت کی دو رکعات کفایت کر جاتی ہیں۔ [2]

یہ تمام احادیث نماز چاشت کی مشروعیت اور اس کی فضیلت کی نشاندہی کرتی ہیں، اگرچہ کچھ اسلاف نے اسے بدعت قرار دیا ہے وہ شاید کسی خاص کیفیت کو انھوں نے بدعت کہا ہوگا بصورت دیگر یہ نماز استحباب کا درجہ رکھتی ہے اس کا وقت طلوع آفتاب کے بعد سے لے کر زوال آفتاب تک ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ نماز چاشت اس وقت ہے جب شدت گرمی کی وجہ سے اونٹ کے پاؤں جلنے لگیں۔ [3] اس کی کم از کم دو رکعات ہیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات پڑھنا ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز چاشت کی آٹھ رکعات ادا کیں۔ [4]

ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے نماز چاشت کی بارہ رکعات ادا کیں، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت میں ایک محل بنا دیا جائے گا۔ [5] لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [6] لہٰذا نماز چاشت کی رکعات دو سے آٹھ تک ہیں، اسی مقدار پر اکتفا کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

حالتِ جنابت میں ادا کی گئی نماز

سوال میں نے صبح کی نماز ادا کی، نماز کے بعد مجھے پتہ چلا کہ مجھے غسل کرنا چاہیے تھا کیونکہ کپڑوں پر احتلام کے اثرات تھے، ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے، مجھے نماز دوبارہ پڑھنا ہوگی یا پہلی نماز کافی ہوگی؟

جواب اگر کسی انسان کو نماز پڑھنے کے بعد پتہ چلے کہ وہ بے وضو تھا یا اس نے غسل کرنا تھا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وضو کرے اگر وضو کرنے کی ضرورت تھی اور غسل کرے اگر اس پر غسل کرنا فرض تھا پھر دوبارہ نماز کو ادا کرے، ناپاکی کی حالت میں ادا کی ہوئی نماز شرعاً نماز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''اللہ تعالیٰ، طہارت کے بغیر کوئی نماز بھی قبول نہیں کرتا۔'' [7]

اس حدیث کے پیش نظر ناپاکی کی حالت میں ادا کردہ نماز باطل ہے، اس سے کسی قسم کے ثواب کی امید نہ رکھی جائے یعنی وہ نوافل میں بھی تبدیل نہیں ہوگی۔

مسافر امام کے پیچھے نماز

سوال ہمارے ہاں مسجد میں اگر کوئی عالمِ دین آ جائے تو امام مسجد اس کے احترام میں اسے نماز پڑھانے کے متعلق کہہ

---

[1] مسند امام احمد، ص۲۸۶، ج۵۔
[2] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۱۰۰۷۔
[3] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۷٤۷۔
[4] صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۳۵۷۔
[5] ترمذی، الصلوٰۃ: ٤۷۳۔
[6] فتح الباری، ص۲۰، ج۲۔
[7] نسائی، الطہارۃ:۱۳۹۔

دیتے ہیں، جب کہ مہمان نے نماز قصر پڑھنا ہوتی ہے لیکن بعض نمازی اسے اچھا نہیں سمجھتے، وہ امام کو مجبور کرتے ہیں کہ خود نماز پڑھائیں، کیا مسافر کے پیچھے مقیم کی نماز نہیں ہوتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب اگر مسجد میں کوئی عالم دین آجائے تو اس کے احترام کے پیش نظر اسے نماز پڑھانے کے لیے کہنا جائز ہے اور مقیم آدمی، مسافر کے پیچھے نماز ادا کرسکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مکہ تشریف لائے تو انھوں نے وہاں کے باشندوں کو دو رکعت پڑھائیں اور فرمایا: ''اے اہل مکہ! تم اپنی نماز مکمل کرلو ہم تو مسافر لوگ ہیں۔'' [1]

اس لیے مقتدی حضرات کو یہ عمل برا محسوس نہیں ہونا چاہیے اور انہیں اپنے امام کو اس امر پر مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کسی مہمان کی موجودگی میں خود ہی نماز پڑھائے، بہرحال امام مسجد کا عمل شریعت کے عین مطابق ہے۔ (واللہ اعلم)

بارش میں نمازوں کو جمع کرنا

سوال بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نماز مغرب کے بعد مطلع ابر آلود ہوتا ہے، معمولی بونداباندی بھی ہوتی ہے، گھنے بادل چھائے ہوتے ہیں، زیادہ بارش آنے کا امکان ہوتا ہے، ایسے حالات میں نماز مغرب کے ساتھ نماز عشا پڑھنے کی اجازت ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب ہر نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ تم نے نماز کو بروقت ادا کرنا ہے۔ [2]

اگر کوئی عذر ہو تو ایک نماز کو دوسری نماز کے وقت میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

① پہلی نماز کے وقت میں دوسری نماز کو ادا کرنا اسے جمع تقدیم کہتے ہیں، جیسا کہ مغرب میں عشا پڑھنا یا ظہر کے وقت عصر پڑھنا

② دوسری نماز کے وقت پہلی نماز پڑھنا مثلاً عشاء کے وقت مغرب پڑھنا یا ظہر کو مؤخر کرکے عصر کے وقت میں ادا کرنا اسے جمع تاخیر کہتے ہیں۔

جمع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ظہر کو آخری وقت اور عصر کو اول وقت بایں طور پر پڑھنا کہ دونوں بظاہر جمع ہوجائیں اس کو جمع صوری کہتے ہیں لیکن یہ انتہائی مشکل ہے کیونکہ آخری وقت اور پہلے وقت کے اتصال کا پتہ چلانا، اس کا انتظار کرنا پھر اپنے اپنے صحیح وقت میں دونوں کو جمع کرنا، اس میں سہولت کے بجائے بہت زیادہ حرج ہے، بہرحال کسی عذر کی بنا پر دو نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے، وہ عذر سفر، مرض، خوف، بارش اور کوئی بھی ہنگامی ضرورت ہوسکتی ہے۔ مثلاً دونوں نمازوں کے لیے الگ الگ وضو کرنے میں دقت ہو یا کسی جگہ کسی اجتماعی معاملے پر گفتگو ہورہی ہو اور درمیان میں وقفہ کرنا مناسب نہ ہو یا کوئی ڈاکٹر لمبا نازک آپریشن کررہا ہو وغیرہ تو ایسے حالات میں دو نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے اگر موسم خراب ہو اور بارش آنے کا قوی امکان ہو تو پھر ایسے مقام جہاں دوران بارش مسجد میں آنا دشوار ہو تو ایسے حالات میں مغرب کے ساتھ پڑھنے میں حرج نہیں۔ چنانچہ جب اصحاب اقتدار بارش کی وجہ سے مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کرتے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان کے ساتھ ان نمازوں کو جمع کرلیتے تھے۔ [3]

---

[1] موطا امام مالك، ص۱۴۹، ج۱۔ [2] صحيح مسلم، المساجد: ۶۴۸۔

[3] موطا امام مالك، قصر الصلوٰة، باب الجمع بين الصلاتين۔

بہر حال تیز بارش کی وجہ سے نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، صحیح مسلم کی روایات میں بھی اسی کا اشارہ ملتا ہے۔ ❶

نماز دیر سے پڑھنے کو معمول بنالینا

سوال میں رات جلد سو جاتا ہوں، جس بنا پر میری عشا کی نماز رہ جاتی ہے، میں اسے صبح کی نماز کے بعد ادا کرتا ہوں، اسے چھوڑتا نہیں، اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب نماز کا بروقت ادا کرنا ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بلاشبہ اہل ایمان پر مقررہ اوقات میں نماز کا ادا کرنا فرض ہے۔'' ❷

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا ہے۔ ❸ ہاں اگر کوئی نماز سے سویا رہے یا غفلت کی وجہ سے نہ پڑھ سکے تو اسے جب یاد آئے پڑھ لے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم میں سے کوئی نماز بھول جائے یا سو یا رہ جائے تو جب اسے یاد آئے وہ نماز پڑھ لے۔'' ❹ ایک روایت میں ہے کہ اس کا کفارہ صرف یہی ہے۔ ❺

لیکن یہ بات مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ہر روز نماز عشا میں اتنی سستی کرے کہ وہ فجر کے بعد پڑھنے کا معمول بنا لے، اگر وہ کام کاج کی وجہ سے بروقت گھر نہیں آتا تو اسے چاہیے کہ اپنی ڈیوٹی کے وقت ہی بروقت نماز پڑھ لے یا گھر آ کر اسے ادا کرلے، گھر میں کسی کی ڈیوٹی بھی لگائی جاسکتی ہے کہ وہ اسے نماز کی ادائیگی کے لیے بیدار کردے، ہاں اگر کوئی شدید عارضہ لاحق ہو یا نیند کا شدید غلبہ ہو تو وہ سونے کے بعد بھی اسے ادا کرسکتا ہے لیکن ہمیشہ اسے صبح کی نماز کے بعد ادا کرنا اور اسے معمول بنالینا مستحسن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین اسلام پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔ آمین

اذان دے کر گھر جانا

سوال ہمارے ہاں ایک امام صاحب اذان دے کر سنتیں ادا کرنے کے لیے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، کیا ان کا ایسا کرنا شرعی طور پر جائز ہے؟ نیز بتائیں کہ جو آدمی اذان کہے تکبیر بھی وہی کہے یا کوئی دوسرا بھی تکبیر کہہ سکتا ہے۔

جواب مندرجہ بالا سوال کے دو جزو ہیں۔ (الف) اذان دے کر مسجد سے باہر جانا، (ب) کیا موذن ہی تکبیر کہے۔

جہاں تک اذان کہہ کر مسجد سے باہر جانے کا تعلق ہے تو اذان ہو جانے کے بعد معقول شرعی عذر کے بغیر مسجد سے باہر نکلنا انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے جیسا کہ جناب ابوالشعثاء بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ موذن نے عصر کی اذان کہی تو اس کے بعد ایک شخص مسجد سے باہر نکل گیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ کر فرمایا: اس نے حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی ہے۔ ❻

---

❶ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۶۳۳۔ ❷ النساء: ۱۰۳۔ ❸ مسند امام احمد: ص ۱۴۷، ج ۵۔
❹ مسند امام احمد، ص ۲۹۸، ج ۵۔ ❺ صحیح مسلم، المساجد: ۶۸۴۔ ❻ مسلم، المساجد: ۶۵۵۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد سے اگر کوئی اذان سننے کے بعد نکل جاتا ہے اور اسے کوئی ضرورت بھی نہیں پھر وہ واپس نہیں آتا تو وہ پکا منافق ہے۔ [1]

اس حدیث میں اگرچہ مسجد نبوی کا ذکر ہے لیکن معنی کے اعتبار سے یہ حکم عام ہے جیسا کہ پہلی حدیث میں ہے۔ کیونکہ نماز باجماعت فرض ہے اور مسجد سے باہر نکل جانے کی صورت میں یہ فرض ادا نہیں ہوسکتا، ہاں اگر کوئی ضرورت ہو تو ایسے حالات میں مسجد سے باہر جاسکتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: کیا آدمی کسی عذر کی بنا پر مسجد سے باہر جاسکتا ہے؟ [2]

پھر انھوں نے حدیث پیش کی ہے کہ ایک دفعہ اقامت ہوچکی تھی اور رسول اللہ ﷺ بھی مصلّٰی امامت کے لیے کھڑے ہوچکے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہو، پھر آپ گھر تشریف لے گئے اور غسل کرکے واپس آئے اور آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اذان کیا، تکبیر ہونے کے بعد بھی کسی معقول عذر کی وجہ سے انسان باہر نکل سکتا ہے۔ صورت مسئولہ میں بھی ایک معقول عذر ہے کہ امام اپنے گھر میں سنت ادا کرنے کا اہتمام کرتا ہے، لہٰذا اگر امام اذان دے کر اپنے گھر سنت ادا کرنے کے لیے آتا ہے تو یہ جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

(ب) کیا مؤذن ہی تکبیر کہے؟

شرعی اعتبار سے یہ ضروری نہیں کہ جو اذان کہے وہی تکبیر کہنے کا فریضہ ادا کرے، کوئی بھی دوسرا شخص تکبیر کہہ سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حدیث پیش کی جاتی ہے کہ حضرت زیاد صدائی رضی اللہ عنہ نے اذان کہی، جب جماعت کا وقت ہوا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہنے کا ارادہ کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس صدائی نے اذان کہی ہے اور جو اذان کہے وہی اقامت کہے، پھر انھوں نے ہی اقامت کہی۔'' [4]

لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے کیونکہ اس میں عبدالرحمن بن زیاد افریقی نامی راوی ضعیف ہے۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''یہ حدیث افریقی سے مروی ہے اور محدثین کے نزدیک یہ راوی ضعیف ہے۔ [5] اس بنا پر موذن کے علاوہ کوئی بھی تکبیر کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ امام ابوداود رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''مؤذن اذان دے اور تکبیر کوئی دوسرا کہے۔'' [6]

اسے ثابت کرنے کے لیے حدیث پیش کی ہے کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان سکھائی گئی تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی، آپ نے فرمایا: تم یہ کلمات حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بتاؤ، چنانچہ انھوں نے بتائے تو بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی،

---

[1] طبرانی، بحوالہ الاحادیث الصحیحہ، رقم: ۲۵۱۸۔ [2] بخاری، الاذان: باب نمبر ۲۴۔

[3] صحیح بخاری، الاذان: ۶۳۹۔ [4] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۵۱۴۔ [5] ترمذی، الصلوٰۃ: ۱۹۹۔

[6] ابو داؤد، الصلوٰۃ، باب ۳۰۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا اور میں ہی اذان دینے کا خواہش مند تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم تکبیر کہہ لو۔'' ❶

لیکن یہ حدیث بھی محمد بن عمر راوی کی بنا پر ضعیف ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ اذان دینے والا ہی تکبیر کہے، تاہم ہماری مساجد میں عام طور پر جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ موذن کو ہی تکبیر کہنے کا پابند بنا دیا جائے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ اذان دینے والا ہی امام ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ کسی مناسب شخص کو تکبیر کہنے کا پابند کر دے، اگرچہ وہ خود بھی تکبیر کہہ کر جماعت کرا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز عشا کے بعد سونے سے پہلے وتر پڑھنا

سوال کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ وتر، نماز تہجد کا حصہ ہیں، چونکہ نماز تہجد سونے کے بعد اٹھ کر پڑھی جاتی ہے اس لیے وتر بھی سونے کے بعد اٹھ کر پڑھنے چاہئیں، انہیں نماز عشا کے متصل بعد پڑھنا درست نہیں ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب بلاشبہ وتر، نماز تہجد کا حصہ ہیں لیکن اس حصہ کو نماز عشاء کے متصل بعد پڑھنا جائز ہے اگرچہ بہتر یہ ہے کہ انہیں تہجد کے وقت ہی پڑھا جائے لیکن اگر کسی کو اندیشہ ہو کہ وہ صبح نہیں اٹھ سکے گا تو اسے شرعی طور پر اجازت ہے کہ وہ سونے سے پہلے نماز وتر پڑھ لے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ مجھے میرے خلیل ﷺ نے تین باتوں کی وصیت کی تھی، میں زندگی بھر انہیں ترک نہیں کروں گا، وہ یہ ہیں۔ ① ہر مہینے تین روزے (ایام بیض ۱۳، ۱۴، ۱۵) رکھوں۔ ② چاشت کی دو رکعت ادا کروں۔ ③ وتر پڑھ کر نیند کروں۔ ❷

ایک روایت میں ہے کہ سونے سے پہلے وتر پڑھا کروں۔ ❸

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی احادیث میں ہے کہ وہ عشاء کے بعد نماز وتر پڑھ لیتے تھے جیسا کہ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے نماز عشاء کے بعد ایک رکعت نماز وتر پڑھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام آپ کے پاس تھے، انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: ''انھوں نے درست کیا ہے کیونکہ وہ ایک فقیہ شخص ہے۔'' ❹

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیداری ایک مشکل اور گراں کام ہے، جب تم میں سے کوئی شخص وتر پڑھ لے تو وہ دو رکعت ادا کرے پھر اگر وہ رات کے وقت بیدار ہو جائے تو تہجد پڑھ لے بصورت دیگر یہ دو رکعت اس کے لیے کافی ہیں۔'' ❺

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز عشاء کے بعد سونے سے پہلے نماز وتر پڑھنا جائز ہے، اگر کوئی شخص نماز فجر سے

---

❶ ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۵۱۲۔ ❷ صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۷۸۔ ❸ صحیح بخاری، الصوم: ۱۸۹۱۔
❹ صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۷۶۵۔ ❺ دارمی، الصلوٰۃ: ۱۵۹۴۔

پہلے بیدار ہو جائے تو دو دو رکعت کر کے مزید نوافل پڑھ سکتا ہے مگر وتر دوبارہ نہ پڑھے۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز وساوس کا آنا

سوال مجھے دوران نماز بہت برے برے خیالات اور وسوسے آتے ہیں کوشش کے باوجود ان سے نجات نہیں ملتی، آپ اس سلسلہ میں کوئی کامیاب علاج بتائیں تا کہ میں دوانِ نماز ان خیالات و وساوس سے محفوظ رہ سکوں۔

جواب ابلیس لعین نے مختلف شیاطین کو گمراہی پھیلانے کے لیے ذمہ داریاں سونپی ہیں، دوران نماز، نمازی کو خیالات میں مصروف کرنے کے لیے ایک شیطان تعینات ہے جس کا نام خنزب ہے، اس کا کام دوران نماز وسوسہ اندازی کرنا ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! شیطان میرے اور میری نماز نیز قرأت کے درمیان حائل ہو کر میری نماز خلط ملط کر دیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کام کے لیے ایک شیطان مقرر ہے جس کا نام خنزب ہے، جب تم اس کی وسوسہ اندازی محسوس کرو تو تم اس وقت اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو اور اپنی بائیں جانب تین بار تھو کر دیا کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے شیطان کی وسوسہ اندازی سے نجات دے دی۔ [1]

صورت مسئولہ میں بھی سائل اسی قسم کے حالات سے دو چار ہے، اسے چاہیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق عمل کرے، ان شاء اللہ وسوسہ اندازی اور برے خیالات ختم ہو جائیں گے۔ بہر حال نمازی کے لیے ضروری ہے کہ وہ وساوس سے بچتے ہوئے ان کے خلاف جنگ لڑے اور کثرت سے تعوذ باللہ پڑھے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور اگر شیطان کی طرف سے آپ کو کوئی وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو، وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔“ [2]

شیطان کی وسوسہ اندازی کو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص بیان کیا ہے بلکہ انسان کو گمراہ کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار اور اس کا طریقہ واردات ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”آپ کہہ دیں، میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ میں آتا ہوں، لوگوں کے مالک اور ان کے معبود کی پناہ میں آتا ہوں، وسوسہ ڈالنے والے، پیچھے ہٹ کر دوبارہ عمل کرنے والے کی برائی سے وہ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ [3]

نمازی کو چاہیے کہ وہ ابلیس کے خلاف اس طریقہ واردات سے نبرد آزما رہے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے کیونکہ تنہا نمازی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (واللہ اعلم)

اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے سجدہ کرنا

سوال اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نعمت کے حاصل ہونے یا کسی مصیبت سے چھٹکارے کے وقت اکیلا سجدہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

---

[1] صحیح مسلم، السلام: ۵۷۳۸۔ [2] الاعراف: ۲۰۰۔ [3] الناس: ۱۔۵۔

جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نعمت کے ملنے یا بیماری سے شفا پانے ، اسی طرح خوشی ومسرت کے موقع پر سجدہ شکر ادا کرنا جائز ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے، ان کا استدلال، درج ذیل احادیث سے ہے:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بغرض دعوت وتبلیغ روانہ کیا، انھوں نے آپ کو بذریعہ خط اطلاع دی کہ اہل یمن مسلمان ہو چکے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مکتوب پڑھا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدے میں گر گئے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ سجدہ کیا اور بڑا طویل سجدہ کیا پھر آپ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ میرے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے تھے، انھوں نے مجھے بشارت دی تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ ریز ہو گیا۔ [1]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ سجدہ شکر میں اس سے زیادہ صحیح اور کوئی حدیث نہیں۔ [2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی خوشخبری ملتی تو آپ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر پڑتے۔ [3]

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''سجدہ شکر ادا کرنے کا بیان''

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نعمت کے حصول کے وقت اکیلا سجدہ ادا کرنا مشروع ہے، اگرچہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں ایسا کرنا نہ مستحب ہے اور نہ مکروہ ، لیکن مذکورہ احادیث اس موقف کی تردید کرتی ہیں۔ (واللہ اعلم)

سجدۂ تلاوت کا حکم

سوال سجدہ تلاوت کی شرعی حیثیت کیا ہے، اگر سجدہ تلاوت کسی وجہ سے چھوڑ دیا جائے تو کیا اس پر گناہ لازم آئے گا، اس کی وضاحت درکار ہے؟

جواب شرعی طور پر سجدہ تلاوت کی بہت اہمیت ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل حدیث سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب ابن آدم کسی آیت سجدہ کی تلاوت کرتا ہے اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا دور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: ''ہائے میری ہلاکت! ابن آدم کو سجدے کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کر لیا، اس لیے اسے جنت ملے گی اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کر دیا، اس لیے مجھے جہنم میں ڈالا جائے گا۔ [4]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت چھوڑ دینا کسی صورت میں بھی مناسب نہیں ہے، جب انسان آیت سجدہ پڑھے خواہ وہ زبانی پڑھے یا دیکھ کر، نماز کے اندر ہو یا باہر، ہر حالت میں اسے سجدہ تلاوت کرنا چاہیے، لیکن سجدہ اہم ضرور ہے، اسے واجب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ منبر پر سورۂ نحل تلاوت کی حتی کہ سجدہ والی آیت کو پڑھا تو نیچے اترے اور سجدہ تلاوت کیا، آپ کے ہمراہ لوگوں نے بھی سجدہ کیا، پھر اگلے جمعہ بھی سورۂ نحل تلاوت کی، جب آیت سجدہ

---

[1] مستدرک حاکم، ص۵۵۰، ج۱۔ [2] بیہقی، ص۳۷۱، ج۲۔ [3] ابو داؤد، الجهاد: ۲۷۷٤۔

[4] صحیح مسلم، الایمان: ۲٤٤۔

تلاوت کی تو فرمانے لگے: ''اے لوگو! ہم سجدہ پر مشتمل آیات کی تلاوت کرتے ہیں جس نے سجدہ کر لیا تو اس نے درست کام کیا اور جس نے سجدہ نہ کیا اس پر کوئی حرج نہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سجدہ نہ کیا، مزید فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدہ تلاوت فرض نہیں کیا بلکہ اسے ہماری صوابدید پر چھوڑا ہے۔ [1]

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: اس شخص کا بیان جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ تلاوت واجب نہیں کیا۔ [2] اس کے بعد آپ نے کچھ آثار بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے۔ واضح رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ نحل میں سجدہ نہ کرنے کا عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں کیا پھر سجدہ تلاوت والی آیت بھی پڑھی لیکن آپ نے سجدہ نہ کیا، اگر سجدہ تلاوت واجب ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سجدہ کرنے کا حکم دیتے۔ [3]

بہرحال آیت سجدہ کی تلاوت پر سجدہ کرنا اہم ہے لیکن ضروری نہیں۔ (واللہ اعلم)

دوران قرأت آیت رحمت پر سوال کرنا

سوال اگر انسان فرض نماز باجماعت ادا کر رہا ہو تو کیا آیت رحمت سنتے وقت اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرنا چاہیے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایت ہے؟

جواب اگر انسان نماز پڑھ رہا ہو تو دوران قرأت آیت رحمت پر ٹھہرنا اور رحمت کا سوال کرنا مشروع ہے جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ قیام اللیل کیا، آپ بہت آہستہ آہستہ قرأت کرتے تھے جب آپ کسی ایسی آیت سے گزرتے جہاں اللہ کی تسبیح ہوتی تو آپ وہاں ٹھہرتے اور سبحان اللہ کہتے، جب آپ کسی سوال پر مشتمل آیت سے گزرتے تو وہاں ٹھہر کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے، اسی طرح جب آیت پناہ سے گزرتے تو اللہ سے پناہ مانگتے۔ [4]

بعض روایات میں ہے کہ جب آپ ایسی آیت پڑھتے جس میں اللہ کی رحمت کا ذکر ہوتا تو آپ وہاں ٹھہر کر رحمت کا سوال کرتے اور جب آیت عذاب سے گزرتے تو وہاں ذرا ٹھہر کر اس سے پناہ مانگتے۔ [5]

اس حدیث سے بعض حضرات کا استدلال ہے کہ فرض نماز میں مقتدی بھی امام کی قرأت کے وقت آیت رحمت سنتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سوال کرے، لیکن اولاً یہ حدیث صلوٰۃ اللیل سے متعلق ہے فرض نماز کے متعلق نہیں۔

نوافل پڑھتے وقت بعض ایسے کام جائز ہوتے ہیں جو فرائض کی ادائیگی کے وقت نہیں کیے جا سکتے، مثلاً استقبال قبلہ نوافل ادا کرتے وقت ضروری نہیں جبکہ انسان سفر کر رہا ہو لیکن فرائض کی ادائیگی میں استقبال قبلہ ضروری ہے، نیز یہ حدیث خود قرآن کی قرأت کرنے والے سے متعلق ہے، سننے والے کے لیے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور خود ان کا عمل کرنا احادیث میں نہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، سجود القرآن:۱۰۷۷۔
[2] باب نمبر ۱۰، کتاب السجود۔
[3] صحیح بخاری، سجود القرآن، ۱۰۷۳۔
[4] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۷۷۲۔
[5] مسند امام احمد، ص۳۸۲، ج۵۔

چنانچہ علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اگر فرائض میں اس طرح مشروع ہوتا تو آپ فرائض میں بھی ایسا ضرور کرتے، اگر آپ نے فرائض میں ایسا کیا ہوتا تو احادیث میں ضرور منقول ہوتا، جب منقول نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرائض میں ایسا نہیں کیا۔ ❶

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق نوافل ادا کرتے ہوئے آیت رحمت پڑھتے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سوال کیا جا سکتا ہے، فرائض میں ایسا کرنے کی گنجائش نہیں۔ (واللہ اعلم)

نماز عشا کے بعد تا دیر باتیں کرنا

سوال ہمارے گھر میں یہ عادت ہے کہ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد باتوں میں لگے رہتے ہیں بعض دفعہ صبح کی نماز با جماعت ادا نہیں ہوتی، کہا جاتا ہے کہ اس کے متعلق شرعی طور پر کوئی پابندی نہیں، کتاب وسنت کے حوالے سے وضاحت فرمائیں۔

جواب نماز عشا کے بعد دعوت دین یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن عمومی طور پر نماز عشاء کے بعد باتوں میں مصروف رہنا ناپسندیدہ عمل ہے۔ چنانچہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عشا سے پہلے نیند اور اس کے بعد باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ ❷

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اس امر کو ثابت کیا ہے کہ رات عشاء کے بعد علمی مجالس قائم کی جا سکتی ہیں، دوسروں کو وعظ و نصیحت بھی کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ایک حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات نماز عشاء کے بعد اپنی بیوی سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے کچھ دیر باتیں کیں اور پھر سو گئے۔ ❸

کتاب العلم میں اس کے متعلق انھوں نے متعدد عنوانات بھی قائم کیے ہیں۔ (واللہ اعلم)

دو آدمی نماز با جماعت پڑھیں تو مقتدی کہاں کھڑا ہو؟

سوال ہمارے ہاں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب دو آدمی نماز با جماعت پڑھتے ہیں تو امام کے ساتھ کھڑا ہونے والا مقتدی اس سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوتا ہے تاکہ امام اور مقتدی میں کچھ فرق برقرار رہے، امام کے بالکل برابر کھڑا نہیں ہوتا، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

جواب جب دو آدمی نماز با جماعت ادا کریں تو مقتدی کو امام کے دائیں جانب کھڑا ہونا چاہیے اور اسے پیچھے ہٹ کر نہیں بلکہ بالکل اس کے برابر کھڑا ہونا چاہیے، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جب دو آدمی نماز با جماعت پڑھیں تو مقتدی کو امام کے برابر دائیں جانب کھڑا ہونا چاہیے۔'' ❹

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مقتدی کو امام کے برابر کھڑا ہونا چاہیے، اس کے آگے یا پیچھے کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات پر امام نخعی رحمہ اللہ کے علاوہ تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ ❺

---

❶ تمام المنه، ص ١٨٥۔ ❷ صحیح بخاری، مواقیت الصلوٰة: ٥٤٧۔ ❸ بخاری التفسیر: ٤٥٦٩۔
❹ بخاری، الاذان: باب ٥٧۔ ❺ فتح الباری، ص ٢٤٧، ج ٢۔

امام بخاری نے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ وہ ایک رات اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آئے، جب رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد پڑھنے لگے تو وہ آپ کے بائیں جانب کھڑے ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی دائیں جانب کھڑا کیا۔ [1]

ایک روایت میں مزید صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''میں تجھے دوران نماز اپنی دائیں جانب کھڑا کرتا تھا لیکن تو پیچھے ہٹ جاتا تھا۔'' [2]

اس صراحت سے معلوم ہوا کہ ایک مقتدی ہونے کی صورت میں اسے امام کے دائیں جانب بالکل برابر کھڑا ہونا چاہیے، اس سے ذرا پیچھے کھڑا ہونے کی ضرورت نہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے انہیں اپنی دائیں جانب کھڑا کیا۔ [3]

اگر امام سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہونا مشروع ہوتا تو ضرور احادیث میں اس کا ذکر ہوتا جبکہ دو آدمیوں کی جماعت کا متعدد مرتبہ واقعہ پیش آیا ہے۔

اس کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی معمول تھا کہ وہ دو آدمیوں کی جماعت کی صورت میں مقتدی کو اپنے برابر کھڑا کرتے تھے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں ایک مرتبہ دوپہر کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو وہ نفل پڑھ رہے تھے، میں بھی ان کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز میں شامل ہو گیا تو انھوں نے مجھے اپنی دائیں جانب اپنے برابر کھڑا کیا۔'' [4]

تابعین کرام کا بھی یہی معمول تھا، چنانچہ ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ ایک آدمی امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تو وہ کہاں کھڑا ہو؟ انھوں نے فرمایا اس کی دائیں جانب، میں نے عرض کیا اس کے برابر صف بنا کر کھڑا ہو؟ تاکہ درمیان میں کوئی خلل نہ رہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! [5]

ان احادیث و آثار سے یہ ثابت ہوا کہ جب دو آدمی نماز باجماعت ادا کریں تو مقتدی کو امام کے دائیں جانب بالکل برابر کھڑا ہونا چاہیے، اس کے آگے یا پیچھے کھڑا ہونا شرعاً ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

لباس حیض میں نماز پڑھنا

سوال عورت نے جن کپڑوں میں ایام گزارے ہوں، کیا ان میں نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ ان پر خونِ حیض کے نشانات وغیرہ نہ ہوں، قرآن وحدیث کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت کر دیں۔

جواب اسلام میں کچھ عورتیں مخصوص ایام میں خاص لباس پہن لیتی تھیں، طہارت و نظافت کے پیش نظر مخصوص لباس استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''طہر کے لباس کے علاوہ مخصوص ایام میں الگ لباس استعمال کرنا۔'' پھر انھوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی عادت بیان کی ہے کہ وہ مخصوص ایام میں الگ لباس استعمال کرتی تھیں۔ [6]

---

[1] صحیح بخاری، الاذان، ٦٩٧۔ [2] مسند امام احمد، ص ٣٣٠، ج١۔ [3] مسلم، الزهد: ٣٠١٠۔
[4] موطا امام مالك: ص١٥٤، ج١۔ [5] فتح الباری، ص٢٤٧، ج٢۔ [6] بخاری، الحیض: ٣٢٣۔

تاہم کسی عورت نے ان دنوں عام معمول کا لباس پہنا ہے، ان دنوں کے لیے مخصوص لباس استعمال نہیں کیا تو بھی جائز ہے چونکہ یہ خون نجس ہوتا ہے، اگر کپڑے پر لگ جائے تو اسے دھو کر اس میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کپڑے کو لگ جانے والے خونِ حیض کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کپڑے کو مل کر دھو لیا جائے پھر اسے پہن کر نماز پڑھ لے۔ ❶

اس کی مزید وضاحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: ''ہم میں سے جب کسی کو حیض آتا تو وہ پاک ہونے پر انگلیوں سے مل کر کپڑے سے خون اتار دیتی تھی پھر وہاں سے کپڑا دھو لیتی اور بعض اوقات صرف پانی ڈالنے سے خون نہیں اترتا۔ اس صورت میں کپڑے کو رگڑ رگڑ کر اچھی طرح صاف کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کے بعد اگر اس کے نشانات باقی رہ جائیں تو قابل معافی ہیں۔ زیادہ شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں، کپڑا پاک ہونے کی صورت میں اسے پہن کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

منہ لپیٹ کر نماز ادا کرنا

سوال سردی کے موسم میں کچھ لوگ اپنا منہ لپیٹ کر نماز پڑھتے ہیں، کیا اس سلسلہ میں کوئی واضح ممانعت احادیث میں مروی ہے؟

جواب دوران نماز، انسان کو کپڑے یا ہاتھ سے اپنا منہ ڈھانپنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران نماز کپڑا لٹکانے اور اپنا منہ ڈھانپنے سے منع فرمایا ہے۔ ❷

ہاں اگر کوئی عذر ہو تو منہ کو ڈھانپا جا سکتا ہے، مثلاً جمائی آ رہی ہے تو اسے حتی الوسع روکنا چاہیے۔ اگر اسے روکا نہ جا سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لیا جائے اور آواز نہ نکالی جائے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جمائی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے، جب تم میں سے کسی کو جمائی آئے تو اسے حتی المقدور روکے، کیونکہ اس وقت جب انسان ''ھا'' کہتا ہے تو شیطان اسے دیکھ کر ہنستا ہے۔ ❸

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی جمائی لے تو منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکے، کیونکہ منہ کھلا چھوڑنے سے شیطان داخل ہو جاتا ہے۔ ❹

اس طرح اگر منہ پر زخم ہو اور مکھیاں وغیرہ تنگ کرتی ہوں تو دوران نماز منہ پر کپڑا رکھا جا سکتا ہے، بصورت دیگر نماز پڑھتے وقت منہ کو کپڑے یا ہاتھ سے ڈھانپنا شرعاً جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

باریک دوپٹے میں نماز پڑھنا

سوال کیا عورت ایسا دوپٹہ اوڑھ کر نماز پڑھ سکتی ہے جس سے سر کے بال اور اس کا لباس نظر آتا ہو، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

---

❶ صحیح بخاری، الوضوء: ۲۲۷۔ ❷ صحیح ابن خزیمہ، ص۲۷۹، ج۱۔
❸ صحیح بخاری، الادب: ۶۲۲۳۔ ❹ صحیح، الرقاق: ۲۹۹۵۔

جواب عورت کا جسم تمام کا تمام قابل ستر ہے، اس لیے دوران نماز اسے تمام جسم ڈھانپنے کا حکم ہے، اس بنا پر عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ باریک دوپٹے یا باریک لباس میں نماز ادا کرے، اسے اس قسم کی اوڑھنی لینا چاہیے جس سے اس کے بال اور نیچے پہنے ہوئے کپڑوں کا رنگ نظر نہ آئے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ جوان عورت کی نماز دوپٹے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔'' [1]

اس حدیث کے پیش نظر ایسے شفاف کپڑے جن سے عورت کے سر کے بال اور دیگر لباس کا رنگ نظر آتا ہو، ان میں نماز پڑھنا جائز نہیں تاہم یہ ضروری نہیں کہ وہ دوران نماز اپنے پاؤں کی پشت بھی ڈھانپے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سوال ہوا ''عورت کن کپڑوں میں نماز پڑھے؟'' تو آپ نے فرمایا: ''اوڑھنی اور پوری قمیص میں نماز پڑھے جو اس کے پاؤں تک کو ڈھانپ لے۔'' [2]

لیکن یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ام محمد بن زید نامی ایک عورت مجہول ہے، اگرچہ امام حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ [3]

اس سلسلہ میں جو صحیح روایات ہیں ان کا تعلق پردے کے مجموعی حکم سے ہے، نمازی عورت کے لیے اس امر کو ضروری قرار دینا انتہائی محل نظر ہے کیونکہ عمومی طور پر پردے کے حکم میں عورت کا چہرہ بھی شامل ہے لیکن دوران نماز عورت کے لیے چہرہ کا ڈھانپنا ضروری نہیں، اس لیے پردے کے عمومی حکم کے پیش نظر عورت کے لیے دوران نماز پاؤں کی پشت ڈھانپنا بھی ضروری نہیں، اسے زیادہ سے زیادہ بہتر تو کہا جاتا ہے لیکن اسے ضروری قرار دینا سینہ زوری ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز مغرب میں قرأت

سوال ہمارے ائمہ کرام جمعرات کے دن نماز مغرب میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھنے کا التزام کرتے ہیں اور اس انداز سے قرأت کرنے کو سنت کا درجہ دیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز اس پر التزام کرنا درست ہے؟

جواب قرآن کریم کی کوئی بھی سورت کسی بھی نماز میں پڑھنا جائز ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''دو سورتوں کو ایک رکعت میں جمع کرنا، سورتوں کی آخری آیات پڑھنا، ایک سورت کو دوسری سے پہلے پڑھنا یعنی ترتیب کے بغیر پڑھنا اور سورت کی ابتدائی آیات پڑھنا۔'' [4]

لیکن اپنی طرف سے کسی نماز میں مخصوص سورتوں کا پڑھنا اور اسے سنت کا درجہ دے کر اس پر التزام کرنا انتہائی محل نظر ہے۔ سوال میں ذکر کیا گیا ہے کہ جمعرات کے دن مغرب کی نماز میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھی جاتی ہیں، غالباً اس التزام کی بنیاد درج ذیل دو احادیث ہیں۔

---

[1] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ٦٤١۔ [2] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ٦٣٩۔ [3] مستدرک حاکم، ص ٢٥٠، ج ١۔

[4] بخاری، الاذان، باب نمبر ١٠٦۔

① حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز مغرب میں قل یا ایها الکافرون اور قل هو الله احد تلاوت کرتے تھے۔ ❶

② حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کی رات نماز مغرب میں قل یا ایها الکافرون اور قل هو الله احد پڑھا کرتے تھے۔'' ❷

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''نماز مغرب میں قرأت کی مقدار۔''

ان احادیث کے متعلق ہمارے ملاحظات درج ذیل ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں دن کی تعیین نہیں، اس میں مطلق طور پر رسول اللہ ﷺ کا عمل بیان ہوا ہے کہ آپ نماز مغرب میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھتے تھے، دن کی تعیین خود ساختہ ہے، پھر یہ دونوں روایات محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ اگرچہ ظاہری طور پر صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن یہ معلول ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ بعض راویوں سے اس میں غلط بیانی ہوئی ہے اور جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ایک راوی سعید بن سماک متروک ہے۔ محفوظ یہ امر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز مغرب کے بعد دو سنتوں میں ان سورتوں کو پڑھتے تھے۔ ❸

نیز حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں راوی احمد بن بدیل ہے جس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''صدوق له اوهام'' سچا ہے لیکن اس کے کچھ اوہام ہیں۔ ❹ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ انتہائی ضعیف ہے، پھر اس کے متعلق تفاصیل لکھی ہیں۔ ❺

ان دونوں سورتوں کی قرأت کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان صحیح سند سے ثابت ہے، آپ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب کے بعد دو رکعتوں میں اور فجر سے پہلے دو رکعتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص اتنی مرتبہ پڑھتے ہوئے سنا کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔ ❻

ان احادیث کے پیش نظر ہمارا رجحان یہ ہے کہ نماز مغرب میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھی جا سکتی ہیں لیکن اسے سنت کا درجہ دے کر اس پر التزام کرنا انتہائی محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز تراویح

سوال نماز تراویح کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہے، اگر کوئی انسان انہیں کسی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے تو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کے متعلق کیا حکم ہے، نیز نماز تراویح کی تعداد کے متعلق بھی وضاحت کریں کہ رسول اللہ ﷺ عمومی طور پر کتنی رکعات پڑھتے تھے؟

جواب رمضان المبارک میں صوم رمضان اور قیام رمضان دو الگ الگ عبادتیں ہیں، ان میں سے صوم رمضان فرض اور قیام رمضان مستحب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں عبادتوں کی فضیلت بیان کی ہے۔ چنانچہ صوم رمضان کے متعلق حضرت

---

❶ ابن ماجه، اقامة الصلوٰة: ۸۳۳۔ ❷ بیهقی: ص ۳۹۱، ج ۲۔ ❸ فتح الباری، ص ۳۲۲، ج ۲، طبع دار السلام۔
❹ تقریب، ص ۲۸۔ ❺ الاحادیث الضعیفه، ص ۳۴، ج ۲، حدیث نمبر ۵۵۹۔ ❻ ترمذی، مواقیت: ۴۳۱۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ایمان کے پیش نظر ثواب کی نیت سے رمضان کا روزہ رکھا اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔'' ❶

اسی طرح قیام رمضان کے متعلق بھی یہی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو انسان ایمان کے پیش نظر ثواب کی نیت سے رمضان المبارک میں رات کا قیام کرتا ہے اس کے بھی سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔'' ❷

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''تطوع قیام رمضان من الایمان'' ❸

قیام رمضان کے نوافل کا اہتمام بھی ایمان کا حصہ ہے۔

معنوی حیثیت سے ان دونوں عبادتوں کا بہت گہرا تعلق ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ایک کی ادائیگی دوسری عبادت کو لازم ہو اور اس کے بغیر ادائیگی صحیح نہ ہو۔ اگر کوئی کسی وجہ سے نماز تراویح نہیں پڑھتا تو اس کے روزوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ روزہ فرض ہے اور اس کا رکھنا ضروری ہے خواہ تراویح پڑھی ہوں یا کسی وجہ سے نہ پڑھی جا سکی ہوں۔ نماز تراویح دراصل نماز تہجد ہے جو لوگ ان میں فرق کرتے ہیں وہ صحیح نہیں، اس کی کوئی دلیل صحیح احادیث سے نہیں ملتی، یہ نماز بھی نفل ہے، رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک میں اس کی ترغیب دیتے تھے، آپ نے رمضان المبارک میں چند دن خود اسے باجماعت پڑھانے کا اہتمام کیا، پھر اس خطرہ سے کہ مبادا فرض ہو جائے گھر میں ادا کرتے رہے۔ ❹

رسول اللہ ﷺ کا عام معمول وتر سمیت گیارہ رکعت پڑھنے کا تھا یعنی آٹھ تراویح اور تین وتر۔ چنانچہ حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ کی نماز تراویح کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔'' ❹

اس حدیث کے مطابق سائل نے رمضان المبارک کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جامع جواب دیا کہ جو تعداد اور کیفیت سارے سال میں اس نماز کی تھی وہی تعداد اور کیفیت رمضان میں رہی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا عام معمول گیارہ رکعت نماز تراویح ادا کرنا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جنگوں کی مشغولیت کی بنا پر اس نفلی نماز کی طرف پوری توجہ نہ ہو سکی، البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف توجہ دی اور اسے اجتماعی طور پر ادا کرنے کا حکم دیا جس کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔ ❺

آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ، گیارہ رکعات پڑھائیں۔ ❻

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ ﷺ کے معمول کو برقرار رکھتے ہوئے گیارہ رکعت

---

❶ بخاری، الایمان: ۳۸۔ ❷ بخاری، الایمان: ۳۷۔ ❸ صحیح بخاری، الایمان، باب نمبر ۲۷۔
❹ صحیح بخاری، صلوٰۃ التراویح، ۲۰۱۲۔ ❹ صحیح بخاری، صلوۃ التراویح: ۲۰۱۳۔
❺ صحیح بخاری، صلوٰۃ التراویح: ۲۰۱۰۔ ❻ موطا امام مالک، ص ۱۱۵، ج ۱۔

پڑھانے کا حکم دیا، اگرچہ بعض مرفوع روایات میں بیس رکعات کا بھی ذکر آیا ہے لیکن ایسی روایات باتفاق ائمہ ضعیف اور نا قابل حجت ہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق اگر کوئی بطور نفل زیادہ پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے تو اس کے لیے گنجائش ہے لیکن اسے سنت کا درجہ نہ دیا جائے کیونکہ سنت گیارہ رکعت ہی ہیں، حدیث نبوی میں بیس یا اس سے زیادہ کا کوئی ذکر نہیں۔ (واللہ اعلم)

جو نماز عید با جماعت نہ پڑھ سکے

سوال جو شخص کسی عذر کی وجہ سے نماز عید با جماعت ادا نہ کر سکے، اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے کہ وہ کتنی رکعت ادا کرے؟ نیز وہ کہاں ادا کرے، عیدگاہ میں یا اپنے گھر بھی پڑھ سکتا ہے۔ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب جو لوگ کسی عذر کی وجہ سے نماز عید باجماعت ادا نہ کر سکیں، انہیں کیا کرنا چاہیے، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کچھ منقول نہیں البتہ علامات نے اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جو شخص امام کے ساتھ نماز عید نہ پڑھ سکے وہ چار رکعت پڑھے۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [2]

جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے متعدد دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ایسا شخص امام کی طرح دو رکعت ادا کرے گا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے عمل، حضرت عکرمہ اور حضرت عطا کے اقوال سے استدلال کیا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''یہ ہم مسلمانوں کی عید ہے'' امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو عنوان میں ذکر کیا ہے۔ لیکن ذخیرہ احادیث میں مجھے یہ الفاظ دستیاب نہیں ہو سکے البتہ اس معنی کے الفاظ ابوداود حدیث نمبر ۲۴۱۹ میں ہیں۔ اس حدیث کی مطابقت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بایں الفاظ بیان کی ہے کہ اس حدیث میں عید کی اضافت عام مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز عید چند لوگوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ سب کے لیے ہے، چونکہ عید کی عبادت نماز عید ہے اس لیے اس میں سب لوگوں کا حصہ ہے خواہ امام کے ساتھ اسے ادا نہیں کر سکے۔ (شرح تراجم بخاری) مقام زاویہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے حکم پر ان کے غلام ابن ابی عتبہ نے ان کے اہل وعیال کو جمع کیا اور سب کو نماز عید شہر والوں کی طرح تکبیرات زوائد کے ساتھ پڑھائی۔ [3]

حضرت عکرمہ نے کہا ''دیہاتوں والے لوگ جمع ہو کر اسی طرح دو رکعت نماز عید ادا کریں گے، جیسا کہ امام شہر میں نماز عید پڑھاتا ہے۔'' [4]

حضرت عطا نے فرمایا کہ جس کی نماز عید رہ جائے وہ دو رکعت پڑھے۔ [5]

ان تمام دلائل کو امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں ذکر کیا ہے۔ [6]

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۱۸۳، ج۲۔ [2] فتح الباری، ص ج ٤۔ [3] مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۱۸۳، ج۲۔
[4] مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۱۹۱، ج۲۔ [5] مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۱۹۲، ج۲۔
[6] بخاری، العیدین باب نمبر ۲۵۔

ہمارا رجحان بھی یہی ہے کہ جس کی نماز عید رہ جائے وہ دو رکعت تکبیراتِ زوائد کے ساتھ ادا کرے خواہ چند ساتھی مل کر جماعت کا اہتمام کرلیں یا انفرادی طور پر پڑھ لیں، اسی طرح خواہ عید گاہ میں پڑھیں یا اپنے گھر ادا کریں، بہر حال انہیں پڑھنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

پانچوں نمازوں کی پابندی

سوال قرآن وحدیث میں نماز پنجگانہ ادا کرنے کی بہت تاکید ہے لیکن ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اپنے مسلمان ہونے کی یہ شرط پیش کی کہ وہ صرف دو نمازیں پڑھے گا تو آپ نے یہ شرط قبول کرلی، اس طرح وہ شخص مسلمان ہوا۔ اس کے متعلق بتائیں کہ یہ حدیث کہاں ہے اور کیسی ہے؟

جواب قرآن وحدیث میں نماز پنجگانہ کی پابندی پر بہت تاکید ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس شخص نے ان نمازوں کی حفاظت و پابندی کی تو وہ اس شخص کے لیے روز قیامت نور، دلیل اور نجات ہوں گی اور جس نے ان کی حفاظت نہ کی تو روز قیامت اس کے لیے نور، دلیل اور نجات نہیں ہوگی بلکہ وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ [1]

اس طرح حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ثقیف قبیلے کا وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا تاکہ دینی ماحول دیکھ کر ان کے دل گداز ہوں۔ انھوں نے اسلام لانے کے لیے یہ شرائط پیش کیں کہ وہ جہاد نہیں کریں گے، زرعی پیداوار سے عشر نہیں دیں گے نیز نماز نہیں پڑھیں گے، اس کے علاوہ ہمارے قبیلے کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو ہم پر حاکم نہیں بنایا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے تم جہاد کے لیے نہیں جاؤ گے، نہ ہی تم سے عشر لیا جائے گا اور تم پر تمہارے علاوہ کسی دوسرے شخص کو حکمران نہیں بنایا جائے گا لیکن نماز کے متعلق چھوٹ نہیں کیونکہ جس دین میں نماز نہیں اس میں خیر و برکت کا کوئی پہلو نہیں۔ [2]

بہر حال نمازوں کی ادائیگی میں کچھ تخفیف تو ہوسکتی ہے لیکن اس کی چھوٹ کے متعلق کوئی گنجائش نہیں۔ سوال میں جس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی تفصیل حضرت نصر بن عاصم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لیث قبیلے کا ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اپنے اسلام لانے کے لیے یہ شرط پیش کی کہ وہ صرف دو نمازیں پڑھے گا تو آپ نے اس کی شرط کو قبول کرلیا۔ [3]

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں نمازوں میں سے اگر دو پڑھ لی جائیں تو گزارہ ہوسکتا ہے حالانکہ مذکورہ بالا احادیث کے پیش نظر یہ مفہوم انتہائی محل نظر ہے، اس کے متعلق علما حدیث نے کئی ایک توجیہات پیش کی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① یہ اس وقت کی بات ہے جب نمازیں دو ہی فرض تھیں، لیکن اس توجیہ پر ہمارا دل مطمئن نہیں کیونکہ اگر دو نمازیں فرض تھیں تو اسے شرط لگانے کی ضرورت ہی نہ تھی

② ممکن ہے باجماعت دو نمازیں ادا کرنے کی شرط لگائی ہو کہ صبح اور عشا کی نماز باجماعت پڑھوں گا اور کاروباری مصروفیات کی

---

[1] مسند امام احمد، ص ۱۶۹، ج۲۔ [2] مسند احمد، ص ۲۱۸، ج۴۔ [3] مسند امام احمد، ص ۳۶۳، ج۵۔

وجہ سے باقی ظہر، عصر اور مغرب باجماعت نہیں پڑھ سکوں گا، لیکن یہ ایک احتمال ہے حدیث میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

④ رسول اللہ ﷺ کو اس امر کا یقین تھا کہ جب نماز کی لذت سے آشنا ہو گا تو خود بخود پانچوں نمازیں ادا کرنے پر مجبور ہو گا، اس لیے آپ نے اس کی شرط کو قبول کر لیا۔ اس قسم کی شرط قبول کرنا صرف رسول اللہ ﷺ کا خاصا ہے کسی دوسرے شخص کو یہ اختیار نہیں کہ نمازوں کے متعلق یہ موقف اختیار کرے، اس توجیہ پر ہمارا دل مطمئن ہے۔ بہر حال پانچوں نمازیں ادا کرنا ضروری ہیں اور اس میں کمی وبیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مذکورہ حدیث کو کمی بیشی کے لیے بطور دلیل پیش کرنا انتہائی محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا بازار میں نماز پڑھنا

سوال میں بعض اوقات سودا سلف لینے کے لیے بازار جاتی ہوں وہاں مجھے نماز کا وقت ہو جاتا ہے، اگر بازار میں مجھے نماز ادا کرنا پڑے تو عورت، بازار میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ قرآن وحدیث میں اس کے لیے کوئی ممانعت تو نہیں، وضاحت فرمائیں۔

جواب عورتوں کے لیے بہتر ہے کہ اپنے گھر میں نمازیں ادا کریں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنی عورتوں کو مساجد میں جانے سے منع نہ کرو اگرچہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔ [1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت کی اپنے گھر کے اندر نماز صحن میں پڑھی جانے والی نماز سے افضل ہے اور گھر کے اندرونی خاص کمرے میں نماز بیرونی کمرے میں ادا کی گئی نماز سے افضل ہے۔ [2]

غرض یہ ہے کہ عورت جس قدر ہو سکے پردے کا اہتمام کرے، ایک روایت میں ہے کہ وہ سادگی کی حالت میں باہر نکلیں۔ [3]

لیکن اگر بازار میں نماز ادا کرنے کی ضرورت پیش آجائے اور وہاں پردے اور سترے وغیرہ کا اہتمام ہو تو ایسے حالات میں عورت بازار میں نماز ادا کر سکتی ہے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کوئی ممانعت میری نظر سے نہیں گزری، تاہم افضل یہی ہے کہ وہ اپنے گھر میں باپردہ ہو کر نماز ادا کرے۔ (واللہ اعلم)

تین وتر پڑھنے کا طریقہ

سوال تین وتر پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟ قرآن وحدیث میں اس کی ادائیگی کس طرح منقول ہے، تفصیل سے وضاحت کریں۔

جواب تین وتر پڑھنے کے عام طور پر تین طریقے حسب ذیل ہیں:

① دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے پھر تیسری رکعت الگ سلام سے ادا کی جائے، اسے طریقہ ''فصل'' کہتے ہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق یہ افضل اور بہتر ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیتے تھے، اس کے بعد وتر (ایک رکعت) پڑھتے۔ [4]

---

[1] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۵۶۷۔ [2] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۵۷۰۔ [3] مسند امام احمد، ص ۴۳۸، ج ۲۔

[4] صحیح بخاری، الوتر: ۹۹۱۔

ایک مرفوع روایت میں بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو رکعت الگ پڑھتے اور ایک رکعت جدا ادا کرتے اور کبھی کبھی سلام کی آواز سنا بھی دیتے تھے۔ ❶

امام ابن حبان نے ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''رسول اللہ ﷺ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے اور ایک الگ پڑھتے۔''

② تین وتر ایک ہی سلام سے پڑھ لیے جائیں، یہ بھی جائز ہے، اس میں چنداں قباحت نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ تشہد نہیں بیٹھتے تھے۔ ❷

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے بھی یہ استنباط کیا گیا ہے جس میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ گیارہ رکعت پڑھتے، پہلے چار خوبصورت اور طویل ہوتیں، اسی طرح پھر چار رکعت پڑھتے، آخر میں تین رکعت پڑھتے تھے۔ ❸

③ تین اس طرح ادا ہوں کہ دو رکعت پڑھ کر سلام کے بغیر تشہد پڑھیں پھر اٹھ کر ایک رکعت پڑھیں اور دوسرے تشہد میں سلام پھیر دیں، لیکن یہ طریقہ کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ اگرچہ بعض اہل علم اور عوام الناس اس طرح تین وتر پڑھتے ہیں، بلکہ اس طرح پڑھنے سے ایک گونہ ممانعت ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین وتر پڑھتے وقت مغرب کی نماز سے مشابہت نہیں ہونا چاہیے۔ ❹

مغرب سے مشابہت نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ① اسے دو سلام کے ساتھ پڑھا جائے۔ ② ایک ہی تشہد کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ (واللہ اعلم)

وتر کی ایک رکعت پڑھنا

سوال ہمارے ہاں عام طور پر نماز عشا کے بعد وتر کی ایک رکعت پڑھی جاتی ہے، کیا کتاب وسنت سے ایک وتر پڑھنے کا ثبوت ہے، کیا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے یہ عمل ثابت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب رسول اللہ ﷺ سے وتر پڑھنے کی متعدد صورتیں کتب حدیث میں منقول ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وتر ایک رکعت پڑھی جاسکتی ہے، اس لیے جواز کی حد تک روزانہ ایک وتر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک وتر کا جواز بایں الفاظ ثابت ہے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ایک وتر پڑھنا چاہے وہ ایک وتر پڑھ سکتا ہے۔'' ❺

ہمارے ہاں ایک وتر پڑھنے کو اچھا خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ ابن ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک وتر پڑھا، اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''ان کے متعلق الجھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے ہیں۔'' ❻

---

❶ مسند امام احمد، ص ٧٦۔ ❷ سنن بیهقی، ص ٣١، ج٣۔ ❸ بخاری، التهجد: ١١٤٧۔
❹ مستدرك حاكم، ص ٣٠٤، ج١۔ ❺ ابو داؤد، وتر: ١٤٢٢۔ ❻ بخاری، الفضائل: ٣٧٦٤۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عمل بلا دلیل نہیں۔ چنانچہ ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ''وہ فقیہ ہیں۔'' ❶

یہ واقعہ عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ بھی بیان کرتے ہیں، ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''انھوں نے سنت پر عمل کیا ہے۔'' ❷

حضرت عبداللہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ جناب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ایک وتر پڑھتے دیکھا تھا۔ ❸

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ نماز عشا کے بعد وتر کی ایک رکعت پڑھتے تھے۔ ❹

ان احادیث و آثار کی روشنی میں عشاء کے بعد وتر کی ایک رکعت پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ کامل اتباع کا تقاضا ہے کہ وتر کی منقول ان تمام روایات پر عمل کیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وقتاً فوقتاً ثابت ہیں۔ (واللہ اعلم)

اذان دیتے وقت کانوں میں انگلیاں دینا

سوال کیا اذان دیتے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنا ضروری ہیں، اس کے متعلق احادیث میں کوئی صراحت ہو تو اس کا حوالہ دیں۔

جواب اذان دیتے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنا مستحب ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''اذان دیتے وقت اپنے کانوں میں انگلیاں داخل کرنا''

پھر انھوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے اذان دیتے وقت اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں داخل کیا تھا۔ ❺

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اذان دیتے وقت اپنی انگلیوں کو کانوں میں داخل کرے کیونکہ ایسا کرنا آواز کے اونچا ہونے کا باعث ہے۔ ❻

اگرچہ اس حدیث کی سند کمزور ہے تاہم دیگر روایات سے اس عمل کی تائید ہوتی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا ہے کہ وہ اذان دیتے وقت اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے۔ ❼

اگر کوئی مؤذن اذان دیتے وقت انگلیاں کانوں میں نہیں ڈالتا اور وہ صرف اپنے ہاتھ کانوں پر رکھتا ہے تو اس صورت میں بھی اذان دینا جائز ہے جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اذان دیتے وقت اپنی انگلیاں کانوں میں نہیں ڈالتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ وصف مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں متصل سند سے بیان ہوا ہے۔ ❽

---

❶ بخاری الفضائل: ۳۷٦۵۔ ❷ مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۲۲۹، ج ۳۔ ❸ بخاری، الدعوات: ٦۳۵٦۔
❹ مسند امام احمد، ص ۴۳۲، ج ۵۔ ❺ ترمذی، الصلوٰۃ، ۱۹۷۔ ❻ ابن ماجہ، الاذان: ۷۱۰۔
❼ بخاری، الاذان: قبل حدیث ٦۳۴۔ ❽ فتح الباری، ص ۱۵۰، ج ۲۔

امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل علم اس امر کو مستحب خیال کرتے ہیں کہ اذان دیتے وقت اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالی جائیں۔ [1]

بہر حال مستحب ہے کہ موذن اذان دیتے وقت اپنی شہادت کی دونوں انگلیاں دونوں کانوں میں رکھے۔ (واللہ اعلم)

قبل از وقت نماز ادا کرنا

سوال اگر قبل از وقت نماز پڑھ لی جائے تو کیا وقت آنے پر دوبارہ پڑھنا ہوگی یا پہلے سے پڑھی ہوئی نماز کافی ہوگی۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب شریعت نے نماز کے اوقات مقرر کیے ہیں، بلا وجہ اسے قبل از وقت ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بے شک نماز کا اہل ایمان پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔'' [2]

حدیث میں ہے کہ ظہر کا وقت سورج ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے۔ [3]

قرآنی آیت اور پیش کردہ حدیث کے مطابق اگر کسی نے وقت سے پہلے نماز ادا کی ہے تو اس سے فرض کی ادائیگی نہ ہوگی، البتہ اس نماز کو نفل شمار کیا جائے گا، یعنی اسے نفل کا ثواب مل جائے گا لیکن وقت ہونے کے بعد اسے دوبارہ ادا کرنا ہوگا، پہلی ادا شدہ نماز کافی نہ ہوگی۔ (واللہ اعلم)

فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنا

سوال نماز فجر سے پہلے جو دو رکعت سنت ادا کی جاتی ہیں، ان کے بعد کچھ لوگ دائیں پہلو پر لیٹتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

جواب نماز فجر سے پہلے دو رکعت سنت پڑھ کر لیٹنا مستحب امر ہے، آج کل یہ سنت متروک ہو چکی ہے، اس کا احیا ہونا چاہیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ جب مؤذن، اذان فجر دے کر خاموش ہو جاتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر ادا کرنے سے پہلے دو رکعت ادا کرتے پھر اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ [4]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ بھی بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سنت فجر پڑھ کر فارغ ہوتے تو اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ باتیں کرتے بصورت دیگر آپ دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ [5]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لیٹنا ضروری نہیں، جبکہ امام ابن حزم رحمہ اللہ اسے ضروری قرار دیتے ہیں، ان کا استدلال ایک حدیث پر ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لیٹنے کے متعلق امر وارد ہے لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اگر صحیح بھی ہو تو دوسرے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ترمذی، الصلوٰۃ، باب نمبر ۳۰۔ [2] النساء:۱۰۳۔ [3] صحیح بخاری، المواقیت:۵٤۱۔

[4] صحیح بخاری، اذان: ٦۲٦۔ [5] بخاری، التہجد، ۱۱٦۱۔

ظہر کی سنتیں

سوال اگر کوئی ظہر سے پہلے سنتیں نہیں پڑھ سکا تو کیا فرض نماز کے بعد انہیں ادا کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں ہماری قرآن وحدیث کے مطابق راہنمائی فرمائیں۔

جواب اگر بھول جائے یا سو جانے یا دیر سے آنے کی وجہ سے سنتیں رہ جائیں تو ان کی قضا ادا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا نماز کے وقت سو یا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے تو اس وقت پڑھ لے۔'' [1]

اس طرح اگر مصروفیت کی وجہ سے سنتیں رہ جائیں تو مصروفیت ختم ہونے کے بعد انہیں پڑھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ مصروفیت کی وجہ سے ظہر کے بعد والی دو سنتیں نہیں پڑھ سکے تھے تو آپ ﷺ نے عصر کے بعد مصروفیت کے اختتام پر انہیں ادا کیا تھا۔ [2]

ان احادیث کی روشنی میں اگر نماز ظہر سے پہلے والی سنتیں رہ جائیں تو انہیں نماز کے بعد ادا کیا جا سکتا ہے لیکن پہلے نماز ظہر کے بعد والی دو سنتیں پڑھی جائیں پھر ان کے بعد پہلی چار سنتیں ادا کی جائیں۔ (واللہ اعلم)

استخارہ کے بعد کوئی اشارہ ہونا

سوال میں بعض اوقات کسی کام کے لیے استخارہ کرتا ہوں تو خواب میں اس کے کرنے یا نہ کرنے کا کوئی اشارہ نہیں ہوتا، ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب استخارہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس کے بعد انسان سو جائے اور اسے خواب میں وہ کام کرنے یا نہ کرنے کا کوئی اشارہ ملے، یہ محض جہلاء کے ہاں ایک مفروضہ ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق کسی کام کے متعلق استخارے کے بعد اگر اسباب و وسائل مہیا ہو جائیں اور دل کا میلان بھی ادھر ہو تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے وہ کام کر لینا چاہیے، اسی طرح اگر کسی کے لیے مشورہ اور خوب سوچ بچار کی جائے اور اس میں دین و دنیا کی بھلائی اور مصلحت واضح ہو تو استخارے کے بعد اسے کر لینا چاہیے، خواب میں کسی قسم کے اشارے کا انتظار نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

سجدۂ سہو کے بعد تشہد

سوال کتب احادیث میں مروی کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ سہو کے بعد تشہد بھی پڑھنا چاہیے، پھر سلام پھیرا جائے، اس کے متعلق راجح قول کی نشاندہی کریں۔

جواب سجدہ سہو کے بعد تشہد پڑھنے کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے، اگر سلام سے پہلے سجدہ سہو کیا جائے تو جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ تشہد کا اعادہ نہ کیا جائے اور اگر سجدہ سہو سلام کے بعد ادا ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان

---

[1] صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۵۹۷۔ [2] صحیح بخاری، السہو:۱۲۳۳۔

ہے کہ تشہد کے بغیر ہی سلام پھیر دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے صحیح بخاری میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''شخص سجدہ سہو کے بعد تشہد نہیں پڑھتا۔'' ❶

پھر آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور جناب حسن بصری رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ وہ سجدہ سہو کے بعد تشہد نہیں پڑھتے تھے اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی سجدہ سہو کے بعد تشہد نہ پڑھنے کے قائل تھے۔ بہرحال کسی صحیح حدیث میں سجدہ سہو کے بعد تشہد پڑھنے کا ذکر نہیں اور جن روایات میں تشہد کا ذکر ہے وہ صحیح اور قابل حجت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مرفوع روایت بھی ذکر کی ہے جس میں سجدہ سہو کے بعد تشہد پڑھنے کا ذکر نہیں۔ ❷

اس حدیث کے بعد مسلمہ بن علقمہ کا بیان ہے کہ میں نے امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے عرض کی کہ کیا سجدہ سہو کے بعد تشہد ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث میں تشہد کا ذکر نہیں، لیکن اشعث بن عبدالملک کی روایت میں تشہد پڑھنے کا ذکر ہے۔ ❸

روایت میں اضافہ کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے شاذ قرار دیا ہے۔ ❹

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی تشہد پڑھنا آیا ہے۔ ❺

لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان ہر دو روایات کو ناقابلِ حجت کہا ہے۔ ❻

صحیح روایات میں سجدہ ہائے سہو کے بعد تشہد پڑھے بغیر سلام پھیرنے کا ذکر ہے لہٰذا اسی کو اختیار کرنا چاہیے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ ❼

سجدہ سہو سلام سے پہلے یا بعد میں

سوال نماز میں بھول چوک کی وجہ سے جو سجدہ سہو کیا جاتا ہے وہ سلام پھیرنے سے پہلے ہے یا بعد، اگر بعد میں ہے تو کیا دوبارہ سلام پھیرنا ہوگا، اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب شریعت کی اصطلاح میں سہو سے مراد دو سجدے ہیں جو دوران نماز بھول کر کمی بیشی کر دینے یا شک میں پڑ جانے کی صورت میں کیے جاتے ہیں، شرعی طور پر اس کے تین اسباب ہیں۔

① بھول کر نماز میں کمی کر دینا جیسے نماز ظہر میں چار رکعت کے بجائے دو پر سلام پھیر دیا جائے۔

② بھول کر نماز میں اضافہ کر دینا جیسے عصر کی نماز میں چار کے بجائے پانچ رکعت پڑھ دینا۔

③ دورانِ نماز شک وشبہ میں مبتلا ہو جانا کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار ادا کی ہیں۔

دوران نماز اس قسم کی غلطی معاف ہے تاہم سہو ونسیان کی وجہ سے ہونے والی غلطی کی تلافی کے لیے شریعت نے دو سجدہ ہائے

---

❶ بخاری، السهو باب نمبر ٤۔ ❷ بخاری، السهو:١٢٢٨۔ ❸ ابو داؤد الصلوٰة:٤٨٢۔
❹ ارواء الغليل، ص ١٣٠، ج٢۔ ❺ مسند امام احمد، ص ٤٢٨، ج١۔ ❻ فتح الباری، ص١٢٩، ج٣۔
❼ مجموع الفتاویٰ، ص ٤٨، ج٢٣۔

سہو کو مشروع قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک انسان تھے اور بحیثیت انسان وہ بھی دوران نماز بھول جاتے تھے جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے: ''میں بھی ایک انسان ہوں، تمہاری طرح بھول کا شکار ہو جاتا ہوں، اس لیے اگر میں دورانِ نماز بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دیا کرو۔'' ❶

رسول اللہ ﷺ عمر بھر دوران نماز پانچ مرتبہ بھول کا شکار ہوئے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اس امت کو مسائل سہو کے متعلق آگاہ فرمائیں، آپ کے بھول جانے کی تفصیل درج ذیل ہے۔

① نماز عصر میں چار رکعت کے بجائے دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ ❷

② نماز ظہر میں چار رکعت کے بجائے پانچ رکعت پڑھا دیں۔ ❸

③ نماز عصر میں تین رکعت پر سلام پھیر دیا۔ ❹

④ نماز مغرب میں دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ ❺

⑤ نماز ظہر میں درمیان والا تشہد پڑھے بغیر تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ❻

الغرض سجدہ سہو کے احکام انتہائی اہم ہیں، بعض حضرات ایسے مقام پر سجدہ سہو چھوڑ دیتے ہیں جہاں اس کا ادا کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ بعض دفعہ ایسی جگہ پر سجدہ سہو کر دیا جاتا ہے جہاں قطعاً اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (ہم نے اس کی تفصیل شرح بخاری میں ذکر کی ہے) صورت مسؤلہ میں بعض اوقات سجدہ سہو سلام سے پہلے کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات سلام پھیرنے کے بعد انہیں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اہل علم کے اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں، ہمارے رجحان کے مطابق سلام سے پہلے سجدہ کرنے کے دو مقام ہیں:

① جب دوران نماز کسی قسم کی کمی ہو جائے تو سجودِ سہو سلام سے پہلے ہوں گے تاکہ دوران نماز ہی اس کمی کی تلافی ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن بحینہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نماز ظہر کی دو رکعت میں بیٹھے بغیر ہی کھڑے ہو گئے، جب آپ اپنی نماز کو پورا کرنے کے قریب تھے تو دو سجدے کیے، اس کے بعد آپ نے سلام پھیرا۔ ❼

② جب دورانِ نماز تعداد رکعات کے متعلق شک پڑ جائے اور کوشش کے باوجود کسی جانب کا فیصلہ نہ ہو سکے پھر یقین پر بنیاد رکھتے ہوئے اگر نماز کو مکمل کیا جائے تو اس میں بھی سلام سے پہلے سجدہ سہو کیے جائیں جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو دورانِ نماز شک پڑ جائے، اسے معلوم نہ ہو کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار تو شک کو ایک طرف رکھ کر یقین پر بنیاد رکھے پھر سلام سے پہلے دو سجدے کرے۔'' ❽

یقین پر بنیاد رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تین یا چار کے متعلق شک ہے تو تین پر بنیاد رکھ کر نماز مکمل کی جائے کیونکہ تین یقینی ہیں اور شک چوتھی میں ہے کہ وہ پڑھی ہے یا نہیں؟

---

❶ بخاری، الصلوٰۃ، ۴۰۱۔ ❷ صحیح بخاری، السهو: ۱۲۲۹۔ ❸ صحیح بخاری، السهو: ۱۲۲۶۔
❹ صحیح مسلم، المساجد: ۱۲۹۳۔ ❺ صحیح بخاری، السهو: ۱۲۲۷۔ ❻ بخاری، السهو: ۱۲۲۶۔
❼ بخاری، السهو: ۱۲۲۵۔ ❽ صحیح مسلم، المساجد: ۵۷۱۔

سلام کے بعد سجدہ سہو کرنے کے تین مقام ہیں:

① اگر دوران نماز کسی قسم کا اضافہ ہو جائے مثلاً ظہر کی چار رکعت کے بجائے پانچ پڑھی جائیں تو سلام کے بعد دو سجدے کیے جائیں پھر دوبارہ سلام پھیرا جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ ظہر کی پانچ رکعات پڑھا دیں، عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! آیا نماز میں کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے؟ آپ نے پوچھا کیا مطلب؟ عرض کیا گیا کہ آپ نے پانچ رکعات پڑھی ہیں تو سلام پھیرنے کے بعد آپ نے دو سجدے کیے۔ ❶

ایک روایت میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سجدہ سہو کرنے کے بعد سلام پھیرا۔ ❷

اس حدیث کے مطابق حکم عام ہے، خواہ نماز میں اضافہ کا علم دوران نماز ہو یا سلام کے بعد، اس بنا پر مطلق طور پر اضافہ کی صورت میں سلام کے بعد سجدہ سہو کرنا مناسب ہے۔

☆ نماز کا کچھ حصہ ابھی باقی تھا کہ سلام پھیر دیا، اس صورت میں باقی ماندہ حصے کو ادا کرنے کے بعد سلام پھیر دیا جائے، پھر دو سجدے بطور سہو کیے جائیں، اس کے بعد سلام پھیرا جائے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ظہر یا عصر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا، یاد دلانے کے بعد آپ نے بقیہ نماز ادا کی اور سلام پھیرا، پھر دو سجدے سہو کیے۔ بعض اوقات حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا جاتا کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تھا؟ تو جواب دیتے کہ مجھے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ نے سلام پھیرا تھا۔'' ❸

☆ اگر دوران نماز تعداد رکعات کے متعلق شک پڑ جائے تو پھر کوشش و تحری سے ایک جانب رجحان ہو جائے تو اس صورت میں بھی سلام کے بعد ہی سجدہ سہو کرنا ہو گا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو وہ درستگی کی کوشش کرے پھر اپنی راجح کوشش کے مطابق اپنی نماز پوری کرے، اس کے بعد سلام پھیر کر آخر میں دو سجدے کرے۔'' ❹

اگر دوران نماز دو سہو اس طرح ہو جائیں کہ ایک سہو کا تقاضا سلام سے پہلے سجدہ سہو کرنے کا ہو جبکہ دوسرے کا تقاضا سلام کے بعد سجدہ سہو کرنے کا ہو تو سلام سے پہلے ہی دو سجدے کر لیے جائیں پھر سلام پھیرا جائے مثلاً ایک شخص نماز ظہر ادا کرتے ہوئے دوسری رکعت میں تشہد بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا جبکہ اس نے اسے دوسری رکعت خیال کیا پھر اسے کوشش کے بعد یاد آیا کہ یہ تیسری رکعت ہے اس کے بعد وہ تشہد بیٹھے پھر ایک رکعت پڑھ کر دوسرا تشہد پڑھے اس صورت میں سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دے ایسی صورت میں نماز میں سلام سے پہلے سجدہ سہو کرنے کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ بھی یاد رہے کہ سجدہ سہو کے بعد تشہد پڑھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

---

❶ بخاری، السھو: ۱۲۲۶۔ ❷ بخاری، الصلوٰۃ: ۴۰۱۔ ❸ بخاری، الصلوٰۃ: ۴۸۲۔

❹ صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۰۱۔

صلوۃ حاجت

سوال نماز حاجت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس سلسلہ میں کوئی حدیث مروی ہے تو اس کی اسنادی حیثیت کیا ہے؟

جواب شریعت میں ''نماز حاجت'' نامی کوئی نماز مشروع نہیں، اس قسم کی عبادات کے لیے شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے جو ہمیں تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکی۔ البتہ ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''جس شخص کو اللہ سے یا مخلوق میں سے کسی کے ساتھ کوئی حاجت وابستہ ہو تو اسے چاہیے کہ وضو کر کے دو رکعت پڑھے پھر ایک دعا پڑھے: آخر میں اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی جو حاجت چاہے مانگ لے، اس کی قسمت میں وہ چیز ہو جائے گی۔ [1]

ہاں کسی پریشانی کے وقت نماز پڑھنا مشروع ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی غم یا پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز پڑھنے لگتے۔ [2]

لیکن یہ نماز کسی خاص وقت نہیں بلکہ مکروہ اوقات کے علاوہ ہر وقت پڑھی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس موقع پر کوئی مخصوص دعا منقول ہے۔ (واللہ اعلم)

بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال کیا کسی بدعتی کو امام بنایا جا سکتا ہے، ایسا امام جو اہل سنت کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنے کی کیا حیثیت ہے؟

جواب امام بخاری نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''فتنہ گر اور بدعتی کی امامت۔'' [3]

پھر آپ نے امام حسن بصری رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے کہ تم بدعتی کے پیچھے نماز پڑھو، اس کی بدعت کا وبال خود اسی پر ہوگا۔ [4]

دراصل بدعت کی دو اقسام ہیں: ایک بدعت یہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے سے انسان دائرہ اسلام سے ہی خارج ہو جاتا ہے، اسے بدعت مکفرہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی بدعت کا ارتکاب حرام اور ایسے بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں۔ دوسری بدعت یہ ہے کہ اس کے ارتکاب سے انسان دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا البتہ فاسق و فاجر ضرور قرار پاتا ہے۔ ایسے بدعتی کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے لیکن اس قسم کے بدعتی کو بھی مستقل امام بنانا صحیح نہیں۔

نوٹ: عرصہ ہوا، اس سلسلہ میں ہمارے دیرینہ دوست اور مہربان حضرت پروفیسر علامہ محمد حسین آزاد نے عرب کے مستند اور معروف علماء کبار کا ایک فتویٰ ارسال کیا تھا تاکہ اسے ''اہل حدیث'' میں شائع کیا جائے۔ سوال کی مناسبت سے ہم اس کا ترجمہ قارئین کی نذر کرتے ہیں: ''جس شخص کے متعلق ہمارا فیصلہ ہے کہ وہ مسلمان ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا بھی صحیح ہے اور جو مسلمان نہیں، اس کی اقتدا میں نماز ادا کرنا بھی جائز نہیں۔ اس بات کو اکثر اہل علم نے اختیار کیا ہے اور جن حضرات نے کہا ہے کہ کسی بھی

---

[1] ابن ماجه، اقامة الصلوٰة: ١٣٧٤۔ [2] ابو داؤد، قيام الليل، ١٣١٩۔ [3] بخاری، الاذان، باب نمبر ٥٥۔
[4] صحيح بخاری، حواله مذكور۔

نافرمان اور گنہگار کی اقتدا میں نماز صحیح نہیں ان کا موقف مرجوح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے امراوقت کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اور امراوقت کی اکثریت نافرمان ہی ہوتی ہے اس کے علاوہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھتے تھے حالانکہ وہ بہت بڑا ظالم تھا، اس بنا پر بدعتی اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کی بدعت اور اس کا فسق اسے دائرہ اسلام سے خارج نہ کردے۔'' (واللہ اعلم)

بے وضو اذان دینا

سوال ہماری مسجد میں جو مؤذن تعینات ہے وہ ہمیشہ بے وضو اذان دیتا ہے حالانکہ مسجد میں پانی کی سہولت موجود ہے لیکن وہ اذان کے بعد وضو کرتا ہے، کیا وضو کے بغیر اذان کہی جاسکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی رشنی میں جواب دیں۔

جواب بلاشبہ اذان اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ وہ اللہ کا ذکر طہارت کی حالت میں کرتے تھے جیسا کہ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کہا تو آپ نے جب تک وضو نہ کرلیا سلام کا جواب نہ دیا پھر آپ نے میرے سامنے یہ عذر پیش کیا: ''مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں اللہ کا ذکر طہارت کے بغیر کروں۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام کا جواب وضو کرنے کے بعد دیا، اس لیے بہتر ہے کہ اذان بھی باوضو ہو کردی جائے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وضو کے بغیر اذان دینا صحیح نہیں اور جو شخص وضو کے بغیر اذان دے گا، اس کی اذان قبول نہیں ہوگی۔ اگرچہ اس سلسلہ میں ایک حدیث بیان کی جاتی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اذان صرف باوضو شخص ہی دے۔'' [2]

لیکن یہ روایت محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتی کیونکہ اس میں معاویہ بن یحییٰ الصدفی نامی راوی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے متصل سند کے ساتھ اس روایت کو موقوف بیان کیا ہے یعنی یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ [3]

لیکن یہ موقوف روایت بھی منقطع ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ روایت مرفوع اور موقوف کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں۔'' [4]

اس سلسلہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ بے وضو اذان دینے کی عادت بنانا کسی طور پر درست نہیں جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے۔ لیکن اگر کبھی کبھار کسی مجبوری کے پیش نظر بے وضو اذان کہہ دی جائے تو اذان صحیح ہے اور ایسی حالت میں مؤذن کسی حرام امر کا مرتکب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اذان کو وضو سے مشروط کرنے کی کوئی دلیل قرآن وحدیث میں موجود نہیں، اگرچہ افضل یہی ہے کہ انسان باوضو ہوکر اذان دے۔ (واللہ اعلم)

بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال ایک حادثہ میں میری ٹانگ ٹوٹ گئی، اس پر پلستر چڑھا دیا گیا ہے، اس بنا پر میں کھڑا نہیں ہوسکتا، اب میرے لیے نماز کے متعلق کیا حکم ہے؟

---

[1] ابو داؤد، الطهارة: ۱۷۔ [2] بیهقی، ص ۳۹۷، ج ۱۔ [3] ترمذی، الطهارة: ۲۰۱۔
[4] ارواء الغلیل، ص ۲۴۰، ج ۱۔

جواب قیام پر قدرت کی صورت میں فرض نماز کھڑے ہو کر پڑھنا ضروری ہے، تندرست آدمی کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنا بہتر نہیں، ہاں اگر کوئی بیماری کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہیں تو اسے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، جیسا کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بواسیر کے مریض تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا تھا: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لو اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھ لو۔ [1]

صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص کسی لاٹھی یا دیوار کے سہارے کھڑا ہو سکتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے اور اگر کھڑے ہونے کی استطاعت نہیں یا ٹانگ کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے اور امید ہے کہ اللہ کے ہاں اس کا پورا اجر دیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

عورت کا فرض نماز پڑھانا

سوال کیا عورت گھر میں فرض نماز پڑھا سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں کوئی صریح نص ہو تو اس کا حوالہ دیں۔

جواب عورت کو اذان یا اقامت کہنے کی اجازت نہیں تاہم وہ جماعت کرا سکتی ہے اور جماعت کراتے وقت وہ عورتوں کے درمیان میں کھڑی ہو گی اور صرف عورتوں کی جماعت کرائے گی، مرد حضرات اس میں شامل نہیں ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور آپ نے ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرائے۔ [2]

ایک روایت میں وضاحت ہے کہ وہ اپنے گھر کی خواتین کو نماز باجماعت پڑھاتی تھیں، مرد حضرات اس میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ [3]

ایک دوسری روایت میں فرض نماز پڑھانے کی صراحت ہے، چنانچہ الفاظ یہ ہیں: ''آپ نے انہیں اجازت دی تھی کہ ان کے لیے اذان دی جائے اور وہ اپنے اہل خانہ کی فرض نماز میں امامت کرائیں کیونکہ وہ قرآن کی حافظہ تھیں۔'' [4]

ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بھی احادیث میں ہے کہ وہ عورتوں کی امامت کراتی تھیں، چنانچہ حضرت ریطہ حنفیہ بیان کرتی ہیں کہ ہمیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نماز کی امامت کرائی اور ہمارے درمیان صف میں کھڑی ہوئی تھیں۔ [5]

اسی طرح حضرت حجیرہ بنت حصین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی تو وہ ہمارے درمیان کھڑی ہوئیں۔ [6]

---

[1] صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ: ۱۱۱۷۔ [2] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۵۹۶۔

[3] التعلیق المغنی علی الدار قطنی: ص ۴۰۴، ج ۱۔ [4] صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر ۱۶۷۶: ۲، ج ۳۔

[5] دار قطنی، ص ۴۰۴، ج ۱۔ [6] بیہقی، ص ۱۳۰، ج ۳۔

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے ان احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''عورت، خواتین کی فرض نماز میں امامت کرا سکتی ہے۔'' ❶

ان احادیث و آثار کے پیش نظر عورت فرض نماز کی جماعت کرا سکتی ہے لیکن اُسے مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا ہوگا۔

① وہ صرف خواتین کی جماعت کرائے، مرد حضرات اس میں شامل نہ ہوں۔

② وہ دیگر خواتین کے ساتھ صف کے درمیان میں کھڑی ہو، ان کے آگے کھڑی نہ ہو۔

③ وہ فرض اور نوافل دونوں قسم کی امامت کرا سکتی ہے، فرض نماز پڑھانے کی صراحت درج بالا احادیث میں موجود ہے۔ (واللہ اعلم)

بوجہ نیند نماز دیر سے پڑھنا

سوال گھر میں اکثر اوقات نیند کی وجہ سے میری نماز عشاء فوت ہو جاتی ہے، میں فوت شدہ نماز کی قضا دوسرے دن صبح کے وقت یا اس کے بعد کسی بھی وقت دے دیتی ہوں، کیا شرعی طور پر اسے عادت بنا لینا جائز ہے؟ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب نماز کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ اسے بروقت ادا کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بلا شبہ اہل ایمان پر مقررہ اوقات میں نماز کا ادا کرنا فرض ہے۔'' ❷

اس بنا پر نماز میں اس قدر سستی کرنا کہ اس کا وقت ہی نکل جائے کسی کے لیے جائز نہیں۔ اگر بعض اوقات ایسا ہو جائے تو قابل معافی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم میں سے کوئی نماز بھول جائے یا سو یا رہ جائے تو جب اسے یاد آئے وہ نماز پڑھ لے۔'' ❸ ایک روایت میں ہے کہ اس کا کفارہ صرف یہی ہے کہ اسے پڑھ لیا جائے۔ ❹

صورت مسئولہ میں اگر کوئی سو رہا ہے تو کسی دوسرے کی ڈیوٹی لگا دے جو اسے بیدار کر دے تاکہ نماز کی ادائیگی بروقت ہو، عشا کی نماز کی ادائیگی بروقت اور عشا کی نماز صبح تک لیٹ کرنا اور اسے بطور عادت اختیار کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی شدید عارضہ ہو یا کسی پر نیند کا غلبہ ہو یا کبھی کبھار ایسا ہو جائے تو قابل معافی ہے جیسا کہ حدیث کے حوالے سے ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ (واللہ اعلم)

تحیۃ المسجد

سوال کچھ لوگ مسجد میں آتے ہیں تو جماعت کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں، کیا اس طرح تحیۃ المسجد کی دو رکعات ترک کر دینا جائز ہے؟

جواب تحیۃ المسجد کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی مسجد میں آئے تو دو رکعت ادا کیے بغیر نہ بیٹھے، اس حدیث کے پیشِ نظر نمازی کو تحیۃ المسجد ادا کرنا چاہیے، اگر اس نے جماعت سے پہلے سنت وغیرہ پڑھ لی ہے تو تحیۃ المسجد اس سے

---

❶ ابن خزیمہ، الصلوٰۃ، باب نمبر ۱٦۸۔ ❷ النساء:۱۰۳۔ ❸ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۱۵٦۹۔

❹ صحیح بخاری، مواقیت الصلوٰۃ:۵۹۷۔

ادا ہو جائے گا، اگر جماعت کے لیے تھوڑا سا وقت باقی ہو کہ اس میں تحیۃ المسجد ادا نہ کی جا سکتی ہو تو مسجد میں آکر کھڑے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر معلوم نہ ہو کہ امام کب آئے گا تو تحیۃ المسجد شروع کر دے پھر اگر امام آ جائے اور جماعت کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو تحیۃ المسجد کو ختم کر کے جماعت میں شامل ہو جائے بصورت دیگر اسے پورا کرے۔ بہر حال مسجد میں آنے کے بعد اگر دو رکعت ادا کرنے کا وقت ہو تو کھڑے رہنا اچھا نہیں، بہتر ہے وہ دو رکعت پڑھ کر باوقار طریقہ سے بیٹھ جائے۔ (واللہ اعلم)

ننگے سر سجدہ تلاوت

سوال میں اپنے گھر میں قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہوں، بعض اوقات سجدہ تلاوت آ جاتا ہے تو کیا سجدہ تلاوت کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے یا یہ بھی لازمی ہے کہ سجدہ تلاوت کے وقت میرا سر ڈھکا ہوا ہو، وضاحت فرمادیں۔

جواب درج ذیل حدیث سے سجدہ تلاوت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب ابن آدم کسی آیتِ سجدہ کی تلاوت کرتا ہے اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا دور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے میری ہلاکت! ابن آدم کو سجدے کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کر لیا، اس لیے اسے جنت ملے گی اور مجھے سجدے کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کر دیا، اس لیے میرے لیے جہنم ہے۔ [1]

اس حدیث سے سجدہ تلاوت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، حتیٰ کہ یہ سجدہ ممنوع اوقات میں بھی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ سجدہ تلاوت کا ایک سبب ہے اور سبب والی ہر نماز ممنوعہ اوقات میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ راجح مسلک کے مطابق سجدہ تلاوت کے لیے نماز کا حکم نہیں چنانچہ اسے وضو کے بغیر بھی ادا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ وہ بغیر وضو کے سجدہ تلاوت کر لیتے تھے۔ [2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے کہ سجدہ تلاوت کے لیے نماز کی شروط نہیں ہیں۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۂ نجم کی تلاوت کرتے ہوئے آیت سجدہ پر سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے بھی سجدہ کیا۔ [3]

حالانکہ مشرک پلید ہے اور اس کا وضو بھی نہیں ہوتا، بہر حال سجدہ تلاوت کے لیے باوضو ہونا ضروری نہیں۔ اس طرح گھر میں تلاوت کرتے وقت اگر کسی عورت کا سر ننگا ہو گیا تو اسی حالت میں سجدہ کیا جا سکتا ہے، اس میں چنداں حرج نہیں اگرچہ بہتر اور افضل ہے کہ سر ڈھانپ کر سجدہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

نماز کے لیے امام کی صفات

سوال نماز کے لیے کس قسم کے شخص کو امام بنایا جائے، نیز جب اصل امام موجود نہ ہو تو کیا کوئی بھی دوسرا آدمی جماعت کرا سکتا ہے یا کسی خاص صفات کے حامل شخص کو امام بنانا چاہیے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

---

[1] مسلم، الایمان: ٢٤٤۔ [2] صحیح بخاری، سجود القرآن: قبل حدیث نمبر ١٠٧١۔

[3] صحیح بخاری، سجود القرآن: ١٠٧١۔

جواب نماز کو دین اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس کی جماعت کے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو کم از کم تین بنیادی صفات کا حامل ہو جو حسب ذیل ہیں۔

① اس کا عقیدہ صحیح اور قرآن و حدیث کے مطابق ہو، کیونکہ مشرک اور کافر کے پیچھے نماز پڑھنا شرعاً جائز نہیں۔ مشرکین اور کفار کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہم ان کے اعمال کا جائزہ لینے کے لیے آئیں تو انہیں بکھرے ہوئے غبار کی طرح بنا دیں۔'' [1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرکین اور کفار کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوگا، نماز جیسا اہم عمل کیسے قبول کیا جائے گا، لہٰذا امام کو صحیح العقیدہ ہونا چاہیے۔

② قرآن کریم اسے زیادہ یاد ہو اور مخارج وصفات کی خوب رعایت کرنے والا ہو، وہ قرآن کریم کی صحیح لب و لہجے سے تلاوت کرتا ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''لوگوں کی امامت وہ شخص کرائے جو کتاب اللہ کو زیادہ پڑھنے والا ہو اور اگر قرأت میں برابر ہوں تو ایسا شخص امامت کرائے جو سنت کا زیادہ علم رکھتا ہو۔'' [2]

③ وہ اچھے اخلاق اور صفات ستھرے کردار کا حامل ہو یعنی وہ لوگوں کو مانوس کرنے والا ہو اور متنفر کرنے والا نہ ہو۔ کیونکہ اگر کوئی بد اخلاق ہے اور لوگ اس سے بیزار ہیں تو اس کی اپنی نماز محل نظر ہے چہ جائیکہ وہ امامت کا اہل ہو۔ حدیث میں ہے کہ تین آدمیوں کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے: پہلا وہ شخص جو امامت کے لیے کسی قوم کے آگے بڑھے لیکن لوگ اسے ناپسند کرتے ہوں۔ [3]

اگر مقررہ امام موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کرنا چاہیے، اگر وہ دستیاب نہ ہو تو حاضرین میں سے امامت کے فرائض وہ شخص ادا کرے جسے قرآن زیادہ یاد ہو اور وہ مخارج وصفات کا خیال رکھتے ہوئے قرآن کی تلاوت کرتا ہو۔ لیکن امام راتب موجود ہے تو اسے ہی جماعت کرانی چاہیے، اگرچہ حاضرین میں کچھ افراد اس سے زیادہ قرآن یاد رکھتے ہوں۔ ایسے حالات میں امامت وہی کرائے جو اس کے لیے تعینات ہے، قرآن و حدیث کے متعدد دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

تیسری اور چوتھی رکعت میں فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت پڑھنا

سوال پہلی اور دوسری رکعت میں فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت پڑھنا احادیث سے ثابت ہے، کیا تیسری اور چوتھی رکعت میں فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت پڑھی جاسکتی ہے یا صرف قرأت فاتحہ پر اکتفا کرنا ہے۔

جواب رسول اللہ ﷺ دورانِ نماز سورۃ فاتحہ کے ساتھ مزید قرآن کریم کی کچھ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ جس کا ثبوت کتب حدیث میں مروی متعدد احادیث سے ملتا ہے، ظہر، عصر اور عشاء کی تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھنا بھی جائز ہے، اس کا ثبوت احادیث میں موجود ہے۔

---

[1] الفرقان: ۲۳۔ [2] صحیح مسلم، المساجد: ۶۷۳۔ [3] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ۵۹۳۔

چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعات میں سے ہر رکعت میں تیس (۳۰) آیات کے برابر قراءت کرتے اور دوسری دو رکعت میں پندرہ آیات کے برابر اور عصر کی پہلی دو رکعات میں سے ہر رکعت میں پندرہ آیات کے برابر قراءت کرتے اور دوسری دو رکعات میں اس سے نصف کے بقدر قراءت کرتے تھے۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی بھی دوسری سورت پڑھی جا سکتی ہے، اگرچہ سورۃ فاتحہ پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی تاہم اس کے ساتھ کوئی دوسری سورت بھی ملائی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

آیتِ سجدہ سننے سے سجدہ کرنا

سوال بعض دفعہ مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر جماعت ہوتی ہے، امام سجدہ کی آیت پڑھتا ہے، بازار میں کسی کے کام میں اچانک آیت سجدہ پڑ جاتی ہے جبکہ اس کا سننے کا ارادہ نہیں ہوتا، کیا محض سننے سے ہی سجدہ لازم ہو جاتا ہے؟

جواب سجدہ تلاوت مشروع ہے لیکن جو شخص قرآن سننے کے لیے فارغ ہوا اور اسے بغور سنے، اسے چاہیے کہ پڑھنے والے کی طرح سجدہ کرے، اگر کوئی شخص قرآن مجید سننے کی نیت سے نہیں بیٹھا بلکہ اچانک اس کے کان میں آیت سجدہ پڑ گئی تو اس کے لیے سجدہ تلاوت ضروری نہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو آیت سجدہ تلاوت کر رہا تھا تو آپ نے سجدہ نہ کیا اور فرمایا کہ سجدہ اسے کرنا چاہیے جو آیت سجدہ کو غور سے سنتا ہے پھر آپ وہاں سے گزر گئے اور سجدہ نہ کیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے درج ذیل الفاظ سند کے بغیر بیان کیے ہیں: ((انما السجدة على من استمعها)) [2]

سجدہ اسے کرنا چاہیے جو آیت سجدہ کو غور سے سنتا ہے، مذکورہ واقعہ کی تفصیل حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔ [3]

البتہ کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ سجدہ تلاوت پڑھنے والے اور سننے والے دونوں پر ضروری ہے، وہ دلیل کے طور پر یہ موقوف روایت پیش کرتے ہیں، ''جس نے سجدے کی آیت سنی اور جس نے تلاوت کی، ان دونوں پر سجدہ لازم ہے۔''

فقہائے احناف اس روایت کو پیش کرتے ہیں، علامہ زیلعی نے لکھا ہے کہ یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں مروی نہیں۔ (واللہ اعلم)

تسبیح کا استعمال

سوال نماز کے بعد اذکار مسنونہ کرنے کے لیے تسبیح کا استعمال شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، ہمارے ہاں کچھ حضرات اسے بدعت کہتے ہیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب نماز کے بعد جو اذکار کیے جاتے ہیں، ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں کہ تسبیح کو استعمال کرنے کی ضرورت پڑے،

---

[1] مسند احمد، ص ۲، ج ۳۔ [2] بخاری، سجود، القرآن، باب نمبر ۱۰۔ [3] فتح الباری، ص ۷۲۰، ج ۲۔

زیادہ سے زیادہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کو تینتیس (۳۳) مرتبہ پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے، ہاتھ کی گرہوں پر آسانی سے اس عمل کو کیا جاسکتا ہے تاہم اگر کسی کی یاداشت کمزور ہے تو تسبیح استعمال کرنے میں چنداں حرج بھی نہیں۔

بہر حال جواز کی حد تک اس کے استعمال کو گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن اسے بدعت کہنا سینہ زوری ہے۔ افضل یہ ہے کہ اس قسم کے اذکار مسنونہ کو انگلیوں اور ان کے پوروں پر کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''انگلیوں کے پوروں کے ساتھ گرہ لگاؤ کیونکہ قیامت کے دن ان سے سوال کیا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا۔'' [1]

ہاتھ میں تسبیح پکڑنے کی صورت میں ریاکاری کا بھی اندیشہ ہے، اس کے علاوہ تسبیح کے ساتھ ذکر کرنے والا اکثر و بیشتر حضور قلب سے کام نہیں لیتا جو ذکر کی روح ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف وہ تسبیح پھیر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف دائیں بائیں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو ہاتھ سے تسبیح کرتے وقت زبان سے باتوں میں مصروف رہتے ہیں۔

لہٰذا ہمارے نزدیک افضل اور بہتر ہے کہ تسبیح کے بجائے انگلیوں اور ان کے پوروں پر ذکر کیا جائے۔ چونکہ تسبیح کا استعمال سہولت کے پیش نظر ہوتا ہے، اس کا تعلق قطعی طور پر عبادت سے نہیں لہٰذا اسے بدعت کہنے سے اجتناب کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

نماز میں چھینک کا جواب دینا

سوال اگر کسی نمازی کو دوران نماز چھینک آجائے تو کیا وہ ''الحمد للہ'' کہہ سکتا ہے نیز ساتھ والا شخص اس کی چھینک کا جواب دے سکتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب دوران نماز اگر کسی کو چھینک آجائے تو خاموشی سے آہستہ آواز کے ساتھ الحمد للہ کہہ سکتا ہے جیسا کہ حضرت رفاعہ بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کی، مجھے دوران نماز چھینک آئی تو میں نے یوں کہا: ''الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه مباركا عليه كما يحب ربنا و يرضى''

رسول اللہ ﷺ جب سلام پھیر کر نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: ''نماز میں گفتگو کس نے کی تھی؟''

آپ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا جو ان کلمات کو لینے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے تھے۔'' [2]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بعد وضاحت کی ہے کہ چھینک مارنے والا آہستہ سے ان کلمات کو ادا کر سکتا ہے اس میں زیادہ وسعت سے کام نہ لیا جائے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث دوران نماز چھینک مارنے کے لیے الحمد للہ کہنے پر دلالت کرتی ہے، اس کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھ رہا تھا اس دوران کسی دوسرے آدمی کو چھینک آگئی تو اس نے الحمد للہ کہا، میں نے باآواز بلند اس کا جواب ''یرحمک اللہ'' سے دے دیا، رسول اللہ ﷺ نے بڑے اچھے انداز سے مجھے سمجھاتے ہوئے فرمایا:

---

[1] مسند امام احمد، ص ۳۷۱، ج۶۔ [2] ترمذی، الصلوٰۃ: ۴۰۴۔

''یہ نماز ہے، اس میں لوگوں کی سی عام گفتگو جائز نہیں، اس میں تسبیح ہوتی ہے، تکبیر ہوتی ہے اور قرآن مجید پڑھا جاتا ہے۔'' ❶

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چھینک مارنے والا الحمدللہ کہہ سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کچھ نہیں کہا۔ البتہ نماز میں چھینک کا جواب دینا جائز نہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ سے صراحت کے ساتھ فرمایا: ''بہرحال دورانِ نماز چھینک مارنے والا اگر آہستہ سے الحمدللہ کہہ لے تو جائز ہے لیکن نماز میں چھینک کا جواب دینا درست نہیں۔ (واللہ اعلم)

اقامت کے باوجود اپنی نماز جاری رکھنا

سوال عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب موذن، فرض نماز کے لیے اقامت کہتا ہے تو کچھ نمازی اپنی نماز جاری رکھتے ہیں اور اسے مختصر کر کے جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب جب موذن، فرض نماز کے لیے اقامت شروع کر دے تو پھر کسی کے لیے کوئی دوسری نماز الگ طور پر پڑھنے کی اجازت نہیں، بلکہ اسے اپنی نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب نماز کی اقامت کہی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی۔'' ❷

ایک روایت میں ہے: ''پھر کوئی نماز نہیں ہوتی سوائے اس نماز کے جس کی اقامت کہی گئی ہو۔'' ❸

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ فرض نماز کی اقامت سن کر دوسری کوئی نماز نہ شروع کی جائے بلکہ اگر کوئی نماز میں مشغول ہو تو اسے توڑ کر اُس نماز میں شامل ہو جائے جس کی اقامت کہی گئی ہے۔ نمازی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے مختصر کر کے جلدی جلدی ادا کرے بلکہ اسے چاہیے کہ اقامت کے ہوتے ہی سنت یا نفل کو ختم کر کے جماعت میں شامل ہو جائے اور اپنی سنتیں بعد میں ادا کرے۔ کیونکہ اقامت کے بعد پڑھی جانے والی نماز کا وجود شرعی طور پر منفی ہے جیسا کہ حدیث میں اس امر کی صراحت ہے، اس سلسلہ میں امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اقامت کے بعد نفل نماز کو چھوڑ کر امام کے ساتھ شامل ہونے میں یہ حکمت ہے کہ انسان شروع ہی سے فرض نماز کے لیے فارغ ہو کر امام کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے، فرض نماز کی محافظت، نفل نماز میں مشغول ہونے سے بہتر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے امام کے ساتھ اختلاف کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اسے تکبیر تحریمہ حاصل ہو جاتی ہے اور امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ میں شامل ہونے سے اس کا مخصوص اجر وثواب ملتا ہے۔'' ❹

بہرحال اقامت کے شروع ہوتے ہی اپنی نماز کو ختم کر کے جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے، اپنی جاری کردہ نماز کو مختصر کر کے جلدی جلدی مکمل کرنے کی شرعاً اجازت نہیں۔ (واللہ اعلم)

---

❶ مسلم، المساجد: ۵۳۷۔ ❷ مسلم، صلاۃ المسافرین: ۷۱۰۔ ❸ مسند امام احمد، ص ۳۵۲، ج ۲۔
❹ شرح نووی، ص ۲۱۵، ج ۵۔

اذان سننے کے باوجود دکان پر نماز پڑھنا

سوال میں ایک دکان پر ملازم ہوں، ہماری دکان کے نزدیک ہی ایک مسجد ہے، جس کی اذان ہمیں سنائی دیتی ہے، لیکن ہمارا مالک کہتا ہے کہ تم دکان پر ہی نماز پڑھ لو کیونکہ گاہکوں کا ہجوم ہے، کیا ایسے حالات میں دوکان پر نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کا وصف بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد، اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔'' [1]

اس قرآنی ہدایت کے مطابق مالک دکان اور ملازمین کو چاہیے کہ اذان سننے کے بعد اپنے کاروبار کو ترک کر کے نماز با جماعت مسجد میں ادا کریں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا واجب ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو شخص اذان کی آواز سننے کے باوجود نماز کے لیے نہ آئے تو اس کی نماز نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اس کے پاس کوئی شرعی عذر ہو۔'' [2]

دکان پر گاہکوں کی آمد و رفت کوئی شرعی عذر نہیں جس کے لیے نماز با جماعت کو ترک کر دیا جائے۔ بلکہ ایک حدیث میں مزید صراحت ہے کہ نابینا آدمی کو بھی گھر میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا صحابی، رسول اللہ ﷺ کے گھر آئے اور گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے پوچھا کیا تم اذان کی آواز سنتے ہو؟ عرض کیا جی ہاں، آپ نے فرمایا: پھر تم مسجد میں آ کر نماز ادا کیا کرو۔ [3]

ان احادیث سے نماز با جماعت کے واجب ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ملازمین کو چاہیے کہ اذان سننے کے بعد اپنا کاروبار جاری رکھنے کے بجائے وہ مسجد میں آئیں اور نماز با جماعت ادا کریں۔ (واللہ اعلم)

صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہنا

سوال لوگوں میں مشہور ہے کہ صبح کی اذان میں جو الصلوٰۃ خیر من النوم کہا جاتا ہے، یہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں بلکہ ان الفاظ کا اضافہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، اس میں کہاں تک صداقت ہے، وضاحت فرمائیں۔

جواب دین اسلام رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی مکمل ہو چکا تھا، لہٰذا دین اسلام کا کوئی حصہ بھی آپ کے بعد مکمل نہیں ہوا۔ صورت مسئولہ میں الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ بھی رسول اللہ ﷺ کے تجویز کردہ ہیں جو آپ نے اذان فجر میں کہلائے تھے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''سنت میں سے ہے کہ جب مؤذن، اذان فجر میں حی علی الفلاح کہے تو **الصلوٰۃ خیر من النوم** دو دفعہ کہے۔ [4]

واضح رہے کہ جب کوئی صحابی سنت کا لفظ استعمال کرے جیسا کہ مذکورہ روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کیا ہے تو اس سے مراد مرفوع حدیث ہوتی ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت

---

[1] النور: ٣٧۔ [2] ابن ماجه، الصلوٰة: ٧٩٣۔ [3] صحيح مسلم، الصلوٰة: ٦٥٣۔

[4] بيهقي: ص٤٢٣، ج١۔

ہے، یہ اضافہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اذان سکھائی۔ اس روایت میں بھی صراحت ہے کہ **الصلوٰۃ خیر من النوم، الصلوٰۃ خیر من النوم** کے الفاظ صبح کی پہلی اذان میں کہے جاتے تھے۔ [1]

واضح رہے کہ متعدد احادیث میں اقامت کو بھی اذان کہا گیا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔'' [2]

مذکورہ حدیث میں پہلی اذان سے مراد اذان تہجد نہیں جیسا کہ کچھ اہل علم نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے بلکہ اس پہلی اذان سے مراد صبح صادق کے بعد والی اذان ہے اور اقامت کے مقابلہ میں پہلی اذان کہا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح ابن خزیمہ، ص ۲۰۱، ج۱۔ [2] بخاری، الاذان: ٦٢٤۔

جمعہ و عیدین

جمعہ وعیدین
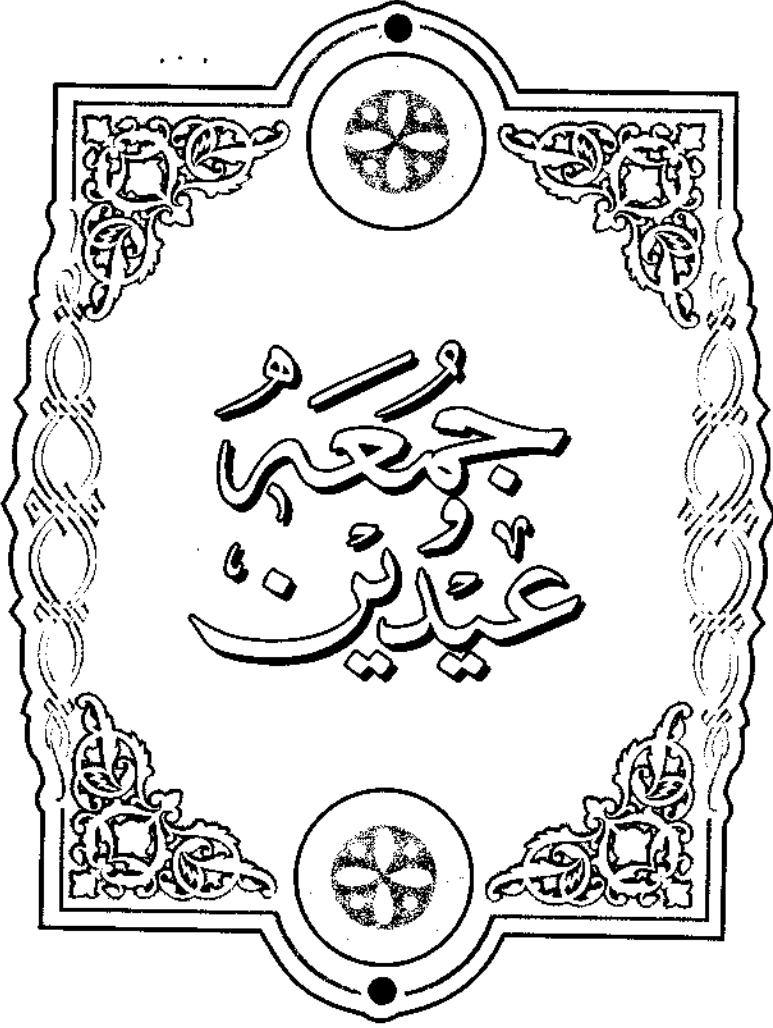
عیدگاہ میں ممبر کا اہتمام

سوال کیا عیدگاہ میں منبر کا اہتمام کرنا چاہیے، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کا عمل کیا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں جمعۃ المبارک اور عام وعظ و نصیحت کے لئے منبر پر بیٹھتے تھے لیکن خطبہ عیدین کے لئے عیدگاہ میں منبر بنانے یا اس کا اہتمام کرنے کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث سے نہیں ملتا۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''عیدگاہ کی طرف منبر کا اہتمام کئے بغیر جانا۔''

پھر انہوں نے اس عنوان کو ثابت کرنے کے لئے اس حدیث سے استنباط کیا ہے: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عیدگاہ تشریف لے جاتے، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن عیدگاہ میں جا کر پہلا کام یہ کرتے کہ نماز پڑھاتے، پھر سلام پھیر کر لوگوں کے بالمقابل کھڑے ہو جاتے۔ [1]

''لوگوں کے بالمقابل کھڑے ہو جاتے'' کے الفاظ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے کہ عیدگاہ میں منبر وغیرہ کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں کہ معاملہ اسی طرح چلتا رہا تا آنکہ میں امیر مدینہ مروان بن حکم کے ہمراہ عیدالاضحیٰ یا عیدالفطر کے دن عیدگاہ گیا، میں نے وہاں دیکھا کہ کثیر بن صلت نے منبر بنا رکھا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدگاہ میں منبر بنانے کا اہتمام مروان بن حکم نے کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین سے عیدگاہ میں منبر لے جانے یا وہاں منبر بنانے کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ ایک روایت میں صراحت ہے کہ مروان بن حکم نے عیدگاہ میں منبر کا اہتمام کیا اور نماز سے پہلے عید کا خطبہ دیا تو حاضرین میں سے ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: ''اے مروان! تو نے سنت کی مخالفت کی ہے، تو نے عیدگاہ میں منبر کا اہتمام کیا ہے جبکہ اس سے پہلے یہ کام نہیں کیا جاتا تھا۔'' [2]

البتہ ایک دوسری حدیث میں اس امر کی بھی صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری پر خطبہ عید ارشاد فرمایا۔ [3]
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سواری پر بیٹھ کر خطبہ عید دیا جا سکتا ہے لیکن منبر وغیرہ کا اہتمام درست نہیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحيح البخاري، العيدين: ٩٥٦۔ [2] سنن أبي داؤد، الصلوٰة: ١١٤٠۔
[3] صحيح ابن خزيمة، الصلوٰة: ١٤٤٥۔

نماز عید کی شرعی حیثیت

سوال نماز عید فرض ہے یا سنت، قرآن وحدیث میں اس کی کیا حیثیت ہے، کیا یہ فرض ہے کہ اس کا تارک گنہگار ہوگا یا اس کا پڑھنا مستحب ہے کہ اس کے چھوڑنے سے کوئی گناہ نہیں ہوگا، وضاحت فرمائیں؟

جواب نماز عید کے متعلق اہل علم میں کچھ اختلاف ہے، کچھ حضرات کا خیال ہے کہ نماز عید فرض نہیں بلکہ ایسی سنت ہے جس کے متعلق بہت تاکید کی گئی ہے۔ جبکہ اکثر اہل علم کا موقف ہے کہ نماز عید فرض ہے۔ پھر فرض کے قائلین میں سے کچھ اسے فرض کفایہ قرار دیتے ہیں کہ چند حضرات اگر پڑھ لیں تو باقی لوگوں سے کفایت کر جاتی ہے۔ جبکہ اکثر حضرات اسے فرض عین قرار دیتے ہیں کہ ہر مسلمان عاقل و بالغ پر اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ ہمارا رجحان یہ ہے کہ نماز عیدین نماز پنجگانہ کی طرح فرض ہے اور اس کا ادا کرنا ضروری ہے، عدم ادائیگی کی صورت میں انسان گنہگار ہوگا جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی صلوٰۃ عیدین کو فرض عین قرار دیا ہے۔ [1]

① رسول اللہ ﷺ نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور دس سال پابندی کے ساتھ عیدین کی نماز پڑھتے رہے، آپ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی عیدین کی نماز کو بڑی پابندی اور اہتمام سے ادا کیا، ایک دفعہ بھی نماز عیدین کا ترک ثابت نہیں۔

② نماز عیدین سے اسلام کی شان وشوکت کا اظہار مقصود ہے، اس بناء پر صلوٰۃ جمعہ کی طرح یہ بھی واجب ہے، جو لوگ بالکل اسے ادا نہ کریں، ان سے قتال کیا جائے گا تاکہ وہ نماز عید پابندی سے ادا کریں۔

③ نماز عید کی ادائیگی اور اس دن اجتماع عظیم میں حاضری عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس دن عورتوں کو باہر کھلے میدان میں نکلنے کا حکم دیا ہے حتیٰ کہ جس کے پاس پردے کے لئے اپنی ذاتی چادر نہیں اسے بھی حاضری کا حکم دیا گیا ہے۔

④ اگر جمعہ اور عیدین ایک دن جمع ہو جائیں تو جمعہ کے متعلق رخصت ہے۔ حالانکہ جمعہ واجب ہے، اگر صلوٰۃ عید فرض نہ ہوتی تو دوسرے فرض کو کیسے ساقط کر سکتی تھی۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ صلوٰۃ عیدین دیگر نماز پنجگانہ کی طرح فرض عین ہے۔

(واللہ اعلم)

سعودیہ کے ساتھ نماز عید

سوال آج کل اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ یکجہتی کے پیش نظر عیدین کی نماز سعودیہ کے مطابق کیوں نہیں ادا کی جاتی، اس جذباتی سوال کا شافی جواب دیں کہ سعودی عرب کے ساتھ نماز عیدین کیوں نہیں ادا کی جاتی؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ سعودی عرب کے ساتھ ہماری ذہنی اور مذہبی وابستگی ہے۔ غالباً مذکورہ سوال کا پس منظر بھی یہی معلوم ہوتا ہے، مگر دین اسلام ہم سے اپنے اصولوں پر قائم رہنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ رمضان کے روزے اور عیدین کے متعلق دین اسلام کا اصول یہ ہے کہ: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھنے کی ابتداء کرو اور چاند دیکھ کر ہی روزوں کو ختم کرو یعنی عیدین مناؤ۔'' [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ ص ۱۶۱ ج۲۳۔ [2] سنن النسائي، الصيام: ۲۱۱۹۔

ایک روایت میں ہے کہ ''چاند دیکھ کر ہی حج اور قربانی کرو۔'' ❶

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص چاند دیکھے بلکہ کوئی ایک معتبر آدمی بھی چاند دیکھ لے یا کسی اور جگہ سے چاند نظر آنے کی خبر پہنچ جائے تو اس علاقے کے تمام لوگ روزہ رکھیں گے یا عیدین کریں اور نیا مہینہ شروع ہو جائے گا۔ البتہ یہ تحقیق کرنا ضروری ہے کہ دونوں جگہوں میں اتنا فاصلہ نہ ہو جتنے فاصلے سے چاند دیکھنے میں ایک یا دو دن کا فرق پڑ سکتا ہو۔ آج کل ہر اسلامی ملک اتنا چھوٹا ہے کہ اس ملک میں کسی بھی جگہ چاند نظر آئے تو پورے ملک میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ البتہ مختلف ممالک میں چاند مختلف ہو سکتا ہے کیونکہ ان کا مطلع الگ الگ ہو سکتا ہے۔ جن ممالک کا مطلع الگ الگ ہے وہاں کے لوگوں کو کسی دوسرے ملک کے تابع کرنا قرین قیاس نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ میں رہتے ہوئے ملک شام کے چاند کا اعتبار نہیں کیا تھا بلکہ انہوں صاف کہہ دیا تھا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔ ❷

ہم دیکھتے ہیں کہ فرنگی اور دین دشمن یہود و نصاریٰ ایک ہی دن اپنی عید مناتے ہیں۔ ان کی تقلید میں ہمارے اندر بھی یہ خواہش مچلتی ہے کہ ہم مسلمان ایک ہی دن عید کریں لیکن ہم لوگ تو شریعت کے پابند ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں کسی بھی دور دراز علاقے والوں کو کسی مخصوص علاقے یا سعودی عرب کے تابع نہیں کیا گیا اور یہ ماضی بعید میں ممکن بھی نہیں تھا۔ خود علماء عرب بھی اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ تمام دنیا میں اہل اسلام کو سعودی عرب کے تابع کر دیا جائے۔ دور صحابہ اور اتباع صحابہ میں ایسا کبھی نہیں کیا گیا تو اب اس حکم کو کیوں تبدیل کر دیا جائے۔ لہٰذا ہر علاقے میں اس کی رؤیت کا اعتبار ہو گا یا پھر قرب و جوار کی رؤیت کا اعتبار کیا جائے گا مگر دور دراز کے علاقوں میں یکجہتی کے طور پر ایک ہی دن عید کرنا فرنگی تہذیب ہے، اسلامی تہذیب میں ایسا ممکن نہیں۔ (واللہ اعلم)

عالم اسلام میں ایک ہی دن عید کرنا اور روزہ رکھنا

سوال عالم اسلام میں اتحاد و یگانگت کا تقاضا ہے کہ ایک ہی دن روزہ رکھا جائے اور ایک ہی دن عید کی جائے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا احکام ہیں؟

جواب ماہرین فلکیات کے آلات اور ان کے حساب کے ہم پابند نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے ماہ سال کا حساب ان کے علم سے وابستہ ہے، بلکہ ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھیں اور چاند دیکھ کر عید کریں۔ ہمارا قمری مہینہ کبھی انتیس کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دنوں کا ہوتا ہے۔ شرعی اعتبار سے اگر کہیں چاند نظر آ جائے یا کسی دوسری جگہ سے چاند نظر آنے کی خبر پہنچ جائے تو اس علاقہ کے تمام لوگوں کو روزہ رکھنا یا عید کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چاند دیکھنے سے نیا مہینہ شروع ہو جائے گا البتہ ایسے مقامات جن میں اتنا فاصلہ ہو کہ چاند دیکھنے میں ایک یا دو دن کا فرق پڑ سکتا ہے وہاں ہر علاقے کی اپنی رؤیت ہو گی۔ آج کل اسلامی ممالک اسقدر چھوٹے چھوٹے ہیں کہ وہاں کسی بھی جگہ چاند نظر آ جائے تو وہ پورے ملک میں نظر آ سکتا ہے لہٰذا ایک ملک میں کسی جگہ چاند نظر آنے سے سارے ملک میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ البتہ مختلف ممالک میں چاند مختلف ہو سکتا ہے مثلاً سعودی عرب اور پاکستان ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر ہیں لہٰذا ان ممالک میں ہر ملک کی اپنی رؤیت ہو گی جیسا کہ حضرت کریب بیان کرتے ہیں:

---

❶ سنن النسائي، الصيام: ۲۱۱۸۔ ❷ سنن النسائي، الصيام: ۲۱۱۳۔

''مجھے ام فضل رضی اللہ عنہا نے کسی کام کے لئے علاقہ شام میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں بھیجا اور ان کا کام پورا کیا، میں ابھی شام میں ہی تھا کہ رمضان المبارک کا چاند طلوع ہو گیا، میں نے بذات خود جمعہ کی رات چاند دیکھا، پھر میں رمضان کے آخر میں مدینہ طیبہ واپس آیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے چاند کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا: ''تم نے رمضان کا چاند کب دیکھا تھا؟ میں نے عرض کیا: ''ہم نے جمعہ کی رات دیکھا تھا، انہوں نے فرمایا: ''تم نے خود دیکھا تھا'' میں نے عرض کیا: ''جی ہاں'' میں نے خود دیکھا تھا، دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا تھا۔ اس رؤیت کے مطابق حضرات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں نے روزہ رکھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ ہم تو تیس دن مکمل ہونے تک روزے رکھتے رہیں گے یا ہمیں چاند نظر آ جائے۔ میں نے عرض کیا، کیا تمہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی رؤیت کافی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا تھا۔ [1]

اس حدیث میں ''یہی حکم'' سے مراد ''چاند دیکھ کر روزہ رکھنا اور چاند دیکھ کر عید کرنا'' ہے۔ اس سلسلہ میں چند اصول حسب ذیل ہیں: چاند دیکھنے کے سلسلہ میں انہیں مدنظر رکھنا چاہیے۔

☆ جب ایک شہر میں چاند نظر آ جائے تو اس سے ملتے جلتے طول و بلد پر واقع تمام شہروں میں اس کی رؤیت کا اعتبار کیا جائے گا خواہ ان کا فاصلہ ہزاروں میل ہی کیوں نہ ہو، مثلاً کراچی اور ڈھاکہ دونوں ایک ہی طول و بلد پر واقع ہیں، ان میں سے کسی کی رؤیت دوسرے کے لئے معتبر ہوگی۔

☆ کسی شہر میں چاند نظر آ جائے تو اس سے مغرب میں واقع تمام علاقوں میں اس کی رؤیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ وہاں دیکھنے کی ضرورت نہیں خواہ فاصلہ ہزاروں میل ہو مثلاً پاکستان میں دیکھا ہوا چاند سعودی عرب کے لئے معتبر ہوگا البتہ اس کا الٹ ضروری نہیں یعنی سعودی عرب کا چاند ہمارے پاکستان کے لئے معتبر نہیں ہوگا۔

☆ نشیبی علاقہ میں چاند نظر آ جائے تو بالائی علاقوں میں اس کا اعتبار کیا جائے گا البتہ بالائی علاقے میں چاند کی رؤیت نشیبی علاقوں کے لئے معتبر نہیں ہوگی، اس سلسلہ میں علمائے رصد اور ماہرین فلکیات سے راہنمائی لی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

عید کے مہینوں میں کمی

سوال حدیث میں ہے کہ ''عید کے دو مہینوں میں یعنی رمضان اور ذوالحجہ میں کمی نہیں آتی'' اس حدیث کا مطلب واضح کریں، نیز حدیث کی نشاندہی بھی کر دیں؟

جواب امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے۔'' [2]

اس کے بعد حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عیدین کے دو مہینے یعنی رمضان اور ذوالحجہ ناقص نہیں رہتے۔'' (۱۹۱۲) اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے اہل علم نے درج ذیل اقوال بیان کیے ہیں:

[1] سنن النسائي، الصيام: ٢١١٣۔ [2] صحيح البخاري، الصوم باب ١٢۔

☆ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ اس حدیث کو ظاہر پر محمول کیا جائے یعنی رمضان اور ذوالحجہ ہمیشہ تیس دن کے ہوں گے۔لیکن معنی ہمارے مشاہدے کے خلاف ہے کیونکہ اکثر اوقات ان میں ایک یا دونوں انتیس، انتیس دن کے ہوتے ہیں۔

☆ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ بیک وقت دونوں میں کمی نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر رمضان کا مہینہ انتیس دن کا ہوا تو ذوالحجہ تیس دن کا ہوگا اور اگر ذوالحجہ انتیس دن کا ہوا تو رمضان کے تیس روزے ہوں گے۔لیکن یہ معنی بھی درست نہیں کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی سال میں دونوں انتیس انتیس دن کے ہوتے ہیں۔

اگرچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے استاد امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کے حوالے سے اس کا معنی بیان کیا ہے کہ فضیلت و برتری میں کمی نہیں آتی اگر ان میں کوئی ایک یا دونوں انتیس دن کے ہوں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہی معنی درست معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا بھی یہی رجحان ہے کہ اگر رمضان کے انتیس دن ہوئے تو اجر وثواب تیس دنوں کا ملے گا یعنی گنتی میں کمی ہو سکتی ہے لیکن اجر وثواب میں کمی نہیں ہوگی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کچھ دوسرے اقوال بھی بیان کئے ہیں جس کی تفصیل فتح الباری (ص ۱۶۰۔۱۶۱ ج ۴) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جمعہ کی دوسری اذان کا جواب

سوال جمعہ کے دن جب خطیب منبر پر بیٹھتا ہے تو اس وقت دوسری اذان دی جاتی ہے، کیا اس اذان کا جواب دینا ضروری ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں۔

جواب جمعہ کے دن جب خطیب خطبہ دینے کے لیے منبر پر بیٹھتا ہے، اس وقت جو اذان دی جاتی ہے وہی اصل اذان ہے۔ چنانچہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمعہ کی پہلی اذان اس وقت دی جاتی تھی جب امام خطبے کے لیے منبر پر بیٹھتا تھا۔‘‘ [1]

واضح رہے کہ اقامت کو اذان کا درجہ دے کر اس اذان کو پہلی اذان کہا گیا ہے، ہمارے ہاں جو پہلی اذان ہے یہ اصل نہیں بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہنگامی ضرورت کے پیش نظر مسجد سے باہر بازار میں ایک اونچے مقام پر اس اذان کا اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو انھوں نے مقام زوراء پر ایک تیسری اذان دلوانے کا اہتمام کر دیا۔ [2]

بہر حال جب خطیب، خطبہ کے لیے منبر پر بیٹھتا ہے تو اس وقت جو اذان دی جاتی ہے اس کا جواب دینا ضروری ہے جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ خطبہ دینے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور مؤذن نے اذان شروع کی تو انھوں نے اس اذان کا جواب دیا اور فرمایا کہ میں نے اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اذان کا جواب دیتے ہوئے سنا ہے۔ [3] اذان کا جواب دینا ضروری ہے جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جیسے مؤذن کہتا ہے۔ [4]

---

[1] بخاري، الجمعة: ٩١٣۔ [2] بخاري، الجمعة: ٩١٣۔ [3] بخاري، الجمعة: ٩١٤۔ [4] بخاري، الاذان: ٦١١۔

اس جواب دینے کی فضیلت یہ ہے کہ دل کی گہرائی سے جواب دینے کی صورت میں انسان جنت میں جانے کا حق دار ہو جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص اذان کا جواب دے حتیٰ کہ اللہ اکبر سے لا الٰہ الا اللہ تک دل کی گہرائی سے کہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ❶

درج بالا احادیث کی روشنی میں بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ جمعہ کے دن جب خطیب خطبہ دینے کے لیے منبر پر بیٹھتا ہے، اس وقت جو اذان دی جاتی ہے اس کا جواب دوسری اذانوں کی طرح ضرور دینا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

جمعہ کے لیے کم از کم ایک رکعت با جماعت پانا

سوال ایک آدمی نے جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد میں خطبہ شروع ہونے سے پہلے حاضری دی، نوافل وغیرہ ادا کیے، خطبہ جمعہ سنا، جب نماز شروع ہوئی تو ایک رکعت پڑھنے کے بعد اس کا وضو ٹوٹ گیا، وضو کرتے کرتے جماعت مکمل ہوگئی، اب یہ شخص نماز جمعہ پڑھے گا یا اسے ظہر ادا کرنا ہوگی۔

جواب جس آدمی نے نماز جمعہ کے لیے اس قدر دوڑ دھوپ کی ہے امید ہے کہ اسے اللہ کے ہاں اس کا پورا پورا اجر ملے گا، اگرچہ ایک مجبوری کی وجہ سے اسے نماز توڑنا پڑی پھر وضو کرتے کرتے اس کی جماعت نکل گئی لیکن ہمارے رجحان کے مطابق اب اسے نماز ظہر پڑھنا ہوگی، کیونکہ نماز کے لیے کم از کم ایک رکعت پانا ضروری ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی نماز کی ایک رکعت حاصل کر لی تو اس نے بلا شبہ مکمل نماز حاصل کر لی۔'' ❷ ایک روایت میں جمعہ کی نماز کے متعلق صراحت ہے کہ: ''جسے جمعہ کی ایک رکعت ملے وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملا لے۔'' ❸

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک رکعت امام کے ساتھ مل گئی تو اس کی نماز جمعہ کی نماز شمار ہوگی، اس لیے اسے صرف ایک رکعت مزید پڑھ کر سلام پھیر دینا چاہیے۔ چنانچہ دوسری روایت میں ہے: ''جس نے نماز جمعہ کی ایک رکعت پالی اس نے نماز جمعہ کو پالیا، ہاں جو رکعت رہ گئی ہے اسے پورا کر لے۔'' ❹

ان روایات میں اشارہ ہے کہ اگر ایک رکعت سے کم ملے تو اس کی نماز جمعہ نہیں ہوگی تب اسے نماز ظہر پڑھنی چاہیے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے کہ اگر نمازی کو نماز جمعہ کی مکمل ایک رکعت نہ ملے تو ظہر کی چار رکعات پڑھنی چاہئیں، اس کی نماز جمعہ نہیں ہوئی، حدیث کا یہی تقاضا ہے۔ اگرچہ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ اگر کوئی دوسری رکعت کے تشہد میں شامل ہوا تب بھی اسے اپنی بقیہ نماز جمعہ مکمل کرنا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں تو اسے جماعت کے ساتھ کچھ بھی نہیں ملا، جو رکعت ملی تھی وہ بھی وضو ٹوٹنے سے ختم ہوگئی، اس لیے اسے پوری نماز ظہر پڑھنا ہوگی۔ (واللہ اعلم)

خطیب کا حاضرین کو سلام کہنا

سوال اکثر خطبا حضرات کو دیکھا گیا ہے کہ وہ خطبہ شروع کرنے سے قبل حاضرین کو السلام علیکم کہتے ہیں، کیا اس عمل کی کوئی دلیل ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

---

❶ مسلم، الصلوۃ: ۸۵۰۔
❷ بخاری، مواقیت الصلوۃ: ۵۸۰۔
❸ ابن ماجہ، اقامۃ الصلوۃ: ۱۱۲۱۔
❹ بیہقی ص ۲۰۴، ج ۳۔

جواب خطیب کا جمعہ سے قبل حاضرین کو سلام کہنا مستحب عمل ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جب امام منبر پر چڑھے تو بیٹھنے سے قبل لوگوں کو سلام کہے۔'' پھر انھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل نقل کیا ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر چڑھتے تو حاضرین کو سلام کہتے۔ [1]

پھر انھوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت بھی بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر کے قریب آتے تو آس پاس بیٹھنے والوں کو سلام کہتے اور جب منبر پر چڑھتے تو حاضرین کی طرف منہ کر کے لوگوں کو سلام کہتے۔ [2] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ روایت کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ [3]

یہ روایات سند کے اعتبار سے کچھ کمزور ہیں، لیکن دیگر شواہد و متابعات کی بنا پر کم از کم اصل عمل کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے کچھ معاصرین نے شرح السنۃ کی تحقیق کرتے ہوئے حاشیہ میں دیگر شواہد کا ذکر کیا ہے جو مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موجود ہیں۔ نیز انھوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ دونوں حضرات اس پر عمل کرتے تھے۔ [4]

نیز امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ [5] علامہ البانی رحمہ اللہ مرحوم نے مذکورہ روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ [6]

ہمارے رجحان کے مطابق ان تمام مرویات و آثار کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کا جمعہ سے قبل سلام کہنا مستحب و مندوب ہے۔ (واللہ اعلم)

عید کے خطبہ میں شامل ہونا

سوال اگر کوئی عید کے خطبہ میں شامل ہو تو اسے نماز عید کس طرح ادا کرنا چاہیے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب اگر کوئی آدمی عید کے خطبہ میں شامل ہو تو اسے چاہیے کہ وہ بیٹھ کر خاموشی سے خطبہ سنے پھر خطبہ کے بعد دو رکعت پڑھ لے اور اگر زیادہ افراد ہوں تو وہ نماز عید با جماعت ادا کر لیں اور یہ دو رکعت بارہ زائد تکبیرات کے ساتھ ادا کرنا ہوں گی، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید میں بارہ تکبیریں کہی تھیں، سات پہلی رکعت میں اور پانچ دوسری رکعت میں۔'' [7]

اسی طرح وہ انسان جسے نماز عید کا آخری حصہ ملا ہے وہ نماز عیدین کی دو رکعت بارہ زائد تکبیروں کے ساتھ ادا کرے گا کیونکہ قضا ادا کے مطابق ہونا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ امام کے ساتھ جو حصہ مل جائے اسے پڑھ لو اور جو حصہ رہ جائے اسے بعد میں مکمل کر لو۔ [8] صورت مسئولہ کے مطابق اگر کوئی آدمی عیدین کے خطبہ میں شامل ہوا ہے تو اسے پہلے خطبہ سننا چاہیے پھر چاہیے کہ نماز عید بارہ تکبیرات زائدہ کے ساتھ ادا کرے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] بیہقی: ص۲۰٤، ج۳۔ [2] بیہقی: ص۲۰٤، ج۳۔ [3] ابن ماجہ،اقامۃالصلوٰۃ: ۱۱۰۹۔
[4] بیہقی: ص۴۲۵، ج٤۔ [5] بیہقی ص۲۰۵ ج ۳۔ [6] الاجوبۃ النافعۃ، ص۵۸۔
[7] مسند امام احمد، ص ۱۸۰، ج۲۔ [8] صحیح بخاری، الاذان: ٦۳۵۔

دوران خطبہ چندہ جمع کرنا

سوال بعض مساجد میں دیکھا گیا ہے کہ جمعہ کے دن دوران خطبہ مسجد کے لیے چندہ جمع کیا جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب امام پہلا خطبہ ختم کر کے منبر پر بیٹھ جاتا ہے اور اسے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ منبر پر کچھ دیر بیٹھا رہے تاکہ ہم چندہ جمع کرنے سے فارغ ہو جائیں، اس طرح چندہ جمع کرنے کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

جواب جمعہ کے دونوں خطبوں کی حیثیت برابر ہے اور ان کا خاموشی کے ساتھ سننا انتہائی ضروری ہے، جب کوئی دوران خطبہ کسی دوسرے کو بات کرنے سے منع کرتا ہے یا خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق وہ ایک لغو حرکت کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو نے اپنے ساتھی کو خاموش رہنے کے متعلق کہا جب کہ امام خطبہ دے رہا تھا تو تو نے لغو حرکت کی۔ [1]

جب دورانِ خطبہ کسی دوسرے کو خاموشی اختیار کرنے کے متعلق کچھ کہنے کی اجازت نہیں تو اس دوران چندہ جمع کرنے کی کیونکر اجازت ہو سکتی ہے، اس سے بڑھ کر یہ بری حرکت ہے کہ امام کو منبر پر اس وقت تک بیٹھنے کا پابند کیا جائے جب تک چندہ نہ جمع کر لیا جائے، چندہ جمع کرنے کے لیے باہر کوئی گلہ وغیرہ رکھ دیا جائے یا نماز سے فراغت کے بعد اسے جمع کرنے کا پروگرام بنا لیا جائے، دورانِ خطبہ یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔

جمعہ اور عید کا جمع ہونا

سوال سنا ہے کہ اگر جمعہ کے دن عید ہو تو یہ ملک اور حکمرانوں کے لیے بہت بھاری ہوتا ہے، ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں کیا ہدایات ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کے نظام کے مطابق ہفتہ کے سات دنوں میں کسی بھی دن عید آ سکتی ہے اور اگر یہ جمعہ کے دن آ جائے تو مسلمانوں کے لیے دو عیدیں جمع ہو جاتی ہیں، لیکن لوگوں نے اسے غلط رنگ دے کر مشہور کر رکھا ہے کہ ایسی عید ملک اور حکمرانوں کے لیے بہت بھاری ہوتی ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ حضرت ابو عبید بیان کرتے ہیں: ''میں ایک مرتبہ عید کے موقع پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حاضر ہوا اور یہ جمعہ کا دن تھا۔ انھوں نے خطبہ سے پہلے نماز عید پڑھائی پھر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! بلاشبہ اس دن دو عیدیں جمع ہو گئی ہیں لہٰذا عوالی کے لوگوں میں سے جو نماز جمعہ کا انتظار کرنا چاہے کر لے اور جو واپس جانا چاہے تو میں اسے واپس جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ [2]

جب جمعہ کے دن عید آ جائے تو شرعی طور پر کیا کرنا چاہیے؟ اسلامی تعلیمات کے مطابق نماز عید تو معمول کے مطابق ہی ادا کی جائے گی البتہ جمعہ کے متعلق اختیار ہے اگر کوئی چاہے تو مسجد میں حاضر ہو کر جمعہ پڑھے اور اگر چاہے تو جمعہ نہ پڑھے، البتہ جمعہ نہ پڑھنے کی صورت میں نماز ظہر کی ادائیگی ضروری ہے۔ خواہ اکیلا پڑھے یا باجماعت ادا کرے لیکن اسے منحوس خیال کرنے کی بات

---

[1] صحیح بخاری، الجمعة: ۹۳٤۔ [2] بخاری الاضاحی: ۵۵۷۲۔

خودساختہ ہے، کتاب وسنت سے کوئی ایسی بات ثابت نہیں، اگر ان دونوں کے اجتماع سے نحوست یا بدشگونی کا مسئلہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ضرور ہمیں آگاہ فرماتے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں جمعہ کے دن عید آئی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''''تمہارے اس دن میں دو عیدیں جمع ہو چکی ہیں، اگر کوئی چاہے تو نماز عید جمعہ کی ادائیگی سے کفایت کر جائے گی لیکن ہم جمعہ ادا کریں گے۔'' ❶

اس حدیث کے مطابق جو شخص جمعہ کے دن نماز عید پڑھ لے تو اسے رخصت ہے کہ جمعہ نہ پڑھے لیکن امام کے لیے عزیمت یہ ہے کہ وہ جمعہ کے لیے مسجد میں حاضر ہو، تاکہ وہ مسجد میں آنے والوں اور نماز عید نہ پڑھنے والوں کو جمعہ پڑھائے کیونکہ ایاس بن ابی رملہ شامی سے مروی ایک حدیث میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں اس وقت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا، جب انھوں نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کیا تمہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کا کبھی ایسا موقع ملا کہ ایک ہی دن میں دو عیدیں جمع ہو گئی ہوں تو انھوں نے فرمایا: جی ہاں! حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس دن کس طرح عمل کیا؟ انھوں نے فرمایا: ''آپ نے نماز عید پڑھائی اور جمعہ کے لیے رخصت دے دی اور فرمایا کہ جو شخص پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے۔'' ❷ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عام لوگوں کے لیے رخصت ہے لیکن امام کو عزیمت پر عمل کرنا ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز جمعہ اور عید میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ تلاوت کرتے تھے۔ اور جب کبھی جمعہ اور عید ایک ہی دن میں جمع ہو جاتے تو دونوں نمازوں میں ہی ان دونوں سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے۔ ❸

یہ بھی واضح رہے کہ جو لوگ نماز عید پڑھنے کے بعد نماز جمعہ میں شریک نہ ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز ظہر چار رکعت ادا کریں خواہ اکیلے اکیلے پڑھیں یا باجماعت ادا کریں۔ جیسا کہ عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ہمیں جمعہ کے دن نماز عید پہلے وقت میں پڑھائی پھر جمعہ کے لیے گئے تو آپ باہر نہ نکلے اور ہم نے اکیلے اکیلے ہی نماز پڑھ لی۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ طائف میں تھے، جب وہ واپس آئے تو ہم نے ان سے اس بات کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ انھوں نے سنت پر عمل کیا ہے۔ ❹

ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے نماز ظہر گھر میں ادا کر لی ہو، اس لیے وہ باہر نہ نکلے ہوں، بہر حال امام کو رخصت پر عمل کرنے کی بجائے عزیمت پر عمل کرنا چاہیے اور اسے جمعہ پڑھانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ہاں اگر نمازیوں کی تعداد محدود اور سب کے اتفاق سے جمعہ نہ پڑھنے کا اتفاق کر لیا گیا ہو تو اس صورت میں سب نماز ظہر ادا کریں گے۔ (واللہ اعلم)

اگر کوئی نماز جمعہ کے تشہد میں شامل ہو

سوال اگر کوئی شخص نماز جمعہ کے لیے دیر سے آتا ہے اور وہ امام کے ساتھ تشہد میں شامل ہوتا ہے تو اسے جمعہ کی نماز ادا کرنا ہوگی یا ظہر کی چار رکعت پڑھے گا، کتاب وسنت کے مطابق راہنمائی کریں۔

---

❶ ابو داؤد، الجمعة: ۱۰۶۹۔ ❷ ابو داؤد، الصلوة: ۱۰۷۰۔ ❸ صحيح مسلم، الجمعة: ۸۷۸۔

❹ ابو داؤد، الصلوة: ۱۰۷۱۔

جواب نماز کو مکمل طور پر پانے کے لیے کم از کم ایک رکعت کا پانا ضروری ہے جیسا کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی نماز کی ایک رکعت حاصل کر لی تو اس نے مکمل نماز حاصل کر لی۔ [1]

ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ جس نے نماز جمعہ کی ایک رکعت کو پالیا تو اسے چاہیے کہ وہ دوسری رکعت بھی اس کے ساتھ ملا لے۔ [2] ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے جمعہ کی ایک رکعت حاصل کر لی اسے نماز جمعہ مل گئی۔'' [3]

ان احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی نے امام کے ساتھ ایک رکعت سے کم حصہ حاصل کیا مثلاً وہ تشہد میں شامل ہوا جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اس کی نماز فوت ہوگئی لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ نماز ظہر کی نیت کر کے جماعت میں شامل ہو اور امام کے ساتھ سلام پھیرنے کے بعد چار رکعات نماز ظہر ادا کرے۔ اگرچہ بعض اہل علم کا موقف ہے کہ وہ ایسی حالت میں اپنی بقیہ نماز جمعہ ادا کرے ظہر نہ پڑھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جتنی نماز تمہیں امام کے ساتھ مل جائے وہ پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے بعد میں پورا کرلو۔'' [4]

تاہم ہمارا رجحان یہ ہے کہ نماز جمعہ کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک رکعت کا پانا ضروری ہے، اگرچہ ایک رکعت سے کم حصہ ملا ہے تو نماز جمعہ کی تکمیل کے بجائے اسے نماز ظہر پڑھنا ہوگی، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد میں نماز عید

سوال آج کل مساجد میں نماز عید پڑھنے کا رواج ہے، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آبادی سے باہر کھلے میدان میں عیدین کی نماز ادا کرتے تھے، مسجد میں نماز عید پڑھنے کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

جواب دین اسلام کی شان وشوکت کے اظہار کے پیش نظر نماز عیدین آبادی سے باہر کھلے میدان میں پڑھنا ہی مسنون ہے، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف باہر نکلتے تھے۔'' [5]

البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ اگر علاقے کی مسجد وسیع اور کشادہ ہو تو نماز عید مسجد میں پڑھنا افضل ہے کیونکہ اصل مقصود مرد وخواتین کا اجتماع ہے اگر وہ مسجد میں ہوسکتا ہے تو آبادی سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمارے رجحان کے مطابق نماز عیدین آبادی سے باہر کشادہ میدان میں ہی پڑھنا مسنون ہے۔ اگر کوئی عذر مانع ہے تو انہیں مسجد میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ ایک دن عید کے موقع پر لوگوں کو بارش نے آلیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز عید مسجد میں پڑھادی۔ [6] لیکن علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [7]

---

[1] ابن ماجه، اقامة الصلوة: ۱۱۲۲۔ [2] ابن ماجه، اقامة الصلوة: ۱۱۲۱۔ [3] بیهقی: ص۲۰٤، ج۳۔
[4] مسند امام احمد: ص۲۳۹، ج۲ [5] مصنف ابن ابی شیبه: ص ۱۸۵ ج ۲ [6] ابو داؤد، الصلوة: ۱۱٦۰۔
[7] ضعیف ابی داؤد: ۲٤۸۔

لیکن اس کی تائید میں ایک موقوف روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا: ''اے لوگو! بلاشبہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو عید گاہ لے جاتے تھے تاکہ وہاں انہیں نماز عید پڑھائیں، یہ بات زیادہ آسان اور وسعت والی تھی، کیونکہ مسجد میں اتنے لوگ نہیں سما سکتے تھے لیکن اگر بارش ہو تو نماز عید مسجد میں پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ زیادہ آسان بات ہے۔'' [1] لیکن مسجد میں حائضہ عورتوں کے لیے مشکل آسکتی ہے کیونکہ مسجد میں ان کے لیے الگ بیٹھنے کا بندوبست نہیں کیا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

خطبہ عید ایک اور نماز عید دوسرا پڑھائے

سوال کیا ایسا کیا جا سکتا ہے کہ خطبہ عید ایک عالم دے اور نماز عید کوئی دوسرا آدمی پڑھائے جو قرآن کو ترتیل سے پڑھنے والا ہو؟

جواب رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک اور خلفاء راشدین کے عہد زریں میں ایک ہی امام خطبہ عید دیتا تھا اور وہی امامت کے فرائض سرانجام دیتا تھا، یہ تقسیم بہت بعد کی پیدا کردہ ہے کہ خطبہ عید خطیب دے اور امامت کوئی دوسرا کرائے جب کہ یہ خلافِ سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔'' [2]

اسی بنا پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ سنت کے مطابق جو خطیب خطبہ عید دے نماز عید بھی وہی پڑھائے، ہاں اگر کسی شخص نے خطبہ عید دیا اور اس کا گلہ خراب ہو گیا، اس قسم کے عذر کی وجہ سے کوئی دوسرا امام نماز عید پڑھا دے تو ایسا کرنا جائز ہے اور اگر کوئی عذر کے بغیر ایسا کرتا ہے اگرچہ اس کا یہ عمل سنت کے خلاف ہے تاہم نماز ہو جائے گی۔ بہر حال انسان کو چاہیے کہ وہ سنت کو اہمیت دے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ (واللہ اعلم)

خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر دینا

سوال ہمارے ہاں عام طور پر جمعہ کا خطبہ کھڑے ہو کر دیا جاتا ہے، لیکن کچھ خطباء بیٹھ کر خطبہ دیتے ہیں، قرآن و حدیث کے مطابق بیٹھ کر خطبہ دینے کی کیا حیثیت ہے؟ آیا متقدمین میں اس کے متعلق کوئی اختلاف ہے، وضاحت فرمائیں۔

جواب قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کے خطبہ جمعہ کی کیفیت بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ''اور جب انھوں نے کوئی تجارت یا کھیل تماشا دیکھا تو ادھر بھاگ گئے اور آپ کو اکیلا کھڑا چھوڑ دیں۔'' [3]

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مدنی دور کی ابتدائی زندگی معاشی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے انتہائی پریشان کن تھی، مہاجرین کی آبادکاری کے علاوہ اہل مکہ نے بھی اہل مدینہ کی معاشی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس کی وجہ سے غلہ، اناج اور کمیاب تھا، انہی ایام کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ شام سے ایک غلہ کا تجارتی قافلہ مدینہ آ پہنچا اور انھوں نے اپنی آمد کی اطلاع طبلے بجا کر دی، خطبہ سننے والے مسلمان بھی محض اس خیال سے کہ اگر دیر سے گئے تو سارا غلہ ہی نہ بک جائے، خطبہ چھوڑ کر ادھر چلے گئے اور آپ کے پاس صرف بارہ آدمیوں کے علاوہ کوئی نہ رہا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ [4]

---

[1] سنن بیہقی: ص ۳۱۰، ص ۳۔ [2] بخاری، الاذان: ۶۳۱۔ [3] الجمعۃ: ۱۱۔ [4] صحیح البخاری، الجمعۃ: ۹۳۲۔

اس آیت سے ضمناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام کو کھڑے ہو کر خطبہ دینا چاہیے اور رسول اللہ ﷺ کا زندگی بھر یہی معمول تھا اور آپ کا یہ معمول وجوب پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر دینا چاہیے، اس سلسلے میں چند احادیث حسب ذیل ہیں:

① حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے خطبہ دینے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے پھر بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہوتے جیسا کہ اب تم لوگ کرتے ہو۔'' ❶

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ان الفاظ سے عنوان قائم کیا ہے: ''کھڑے ہو کر خطبہ دینا۔'' ❷

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہوا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے مال مویشی قحط سالی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے ہیں آپ بارش کی دعا فرمائیں۔ ❸

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے اور جو شخص یہ بات کرے کہ آپ نے بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس نے جھوٹ بولا ہے۔ ❹

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے تو انھوں نے دیکھا کہ عبدالرحمن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ جمعہ دے رہا ہے، آپ نے دیکھ کر فرمایا: اس خبیث کو دیکھو، یہ بیٹھ کر خطبہ دیتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ''جب انھوں نے خرید و فروخت یا کھیل تماشا دیکھا تو اس کی طرف بھاگ نکلے اور آپ ﷺ کو کھڑا ہوا چھوڑ گئے۔'' ❺

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ آیت کریمہ سے کھڑے ہو کر خطبہ دینے کا استدلال کیا ہے اور بیٹھ کر خطبہ دینے والے کو سخت الفاظ کہے ہیں۔ ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہیے، ہاں اگر کوئی عذر ہو تو بیٹھ کر دیا جا سکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پیٹ کی چربی اور گوشت زیادہ ہو گیا تو انھوں نے بیٹھ کر خطبہ دیا۔ ❻

اس حدیث میں عذر کی وضاحت ہے، اگر خطیب بیمار ہے یا ضعیف و ناتواں ہے تو بالاتفاق بیٹھ کر خطبہ دیا جا سکتا ہے بصورت دیگر کھڑے ہو کر خطبہ دینا واجب ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا دائمی عمل اس پر دلالت کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

شب عیدین میں خصوصی عبادت

سوال اہل حدیث مجریہ ۲۶ اگست عید الفطر ایڈیشن میں ص ۹ پر عید الفطر کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں شب عید کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس رات مسلمانوں کو نفل، تلاوت قرآن اور شب بیداری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں کئی ایک احباب نے ہم سے رابطہ کیا کہ اس رات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ اس سلسلہ میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں وہ انتہائی ضعیف بلکہ بے اصل اور موضوع ہیں۔ مجھے بیان کردہ احادیث کی حیثیت بیان کرنے کے لیے از خود نوٹس لینا پڑا تا کہ ہمارے موقر جریدہ اہل حدیث کی یکجہتی مجروح نہ ہو کیونکہ اس میں متعدد مرتبہ اس کے متعلق ہمارا فتویٰ شائع ہو چکا ہے کہ

---

❶ صحیح بخاری، الجمعة: ۹۲۰۔ ❷ صحیح بخاری، الجمعة باب نمبر ۲۷۔
❸ صحیح بخاری، الاستسقاء: ۱۰۱۴۔ ❹ ابو داؤد، الصلوة: باب نمبر ۲۱۹۔
❺ صحیح مسلم، الجمعة: ۲۰۰۱۔ ❻ مصنف ابن ابی شیبة: ص ۱۱۳، ج ۲۔

شب عید میں خصوصی عبادت کا اہتمام کرنا احادیث سے ثابت نہیں ہے۔ ذیل میں ہم بیان کردہ احادیث کی اسنادی حیثیت بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں قرآن وصحیح احادیث پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔

جواب اس سلسلہ میں پہلی حدیث بیان کی گئی ہے جسے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دونوں عیدوں کی رات میں اخلاص کے ساتھ اور حصول ثواب کے لیے قیام کیا تو اس کا دل اُس (قیامت کے) دن زندہ رہے گا جس دن دل مردہ ہو جائیں گے۔'' [1]

یہ روایت انتہا درجہ کی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں بقیہ بن ولید نامی راوی انتہائی مدلس ہے، محدثین کرام نے اس کی تدلیس سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے، علامہ البانی مرحوم نے اس روایت کو ''ضعیف جداً'' یعنی انتہا درجہ کی ضعیف قرار دیا ہے۔ [2] بلکہ ایک مقام پر تو اسے موضوع اور خود ساختہ کہا ہے۔ [3] پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس روایت میں بقیہ بن ولید نامی راوی بدترین قسم کی تدلیس کرنے والا ہے، وہ ایسے کذاب لوگوں سے روایت کرتا ہے جو ثقہ راویوں سے بیان کرتے ہیں، پھر کذاب راویوں کو حذف کر کے براہ راست ثقہ راویوں سے بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، بعید نہیں کہ اس نے جس شیخ کو ساقط کر دیا ہے وہ اسی قسم کے کذاب راویوں سے ہو۔ [4] پھر ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: اس روایت کو علامہ اصفہانی نے عمر بن ہارون بلخی کی سند سے بیان کیا ہے۔

یہ روایت خود ساختہ ہے کیونکہ اسے بیان کرنے والا عمر بن ہارون بلخی کذاب راوی ہے، میں نے پہلے اپنے شبہ کا اظہار کیا تھا لیکن اب مجھے یقین ہے کہ مذکورہ روایت اس کذاب کی وجہ سے موضوع ہے، ممکن ہے کہ بقیہ بن ولید نے اسی کذاب سے اس روایت کو لیا ہو پھر اسے درمیان سے حذف کر کے براہ راست بیان کر دیا ہو۔ [5]

علامہ موصوف نے ضعیف الترغیب والترھیب میں بھی اسے موضوع قرار دیا ہے۔ [6]

واضح رہے کہ بقیہ بن ولید کی تدلیس سے محدثین نے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے، چنانچہ علامہ ذھبی رحمہ اللہ نے حافظ ابو مسھر کا قول بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''بقیہ کی احادیث صاف ستھری نہیں ہوتیں، اس کی احادیث سے ایک طرف رہنا چاہیے۔ [7]

اس سلسلہ میں دوسری حدیث بایں الفاظ بیان کی گئی ہے کہ مشہور صحابی رسول حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو ان پانچ راتوں میں جاگے گا (یعنی عبادت میں مصروف رہے گا) اس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی۔ ① ذو الحجہ کی آٹھویں رات۔ ② ذوالحجہ کی نویں رات، ③ عید الاضحیٰ کی رات ④ عید الفطر کی رات ⑤ شعبان کی پندرھویں رات۔ [8]

یہ روایت بھی بے اصل ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے بھی موضوع قرار دیا ہے۔ [9] علاوہ ازیں علامہ منذری رحمہ اللہ کا اس

---

[1] ابن ماجه، الصیام: ۱۷۸۲۔ [2] سلسله الاحادیث الضعیفه: ۵۲۱۔ [3] ضعیف ابن ماجه: ۳۹۵، ص ۱۳۸۔
[4] سلسله الاحادیث الضعیفه، ص ۱۱، ج ۲۔ [5] سلسلة الاحادیث الضعیفه، ص ۲۶۸، ج ۱۱۔
[6] ص ۳۳٤، ج ۱۔ [7] میزان الاعتدال، ص ۳۳۲، ج ۱۔ [8] التر غیب و الترھیب: ص ۲۷۳، ج ۱۔
[9] ضعیف التر غیب و التر ھیب، ص ۱۷۔

کتاب ''الترغیب والترھیب'' میں منہج یہ ہے کہ جس حدیث کی ابتداء مجہول صیغہ سے کریں یعنی اسے روی سے بیان وہ روایت ضعیف یا موضوع ہوتی ہے، اس حدیث کو بھی انھوں نے صیغہ تمریض سے شروع کیا ہے۔ اس روایت کو علامہ نصر مقدسی نے بھی بیان کیا ہے، اس میں چار راتوں کا ذکر ہے، پانچویں رات یعنی پندرھویں شعبان کا ذکر نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں عبدالرحیم بن زید العمی نامی راوی کذاب اور متروک ہے، اس سے بیان کرنے والا سوید بن سعید بھی ضعیف ہے۔ اس سند کے متعلق علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ظلمات بعضها فوق بعض'' اس کی سند میں کئی ایک اندھیرے ہیں۔ [1]

اس سلسلہ میں تیسری روایت بھی بیان کی جاتی ہے جو شخص عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی رات عبادت کرتا رہا، اس کا دل اس دن بھی مردہ نہیں ہوگا جس دن (قیامت کے دن) تمام دل مردہ ہو جائیں گے۔ اس روایت کو حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے۔ [2] انھوں نے بتایا ہے کہ اس روایت میں عمر بن ہارون بلخی نامی راوی ہے، اس کے متعلق ہم پہلے بھی وضاحت کر آئے ہیں، علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق مزید لکھا ہے: ابن معین نے اس کو کذاب کہا ہے اور محدثین کی ایک جماعت نے اسے متروک قرار دیا ہے۔ [3] میزان الاعتدال میں اس کے متعلق ''کذاب خبیث'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ [4]

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عید کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تک سوئے رہے اور آپ نے شب بیداری نہیں فرمائی، عیدین کی رات عبادت کرنے کے متعلق کوئی صحیح روایت مروی نہیں ہے۔ [5] محدثین کرام کی مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر ہمیں چاہیے کہ عیدین کی رات خصوصی عبادت سے پرہیز کریں، ہاں اگر کوئی پابندی سے تہجد گزار ہے تو حسب عادت اس رات نوافل ادا کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

خطبہ جمعہ کی طوالت

سوال ہمارے ہاں خطباء حضرات خطبہ جمعہ بہت لمبا کرتے ہیں جس سے سامعین اکتا جاتے ہیں اور نماز بہت ہی مختصر پڑھاتے ہیں، کیا قرآن وحدیث میں اس کا جواب ہے، وضاحت فرمائیں۔

جواب عقل مند اور صاحب بصیرت خطیب وہ ہے جو حالات پر نظر رکھتے ہوئے خطبہ دیتے وقت جامع کلمات استعمال کرے اور مختصر گفتگو کرے کیونکہ مختصر اور جامع بات جلدی ذہن نشین ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل خطبے سے احتراز فرماتے تھے، چنانچہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت طویل وعظ ونصیحت نہیں فرماتے تھے بلکہ چند مختصر کلمات پر ہی اکتفاء فرماتے تھے۔ [6] خطبہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درج ذیل ارشاد گرامی ہمارے واعظین اور خطباء کے لیے مشعل راہ ہے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کی لمبی نماز اور چھوٹا خطبہ اس کی فقاہت کی علامت ہے۔ [7] اس میں نماز اور خطبہ کا باہمی تقابل مراد نہیں ہے بلکہ عام نمازوں سے جمعہ کی نماز طویل اور عام خطبوں سے جمعہ کا خطبہ مختصر ہونا

---

[1] الترغیب و الترھیب: ص ۱۵۲، ج ۱۔ [2] مجمع الزوائد: ص ۱۹۸، ج ۲۔
[3] تلخیص المستدرک، ص ۸۷، ج ٤۔ [4] ص ۲۲۸، ج ۳۔ [5] زاد المعاد، ص ۱۵٦، ج ۱۔
[6] ابو داؤد، الصلوۃ: ۱۱۰۷۔ [7] صحیح مسلم، الجمعۃ: ۸٦۹۔

چاہیے، چنانچہ حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اور خطبہ اعتدال کے ساتھ ہوتے تھے۔ ❶

یہ بھی ذہن میں رہے کہ نماز بھی اتنی طویل نہ ہو کہ مقتدی اکتا جائیں اور وہ مشقت میں پڑ جائیں جیسا کہ ائمہ حضرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے متعلق تنبیہ فرمائی ہے۔ بہر حال ہمارے خطباء حضرات کو چاہیے کہ وہ وقت اور سامعین کی نزاکت کا خیال رکھیں اور اعتدال کے ساتھ نماز اور خطبہ ادا کریں، دو اڑھائی گھنٹے پر مشتمل خطبہ جمعہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے، خطبہ جامع مختصر اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے اور نماز کا بھی جھٹکا کرنے کے بجائے اعتدال کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

(واللہ اعلم)

مرزائی کا مسجد میں آنا

سوال کیا کسی مرزائی کو وعظ و نصیحت سنانے کے لیے مسجد میں لایا جا سکتا ہے؟ اسی طرح جمعہ مبارک کے دن اسے خطبہ سنانے کے لیے مسجد میں لانا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، اس سے مقصود اسے راہ راست پر لانا ہے۔

جواب کسی بھی غیر مسلم کو وعظ و نصیحت کے لیے مسجد میں آنے کی دعوت دی جا سکتی ہے، ممکن ہے کہ اس طرح اسے توبہ اور قبول اسلام کی توفیق مل جائے، قرآن کریم میں اس کا واضح اشارہ موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دو تا آنکہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اپنی جائے امن تک پہنچا دو۔'' ❷

اس مقام پر مشرک کو پناہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کی باتیں سن لے اور اسے اسلام کو سمجھنے کا موقع مل جائے، اسی طرح اگر مرزائی مسجد میں آنے کی خواہش رکھتا ہے تو اسے موقع دینا چاہیے اور موقع کی مناسبت سے ایسا درس دیا جائے جس سے وہ مطمئن ہو سکے، جس آیت کریمہ میں مشرکین کو پلید کہا گیا ہے وہ عقائد و اعمال کی نجاست کی وجہ سے انہیں نجس قرار دیا گیا ہے، ویسے بھی وہاں مسجد حرام میں داخلے کی پابندی کا ذکر ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''مشرک انسان کا مسجد میں داخل ہونا۔'' ❸

پھر انھوں نے اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث پیش کی ہے، جسے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک مختصر سا دستہ نجد کی طرف روانہ فرمایا وہ لوگ قبیلہ بنوحنیفہ کا ایک آدمی پکڑ لائے جسے ثمامہ بن اثال کہا جاتا تھا، اسے مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔'' ❹

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو بھی مسجد میں ٹھہرایا تھا، نیز ایک مرتبہ وفد ثقیف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور وہ لوگ مشرک تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد نبوی میں ہی ٹھہرایا تھا۔ ❺ بہر حال اگر وعظ و نصیحت اور تبلیغ مقصود ہو تو مرزائی کو خطبہ جمعہ سننے کی دعوت دی جا سکتی ہے، اور اس کا مسجد میں آنا اور خطبہ جمعہ سننا قابل مواخذہ نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ مسلم، الجمعۃ: ۸۶۶۔ ❷ التوبہ: ٦۔ ❸ صحیح بخاری، الصلوۃ باب: ۸۲۔

❹ صحیح بخاری، الصلوۃ: ٤٦٩۔ ❺ مسند امام احمد، ص ۳٤۳، ج ٦۔

مسائل عیدین

سوال عید الفطر کی آمد آمد ہے، اس سلسلہ میں ہمیں مسائل سے آگاہ کر دیں جو کتاب وسنت کے مطابق ہوں۔

جواب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ہر قوم کے لیے ایک دن ہوتا ہے جس میں وہ زیب وزینت سے آراستہ ہو کر اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور اپنی خوبصورتی کا اظہار کرتے ہیں۔ ❶

رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے اہل مدینہ کو دیکھا کہ وہ سال میں دو مرتبہ نہا دھو کر، اچھے کپڑے پہن کر اپنی زینت کا اظہار کرتے ہیں اور ان میں کھیل کود بھی کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ان دو دنوں کی کیا حیثیت ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہم دور جاہلیت سے ہی ان دنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان کے بدلے ان سے اچھے دو دن دیئے ہیں، ایک اضحیٰ کا دن اور دوسرا فطر کا دن۔'' ❷

شارحین نے لکھا ہے کہ یہ دو دن نوروز اور مہرجان کے دن تھے، اہل فارس (ایرانی) جب موسم خوشگوار اور معتدل ہوتا تو ان دو دنوں میں ''جشن بہاراں'' مناتے تھے، عرب بھی ان کی نقالی میں ان دنوں خصوصی طور پر کھیل کود کا اہتمام کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کو ان دنوں کے منانے سے منع فرمایا اور ان کے بجائے دو اچھے دن یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ منانے کا حکم دیا۔ کیونکہ ان دونوں کا تعلق موسم کی خوشگواری کے بجائے دو عظیم عبادات کی ادائیگی سے ہے یعنی رمضان کے روزوں اور اعمال حج کی ادائیگی۔ یہ دونوں دن انتہائی خیر و برکت کے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت گزاروں کے لیے اپنی وسیع مغفرت کا اعلان کرتا ہے، ہم احکام عیدین کو اختصار سے ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

صلوۃ عید کا حکم

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نے نماز عیدین کو التزام سے ادا کیا اور شریعت نے اس دن شان وشوکت کے اظہار کے لیے لوگوں کو کھلے میدان میں جانے کا حکم دیا ہے حتیٰ کہ جو عورتیں اپنی مجبوری کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ سکتیں انہیں بھی عیدگاہ جانے کی تاکید ہے، اس بناء پر نماز عیدین کا ادا کرنا ضروری ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس کے وجوب کا قول اختیار کیا ہے۔ ❸

نماز عید کا وقت

نماز عید کا وقت طلوع آفتاب کے کچھ دیر بعد شروع ہو جاتا ہے اور زوال آفتاب سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ عید پڑھنے کے لیے تشریف لائے تو امام کے تاخیر کر دینے کو انھوں نے ناپسند کیا اور فرمایا کہ ہم تو اس وقت فارغ ہو چکے ہوتے تھے یعنی اشراق کے وقت ❹ اس لیے نماز عید کی ادائیگی میں زیادہ تاخیر مناسب نہیں۔ رسول اللہ ﷺ دیگر امور کی نسبت نماز عید سب سے پہلے ادا کرتے تھے، عید الاضحیٰ کو اول وقت میں ادا کرنا چاہیے تاکہ قربانی کے لیے کھلا وقت مل جائے۔

---

❶ حجۃ اللّٰہ البالغہ: ص۳۲، ج ۲۔ ❷ ابو داؤد، الصلوۃ: ۱۱۳٤۔
❸ مجموع الفتاویٰ: ص ۱٦۱، ج ۲۳۔ ❹ ابو داؤد، الصلوۃ: ۱۱۳۵۔

اذان واقامت کا حکم

نماز عید کے لیے اذان اور اقامت نہیں کہی جاتی، چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں متعدد مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز عید میں حاضر ہوا، آپ نے نماز عید خطبہ سے پہلے اذان اور اقامت کے بغیر پڑھائی۔ [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز عید کے لیے اذان اور اقامت ثابت نہیں۔

نماز عید کے لیے رکعات کی تعداد

عیدین کی نماز دو، دو رکعت ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی نماز دو، دو رکعت ہے، مسافر کی نماز بھی دو رکعت ہے، اسی طرح نماز جمعہ کی بھی دو رکعت ہے ہیں، یہ تمام نمازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی مکمل ہیں، ان میں کوئی کمی یا نقص نہیں۔ [2]

تکبیرات زوائد

نماز عیدین میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ بارہ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں، سات پہلی رکعت اور پانچ دوسری رکعت میں۔ دونوں رکعات میں تکبیرات زوائد، قرأت سے پہلے ہوں گی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ پڑھتے وقت پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے۔ [3]

تکبیرات میں رفع الیدین:

تکبیرات کہتے وقت رفع الیدین کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہیں، البتہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہر تکبیر کہتے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔ [4] اسی طرح عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ''کیا امام نماز عیدین میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرے اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہاتھ اٹھائیں۔ انھوں نے جواب دیا: ''ہاں''۔ [5]

ان آثار و اقوال کی روشنی میں اگر کوئی تکبیرات عیدین میں رفع الیدین کرتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور اگر کوئی نہیں کرتا تو اس کا بھی جواز ہے، ایسے مسائل میں تشدد درست نہیں۔

تکبیرات کے درمیان ذکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکبیرات زوائد کے درمیان کوئی ذکر ثابت نہیں، البتہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو تکبیرات کے درمیانی وقفہ میں اللہ کی تعریف اور حمد و ثناء کرنی چاہیے۔ [6]

نماز عیدین میں مسنون قرأت

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نمازوں میں

---

[1] مسلم، العیدین: ۸۸۵۔ [2] نسائی، العیدین: ۱۵۶۷۔ [3] مسند احمد، ص ۷۰، ج ٦

[4] زاد المعاد، ص ۱٤٤١، ج ۱۔ [5] مصنف عبد الرزاق، ص ۲۹۷، ج ۳۔ [6] بیهقی: ص ۲۹۱، ص ۳۔

کونسی سورتیں پڑھتے تھے؟ انھوں نے کہا کہ پہلی رکعت میں سورۃ ''ق'' اور دوسری رکعت میں ''سورۃ القمر'' کی تلاوت کرتے تھے۔ ❶ جبکہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز جمعہ اور نماز عید کی پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے ❷ اس بنا پر امام کو چاہیے کہ مقتدیوں اور موقع محل کا خیال رکھتے ہوئے دونوں احادیث میں سے کسی ایک حدیث پر عمل کرے۔

عیدین کا خطبہ

عیدین کا خطبہ نماز عید کے بعد ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز عید کے لیے حاضر ہوا، آپ نے پہلی نماز پڑھی پھر خطبہ دیا۔ ❸ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ عیدین کی نمازوں میں حاضر ہوا، یہ سب حضرات نماز عید خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے۔ ❹ یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ عیدین کا خطبہ ایک ہی ہے، دو خطبوں والی جتنی بھی روایات ہیں وہ معیار صحت پر پوری نہیں اُترتیں۔

منبر کے بغیر خطبہ دینا

عید گاہ میں منبر لے جانا احادیث سے ثابت نہیں بلکہ سنت کی خلاف ورزی ہے۔ سب سے پہلے مروان بن حکم نے اپنے عہد میں منبر کا اہتمام کیا، ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے مروان! تو نے سنت کی خلاف ورزی کی ہے، تم نے عید کے دن منبر رکھنے کا اہتمام کیا ہے جب کہ اس دن منبر نہیں نکالا جاتا تھا۔'' ❺

خطبہ سننے کا اختیار

امام کو چاہیے کہ موقع محل کی مناسبت سے خطبہ میں وعظ و ارشاد کا اہتمام کرے البتہ خطبہ سننا ضروری نہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عید پڑھائی پھر فرمایا: جو آدمی جانا چاہے وہ جا سکتا ہے اور جو خطبہ سننے کے لیے ٹھہرنا چاہتا ہے وہ ٹھہر جائے۔ ❻ البتہ خطبہ سننے سے بلاوجہ لا پرواہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ بغور خطبہ عید سنا جائے۔

نماز عید سے پہلے کے آداب

نماز عید سے پہلے چند آداب حسب ذیل ہیں۔

زیب و زینت اختیار کرنا

خوشی کے موقع پر اچھے کپڑے زیب تن کرنا مستحسن امر ہے بلکہ غسل کرنا اور خوشبو لگانا بھی مستحب ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ بازار میں ایک بہترین جبہ فروخت ہو رہا تھا تو آپ نے اسے رسول اللہ ﷺ کے حضور پیش کرتے ہوئے عرض کیا: ''یا

---

❶ مسلم، العیدین: ۸۹۱۔ ❷ صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین: ۸۷۸۔ ❸ صحیح مسلم، العیدین: ۸۸۵۔
❹ بخاری، العیدین: ۹۶۲۔ ❺ ابو داؤد، الصلوۃ: ۱۱۴۰۔ ❻ نسائی، العیدین: ۱۵۷۲۔

رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ عید اور وفد کی آمد کے موقع پر زیب تن کیا کریں۔'' ❶ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن سرخ رنگ کا دھاری دار جوڑا زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ ❷

عید الفطر سے پہلے کچھ کھانا

عید الفطر کی نماز سے پہلے طاق عدد میں کھجوریں کھانا مسنون عمل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن اس وقت تک نہیں نکلتے تھے جب تک چند کھجوریں تناول نہ فرما لیتے۔ ❸ اگر کھجوریں دستیاب نہ ہوں تو کوئی بھی میٹھی چیز کھائی جا سکتی ہے البتہ عید الاضحیٰ کے دن جب تک نماز نہ پڑھ لیتے کوئی چیز تناول نہیں فرماتے تھے۔ ❹ یک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قربانی کی کلیجی اور جگر وغیرہ کھایا کرتے تھے۔ ❺

عید گاہ کی طرف پیدل جانا

عید گاہ کی طرف پیدل جانا چاہیے، بوقت ضرورت سوار ہو کر جانا بھی جائز ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ عید گاہ کی طرف پیدل جانا مسنون عمل ہے۔ ❻ امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ اس حدیث پر اکثر اہل علم کا عمل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عید گاہ کی طرف پیدل جانا کم از کم مستحب عمل ہے اگرچہ کسی معقول عذر کی وجہ سے سواری استعمال کی جا سکتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ پیدل جاتے اور پیدل ہی وہاں سے واپس آتے تھے۔ ❼

تکبیرات عیدین

عیدین کے موقع پر اللہ کی کبریائی اور عظمت بیان کرنا مستحب عمل ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے الفاظ کے متعلق کوئی صحیح حدیث منقول نہیں، البتہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ درج ذیل الفاظ کہا کرتے تھے۔ اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا للّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللہ الحمد۔ ❽

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے درج ذیل الفاظ مروی ہیں: اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللہ الحمد، للّٰہ اکبر و اجل اللّٰہ اکبر علی ما ھدانا۔ ❾

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ درج ذیل الفاظ کہا کرتے تھے۔ اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر کبیرا

تکبیرات کے علاوہ نعت خوانی اور اشعار وغیرہ پڑھنا ثابت نہیں۔

نماز عید کے بعد کے آداب

نماز عید کے بعد حسب ذیل آداب کا خیال رکھا جائے۔

---

❶ بخاری، العیدین: ۹٤۷۔ ❷ سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ: ۱۲۷۹۔ ❸ بخاری، العیدین: ۹۵۳۔
❹ ترمذی، العیدین: ٥٤۲۔ ❺ بیہقی: ص۲۸۳، ج۳۔ ❻ ترمذی، العیدین: ۵۳۰۔
❼ ابن ماجہ: اقامۃ الصلوۃ: ۱۲۹۵۔ ❽ مصنف ابن ابی شیبہ: ص۱۸٦، ج ۲۔ ❾ بیہقی: ص۲۱۰، ج۲۔

راستہ بدلنا

عید کے دن ایک راستے سے جانا اور واپسی پر دوسرا راستہ اختیار کرنا بھی مسنون ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے روز آتے جاتے ہوئے راستہ تبدیل فرماتے تھے۔ (1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عید کے لیے جاتے تو واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرتے تھے۔ (2)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے عید گاہ آنے جانے کا راستہ الگ الگ ہونا چاہیے۔

نماز عید کے پہلے اور بعد نوافل پڑھنا

عید کے دن صرف نماز عید پڑھنے پر اکتفاء کیا جائے، عید گاہ میں نماز عید سے پہلے یا بعد میں نفل نہیں پڑھنے چاہئیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید کی دو رکعت ہی ادا فرمائیں، اس سے پہلے نماز پڑھی نہ بعد میں (3) ایک حدیث میں ہے کہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر آکر دو رکعت پڑھی تھیں۔ (4) ان دونوں روایات میں تطبیق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ میں کوئی نوافل نہیں پڑھتے تھے، البتہ گھر واپس آکر دو رکعت ادا کرتے جن کا نماز عید سے کوئی تعلق نہ ہوتا بلکہ وہ مطلق نوافل ہوتے تھے۔

مبارک باد دینا

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت جبیر بن نفیر سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام عید کے دن جب ایک دوسرے سے ملتے تو بایں الفاظ مبارک باد دیتے تھے۔ (تقبل اللہ منا و منك) (5)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی ان الفاظ کا مشروع ہونا بیان کیا ہے۔ (6)

اس لیے ان الفاظ کے ساتھ ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دی جا سکتی ہے البتہ معانقہ کرنا احادیث سے ثابت نہیں۔

کھیل کود

عید مسلمانوں کا ایک قومی تہوار ہے لہٰذا اس دن خوشی کا اظہار کرنا، چھوٹے بچوں کا دف بجا کر ایسے اشعار پڑھنا جو اسلامی رواج کے منافی نہ ہوں، جائز ہیں۔ اسی طرح ایسا کھیل کود جو جنگی مشقوں پر مشتمل ہو اور جسمانی صحت کے لیے بھی مفید ہو، جائز ہے جیسا کہ عید کے دن اہل حبشہ کا جنگی مشق کرنا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں انہیں دیکھنا احادیث میں آیا ہے۔

عمومی آداب

عیدین کے کچھ عمومی آداب حسب ذیل ہیں

---

(1) بخاری، العیدین: ۹۸٦۔ (2) ابن ماجه، اقامة الصلوة: ۱۳۰۱۔ (3) بخاری، العیدین: ۹٦٤۔
(4) ابن ماجه، اقامة الصلوة: ۱۲۹۳۔ (5) فتح الباری، ص ۵۱۷، ج ۲۔ (6) الفتاویٰ، ص ۲۵۳، ج ۲٤۔

نماز عید کھلے میدان میں ادا کرنا

عیدین کے موقع پر اسلام اور اہلِ اسلام کی شان و شوکت کا اظہار مقصود ہے، اس لیے نماز عید کا اہتمام کھلے میدان میں ہونا چاہیے، جس کی دو صورتیں حسب ذیل ہیں۔ ① عیدگاہ میں پڑھی جائے۔ ② اگر عیدگاہ نہ ہو تو کسی کھلے پارک میں پڑھنی چاہیے۔

شرعی عذر کے بغیر مسجد میں ادا کرنا مسنون نہیں، البتہ سخت بارش، تیز آندھی یا اس قسم کے کسی دوسرے عذر کے پیش نظر مسجد میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں عید کے دن بارش ہوگئی تو آپ نے مسجد میں عید پڑھائی۔ [1] لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہے۔ (واللہ اعلم)

خواتین کا عیدگاہ میں جانا

عیدین کے موقع پر خواتین کو بھی عیدگاہ جانے کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ اجتماعی خوشی کا موقع ہوتا ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں کو شامل ہونا چاہیے۔ خواتین کی شرکت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو خاتون اپنی طبعی مجبوری کی وجہ سے نماز عید نہیں پڑھ سکتی اسے بھی عیدگاہ جانے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو ملنے والی خیر و برکت سے محروم نہ ہو۔ اگر کسی کے پاس پردے کے لیے چادر نہ ہو تو دوسری عورت اسے اپنی چادر میں شریک کر کے عیدگاہ لے جائے، دو عورتوں کا ایک چادر اوڑھ کر چلنا اگرچہ مشکل کام ہے لیکن اس سے عورتوں کے عید میں شریک ہونے کی انتہائی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

بچوں کی عید میں شرکت

باشعور بچے بھی مسلمانوں کی عید میں شریک ہو سکتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ آیا تم نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ عید میں شرکت کی تھی؟ انھوں نے جواب دیا، ہاں اگر چھوٹے ہونے کے باوجود میرا رسول اللہ ﷺ کے ہاں مقام نہ ہوتا تو میں شرکت نہ کرتا۔ [2] لیکن بچوں کو کنٹرول کرنے کا بندوبست ہونا چاہیے تاکہ وہ دوسرے حضرات کی نماز خراب نہ کریں۔

---

[1] ابن ماجه، اقامة الصلوة: ١٣١٣۔ [2] بخاري، العيدين: ٩٧٧۔

جنائز و زیارت قبور

جنائز و زیارتِ قبور

جنازے میں صفوں کا طاق ہونا

سوال جنازے کے موقع پر صفوں کے طاق ہونے کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے، قرآن و سنت سے اس قسم کا اہتمام کیا حیثیت رکھتا ہے، وضاحت فرمائیں؟

جواب نماز جنازہ کے موقع پر طاق صفیں بنانے کا اہتمام کتاب و سنت سے ثابت نہیں، جیسا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کا جنازہ پڑھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری دو صفیں بنائی تھیں۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں طاق صفوں کا اہتمام کرنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں بلکہ صفیں طاق ہوں یا جفت دونوں طرح جائز ہے۔ البتہ مالک بن حبیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنازہ کے وقت تین صفیں بنانا مستحب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''جو کوئی مسلمان فوت ہو جائے اور پھر اس پر مسلمانوں کی تین صفیں جنازہ پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت لازم کر دیتا ہے۔'' [2]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے نماز جنازہ میں تین صفوں کی فضیلت کا اثبات کیا ہے۔ [3]

لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی محمد بن اسحاق مدلس ہے، تاہم کچھ اہل علم نے اسے حسن قرار دے کر مذکورہ مسئلے کا اثبات کیا ہے، ہمارے رجحان کے مطابق جنازے کے موقع پر طاق صفیں بنانے کا اہتمام کتاب و سنت سے ثابت نہیں، یہ محض ایک تکلف ہے۔ (واللہ اعلم)

میت کو دوسرے شہر دفن کرنا

سوال کیا عقیدت کی وجہ سے کسی میت کو دوسرے شہر دفن کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے علاقے کے کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں، وہ اپنی میت کو دوسرے شہر جا کر دفن کرتے ہیں کیونکہ وہاں ان کے پیر دفن ہیں۔ کتاب و سنت میں اس کا کوئی ثبوت ہے؟

جواب اصل بات تو یہ ہے کہ قیامت کے دن نجات کا باعث انسان کا کتاب و سنت پر مبنی عقیدہ اور نیک عمل ہوگا، خواہ اسے کہیں بھی دفن کر دیا جائے۔ اگر عقیدہ اور عمل اچھا نہیں تو مدینہ طیبہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن ہونا بھی اس کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ صورت مسئولہ میں کتاب و سنت سے یہی ثابت ہے کہ میت جہاں فوت ہوا سے وہیں یعنی اس کے علاقہ میں ہی دفن کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی میت کو وادی حبشہ سے مکہ مکرمہ لایا گیا اور وہاں دفن

---

[1] صحیح مسلم، الجنائز: ۹۵۲۔ [2] سنن أبي داوٗد، الجنائز: ۳۱۶۶۔ [3] نیل الاوطار ص ٦٤ ج ٤۔

کیا گیا تو ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اگر میں وہاں ہوتی تو میرے بھائی کو وہیں دفن کیا جاتا جہاں وہ فوت ہوا تھا۔'' ❶

اس حدیث پر محدث بیہقی رحمہ اللہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''میت کو ایک علاقے سے دوسرے علاقہ میں منتقل کرنا مکروہ ہے۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے احد کے دن شہداء کو مدینہ میں دفن کرنے کے لئے اٹھایا تو ایک منادی کرنے والے نے اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق مقتولین کو ان کی جائے قتل پر ہی دفن کیا جائے۔ ❷

اس حدیث پر محدث ابوداؤد رحمہ اللہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ناپسندیدہ ہے۔''

بہرحال عمومی طور پر اسلام میت کی منتقلی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ ہاں اشد ضرورت اور مجبوری ہو تو وفات کی جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد گرامی کی میت کو چھ ماہ بعد نکال کر دوسری جگہ دفن کیا تھا۔ ❸

لیکن خود ساختہ عقیدت کی بنا پر میت کو دوسری جگہ پر منتقل کرنا درست نہیں البتہ جن مقامات کی فضیلت کتاب وسنت سے ثابت ہے وہاں دفن ہونے کی خواہش کی جا سکتی ہے اور اگر حالات اجازت دیں تو میت کو وہاں منتقل بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً ارض مقدس، حرمین کی سرزمین وغیرہ۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ مجھے ارض مقدس وغیرہ میں دفن کیا جائے۔'' ❹

اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موت کے وقت ایک خواہش کو بیان کیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ مجھے ارض مقدس کے اتنا قریب کر دے کہ اگر پتھر پھینکا جائے تو وہاں پہنچ جائے۔

اس مقام پر امام ابن حجر رحمہ اللہ نے بہت نفیس بحث کی ہے کہ اگر کوئی خاص مصلحت ہو تو میت کو دوسرے شہر منتقل کیا جا سکتا ہے، بصورت دیگر اسے وہیں دفن کیا جائے جہاں فوت ہوا ہے۔ ❺

ہمارے رجحان کے مطابق ارض مقدس اور حرمین کی فضیلت قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اگر حالات اجازت دیں تو ان مقامات پر میت کو منتقل کیا جا سکتا ہے لیکن خود ساختہ ''مزارات'' کے پڑوس میں دفن ہونے کی خواہش اور عملی طور پر وہاں میت کو منتقل کر کے دفن کرنا ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

عرس کے لئے کھانا تیار کرنا

سوال ہمارے ہاں ایک بزرگ کی قبر پر سالانہ میلہ لگتا ہے، وہاں دور دور سے لوگ آتے ہیں، میرے والد وہاں باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے کھانے کا انتظام کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ میں فی سبیل اللہ خیرات کرتا ہوں، کیا ایسے مقام پر

---

❶ سنن البيهقي ص ٥٤ ج ٤۔ ❷ سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣١٦٥۔

❸ صحيح البخاري، الجنائز: ١٣٥٢۔ ❹ صحيح البخاري، الجنائز: ١٣٣٩۔

❺ فتح الباري ص ٢٦٤ ج ٣۔

خیرات وغیرہ کی جاسکتی ہے؟

جواب جس مقام پر غیر اللہ کے نام پر نذریں پوری کی جاتی ہوں یا منتیں مانی جاتی ہوں وہاں اللہ کے نام پر دینا بھی منع ہے جیسا کہ حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص نے مقام بوانہ میں اونٹ ذبح کرنے کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت کیا: ''کیا وہاں زمانہ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ وہاں زمانہ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت نہیں جس کی پوجا پاٹ کی جاتی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا سوال کیا: ''کیا وہاں زمانہ جاہلیت میں کوئی میلہ لگتا تھا؟'' اس نے جواب دیا کہ وہاں زمانہ جاہلیت میں کسی میلہ کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاؤ اپنی نذر کو پورا کرلو اور اونٹ ذبح کرو البتہ ایسی نذر کو پورا نہیں کرنا چاہیے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسی جگہ پر ذبح کرنا حرام ہے جہاں زمانہ جاہلیت میں کسی بت کی تعظیم کی جاتی تھی یا وہاں اہل جاہلیت کا کوئی میلہ لگتا تھا لیکن جہاں عملی طور پر غیر اللہ سے مانگا جاتا ہو، وہاں غیر اللہ کی نذریں نیازیں چلتی ہوں اور غیر اللہ کے نام پر میلہ لگایا جاتا ہو، وہاں صدقہ خیرات اور ذبح کرنا بالاولی ناجائز اور حرام ہے اگرچہ ذبح کرنے والے اور صدقہ وخیرات دینے والے کا مقصود رضاء الٰہی کا حصول ہی کیوں نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

میت پر نوحہ کرنے سے اسے عذاب ہونا

سوال کیا میت پر نوحہ کرنا جائز ہے؟ کیا نوحہ کرنے سے میت پر کوئی اثر ہوتا ہے، کتاب وسنت کے مطابق وضاحت فرمائیں؟

جواب میت پر نوحہ کرنا یعنی بآواز بلند چیخنا چلانا حرام ہے۔ اسی طرح کپڑے پھاڑنا، رخسار پیٹنا بھی ناجائز ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص مصیبت کے وقت رخسار پیٹتا، گریبان پھاڑتا یا جاہلانہ انداز میں چیختا چلاتا ہو، وہ ہم میں سے نہیں۔'' [2]

میت کو پس ماندگان کے رونے دھونے سے اس وقت عذاب ہوتا ہے جب کہ نوحہ و ماتم میت کی زندگی کا حصہ رہا ہو یا اس نے گھر والوں کو نوحہ کرنے کی وصیت کی ہو یا زندگی میں انہیں اس سے باز نہ رکھا ہو، گویا اس طرح وہ اس نوحہ گری کا سبب بنا ہے اس لئے رشتے داروں کے رونے دھونے سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''میت کو اس کے اہل وعیال کے نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔'' [3]

لیکن اگر مرنے والے نے اپنی زندگی میں کبھی نوحہ نہ کیا اور نہ ہی اس طرح کے غیر شرعی کام کی وصیت کی بلکہ اپنے گھر والوں کو عمر بھر ایسے کاموں سے منع کرتا رہا تو ایسے شخص کو کسی کے نوحہ کرنے کی وجہ سے ہرگز عذاب نہیں دیا جائے گا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔'' [4]

---

[1] سنن أبي داؤد، الائیان: ۳۳۱۳۔ [2] صحیح البخاري، الجنائز: ۱۲۹۷۔

[3] صحیح البخاري، الجنائز: ۱۲۸٦۔ [4] الانعام: ١٦٤۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اسی مفہوم کو ثابت کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

قریب المرگ کے پاس سورۂ یٰسین پڑھنا

سوال ہماری خالہ کافی دنوں سے بے ہوش ہیں۔ ہم بہت پریشان ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پاس سورۂ یٰسین کی تلاوت کی جائے تاکہ ان پر آسانی ہو اور ان کی روح جلد پرواز کر جائے، اس سلسلہ میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، کتاب و سنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ جب کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو ایک لحہ بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، اس سلسلہ میں ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے مخلصانہ دعاؤں کا سلسلہ تیز کر دینا چاہیے کہ وہ قریب الموت پر آسانی فرمائے۔ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''قریب الموت کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔'' [1]

اس تلقین کے دو مفہوم ہیں: ① اس کے پاس بکثرت لا الٰہ الا اللہ کا ورد کیا جائے ممکن ہے کہ وہ دیکھ کر خود بھی لا الٰہ الا اللہ پڑھے اور قیامت کے دن کامیابی اس کا مقدر بن جائے، جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کا آخری کلام ''لا الٰہ الا اللہ'' ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' [2]

② اسے لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کے متعلق کہا جائے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی عیادت فرمائی، آپ نے اسے فرمایا: ''اے ماموں! تم ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھو۔'' [3]

یہ صورت اس وقت ہوگی جب قریب الموت انسان کے ہوش و حواس صحیح ہوں، اگر وہ دماغی اعتبار سے صحیح نہیں ہے تو اسے اس قسم کی تلقین پر زور نہ دیا جائے، مبادا آخری وقت کوئی ایسی بات کہہ دے جو آخرت کے اعتبار سے اس کے حق میں بہتر نہ ہو۔ باقی رہا اس کے پاس سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنا تاکہ اس کی جان جلدی نکل جائے تو یہ عمل صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ ایک روایت میں ہے کہ تم اپنے مرنے والوں کے پاس سورۂ یٰسین پڑھا کرو۔ [4]

لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح نہیں جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ [5] (واللہ اعلم)

جنازے سے پہلے میت کا چہرہ دیکھنا

سوال ہمارے ہاں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب میت کو جنازہ پڑھنے کے لئے رکھا جاتا ہے تو بڑے اہتمام سے قطار میں کھڑے ہو کر اس کا چہرہ دیکھا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں، کیا قرون اولیٰ میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟

جواب میت کو جب کفن دیا جاتا ہے تو میت کے چہرے سے کپڑا اٹھا کر منہ دیکھا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فوت ہوئے تو آپ کو دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کے چہرے سے کپڑا اٹھایا پھر آپ پر جھکے اور آپ کا بوسہ لیا۔ [6]

---

[1] صحيح مسلم، الجنائز: ٩١٦۔ [2] سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣١١٦۔ [3] مسند أحمد ص ١٥٢ ج٣۔
[4] سنن أبي داؤد، الجنائز: ٦٨٣۔ [5] ضعيف أبي داؤد: ٦٨٣۔ [6] صحيح البخاري، الجنائز: ١٢٤٢۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب میرے والد گرامی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شہید ہو گئے تو میں ان کے چہرے سے کپڑا ہٹانے لگا، اس وقت میں رو رہا تھا، لوگوں نے مجھے روکا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس کام سے منع نہیں کیا۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفن کے بعد میت کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر اس کا منہ دیکھنا جائز ہے لیکن سوال میں ذکر کردہ صورت کا ثبوت قرون اولیٰ میں نہیں ملتا کہ جب میت کو جنازہ پڑھنے کے لئے رکھ دیا جاتا ہے تو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ قطار باندھ کر اس کا چہرہ دیکھا جاتا ہے، بعض اوقات تو عجیب سی صورت حال بن جاتی ہے کہ امام جنازہ پڑھانے کے لئے تیاری کر لیتا ہے کہ اچانک آواز آتی ہے دو منٹ ٹھہریئے ہم نے چہرہ دیکھنا ہے، اسی طرح جنازہ پڑھنے کے بعد بعض اوقات اہتمام کے ساتھ میت کا چہرہ دیکھا جاتا ہے، ایسے حالات میں میت کا چہرہ دیکھنا کوئی کار ثواب نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

اجتماعی جنازہ

سوال جب میتیں زیادہ ہوں تو کیا ان کا اجتماعی جنازہ پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب متعدد میتیں خواہ مردوں کی ہوں یا عورتوں کی یا دونوں کی ملی جلی ہوں تو ان سب پر ایک ہی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، چنانچہ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے ۹ جنازوں کی اکٹھی نماز جنازہ پڑھی، مردوں کو امام کے قریب اور عورتوں کو قبلہ کے قریب کیا۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ [2]

اگرچہ زیادہ جنازوں کی الگ الگ نماز جنازہ پڑھنا بھی درست ہے۔ (واللہ اعلم)

غائبانہ نماز جنازہ

سوال نماز جنازہ غائبانہ ادا کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ نماز جنازہ ثابت ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب غائبانہ نماز جنازہ صحیح احادیث سے ثابت ہے جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کی وفات کا اعلان کیا اور وہ اسی دن فوت ہوا تھا، پھر آپ لوگوں کو لے کر عید گاہ گئے، ان کی صفیں بنائیں پھر غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے ہوئے اس پر چار تکبیریں کہیں۔ [3]

البتہ کچھ اہل علم غائبانہ نماز جنازہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ صرف نجاشی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تمام پردے ہٹا دیئے گئے تھے اور نجاشی رضی اللہ عنہ کی میت آپ کے سامنے

---

[1] سنن البیهقي ص ٣٣ ج٤۔ [2] تلخیص الحبیر ص ٢٧٦ ج٥۔ [3] صحیح البخاري، الجنائز: ١٣٣٣۔

تھی، لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے اسے محض اوہام وخیالات سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس تاویل کو فاسد قرار دیا ہے۔ [1]

چونکہ خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لئے یہ عمل بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی کے دیگر اعمال کی طرح قابل نمونہ ہے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نجاشی کی نماز جنازہ اس علاقہ میں نہیں پڑھی گئی تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھنے کا اہتمام فرمایا، لیکن اس بات کی وضاحت کسی دوسری حدیث میں نہیں ہے کہ حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کا جنازہ اس کے علاقہ میں نہیں پڑھا گیا تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ایسی کوئی خبر میرے علم میں نہیں، جس سے معلوم ہو کہ نجاشی کی نماز جنازہ اس کے شہر میں نہیں پڑھی گئی تھی۔'' [2]

البتہ ہم یہ ضرور لکھتے ہیں کہ ہر مسلمان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا مشروع نہیں ہے بلکہ جس مسلمان کا معاشرہ میں علمی، سیاسی اور رفاہی طور پر اثر ورسوخ ہو، اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کا اہتمام کیا جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نجاشی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان کا غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا ثابت نہیں ہے اور نجاشی رضی اللہ عنہ کا سیاسی اثر ورسوخ اور اس کی اسلام دوستی واضح ہے، اس کے لئے دلائل مہیا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز جنازہ میں درود

سوال ایک شخص نے کہا ہے کہ نماز جنازہ میں دوسری تکبیر کے بعد درود پڑھنے کی کوئی حدیث نہیں ہے، اس کا حوالہ درکار ہے؟ کیا واقعی اس کے متعلق کوئی حدیث نہیں ہے؟

جواب نماز جنازہ کا طریقہ حدیث کے مطابق یہ ہے کہ اس کی چار تکبیریں ہوتی ہیں، پہلی تکبیر کے بعد سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی بھی سورت ملائی جاسکتی ہے، دوسری تکبیر کے بعد درود شریف، تیسری تکبیر کے بعد میت کے لئے دعائیں اور چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیر دیا جاتا ہے۔ حضرت امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی نے بتایا کہ سنت کے مطابق نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے بعد فاتحہ پڑھی جائے جو آہستہ ہو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جائے، پھر میت کے لئے دعائیں، پھر آخر میں سلام پھیر دیا جائے۔ [3]

اس حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ دوسری تکبیر کے بعد درود پڑھنا چاہیے، لہٰذا نماز جنازہ میں درود پڑھنا بلا ثبوت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

قبر پر اجتماعی دعا

سوال تدفین سے فراغت کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر میت کے لئے اجتماعی دعا کرنا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً وعملاً دونوں طرح سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کو دفن کر کے فارغ ہوتے تو کھڑے ہوتے اور فرماتے:

---

[1] احکام الجنائز ص ۱۱۹۔ [2] فتح الباري ص ۲۴۰ ج ۲۔ [3] سنن البيهقي ص ۳۹ ج ۴۔

''اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو پھر اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا کرو کیونکہ اس سے اب باز پرس ہو رہی ہے۔'' [1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو جب قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو سوال و جواب کرنے کے لئے فرشتے آ جاتے ہیں اور میت سے سوال و جواب کرتے ہیں، اس بناء پر رسول اللہ ﷺ نے تلقین کی ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کی جائے اور اللہ سے ثابت قدم رہنے کی بھی التجاء کی جائے، اس کے علاوہ فتح الباری میں صحیح ابن عوانہ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت عبداللہ بن ذی البجادین رضی اللہ عنہ کی قبر پر دیکھا، جب آپ اسے دفن کرنے سے فارغ ہوئے تو قبلہ کی طرف منہ کیا، دونوں ہاتھ اٹھائے (اور دعا کی)۔ [2]

اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کا عمل معلوم ہوا کہ آپ ﷺ جب حضرت عبداللہ بن ذی البجادین رضی اللہ عنہ کی تدفین سے فارغ ہوئے تو ان کے لئے قبلہ رو ہو کر دعا کی اور اپنے ہاتھ اٹھائے، قبلہ رو ہو کر کھڑے ہو کر دعا کرنا بہتر ہے لیکن یہ دعا کے لئے شرط نہیں ہے، ویسے جس طرف بھی منہ کر کے قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے قولاً و عملاً دونوں طرح ثابت ہے، اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

قبر پر کتبہ لگانا

سوال قبر پر صاحب قبر کے نام سے کتبہ لگانے کی کیا حیثیت ہے؟ قرآن و حدیث کے مطابق جواب دیں؟

جواب قبر کو پختہ بنانا یا اس پر لکھنا منع ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔ [3]

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ قبر پر لکھنے سے بھی آپ ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔ [4]

ہمارے اسلاف سے یہ عمل ثابت نہیں ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے، البتہ قبر پر نشانی کے طور پر کوئی پتھر وغیرہ رکھنے میں حرج نہیں ہے جیسا کہ جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو پتھر لانے کا حکم دیا جب وہ نہ اٹھا سکا تو رسول اللہ نے پتھر اٹھانے میں اس کی مدد کی اور اسے میت کے سر کی جانب رکھ دیا۔ [5]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں عنوان قائم کیا ہے: ''پتھر یا کسی بھی علامت کے ذریعے قبر کی نشانی مقرر کرنا۔'' (واللہ اعلم)

کفن کیا ہو؟

سوال کفن کے بارے میں شرعاً کیا ہدایات ہیں، وہ کس رنگ کا اور کتنے کپڑوں پر مشتمل ہو؟

جواب کفن کے متعلق شرعی ہدایات حسب ذیل ہیں: ① کفن کا رنگ سفید ہو چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''تم سفید لباس زیب تن کیا کرو، کیونکہ یہ بہتر اور عمدہ لباس ہے اور اپنے مرنے والوں کو بھی اسی میں کفن دیا کرو۔'' [6]

---

[1] سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣٢٢١۔ [2] فتح الباري ص ١٧٢ ج١١۔ [3] صحيح مسلم، الجنائز: ٩٧٠۔
[4] سنن الترمذي، الجنائز: ١٠٥٢۔ [5] سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣٢٢٠۔ [6] مسند أحمد ص ٢٤٧ ج١۔

تین کپڑوں میں کفن دیا جائے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین سوتی چادروں میں کفن دیا گیا جو سفید رنگ کی تھیں اور سحولیہ کی بنی ہوئی تھیں، ان میں قمیص اور پگڑی نہ تھی۔ ❶

محرم آدمی اگر فوت ہو جائے تو اسے احرام کی دو چادروں میں ہی کفن دے دیا جائے جیسا کہ احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ❷

بوقت مجبوری ایک چادر میں بھی کفن دیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ایک ہی چادر میں کفن دیا گیا تھا، اس سے زائد چادریں ثابت نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

رات کے وقت میت کی تدفین

سوال کیا رات کے وقت میت کو دفن کرنا منع ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب رات کے وقت میت کو دفن کرنے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت دی ہے جسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ''اپنے مرنے والوں کو رات کے وقت دفن نہ کرو الا یہ کہ تم اس کے لیے مجبور کر دیئے جاؤ۔'' ❸

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت میت کو دفن کرنے کے متعلق ڈانٹا ہے، ہاں اگر نماز جنازہ پڑھ لی گئی تو چنداں حرج نہیں ہے۔ ❹

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت میت کو دفن کرنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں کم لوگ شریک ہوں گے، لہٰذا اگر دن کے وقت جنازہ پڑھ لیا گیا ہو اور کسی عذر کی وجہ سے رات کو دفن کرنا پڑے تو ایسا کرنا ممنوع نہیں ہے، نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت ایک آدمی کو قبر میں داخل کیا تھا۔ ❺

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''رات کے وقت دفن کرنا۔''

پھر سند کے بغیر یہ حدیث لائے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ ❻

بہر حال کسی مجبوری کے بغیر میت کو رات کے وقت دفن نہیں کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

مسجد میں نماز جنازہ

سوال کیا مسجد میں نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، کچھ لوگ اس امر کا انکار کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب مسجد میں نماز جنازہ کی ادائیگی جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں جنازے کی نماز ادا کی جائے کیونکہ اکثر و بیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نماز جنازہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں پڑھی جاتی تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے

---

❶ صحيح البخاري، الجنائز : ١٢٦٤۔ ❷ صحيح البخاري، الجنائز : ١٢٦٧۔

❸ سنن أبي داؤد، الجنائز : ٣١٤٧۔ ❹ صحيح مسلم، الجنائز : ٩٤٣۔

❺ ابن ماجه، الجنائز : ١٥٢٠۔ ❻ صحيح البخاري، الجنائز قبل حديث : ١٣٤٠۔

اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جنازگاہ اور مسجد دونوں جگہ جنازہ ادا کرنا درست ہے۔'' ❶

امام بخاری کے نزدیک جنازگاہ اور مسجد دونوں کا حکم ایک ہے۔ چنانچہ جنازگاہ میں پڑھنے کی صراحت موجود ہے، لہٰذا مسجد میں بھی اس کی ادائیگی صحیح ہے۔ ❷

اسکے علاوہ احادیث میں اس امر کی بھی صراحت ہے کہ مسجد میں جنازہ پڑھا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا کی تھی۔'' ❸

امام ابوداؤد نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔'' ❹

اس حدیث میں ان لوگوں کی تردید ہے جو میت کو ناپاک کہتے ہیں یا جو اوہام کا شکار ہو جاتے ہیں کہ مبادا اس سے کوئی آلائش نکل آئے، اس لئے ان کے نزدیک مسجد میں جنازہ جائز نہیں ہے۔ یہ ان کا گمان ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ذکر ہوا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی میت کا جنازہ مسجد میں ادا کیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' ❺

حافظ ابن حجر نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ مسجد میں ادا کی تھی اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ بھی مسجد میں پڑھا تھا۔ ❻

ان روایات کے پیش نظر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا اور جو لوگ اسے ناجائز کہتے ہیں وہ بے بنیاد اور لایعنی اوہام کا شکار ہیں، اگرچہ ہمارے نزدیک جنازہ مسجد سے باہر جنازگاہ میں پڑھنا افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام سے اکثر و بیشتر مسجد سے باہر جنازگاہ میں پڑھنا ہی ثابت ہے۔ (واللہ اعلم)

قبرستان میں مجاور بٹھانا

سوال ہمارے اہل دیہہ نے قبرستان میں ایک مجاور بٹھانے کا پروگرام بنایا ہے تاکہ وہ قبروں کی حفاظت کرے اور اس کی خدمت کے لئے ہر گھر سے کچھ طے شدہ رقم لی جاتی ہے، کیا قبروں میں اس طرح مجاور بٹھانا شرعاً جائز ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب قبروں میں کونسا خزانہ مدفون ہے جس کے لئے کسی مجاور کو بٹھانے کی ضرورت ہو، یہ ایک فضول حرکت ہے، دین اسلام اس طرح کے بے فائدہ کاموں کی اجازت نہیں دیتا۔ ۹۷ھ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بیٹے حسن بن حسن فوت ہوئے تو ان کی شریک حیات حضرت فاطمہ بنت حسین نے ایک سال تک ان کی قبر پر خیمہ لگائے رکھا، خاوند کی شدید محبت نے انہیں اس کام پر مجبور کیا، جب خیمہ اکھاڑ دیا گیا تو ہاتف غیبی سے آواز آئی ''کیا انہوں نے اپنی گم شدہ چیز کو حاصل کر لیا۔'' اس کے جواب میں ایک

---

❶ صحيح البخاري، الجنائز باب ٦٠۔ ❷ فتح الباري ص٢٥٤ ج٣۔ ❸ صحيح مسلم، الجنائز: ٩٧٣۔
❹ سنن أبي داؤد، الجنائز: ٥٠۔ ❺ سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣١٩١۔ ❻ فتح الباري ص ٢٥٥ ج ٣۔

دوسری آواز سنائی دی ''حاصل کیا ہونا تھا بلکہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔'' ❶

ہاتف غیبی سے جو آواز آئی اس سے اس عمل کے ناپسندیدہ ہونے کا اشارہ ملتا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ ابن منیر رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے۔ ❷

ویسے بھی قبر پر بیٹھنے کی سخت ممانعت ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔ ❸

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قبروں پر مت بیٹھو۔ ❹

قبروں پر بیٹھنا اور قبروں میں بیٹھنا دونوں کا ایک ہی حکم ہے، اس کے علاوہ قبرستان سے اس قسم کا تعلق رکھنا کئی ایک قباحتوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ اس سے اہل قبور سے روحانی فیض لینے کا چور دروازہ کھلتا ہے۔

اس بنا پر ہمارے رجحان کے مطابق اس فضول حرکت کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے لیے ہر گھر سے مخصوص رقم لے کر مجاور کی ''خدمت'' کا بندوبست کیا جائے، ایک دوسرے پہلو سے بھی اس کی قباحت واضح ہے کہ قبرستان میں نماز وغیرہ نہیں پڑھی جا سکتی، لہٰذا ایک بے نمازہی قبروں کی مجاوری کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے فضول کاموں سے محفوظ رکھے اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے۔ آمین!

عورتوں کا قبروں کی زیارت کرنا؟

سوال کیا عورتیں قبروں کی زیارت کر سکتی ہیں، اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ جو عورتیں قبروں کی زیارت کرتی ہیں ان پر لعنت کی گئی ہے، آیا اس کے متعلق کوئی حدیث ہے، وضاحت فرمائیں؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی دور میں شرک عام تھا، بتوں کی کھلے عام پوجا پاٹ کی جاتی تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو قبرستان جانے سے روک دیا تھا تاکہ شرک کی طرف ذہن متوجہ ہی نہ ہو لیکن جب توحید کا چرچا عام ہو گیا اور مسلمانوں کے ذہن بھی پختہ ہو گئے تو آپ نے قبروں پر جانے کی اجازت دے دی، چنانچہ آپ نے فرمایا: ''میں نے تمہیں قبرستان جانے سے روکا تھا، اب تمہیں قبرستان جانے کی اجازت ہے۔'' ❺

جب قبرستان جانے کی ممانعت تھی تو اس وقت عورتوں کے متعلق بطور خاص حکم دیا کہ ان کے لئے قبروں کی زیارت کرنا باعث لعنت ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ ❻

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان جانے کی اجازت دی تو یہ اجازت مرد اور عورتوں تمام کے لئے تھی، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! زیارت قبر کے موقع پر میں کیسے دعا کروں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

❶ بخاري، تعليقًا باب ٦١۔ ❷ فتح الباري ص ٢٥٦ ج٣۔ ❸ صحيح مسلم، الجنائز: ٩٧٠۔
❹ صحيح مسلم، الجنائز: ٩٧١۔ ❺ صحيح مسلم، الجنائز: ٢٢٦٠۔ ❻ سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣٢٣٦۔

نے انہیں اس معروف دعا کی تعلیم دی جو قبرستان کی زیارت کے موقع پر پڑھی جاتی ہے۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتیں بھی قبروں کی زیارت کرسکتی ہیں، تاہم عورتوں کا ضبط وصبر بہت کم ہوتا ہے اس لئے یہ اجازت دو شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

① کبھی کبھار جائیں، ہر روز جانے سے اجتناب کریں۔ ② ٹولیوں کی شکل میں نہ جائیں۔ اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (زوارات) ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو کثرت سے قبرستان جاتی ہیں۔ [2]

زوارات کے مفہوم میں ''باجماعت'' جانا بھی شامل ہے کیونکہ ان میں جزع فزع زیادہ ہوتا ہے، خطرہ ہے کہ مبادا وہاں کوئی خلاف شرع کام کرلیں۔ بہر حال عورتوں کے لئے زیارت قبور کی ممنوعہ صورتیں حسب ذیل ہیں:

① جن عورتوں کے متعلق یقین ہو کہ وہاں جا کر چیخ و پکار یا نوحہ خوانی یا چراغاں کریں گی، انہیں قبرستان جانے سے منع کر دیا گیا ہے۔

② جو عورتیں قبروں کو سجدہ کرتی، اور اہل قبور سے طلب حاجات کرتی ہیں تو یہ کام بھی باعث لعنت ہے، اس سے خود بچنا اور بچانا ضروری ہے۔

③ جب عورتیں کسی خاص دن کو زیارت قبور کے لئے مقرر کرلیں، مثلاً دس محرم یا شعبان کی پندرہویں وغیرہ تو ایسے حالات میں بھی ان پر قبرستان جانے کی پابندی ہونی چاہیے۔

④ اسی طرح جب عورتیں زیب وزینت سے مزین اور بے پردہ ہوں تو ایسے حالات میں بھی انہیں قبرستان جانے کی اجازت دینا فتنہ وفساد کو دعوت دینا ہے۔

مذکورہ بالا چار صورتوں کو خلاف شرع ٹھہرانا چاہیے اور انہیں قبرستان جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور اگر ان کاموں سے اجتناب کریں اور کبھی کبھی اپنے کسی محرم کے ساتھ قبرستان جائیں تو جائز ہے، کیونکہ زیارت قبور کی جو عمومی رخصت ہے اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ (واللہ اعلم)

جنازے میں تاخیر

سوال کیا رشتہ داروں کے انتظار میں جنازہ میں دیر کی جاسکتی ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ باہر سے آنے والے رشتہ داروں کی وجہ سے جنازہ پڑھنے میں بہت دیر کی جاتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب مرنے والے کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ اس کی تجہیز وتکفین اور تدفین میں دیر نہ کی جائے بلکہ جلدی کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جنازہ میں جلدی کرو، میت اگر نیک ہے تو اسے خیر کی طرف لے جارہے ہو اور میت اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو تم شر کو اپنی گردنوں سے اتار رہے ہو۔'' [3]

---

[1] صحیح مسلم الجنائز: ۲۲۵٦۔ [2] مسند أحمد ص ۳۳٦ ج۲۔ [3] صحیح البخاري، الجنائز: ۱۳۱۵۔

اس حدیث کی بنا پر رشتہ داروں کے انتظار میں جنازہ میں دیر نہیں کرنی چاہیے البتہ ایک دو گھنٹے تک انتظار کرنے میں چنداں قباحت نہیں۔ ہمارا رجحان یہی ہے کہ میت کی تدفین میں جلدی کی جائے اور اگر بعض رشتہ دار دیر سے پہنچتے ہیں تو وہ میت کی قبر پر جنازہ پڑھ سکتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں جھاڑو دینے والے مرد یا عورت کی نماز جنازہ قبر پر جا کر پڑھی تھی، جسے دفن کر دیا گیا تھا اور آپ ﷺ کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر بتاؤ۔'' [1]

چنانچہ صحابہ کرام نے اس کی قبر کے متعلق آپ ﷺ کو آگاہ کیا تو آپ ﷺ نے اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔ اس حدیث کی بناء پر رشتہ داروں کے انتظار میں جنازہ میں دیر نہ کی جائے اگر وہ دیر سے آتے ہیں تو وہ اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھ لیں۔ (واللہ اعلم)

سوال ہمارے ہاں جب جنازہ اٹھایا جاتا ہے تو کچھ لوگ بآواز بلند کلمہ شہادت کے الفاظ کہتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھر دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اذان دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے شیطان میت پر وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ کیا ایسا کرنا شرعی طور پر ثابت ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب بلاشبہ ہمارے معاشرے میں کچھ کام ایسے ہیں جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں جیسا کہ سوال میں دو کاموں کا ذکر ہے، اس کا ثبوت کتاب وسنت سے نہیں ملتا، رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی جنازہ اٹھایا جاتا تھا، لیکن حاضرین میں سے کوئی کلمہ شہادت کے الفاظ بآواز بلند نہیں کہتا تھا، اگر ایسا کرتا تو ضرور کتب حدیث میں اس کا ذکر ہوتا۔ اسی طرح میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اذان دینے کا مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق بھی کتاب وسنت سے کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس سے اس امر کا جواز ثابت ہوتا ہو۔

باقی رہی شیطان کی وسوسہ اندازی تو وہ انسان کی زندگی تک محدود ہے، مرنے کے بعد اسے کسی کے متعلق وسوسہ اندازی کا اختیار نہیں۔ قبر کے اندر فرشتوں کے سوالات کے جوابات ایمان کی بنیاد پر ہوں گے، وہاں شیطان کا قطعاً کوئی اختیار نہیں ہوگا کہ وہ غلط جوابات اس کی زبان سے جاری کرا سکے۔ ہمارے نزدیک جنازہ لے جاتے وقت بآواز بلند کلمہ شہادت کے الفاظ کہنا اور میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اذان دینا بدعت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جس نے ہمارے اس دین میں کسی نئے کام کو رواج دیا جو اس سے نہیں تو وہ مردود ہے۔'' [2]

ہمیں چاہیے کہ کتاب وسنت سے تمسک کریں، اس کے علاوہ دوسری ہر چیز کو چھوڑ دیں، اس میں ہماری کامیابی اور عزت و ناموس کا تحفظ ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال غیر محرم آدمی کسی عورت کے جنازے کو کاندھا دے سکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے اس کی وضاحت کریں؟

جواب جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے جنازے کے ساتھ جانا اور اسے کاندھا دینا اس کا حق ہے جو دوسرے

---

[1] صحيح مسلم، الجنائز: ٩٥٦۔ [2] صحيح البخاري، الصلح: ٢٥٩٧۔

مسلمانوں کو ادا کرنا چاہیے۔ جنازے کے ساتھ جانے والے مرد ہی ہوتے ہیں کیونکہ عورتوں کو جنازے کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں۔ جیسا کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: ہمیں جنازوں کے پیچھے جانے سے روک دیا گیا لیکن اس معاملہ میں ہم پر زیادہ سختی نہیں کی جاتی تھی۔ ❶

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنازے کے ساتھ جانے والے مرد حضرات ہوتے ہیں اور عورتوں کا جنازے کے ساتھ جانا مکروہ ہے پھر عورت کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے محرم اور غیر محرم کی تفریق کتاب وسنت سے ثابت نہیں، کوئی بھی مسلمان میت کو کندھا دے سکتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جنازہ اٹھانا مردوں کا کام ہے، عورتوں کا نہیں'' ❷

بلکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر محرم آدمی عورت کی میت کو قبر میں اتار سکتا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر کے جنازے میں موجود تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جس نے آج اپنی بیوی سے صحبت نہ کی ہو، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ہوں، آپ نے فرمایا: ''تم اس قبر میں اترو۔'' چنانچہ ابوطلحہ قبر میں اترے اور اسے لحد میں لٹایا۔ ❸

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو قبر میں اتارنا اس بات کی دلیل ہے کہ غیر محرم مرد عورت کو قبر میں اتار سکتا ہے۔ جب غیر محرم میت کو قبر میں اتار سکتا ہے تو اسے کندھا دینے میں کون سا امر مانع ہے؟ ہمارے رجحان کے مطابق میت کو کندھا دیتے ہوئے محرم اور غیر محرم کی تفریق غیر شرعی ہے اور غیر محرم میت کو کندھا دے سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

خواتین کے لئے جنازہ

سوال ہمارے گاؤں میں ایک آدمی فوت ہوا، اس کے جنازے کے متعلق اعلان کیا گیا کہ مسجد میں صرف خواتین کے لئے جنازے کا اہتمام کیا گیا ہے، چنانچہ مسجد میں صرف خواتین نے جنازہ پڑھا اور دوسرا جنازہ گراؤنڈ میں صرف مردوں نے ادا کیا، کیا ایسا کرنا قرآن وسنت سے ثابت ہے، کیا قرون اولیٰ میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟

جواب بوقت ضرورت مسجد میں نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

''جنازہ گاہ اور مسجد دونوں جگہ نماز جنازہ ادا کرنا درست ہے۔'' ❹

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا فرمائی۔'' ❺

اگرچہ افضل یہ ہے کہ مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں نماز جنازہ ادا کی جائے جیسا کہ اکثر و بیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا

---

❶ صحیح البخاری، الجنائز: ۱۲۷۸۔ ❷ صحیح البخارہ، الجنائز باب ۵۰۔
❸ صحیح البخاري، الجنائز: ۱۳۴۲۔ ❹ صحیح البخاري، الجنائز باب ۶۰۔
❺ صحیح مسلم، الجنائز: ۹۷۳۔

ہی ہوتا تھا، تاہم بوقت ضرورت مسجد میں جنازہ پڑھنا جائز ہے اور خواتین کی نماز جنازہ میں شرکت بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ انہوں نے مسجد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ ❶

بلکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ازواج مطہرات نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی تھی جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا خود بیان کرتی ہیں کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے پیغام بھیجا کہ ان کا جنازہ مسجد میں لائیں تاکہ ہم ان کی نماز جنازہ پڑھ لیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، مسجد میں ان کے حجروں کے پاس ان کا جنازہ رکھا گیا اور انہوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ ❷

لوگوں نے مسجد میں جنازہ لانا اچھا خیال نہ کیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے وضاحت فرمائی لیکن عورتوں کے جنازہ پڑھنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا، لہٰذا اگر کسی بزرگ کی نماز جنازہ عورتیں مسجد میں ادا کرنا چاہتیں تو کر سکتی ہیں، جیسا کہ حدیث بالا میں اس کی وضاحت ہے۔ واضح رہے کہ اسے بطور عادت اختیار نہ کیا جائے، اگر کبھی کبھار کسی بزرگ کی وفات پر عورتیں مسجد میں نماز جنازہ پڑھ لیں تو اس کا جواز حدیث سے ثابت ہے۔ (واللہ اعلم)

قبر پر قرآنی آیات پڑھنا

سوال ہمارے ہاں جب میت کو دفن کیا جاتا ہے تو اس کے سر کی جانب سورۂ بقرۃ کی ابتدائی آیات اور پاؤں کی طرف سورۃ بقرۃ کی آخری آیات پڑھی جاتی ہیں، اس طرح قرآنی آیات پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب قبرستان، قرآن کریم کی تلاوت کا محل نہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں اس کے متعلق واضح اشارہ موجود ہے، آپ نے فرمایا: ''اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ، بے شک شیطان اس گھر سے فرار اختیار کرتا ہے جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔'' ❸

صحابہ کرام میں بھی کوئی اس کا فاعل یا قائل نہیں اور نہ کسی نے قبرستان میں قرآن خوانی کی ہے۔ صورت مسئولہ کے جواز کے متعلق ایک روایت پیش کی جاتی ہے، جو حسب ذیل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اسے نہ روک رکھو بلکہ اسے جلد دفن کرو اور دفن کرنے کے بعد اس کے سرہانے سورۃ بقرۃ کا ابتدائی حصہ اور اس کے پاؤں کی جانب اس سورت کا آخری حصہ پڑھا جائے۔'' صاحب مشکوٰۃ نے اس روایت کو شعب الایمان کے حوالہ سے بیان کیا ہے پھر فرمایا ہے کہ یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ❹

علامہ البانی رحمہ اللہ اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں: ''اس کی سند انتہائی ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی یحییٰ بن عبداللہ بن ضحاک ضعیف ہے، اس نے ایوب بن نہیک سے اس کو بیان کیا ہے جسے ابو حاتم وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ امام ازدی رحمہ اللہ نے بھی اسے متروک قرار دیا ہے۔ ❺

---

❶ سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣١٨٩۔ ❷ صحيح مسلم، الجنائز: ٩٧٣۔ ❸ مسند أحمد ص ٢٨٤ ج٢۔
❹ مشكوٰة، الجنائز: ١٧١٧۔ ❺ تعليق الباني على المشكوٰة۔

علامہ البانی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں کہ صاحب مشکوٰۃ نے امام بیہقی کے حوالے سے جو لکھا ہے کہ مذکورہ روایت موقوفاً صحیح ہے، مجھے شعب الایمان میں یہ الفاظ نہیں مل سکے۔ بہر حال مذکورہ روایت نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے ثابت ہے، اس لئے ایسی روایت کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے رجحان کے مطابق یہ ایک رواج ہے جو ہمارے ہاں مشہور ہو چکا ہے، اس کے جواز کے لئے کوئی مستند روایت نہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

قبر کشائی کی شرعی حیثیت

سوال بعض اوقات کسی جرم کی تحقیق کرنے کی غرض سے قبر کشائی کی ضرورت پڑتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہمارے ہاں کچھ اہل علم اسے اچھا خیال نہیں کرتے، اس کے متعلق قرآن وحدیث کے مطابق وضاحت کریں؟

جواب بعض اہل علم حضرات کا موقف ہے کہ اگر میت کو غسل دیئے بغیر یا جنازہ پڑھے بغیر دفن کیا گیا ہو تو اسے غسل دیئے یا جنازہ پڑھنے کے لئے قبر سے نکالا جا سکتا ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کی تردید کرتے ہوئے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''کیا کسی بھی ضرورت کے پیش نظر میت کو قبر اور لحد سے نکالا جا سکتا ہے؟ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ میت کو مذکورہ بالا دو اسباب کے علاوہ اگر ضرورت ہو تو قبر سے نکالنے میں چنداں حرج نہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے دو احادیث ذکر کی ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن أبي کو قبر میں ڈالا جا چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ کے حکم سے اسے قبر سے نکالا گیا، آپ نے اسے اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اپنا لعاب دھن اس کے منہ میں ڈالا اور اپنا قمیص پہنایا، ویسے تو اس کی وجہ اللہ بہتر جانتا ہے البتہ اس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ اپنی قمیص دی تھی (شاید رسول اللہ ﷺ نے اس احسان کا بدلہ چکایا ہو۔) [2]

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے اس کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ جو مسلمان تھا اس کی حوصلہ افزائی کی تھی، اس حدیث میں میت کو دفن کرنے کے بعد نکالنے کا بیان ہے جو قبر کشائی کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے کسی شرعی عذر کی وجہ سے میت کی قبر کشائی کی جا سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے دوسری حدیث جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، میں فرماتے ہیں: ''میرے والد کے ہمراہ قبر میں ایک اور شہید بھی دفن کیا گیا تھا لیکن میرا دل اس پر راضی نہیں ہو رہا تھا، میں نے اس کی لاش نکال کر دوسری قبر میں دفن کر دی۔'' [3] اس حدیث کے مطابق حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اپنے والد کی قبر کشائی کی اور اسے نکال کر دوسری قبر میں دفن کیا، اس بناء پر کسی جرم کی تحقیق کے لئے قبر کشائی کی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

اچانک مرنا

سوال بعض دفعہ کوئی شخص اچانک مر جاتا ہے مثلاً ٹرین یا بس کے ٹکرانے یا مکان کو آگ لگ جانے یا کسی حادثے کی بنا پر ایسا ہو جاتا ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا حکم ہے؟

---

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب ۷۷۔ [2] صحيح البخاري، الجنائز: ۱۳۵۰۔
[3] صحيح البخاري، الجنائز: ۱۳۵۲۔

جواب مختلف حالات وظروف کی وجہ سے اچانک موت کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے مختلف قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سات قسم کی اموات سے پناہ مانگا کرتے تھے، ناگہانی موت، سانپ کے ڈس جانے، کسی درندے کے چیر پھاڑ کرنے، آگ لگنے، غرق ہونے، کسی چیز کے گرنے، کسی چیز پر گرنے اور میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے موت آنے سے پناہ مانگتے تھے۔ ❶

اس حدیث میں ناگہانی موت کا بھی ذکر ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ پناہ مانگتے تھے کیونکہ ایسے حالات میں انسان ضروری وصیت نہیں کر سکتا، اپنے قرضوں کی ادائیگی نہیں کر پاتا اور نہ ہی گناہوں سے توبہ کرنے کی مہلت ملتی ہے، اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اچانک موت مومن کے لئے باعث رحمت اور بدکار کے لئے موجب افسوس ہے۔'' ❷

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اچانک موت ناراضی کی پکڑ ہے۔'' ❸

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے۔ ❹

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ناگہانی موت کافر کے لئے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے ایک بدترین پکڑ ہے کیونکہ اس کی تمام عمر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں گزری ہوتی ہے، اچانک موت آنے سے اس کی توبہ کا جو امکان ہوتا ہے وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، اس کے برعکس جب انسان بیمار ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھتا ہے، ایسے حالات میں مرنے سے پہلے اصلاح عقائد اور درستگی اعمال کا موقع ملتا ہے جو اچانک موت سے ختم ہو جاتا ہے لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار ہوتے ہیں وہ ہر وقت موت کے لئے تیار رہتے ہیں اس لئے ان کی اچانک موت رفع درجات کا ذریعہ بنتی ہے۔ مذکورہ بالا مختلف احادیث میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''موت کا اچانک آنا'' ❺

پھر انہوں نے ایک حدیث کو ذکر کیا ہے، جس میں ایک شخص کی والدہ کے اچانک مرنے کا ذکر ہے، رسول اللہ ﷺ سے اس نے اپنی والدہ کی طرف سے صدقہ وخیرات کرنے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی۔ ❻

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے کہ مومن کے لئے ناگہانی موت نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس ناگہانی موت کا ذکر ہوا تو آپ نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا: البتہ جسے اچانک موت آ جائے اس کی اولاد کو چاہیے کہ صدقہ وخیرات کر کے اس کی تلافی کرے۔ (واللہ اعلم)

جنازہ میں امام کہاں کھڑا ہو

سوال جنازہ پڑھاتے وقت امام میت کے مقابل کہاں کھڑا ہو، کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں؟

---

❶ مسند أحمد ص ١٧١ ج٢۔ ❷ مسند أحمد ص ١٣٧ ج٦۔ ❸ سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣١١٠۔
❹ مسند أحمد ص ٤٢٤ ج٣۔ ❺ صحيح البخاري، الجنائز باب ٩٥۔ ❻ صحيح البخاري، الجنائز: ١٣٨٨۔

جواب مردوں اور عورتوں کی نماز جنازہ میں کوئی فرق نہیں ہے البتہ امام کو چاہیے کہ مرد کے جنازہ کے لئے اس کے سر یا سینے کے مقابل اور عورت کے جنازے کے لئے اس کی کمر کے مقابل کھڑا ہو چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک مرد کا جنازہ پڑھایا تو اس کے سر کے مقابل کھڑے ہوئے۔ پھر ایک عورت کا جنازہ لایا گیا، حاضرین نے کہا: اے ابوحمزہ! اس کا جنازہ بھی پڑھا دیجئے تو آپ چار پائی کے وسط کے مقابل کھڑے ہوئے اور جنازہ پڑھایا، حضرت علاء بن زیاد نے عرض کیا: اے ابوحمزہ! کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے دیکھا ہے کہ آپ مرد کے جنازہ میں اس طرح کھڑے ہوئے تھے جس طرح آپ کھڑے ہوئے ہیں اور عورت کے جنازہ میں اس طرح کھڑے ہوئے تھے طرح جس آپ کھڑے ہوئے ہیں؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہاں'' حضرت علاء بن زیاد نے حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''یہ مسئلہ اچھی طرح یاد کر لو۔'' [1]

اس حدیث میں صراحت ہے کہ نماز جنازہ پڑھاتے وقت امام کو مرد کے سر کے قریب اور عورت کی کمر کے مقابل کھڑا ہونا چاہیے، لیکن کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ مرد ہو یا عورت امام کو اس کے سینے کے برابر کھڑا ہونا چاہیے وہ مذکورہ بالا حدیث کا جواب دیتے ہیں کہ راوی حدیث حضرت ابو غالب کہتے ہیں: ''میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس عمل کے متعلق دریافت کیا جو وہ عورت کی کمر کے مقابل کھڑے ہوئے تھے تو لوگوں نے کہا یہ اس لئے ہوتا تھا کہ میت پر تابوت نہیں رکھا جاتا تھا تو امام عورت کی کمر کے مقابل کھڑا ہو جاتا تاکہ اس کے لئے قوم سے پردہ بن جائے۔'' [2]

لیکن یہ موقف اس بناء پر محل نظر ہے کہ اس روایت میں اس عورت کی میت پر سبز رنگ کے تابوت کے رکاوٹ ہونے کا ذکر موجود ہے۔ [3]

پھر روایت میں ابو غالب کو بتانے والے لوگ مجہول ہیں۔ اس بناء پر مذکورہ اضافہ بھی محل نظر ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری حدیث میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کا جنازہ پڑھایا جو حالتِ نفاس میں فوت ہو گئی تھی تو آپ اس کے وسط میں کھڑے ہوئے تھے۔ [4]

ان احادیث و آثار کے پیش نظر حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جنازہ پڑھاتے وقت امام کو مرد کے سر کے مقابل اور عورت کے درمیان میں کھڑا ہونا چاہیے۔ [5] علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے بھی سیر حاصل بحث کرنے کے بعد یہی لکھا ہے۔ [6]

ہمارے رجحان کے مطابق جو حضرات مرد اور عورت دونوں کے جنازے کے لئے درمیان میں کھڑا ہونے کے قائل ہیں، ان کا موقف محل قیاس پر مبنی ہے اور صریح نصوص کے بھی خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

رات کو دفن کرنا

سوال کیا کسی میت کو رات کے وقت دفن کیا جا سکتا ہے؟ اس کی ممانعت کے متعلق کوئی حدیث مروی ہے؟ وضاحت کریں۔

---

[1] ابن ماجه، الجنائز: ١٤٩٤۔ [2] سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣١٩٤۔ [3] سنن أبي داؤد، الجنائز: ٣١٩٤۔
[4] صحيح البخاري، الجنائز: ١٣٣٢۔ [5] محلى ابن حزم، ص ١٢٣ ج ٥۔ [6] احكام الجنائز: ١٣٨۔

جواب: رات کے وقت کسی میت کو دفن کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''میت کو رات کے وقت دفن کرنا۔'' ❶

پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق وضاحت کی ہے کہ وہ رات کے وقت دفن کئے گئے تھے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ روایت کو مصنف ابن ابی شیبہ میں متصل سند سے بیان کیا گیا ہے۔ ❷

خود امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی متصل سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صبح سے پہلے دفن کیا گیا تھا۔ ❸

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کے اثبات کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھی جسے رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ ❹

اس حدیث سے بھی رات کے وقت دفن کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق لوگوں سے کوئی باز پرس نہیں کی ہے، حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی رات کے وقت ہی دفن کیا گیا تھا۔ ❺

البتہ ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر ڈانٹا کہ آدمی کو رات کے وقت دفن کیا جائے اور اگر کوئی مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔ ❻

لیکن ایک دوسری روایت میں اس ممانعت کا سبب بیان ہوا ہے کہ بعض لوگ مرنے والوں کا کفن اچھا نہیں بناتے تھے اور رات ہی کو دفن کر دیتے تھے تاکہ ان کی حرکت پر پردہ پڑا رہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رات کے وقت دفن کرنے سے منع فرما دیا اور میت کو اچھا کفن پہنانے کی تلقین فرمائی۔ ❼

صحیح مسلم کی اس روایت پر مزید غور کرنے سے ایک اور سبب کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گمان کے پیش نظر رات کے وقت دفن کرنے سے منع فرمایا کہ رات کے وقت لوگ نماز جنازہ میں کم تعداد میں شریک ہوں گے لہٰذا اگر اس کا جنازہ دن کے وقت پڑھ لیا جائے تو رات کے وقت دفن کرنا منع نہیں ہے، اس کے علاوہ اگر میت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی رات کو دفن کرنا ممنوع نہیں خواہ وہاں پر روشنی کا عارضی انتظام ہی کیوں نہ کرنا پڑے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا اور روشنی کے لئے وہاں دیا جلایا گیا تھا۔ ❽

ہمارے رجحان کے مطابق کسی عذر کی بنا پر اگر میت کو رات کے وقت دفن کرنا پڑے تو اس میں چنداں حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

قبرستان میں مسجد بنانا

سوال: قبرستان میں مسجد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر پرانی قبروں کو نیست و نابود کر کے مسجد بنائی جائے تو کیا وہاں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

---

❶ صحیح البخاري، الجنائز باب ٦٩۔ ❷ فتح الباري ص ٢٦٥ ج٣۔ ❸ صحیح البخاري، الجنائز: ١٣٨٧۔
❹ صحیح البخاري، الجنائز: ١٣٤٠۔ ❺ مصنف ابن أبي شیبة ص ٣١ ج٣۔
❻ صحیح ابن حبان ص ٤١ ج٦۔ ❼ صحیح مسلم، الجنائز: ٩٤٣۔ ❽ سنن الترمذي، الجنائز: ١٠٥٧۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے نفلی نماز ادا کرنے کے متعلق حکم دیا ہے کہ اسے اپنے گھروں میں پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔'' ❶

اس حدیث کا واضح مطلب یہ ہے کہ قبرستان نماز پڑھنے کی جگہ نہیں ہے، جب قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جاسکتی تو وہاں مسجد بنانا کیونکر جائز ہوسکتی ہے، اس امر کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زمین تمام کی تمام مسجد ہے، سوائے حمام اور مقبرہ کے۔'' ❷

اس حدیث کا مطلب ہے کہ قبرستان میں مسجد نہیں بنائی جاسکتی، قبرستان میں یا قبر کے آس پاس نماز پڑھنے کا معاملہ بہت حساس ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بزرگ یا نبی کی قبر کے پاس مسجد بنانے سے منع کیا ہے مبادا لوگ یہ خیال کریں کہ مدفون ہستی کی برکات اور اس کے فیوض کی بنا پر یہاں نماز پڑھنا افضل ہے اور یہ بات شرک کے لئے ایک چور دروازہ کھولتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔'' ❸

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قبروں کو مسجدیں بنانے میں تین امور شامل ہیں:

① قبروں کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا ② قبروں پر سجدے کرنا ③ قبروں پر مساجد تعمیر کرنا۔ ❹

اس بنا پر ہمارے رجحان کے مطابق قبرستان میں مسجد تعمیر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے اگر کوئی قبرستان میں مسجد بناتا ہے تو اس کا حکم قبر جیسا ہی ہے۔ چنانچہ حضرت قتادہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ قبرستان کے پاس سے گزرے تو لوگ اس میں مسجد تعمیر کررہے تھے، انہیں دیکھ کر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''قبروں کے درمیان مسجد بنانا ناپسند کیا جاتا تھا۔'' ❺

ہاں اگر قبرستان پرانا ہوچکا ہو اور وہاں دفن کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہوچکا ہو اور وہ قبرستان بھی غیر مسلم لوگوں کا ہو تو وہاں قبروں کو سطح کے برابر کرکے وہاں مسجد تعمیر کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کرکے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مدینہ طیبہ کے ایک پرانے قبرستان کو ہموار کرکے وہاں مسجد نبوی تعمیر کی تھی۔ ❻

امام بخاری نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''کیا مشرکین کی قبروں کو ہموار کرکے وہاں مسجد بنائی جاسکتی ہے۔'' ❼

لیکن مسلمانوں کے قبرستان میں یہ کام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کی قبریں اعزاز و تکریم کی حقدار ہیں، انہیں اکھاڑنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ بعض لوگ مسجد نبوی میں موجود قبور ثلاثہ سے دلیل لیتے ہیں کہ قبرستان میں مسجد بنائی جاسکتی ہے لیکن یہ دلیل اس لئے بے کار ہے کہ قبور ثلاثہ سے پہلے وہاں مسجد موجود نہ تھی اور یہ تینوں قبریں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں ہیں جو مسجد نبوی سے باہر تھا، ان تینوں قبروں کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم نہ اللہ تعالیٰ نے دیا نہ اس کے رسول ﷺ نے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے

❶ سنن النسائي، قيام الليل: ۱۵۹۹۔ ❷ سنن أبي داؤد، الصلوٰة: ٤٩٢۔
❸ صحيح البخاري، الصلوٰة: ٤٣٥۔ ❹ احكام الجنائز ص ٢٧٩۔ ❺ المغني ص ٤٧٥ ج٢۔
❻ صحيح البخاري، الصلوٰة: ٤٢٨۔ ❼ صحيح البخاري، الصلوٰة باب ٤٨۔

اس کے متعلق کوئی اشارہ دیا، اسے خیر القرون کے بعد مسجد نبوی میں شامل کیا گیا اس لئے یہ کام کسی شرعی مسئلہ کی دلیل نہیں بن سکتا، ویسے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مبارکہ جس میں یہ تینوں قبریں موجود ہیں چاروں طرف سے بند ہے وہاں جانا ممکن نہیں، اس طرح گویا انہیں مسجد سے الگ کر دیا گیا ہے۔

بہرحال قبرستان میں مسجد تعمیر کرنا اور تعمیر شدہ مسجد میں دو تین قبروں کا آ جانا ان دونوں میں واضح فرق ہے، تعمیر شدہ مسجد میں بھی اگر قبر سامنے قبلہ کی طرف ہو تو وہاں نماز پڑھنا درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ [1]

البتہ نماز جنازہ جس میں رکوع اور سجدہ نہیں ہوتا، اسے پڑھنے کی خصوصی اجازت ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح مسلم، الجنائز: ۹۷۲۔

زکوٰۃ و صدقات

زکوٰۃ و صدقات

بچے کے مال میں زکوۃ

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کا بچہ بہت چھوٹا تھا اور اسے وراثت میں ڈھیروں مال ملا، کیا بچے کے مال میں سے زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب شرعی احکام اس انسان پر لاگو ہوتے ہیں جو عاقل، بالغ اور مسلمان ہو اور فرضیت زکوۃ کے لیے اس کا صاحب نصاب ہونا بھی ضروری ہے، بچے کے مال میں سے زکوۃ دینے یا نہ دینے کے متعلق فقہاء کا بہت اختلاف ہے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق بچے کے مال میں سے زکوۃ ادا کرنی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ان کے اموال میں سے آپ زکوۃ وصول کریں اس کے ذریعے انہیں پاک کریں۔'' [1]

اس آیت کریمہ میں بالغ اور غیر بالغ کی کوئی قید نہیں ہے نیز زکوۃ سے مقصود غرباء و مساکین کا فائدہ کرنا ہے لہٰذا ان کا حصہ نکالنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل روایات بھی بطور تائید پیش کی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ سند کے اعتبار سے ان میں کچھ ضعف پایا جاتا ہے۔ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کسی یتیم کا کفیل ہو اسے چاہیے کہ وہ اس کے مال کو تجارت میں لگائے اسے یونہی نہ چھوڑے رکھے کہ اسے زکوۃ ختم کر دے۔'' [2]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یتیموں کے اموال کو تجارت میں لگاؤ، مبادا انہیں زکوۃ ختم کر دے۔'' [3]

یہ دونوں روایات اگرچہ ضعیف ہیں تاہم بطور تائید انہیں پیش کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔

زیورات کی زکوۃ

سوال میرے پاس دس تولے سونے کے زیورات تھے جو میں نے ایک گھریلو ضرورت کے پیش نظر فروخت کر دیئے ہیں، میں نے ان کی زکوۃ ادا نہیں کی تھی، اب مجھے شریعت کیا حکم دیتی ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی کریں۔

جواب سونے کے زیورات اگر نصاب کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوۃ واجب ہو جاتی ہے، اگر کسی کو زکوۃ کے وجوب کا علم نہیں تھا، پھر انہیں فروخت کیا ہے تو اس صورت میں زکوۃ نہ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر آپ کو اس کے وجوب کا علم تھا اور دیدہ دانستہ طور پر اس سے پہلو تہی کی ہے تو اڑھائی فیصد کے حساب سے اس کی زکوۃ ادا کی جائے اور اگر کئی سالوں سے زکوۃ ادا

---

[1] التوبہ: ۱۰۳۔ [2] ترمذی: زکوۃ ٦٤١۔ [3] بیہقی ص ۱۰۷، ۹، ٤۔

نہیں کی تو مارکیٹ میں سونے کی قیمت کے حساب سے ان زیورات سے زکوۃ ادا کرنا ہوگی اور اگر اس کے وجوب کا علم آخری سال ہوا پھر انہیں فروخت کر دیا اور زکوۃ ادا نہیں کی تو ایک سال کی زکوۃ ادا کر دی جائے۔ ان کی زکوۃ آپ خواہ ادا کریں یا آپ کے مشاورت سے آپ کا خاوند اپنی گرہ سے دے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کا بھائی، باپ اور بیٹا بھی آپ کی اجازت سے زیورات کی زکوۃ ادا کر سکتا ہے، بہر حال اس فرض کی ادائیگی ضروری ہے خواہ آپ خود ادا کریں یا آپ کی اجازت سے کوئی دوسرا ادا کر دے، مسئلہ کی نوعیت یکساں رہے گی۔ (واللہ اعلم)

صدقہ فطر میں قیمت ادا کرنا

سوال ہمارے ہاں غرباء کی ضرورت کے پیش نظر فطرانہ کی قیمت ادا کر دی جاتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے دور میں فطرانہ کی قیمت ادا کرنا ثابت نہیں ہے بلکہ اس وقت فطرانہ میں جنس ہی ادا کی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فطرانہ کا مقصد ''طعمة للمساكين'' (مساکین کی خوراک) ٹھہرایا ہے، اس کا بھی تقاضا ہے کہ فطرانہ میں اشیاء خوردنی ادا کی جائیں، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ صرف جنس ہی سے فطرانہ ادا کرنے کے قائل ہیں۔ محدثین کرام میں سے کسی نے بھی اس بات کی صراحت نہیں کی ہے جس سے پتہ چلتا ہو کہ فطرانہ میں قیمت بھی دی جاسکتی ہے بلکہ محدث ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے قیمت ادا کرنے کے خلاف عنوان قائم کیا ہے۔ (صحیح ابن خزیمہ، ص ۸۹، ج ۴) محدث العصر علامہ عبید اللہ رحمانی لکھتے ہیں کہ صدقۃ الفطر کی قیمت نہ دی جائے بلکہ جنس سے ہی ادا کیا جائے البتہ کسی عذر کے پیش نظر قیمت دی جاسکتی ہے۔ [1]

عذر کی صورت یوں ہوسکتی ہے کہ ایک شخص روزانہ بازار سے آٹا خرید کر استعمال کرتا ہے تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بازار سے غلہ خرید کر صدقہ فطر ادا کرے، بلکہ اسے چاہیے کہ بازار کے نرخ کے مطابق اس کی قیمت ادا کر دے۔

مال زکوۃ دوسرے شہر میں صرف کرنا

سوال ہمارے ہاں اکثر مدارس کے لیے سفیر حضرات مال زکوۃ اکٹھا کرتے ہیں، کیا زکوۃ کے حقدار مقامی فقراء ہیں یا انہیں دوسرے شہروں کے مستحقین پر بھی صرف کیا جاسکتا ہے؟

جواب بہتر یہ ہے کہ جس علاقے سے زکوۃ وصول کی جائے، اسی علاقہ کے فقراء میں تقسیم کر دی جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''زکوۃ اغنیاء سے وصول کر کے وہاں کے محتاجوں پر تقسیم کر دی جائے۔'' [2]

تاہم ضرورت و مصلحت کے پیش نظر کسی دوسرے شہر میں بھی مال زکوۃ صرف کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ہمارے ہاں مدارس کے لیے زکوۃ وصول کی جاتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''مالداروں سے زکوۃ وصول کی جائے اور فقراء پر خرچ کر دی جائے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔'' [3]

---

[1] مرعاة المفاتيح، ص ۱۰۰، ج ٤۔ [2] بخاري الزكوة: ۱٤٥۸۔ [3] صحيح بخاري، الزكوة: باب نمبر ٦٣۔

انھوں نے اس حدیث کونقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''**تؤخذ من اغنیائهم و نرد علی فقرائهم**'' معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فقراء ھم کی ضمیر کوتمام انسانوں کے لیے عام رکھا ہے، بہر حال کسی مصلحت کی بنا پر زکوۃ دوسرے شہر منتقل کی جا سکتی ہے مثلاً مقامی جماعت مدرسہ کے کے اخراجات کی متحمل نہیں ہے یا مقامی طور پر لوگ اس کے ضرورت مند نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

والدین کو زکوۃ دینا

سوال میرے والدین انتہائی غریب ہیں، کیا میں انہیں مال زکوۃ دے سکتا ہوں، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا وضاحت ہے؟

جواب انسان کے لیے یہ انتہائی شقاوت اور بد بختی ہے کہ وہ والدین کی خدمت کرنے کے بجائے انہیں اپنی زکوۃ دینے کے متعلق سوچ و بچار کرے۔ والدین نے اسے بچپن سے جوانی تک پالا اور اس کے جملہ اخراجات برداشت کیے اب جب بیٹا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے تو انہیں اپنی جیب سے کچھ دینے کے بجائے زکوۃ دینے کے لیے فتویٰ پوچھتا ہے۔ بیٹے کو چاہیے کہ وہ اپنے ضرورت مند والدین پر اپنے ذاتی مال سے خرچ کرے، بلکہ اگر والدین ضرورت مند ہیں تو وہ اولاد کی اجازت کے بغیر بھی ان کے مال میں سے حسبِ ضرورت لے سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''سب سے پاکیزہ چیز جو آدمی کھاتا ہے وہ ہے جو اس نے خود کمائی ہو اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی ہے۔'' [1]

والدہ کا حق تو والد سے بھی بڑھ کر ہے جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔ [2]

کرنسی نوٹ پر زکوۃ

سوال ہمارے ہاں رائج کرنسی یعنی روپیہ میں کس حساب سے زکوۃ دی جائے، سونے کا نصاب معتبر ہوگا یا چاندی کے نصاب کو معیار بنایا جائے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کے دور میں سونا چاندی دھات کے علاوہ زر مبادلہ کے طور پر بھی استعمال ہوتے تھے، سونے کا سکہ دینار اور چاندی کا سکہ درہم رائج تھا، اس وقت سونے اور چاندی دونوں دھاتوں کا نصاب مقرر تھا، سونے کا نصاب ۲۰ دینار یعنی ساڑھے سات تولے یا ۸۵ گرام تھا جب کہ چاندی کا نصاب ۲۰۰ درہم یعنی ساڑھے باون تولے یا ۵۹۵ گرام تھا، اس وقت ان کی قیمتوں میں صرف ایک اور سات کی نسبت تھی، دوسرے الفاظ میں سونے کا بھاؤ چاندی کے مقابلہ میں صرف سات گنا زیادہ تھا، اس کے بعد سونے کی قیمت تو بڑھتی رہی اور چاندی کی قیمت گرتی رہی حتی کہ ۱۹۳۷ء کی جنگ عظیم سے پہلے سونے اور چاندی کی مالیت کا تناسب ایک اور تیس کا تھا، اب تو نسبت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ سونا تقریباً ساٹھ ہزار روپے تولہ اور چاندی صرف پانچ صد روپے تولہ ہے، اس کی ہمارے نزدیک دو وجوہ ہیں:

① چاندی کے بجائے سونے کو زر مبادلہ قرار دیا گیا ہے۔ ② چاندی کے زیورات آہستہ آہستہ متروک ہو چکے ہیں۔

---

[1] ابو داؤد، البیوع: ۳۵۲۸۔ [2] ترمذی، البر و الصلة: ۱۸۹۷۔

ہمارے ہاں رائج کرنسی نوٹ زر مبادلہ کے طور پر ہوتے ہیں، ان کی زکوٰۃ کے متعلق دو مختلف نظریات ہیں: کچھ اہل علم کا کہنا ہے کہ کرنسی کے نصاب کے لیے اتنے روپے ہونے چاہئیں جن سے ساڑھے سات تولے سونا خریدا جا سکے یعنی کم از کم چار لاکھ پچاس ہزار روپے پر زکوٰۃ لاگو ہوگی کیونکہ ساٹھ ہزار روپے تولہ کے حساب سے ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت چار لاکھ پچاس ہزار بنتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہر ملک میں زر مبادلہ کے طور پر سونے کو معیار بنایا جاتا ہے یعنی ہر ملک اتنے ہی نوٹ چھاپتا ہے جتنے اس کے پاس سونے کے ذخائر ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس کچھ حضرات کہتے ہیں کہ نقدی کی زکوٰۃ کے لیے چاندی کو معیار بنایا جائے یعنی اتنی نقدی پر زکوٰۃ لاگو کی جائے جس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم چھبیس یا ستائیس ہزار نقدی پر زکوٰۃ وصول کی جائے کیونکہ اتنی مالیت سے ساڑھے باون تولے چاندی خریدی جاسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ سونے اور چاندی کا نصاب جو رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے اس میں قطعی طور پر ردو بدل کی کوئی گنجائش نہیں البتہ نقدی کا نصاب چاندی کے مطابق مقرر کیا جائے، اس کی درج ذیل وجوہات ہیں۔

① ہمارے ہاں برصغیر میں نوٹوں کے اجراء سے پہلے چاندی کا روپیہ رائج تھا لہٰذا چاندی کو بنیاد بنا کر چاندی کی موجودہ قیمت کے حساب سے باون تولے چاندی کی قیمت نکال لی جائے۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ آج کل سعودی عرب میں کاغذی نوٹوں کو ورقہ کہا جاتا ہے اور یہی لفظ چاندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

② غرباء اور مساکین کا فائدہ اسی میں ہے کہ چاندی کو معیار بنایا جائے تاکہ تھوڑی مالیت پر زکوٰۃ وصول کر کے ان سے تعاون کیا جائے، اگر سونے کو معیار بنایا جائے تو کم از کم ساڑھے چار لاکھ نقدی پر زکوٰۃ لاگو ہوگی، اتنی مالیت والے حضرات ہمارے معاشرہ میں بہت کم ہوں گے۔

③ چاندی کو نقد روپیہ کے لیے نصاب قرار دینا اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ مبادا اللہ کا حق ہمارے ذمے رہ جائے لہٰذا اس اہم دینی فریضہ میں ہر ممکن احتیاط لازم ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آج کل کوئی ملک بھی سونے کو بنیاد بنا کر نوٹ نہیں چھاپتا، غالباً اسی لیے کئی ممالک افراط زر کا شکار ہوتے ہیں، ہر ملک دھڑا دھڑ نوٹ چھاپے جا رہا ہے، خواہ اس کے ہاں سونے کے ذخائر نہ ہوں۔ بہر حال چاندی کو معیار بنایا جانا زیادہ مناسب ہے، یہ تشخیص ہر مقام پر ہر دفعہ خود کرنا ہوگی کیونکہ چاندی کا بھاؤ بھی بدلتا رہتا ہے، اگر چاندی کا بھاؤ ایک ہزار روپے فی تولہ ہو تو کم از کم ساڑھے باون ہزار روپے پر زکوٰۃ لاگو ہوگی، اس سے کم رقم پر زکوٰۃ دینا ضروری نہیں، انسان کے پاس جتنی نقدی ہو اس میں سے اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے، اس کا حساب پورا پورا کرنا چاہیے، اندازے سے کام نہ چلایا جائے۔

قیمتی جواہرات میں زکوٰۃ

سوال کچھ زیورات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں قیمتی پتھروں اور موتیوں کا جڑاؤ ہوتا ہے۔ مثلاً انگوٹھیوں میں مرجان،

زبرجد اور یاقوت جیسے قیمتی پتھر لگے ہوتے ہیں، ان کے متعلق زکوۃ کس حساب سے ادا کی جائے گی، زیورات میں انہیں شمار کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب سونے چاندی کے علاوہ دیگر جواہرات کو استعمال کرنے میں کوئی زکوۃ نہیں دی جاتی، کیونکہ ان کے استعمال کرنے پر زکوۃ کی ادائیگی کتاب وسنت سے ثابت نہیں، اگر انہیں تجارت اور خرید وفروخت کے لیے رکھا ہے تو پھر عام تجارتی سامان کی طرح ان کی قیمت میں زکوۃ ادا کرنا ہوگی۔ اسی طرح انگوٹھیوں میں جو قیمتی پتھروں کے نگینے ہوتے ہیں اگر آسانی کے ساتھ انہیں الگ کیا جاسکتا ہے تو انہیں الگ کر کے سونے کے صافی وزن سے زکوۃ ادا کر دی جائے گی اور اگر انہیں الگ کرنے سے انگوٹھی خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو سونے کے وزن کا اندازہ کر کے اس سے زکوۃ ادا کی جائے گی۔ جواہرات کے استعمال کرنے پر کوئی زکوۃ نہیں خواہ وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں، اگر یہ انگوٹھیاں بغرض تجارت تیار کی گئی ہیں اور ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے تو سونے کی قیمت کے ساتھ ان کا حساب لگایا جائے گا پھر مجموعی قیمت سے زکوۃ ادا کی جائے گی جو اڑھائی فیصد کے حساب سے ہوگی، مثلاً انگوٹھی میں لگے ہوئے سونے کی قیمت دو لاکھ اور قیمتی پتھر کا نگینہ ایک لاکھ کا ہے تو تین لاکھ کی زکوۃ ادا کرنا ہوگی جو ساڑھے سات ہزار روپیہ ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ انگوٹھی تجارت اور خرید وفروخت کے لیے ہو، اگر اسے کسی عورت نے بطور زیور استعمال کرنا ہے تو اس صورت میں صرف سونے پر زکوۃ ہوگی قیمتی نگینہ سے زکوۃ نہیں دی جائے گی۔ (واللہ اعلم)

زکوۃ کے لیے اصل مال پر سال گزارنا

سوال کیا زکوۃ ادا کرتے وقت مال پر سال کا گزرنا ضروری ہے، آیا سال گزرنے سے پہلے اگر کوئی ضرورت مند آجائے تو کیا اسے زکوۃ دی جاسکتی ہے یا سال گزرنے کا انتظار کرنا ہوگا؟

جواب زکوۃ کی شرائط میں سے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ مال مملوکہ پر ایک سال گزر جائے، شریعت نے حکمت و مصلحت کے پیش نظر ایک مدت مقرر کر دی ہے اور وہ مدت ایک سال ہے۔ زکوۃ کو اس مدت سے مربوط کرنے سے اہل ثروت اور زکوۃ کے حقداروں میں توازن پیدا کرنا مقصود ہے۔ اگر سال سے کم عرصے میں زکوۃ کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا جائے تو اس سے مال داروں کے مال میں نقصان کا اندیشہ ہے اور سال سے زیادہ مدت مقرر کر دی جاتی تو اس سے مستحقین زکوۃ کا استحقاق مجروح ہوتا، لہٰذا شریعت نے زکوۃ کے واجب ہونے کے لیے ایک سال گزرنے کی شرط لگا دی ہے۔ اگر اموال مملوکہ پر سال گزرنے سے پہلے پہلے صاحب فوت ہو جائے یا اس کا مال تلف یا چوری ہو جائے تو اس میں زکوۃ ساقط ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر سال گزرنے سے پہلے کوئی حقدار آجائے اور زکوۃ کا طالب ہو تو اسے فرضیت سے قبل زکوۃ دی جاسکتی ہے، ادا کردہ زکوۃ کو آئندہ حساب میں شامل کر لیا جائے گا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ زکوۃ الفطر، عید کا چاند نظر آنے سے ایک دو دن پہلے تحصیل دار کو جمع کرا دیتے تھے، اس سے قبل از وقت زکوۃ ادا کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تین چیزیں سال پورا ہونے کی شرط سے مستثنیٰ ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① تجارت کا نفع: جو مال تجارت میں لگا ہے وہ اصل ہے، اس میں سال گزرنا ضروری ہے لیکن جو سال کے دوران نفع حاصل ہوتا ہے وہ اصل کے تابع ہوتا ہے لہذا اس نفع پر سال کا گزرنا ضروری نہیں۔

② مویشیوں سے پیدا ہونے والے بچے بھی اپنی ماؤں کے تابع ہوتے ہیں، بچوں پر بھی سال گزرنے کی شرط ساقط ہے۔ انہیں اپنے اصل کے ہمراہ شمار کیا جائے گا۔

③ زمین کی پیداوار بھی سال گزرنے سے مستثنیٰ ہے یعنی غلہ جات کا سال اس وقت ہے جب یہ حاصل ہوں، ان تین کے علاوہ باقی اموال میں زکوۃ کے لیے ان پر سال کا گزر جانا ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

زیورات سے مال کا حساب

سوال جو زیورات بازار سے لیے جاتے ہیں، ان میں سے زکوۃ، بل پر لکھے ہوئے وزن پر ہوگی یا سونے کے اضافی وزن پر زکوۃ دی جائے گی، اس کے متعلق وضاحت کریں، کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب بنیادی طور پر زکوۃ سونے پر ہے بشرطیکہ نصاب کو پہنچ جائے۔ سونے کا نصاب ۲۰ دینار جو کہ ساڑھے سات تولہ کے برابر ہوتے ہیں، رائج الوقت اعشاری نظام کے اعتبار سے ۸۵ گرام وزن بنتا ہے، اگر سونا اتنی یا اس سے زیادہ مقدار میں ہے تو اس سے چالیسواں حصہ زکوۃ ادا کی جاتی ہے ۔ دور حاضر میں جو زیورات زرگر حضرات تیار کرتے ہیں ان میں درج ذیل چار چیزیں ایسی شامل ہوتی ہیں جو سونا نہیں ہوتیں اگرچہ ان کی قیمت سونے کے برابر ہی وصول کی جاتی ہے۔

① سونا نرم اور کمزور ہوتا ہے، اسے سخت اور مضبوط کرنے کے لیے اس میں تانبے یا چاندی کی ملاوٹ کی جاتی ہے تاکہ زیورات میں مضبوطی آجائے یہ ملاوٹ ایک تولہ سونے میں نصف ماشہ سے لے کر دو ماشہ تک کہلاتی ہے، یہ ملاوٹ ہونے کے حساب سے ہی فروخت کی جاتی ہے۔

② زیورات کو جوڑ لگانے کے لیے جو ٹانکا تیار کیا جاتا ہے وہ جست یا چاندی کا ہوتا ہے، سونے کا ٹانکا کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے کسی دوسری دھات سے انہیں جوڑ لگایا جاتا ہے۔ اکثر زرگر حضرات کا کہنا ہے کہ جوڑ لگاتے وقت وہ دھات اڑ جاتی ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے بہرحال اس ٹانکے کو بھی سونے کے بھاؤ فروخت کیا جاتا ہے۔

③ زیورات میں کچھ موتی ایسے ہوتے ہیں جنہیں وزن کرتے وقت علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ باریک موتی ایسے ہوتی ہیں جنہیں الگ کرنے سے زیور کی خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اس لیے انہیں سونے کے ساتھ ہی وزن کیا جاتا ہے اور وہ سونے کے بھاؤ ہی فروخت ہوتے ہیں۔

④ زیورات میں چمک پیدا کرنے کے لیے اسے کئی مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ ہر مرحلہ میں اسے رگڑنے، تراشنے اور چھیلنے سے وزن میں کمی آجاتی ہے اسے زرگر حضرات کی اصطلاح میں ''پالش'' کا نام دیا جاتا ہے۔ زیورات کے اصل وزن میں پالش کا وزن الگ جمع کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی وزن نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ کمی ہوتی ہے جو مختلف مراحل گزرنے کے بعد عمل میں آتی ہے، اس

اضافی وزن کو بھی سونے کے بھاؤ دیا جاتا ہے، جب زیور واپس کرنا ہوتا ہے تو ایک رتی یا دو رتی فی ماشہ کٹوتی یہی ہوتی ہے جو صارف کے کھاتے میں ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بل پر لکھا ہوا تمام وزن سونے کا نہیں ہوتا بلکہ اس میں کچھ مزید چیزیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اس لیے کسی ماہر اور تجربہ کار زرگر سے صافی سونے کا حساب لگا کر اس سے زکوۃ ادا کی جائے اور زکوۃ کا نصاب ۸۵ گرام ہے۔ جس سے چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فیصد زکوۃ ادا کی جائے۔ (واللہ اعلم)

آلوؤں سے عشر

سوال ہمارے ہاں آلوؤں کی فصل بہت ہوتی ہے کیا اس سے بھی عشر نکالا جائے گا؟

جواب قرآن وحدیث کے جو عمومی دلائل ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ہر زمینی پیداوار سے عشر نکالا جائے بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے۔ عمومی دلائل حسب ذیل ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی میں سے خرچ کرو اور اس چیز سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کیا ہے۔'' [1]

اس عام حکم کا تقاضا ہے کہ زمین سے پیدا ہونے والی ہر چیز سے زکوۃ ادا کی جائے۔ قرآن مجید میں ہے:

''اور اس میں جو حق واجب ہے وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرو۔'' [2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کھیتی سے غلہ کاٹ کر صاف کر لیا جائے اور درختوں سے پھل توڑ لیا جائے تو اس سے حق واجب ادا کرنا چاہیے۔ اس آیت کریمہ کے عموم کا بھی تقاضا ہے کہ زمین کی ہر پیداوار سے عشر ادا کرنا چاہیے۔ آلو کی فصل تو بہت منفعت بخش ہے، اگر اس کی پیداوار نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے عشر دینا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جَو، گندم، منقی اور کھجور ان چار اصناف کے علاوہ کسی غلے سے زکوۃ نہ وصول کی جائے۔'' [3]

اس حدیث سے کچھ اہلِ علم نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ آلو وغیرہ سے عشر نہیں لیا جائے گا کیونکہ عشر کے لیے حدیث میں صرف چار اجناس کا ذکر ہے لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ ابو حذیفہ نامی راوی کا حافظہ کمزور ہے نیز اس میں سفیان ثوری مدلس راوی ہیں جو ''عن'' سے بیان کرتے ہیں پھر طلحہ بن یحییٰ بھی مختلف فیہ ہے، لہٰذا عمومی دلائل کے پیش نظر آلوؤں سے عشر ادا کیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

مسجد کے مدرس پر زکوۃ خرچ کرنا

سوال مسجد کی انتظامیہ کے پاس زکوۃ، فطرانہ سے پس انداز کی ہوئی رقم موجود ہے اور مسجد میں بسلسلہ ناظرہ قرآن بچوں کی تعلیم جاری ہے، کیا مذکورہ رقم سے مدرس کو تنخواہ دی جا سکتی ہے؟

جواب مسجد اور اس کے کسی مصرف پر زکوۃ اور فطرانہ کی رقم خرچ نہیں کی جا سکتی، ہاں اگر مدرس غریب و مسکین ہے تو

---

[1] البقرۃ: ۲۸۷۔ [2] الانعام: ۱۴۱۔ [3] مستدرک حاکم: ص۱۰، ج۱۔

اسے زکوۃ فطرانہ دیا جا سکتا ہے، اس کے لیے مسجد میں بسلسلہ ناظرہ قرآن مدرس ہونا ضروری نہیں۔ کچھ حضرات مصارف زکوۃ میں فی سبیل اللہ کے مفہوم کو اس قدر وسعت دیتے ہیں کہ ہر قسم کے رفاہی کاموں پر زکوۃ صرف کرنے کو جائز خیال کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو زکوۃ کو آٹھ مصارف میں محدود کرنا بے مقصد ٹھہرتا ہے کیونکہ اس طرح فی سبیل اللہ کی مد اس قدر وسیع ہو جاتی ہے کہ ہر قسم کے کار خیر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ البانی مرحوم لکھتے ہیں:

''آیت مصارف میں فی سبیل اللہ کی یہ تفسیر کہ اس سے جملہ اعمال خیر مراد ہوں گے، سلف میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو آیت کریمہ میں زکوۃ کو صرف آٹھ مصارف میں محدود کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' [1]

ہمارے رجحان کے مطابق آیت میں ''فی سبیل اللہ'' سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے جیسا کہ مختلف احادیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے، کیونکہ اس سے مراد براہ راست اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہوتا ہے، دینی مدارس بھی اسی مد میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے حج کو بھی فی سبیل اللہ میں شامل فرمایا ہے جیسا کہ آپ نے حضرت ام معقل اسدیہ کو اس اونٹ پر حج کرنے کا حکم دیا جسے ان کے شوہر نے فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا، آپ نے اس وقت فرمایا تھا کہ حج بھی فی سبیل اللہ ہے۔ [2]

اس لیے صورت مسئولہ میں زکوۃ اور فطرانہ کی رقم مسجد میں بسلسلہ ناظرہ قرآن بچوں کو پڑھانے والے مدرس کو نہیں دی جا سکتی۔

ڈیری فارم پر زکوۃ

سوال لوگوں نے بھینسوں اور گائیوں کے فارم بنا رکھے ہیں، ان سے زکوۃ کیسے ادا ہو گی، زکوۃ کے لیے جانوروں کا حساب ہو گا یا ان کی پیداوار یعنی دودھ وغیرہ کے حساب سے زکوۃ ادا کرنا ہو گی، قرآن و حدیث کے مطابق وضاحت فرمائیں۔

جواب پالتو جانوروں کی چار اقسام حسب ذیل ہیں۔

① وہ جانور جو سال کے اکثر حصہ میں باہر چرتے ہوں، ان کے لیے قیمتاً چارہ نہیں خریدا جاتا، ایسے جانوروں کی زکوۃ کے لیے تین شرائط ہیں۔ (الف) نصاب کو پہنچ جائیں۔ (ب) ان پر سال گزر جائے۔ (ج) وہ جنگلات میں چرنے والے ہوں۔

② جانور گھروں یا ڈیری فارم میں رکھے ہوتے ہیں، ان کے لیے چارہ خریدا جاتا ہے یا کاشت کیا جاتا ہے وہ صرف دودھ یا افزائش نسل کے لیے رکھے جاتے ہیں، ایسے جانوروں کی پیداوار (دودھ) کی آمدن اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس سے زکوۃ ادا کرنا ہو گی۔

③ وہ جانور جو کھیتی باڑی یا سواری کے لیے رکھے جاتے ہیں، ان میں زکوۃ نہیں ہوتی۔

④ وہ جانور جو تجارت کے لیے رکھے جاتے ہیں، ان کی قیمت میں زکوۃ ہو گی، مثلاً ایک بھینس اگر لاکھ روپے کی ہے تو اس میں اڑھائی ہزار روپیہ بطور زکوۃ ادا کرنا ہو گا۔ صورت مسئولہ میں اسی تفصیل کے مطابق اگر ڈیری فارم میں گائے بھینس صرف دودھ کے لیے رکھی گئی ہیں تو ان کے دودھ کا حساب ہو گا اس سے حاصل ہونے والی رقم اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس

---

[1] تمام المنه: ص ٣٨٢۔ [2] أبو داؤد، المناسك: ١٩٨٩۔

سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ اس صورت میں بھینسوں اور گائیوں کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں اور اگر انہیں برائے فروخت رکھا گیا ہے یا انہیں گوشت کے لیے پالا گیا ہے یا بکریاں قربانی کے دنوں میں فروخت کرنے کے لیے رکھی گئی ہیں تو ان کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی۔ ہمارے ہاں جو ڈیری فارم ہیں ان میں جانور دودھ کے لیے رکھے جاتے ہیں لہٰذا اس دودھ سے حاصل ہونے والی رقم اگر نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

حرام کمائی سے صدقہ کرنا

سوال ہمارا ایک دوست غلط کاروبار کرتا ہے پھر اس حرام کمائی سے صدقہ و خیرات بھی کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صدقہ و خیرات کرنے سے سب گناہ دھل جاتے ہیں، کیا واقعہ صدقہ کرنے سے حرام کمائی کا دھبہ صاف ہو جاتا ہے؟

جواب یہ ہماری انتہائی بدبختی ہے کہ آج کل حلال اور حرام کی تمیز بالکل مٹ چکی ہے۔ پیسے کی طمع اور دولت کی حرص نے ہر آدمی کو کچھ اس طرح اندھا کر دیا ہے کہ وہ جائز اور ناجائز ہر طریقہ سے دولت سمیٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اس مقصد کے لیے نہ وہ مکر و فریب سے باز آتا ہے اور نہ ہی جھوٹ اور بد دیانتی کو چھوڑتا ہے۔ غالباً اسی دور کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''لوگوں پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ آدمی اس بات کی پروا نہیں کرے گا، جو مال اس کے ہاتھ آیا وہ حلال ہے یا حرام۔'' [1]

اس حدیث کے پیش نظر ہمیں چاہیے کہ ہم کسب حرام سے کلی طور پر اجتناب کریں اور اپنی تمام تر توجہ کسب حلال کی طرف دیں، کیونکہ حرام خوری کرنے والا خواہ کتنی ہی عاجزی سے اپنے رب کو پکارے، اللہ تعالیٰ اس کی دعا نہیں سنتے اور نہ ہی اسے شرف قبولیت سے نوازتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک حرام خور کا ذکر کیا جو لمبے سفر سے آیا جس کے بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا ہے: اے میرے رب! اے میرے رب! جبکہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام اور حرام ہی سے پروان چڑھا تو ایسے شخص کی دعا کیونکر قبول ہو......؟ [2]

ایسے حرام خور کے متعلق یہ بھی صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کا صدقہ بھی قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص حرام کمائے پھر اسے صدقہ کرے تو ایسا صدقہ قبول نہیں ہوتا اور اگر اس سے خرچ کرے تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ [3]

حدیث میں اس امر کی بھی صراحت ہے کہ ''اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور حلال و پاکیزہ چیز کو قبول کرتا ہے۔ [4]

لہٰذا ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے جو ڈھٹائی کے ساتھ حرام مال کماتا ہے اور پھر دھوکہ دینے کے لیے اس سے کچھ صدقہ کر دیتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ بزعم خویش اسے اپنے گناہ کا کفارہ سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کسب حلال کی توفیق دے۔ آمین!

قبل از وقت زکوٰۃ دینا

سوال ہم ماہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کر دیتے ہیں لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوران سال کوئی ضرورت، مند

[1] صحیح البخاری، البیوع: ۲۰۵۹۔
[2] مسلم الزکوۃ: ۱۰۱۵۔
[3] مسند امام احمد، ص ۳۸۷، ج ۱۔
[4] صحیح مسلم، الزکوۃ: ۱۰۱۵۔

ہمارے سامنے آتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مال زکوۃ سے اس کا تعاون کریں، کیا قبل از وقت زکوۃ ادا کی جاسکتی ہے، شرعی طور پر اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

جواب زکوۃ کے فرض ہونے کی تین شرائط ہیں۔

① مال نصاب کو پہنچ جائے۔ ② مال ضروریات سے فاضل ہو۔ ③ اس مال پر سال گزر جائے

اگر ایک آدمی نے ان شرائط کی موجودگی میں زکوۃ ادا کر دی ہے، اس کے بعد پھر اس کے سامنے کوئی ضرورت مند آجاتا ہے اور وہ شخص مال زکوۃ کے علاوہ اپنی گرہ سے اس کا تعاون کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو وہ زکوۃ فرض ہونے سے پہلے بھی اس سے تعاون کر سکتا ہے، یعنی زکوۃ کی ادائیگی قبل از وقت کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آیا زکوۃ اپنے وقت سے پہلے ادا ہو سکتی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مال پر سال گزرنے سے پہلے زکوۃ دینا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے ہاں بھی قبل از وقت زکوۃ ادا کرنا جائز ہے۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے "قبل از وقت زکوۃ ادا کرنے کا بیان" جبکہ امام ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وقت سے پہلے زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، ہمارے رجحان کے مطابق امام ابن حزم رحمہ اللہ کا موقف مرجوح ہے۔ (واللہ اعلم)

صدقہ فطر کے لیے صاحبِ نصاب کی شرط

سوال ہمارے ہاں کچھ اہل علم کا کہنا ہے کہ صدقہ فطر ان حضرات پر فرض ہے جو صاحب نصاب ہوں، اس موقف کی کیا حیثیت ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب صدقہ فطر ادا کرنے کے لیے صاحب نصاب ہونے کی شرط لگانا خود ساختہ اور ایجاد بندہ ہے، شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کیونکہ احادیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ صدقہ فطر ہر چھوٹے بڑے، مرد، عورت اور آزاد یا غلام کی طرف سے ادا کیا جائے، اس کے لیے کوئی نصاب مقرر نہیں ہے۔ بلکہ ہر اس شخص پر اس کا ادا کرنا ضروری ہے جس کے پاس عید کے دن اپنے اہل و عیال کی خوراک سے اتنا غلہ زائد موجود ہو کہ وہ گھر کے ہر فرد کی طرف سے صدقہ فطر ادا کر سکے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"زکوۃ فطر میں نصاب کی ملکیت کا اعتبار نہیں ہے بلکہ یہ ہر انسان پر واجب ہے جو عید کی رات اور دن اپنی خوراک سے زائد ایک صاع کے برابر رکھتا ہو، یہی جمہور اہل علم کا موقف ہے۔" [2] حدیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زکوۃ فطر مسلمانوں میں سے ہر نفس پر فرض ہے۔" [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مقام پر اشارے سے بھی نہیں فرمایا کہ ہر نفس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں، جن کے پاس زکوۃ مال کا

---

[1] ابو داؤد، الزکوۃ: ۱۶۲۴۔ [2] اختیارات: ص ۱۰۲۔ [3] صحیح مسلم، الزکوۃ: ۲۲۸۲۔

نصاب نہ ہو، اس لیے جن حضرات نے صدقہ فطر کے لیے صاحب نصاب کی شرط لگائی ہے وہ ان کی رائے تو ہو سکتی ہے لیکن شریعت کا قطعاً یہ تقاضا نہیں ہے۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ نے ہر اس شخص کی طرف سے فطرانہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے جس کی کفالت دوسرے کے ذمے ہو خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، غلام ہو یا آزاد، لیکن اس کا صاحب نصاب ہونا ضروری نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

ورثا کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنا

سوال ہماری مسجد میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے، ان کا کھانا وغیرہ ہمارے گھر سے ہی جاتا تھا وہ بیمار ہوئے تو میں نے اُن کا اتا پتا معلوم کرنا چاہا۔ انھوں نے بتایا کہ میرے چار بھائی، ایک بہن اور بیوی فلاں شہر میں رہتے ہیں، میں ان سے لاتعلق ہوں، وہ فوت ہو گئے تو میرے پاس ان کی بارہ ہزار روپے کی رقم امانت پڑی ہے کیا میں اس امانت کو ان کی طرف سے صدقہ کر سکتا ہوں؟

جواب بزرگ کا رشتہ داروں سے قطع تعلقی کر کے گوشہ نشینی اختیار کرنا کوئی اچھا اقدام نہیں، اگر معاشرہ میں برائی زیادہ ہو جائے تو بھی علیحدگی اختیار کرنا ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے، ان کے اندر رہتے ہوئے ان کی اصلاح کے لیے کوشاں رہنا ضروری تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو مومن لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان سے ملنے والی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے زیادہ ثواب حاصل کر لیتا ہے جو لوگوں سے ملتا جلتا نہیں اور ان کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر صبر نہیں کرتا۔ [1]

تاہم وہ بزرگ اب فوت ہو چکے ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ اپنی رحمت سے نوازے، صورت مسئولہ میں بزرگ کی امانت جو بارہ ہزار روپے ہے اب وہ اس کے ورثاء کو منتقل ہو چکی ہے، ورثا کی اجازت کے بغیر اسے صدقہ نہیں کیا جا سکتا، اگر اس نے وصیت کی ہوتی تو ایک تہائی یعنی چار ہزار روپے تک صدقہ کرنے کی اجازت تھی، لیکن سوال میں وصیت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے اگر اس کے کفن دفن پر کوئی اخراجات نہیں ہوئے ہیں تو اس کی رقم اس کے ورثاء کے حوالے کر دی جائے، چونکہ وہ لاولد تھے اس لئے بیوہ کو ۱/۴ ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو بیویوں کے لیے ترکہ سے چوتھائی ہے۔'' [2] بارہ ہزار کا چوتھائی تین ہزار روپے بیوہ کو دے دیئے جائیں، پھر باقی ماندہ رقم چار بھائیوں اور ایک بہن میں اس طرح تقسیم کی جائے کہ ایک بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر اس کے کئی بھائی اور بہنیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔'' [3] اس آیت کے پیش نظر باقی نو ہزار میں سے دو دو ہزار فی بھائی اور ایک ہزار بہن کا ہے، اگر ورثاء رضامند ہوں تو پوری رقم صدقہ کی جا سکتی ہے بصورت دیگر اسے صدقہ کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

صدقہ فطر کی مقدار

سوال صدقہ فطر کے متعلق کچھ اہل علم کا کہنا ہے کہ نصف صاع بھی دیا جا سکتا ہے، جب کہ ہم تو ایک صاع ہی دیتے

---

[1] ابن ماجہ، الفتن: ۴۰۳۲۔ [2] النساء: ۱۲۔ [3] (النساء: ۱۷۶۔

آرہے ہیں، کیا نصف صاع دینے کی کوئی گنجائش ہے، وضاحت کریں۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے بنیادی غذائی اجناس سے صدقہ فطر کے لیے ایک صاع کے برابر ادا کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں عید الفطر کے موقع پر کھانے کی اشیاء سے ایک صاع ادا کرتے تھے اور اس وقت ہمارے کھانے کی اشیاء جو، منقی، پنیر اور کھجور ہوا کرتی تھیں۔ [1] رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں گندم عام دستیاب ہونے لگی تو صدقہ فطر گندم سے ادا ہونے لگا لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ لوگوں نے قیمت کو بنیاد بنا کر گندم سے ایک صاع کی بجائے نصف صاع ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ [2]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ وضاحت کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں جب شام کے علاقہ سے گندم آنا شروع ہوئی تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے کے مطابق اس گندم کا ایک مُد دوسری غذائی اجناس کے دو مُد کے برابر ہے۔ [3] ایک روایت میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ہم غذائی اجناس سے ایک صاع ہی صدقہ فطر دیا کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حج یا عمرہ کرنے کے لیے ارضِ حرم میں آئے تو انھوں نے منبر پر خطبہ دیا اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میرے خیال کے مطابق اس گندم کے دو مُد کھجوروں کے ایک صاع کے برابر ہیں، پھر لوگوں نے اس کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا لیکن میں تو ایک صاع ہی دیتا رہوں گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں دیا کرتا تھا۔'' [4] حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے بھی ایک روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں گندم سے دو مُد یعنی نصف صاع بطور فطرانہ ادا کرتے تھے [5] عرب میں دوسری اشیاء خوردنی کے مقابلہ میں گندم قیمتی ہوتی تھی اس لیے نصف صاع کا اعتبار کیا گیا، لیکن اس پر صحابہ کرام کا اجماع نہیں ہوا جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی رائے اس کے مخالف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے ایک وقت میں نصف صاع دینے کی اجازت دی لیکن بعد میں گندم کی ارزانی دیکھ کر دوبارہ پورا صاع ادا کرنے کا حکم دیا۔ [6]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، صحابہ کرام کا یہ اختلاف بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''اگر ہر زمانے میں قیمت کو بنیاد بنا کر صدقہ فطر کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اس کی مقدار کبھی منضبط نہیں رہ سکے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے کسی وقت خود گندم سے بہت سے صاع مقرر کرنا پڑیں۔ [7]

ہمارے رجحان کے مطابق قیمتوں سے قطع نظر ہر علاقے کی بنیادی غذائی جنس سے ایک صاع صدقہ فطر ادا کرنے کا طریقہ ہی قابل عمل ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور کی مختلف بنیادی اجناس کے حوالے سے مقرر فرمایا۔ آپ نے جن اشیاء کا نام لیا وہ بھی ہم قیمت نہ تھیں، لیکن آپ نے قیمتوں کے فرق کو ایک طرف رکھتے ہوئے رائج چیز کا نام لے کر ہر ایک میں صاع کی مقدار

---

[1] صحیح بخاری، الزکوۃ: ۱۵۱۰۔ [2] صحیح بخاری، الزکوۃ: ۱۵۰۔
[3] صحیح بخاری، الزکوۃ: ۱۵۰۸۔ [4] صحیح مسلم، الزکوۃ: ۲۲۸۴۔
[5] مسند امام احمد، ص ۳۵۰، ج ۶۔ [6] ابو داؤد، الزکوۃ: ۱۶۲۲۔
[7] فتح الباری: ص ۴۷۱، ج ۳۔

متعین فرمائی، یعنی رسول اللہ ﷺ نے بنیادی غذائی اجناس کی قیمتوں کو بنیاد بنانے کی بجائے مقدار کو بنیاد بنایا اور تمام اجناس کی یکساں مقدار کو ملحوظ رکھا۔ ہمارے نزدیک سنت پر عمل کرنا ہی باعث خیر و برکت ہے نیز ہمارے ہاں چونکہ گندم عام دستیاب ہے اس لیے ایک صاع ہی ادا کرنا چاہیے۔ اگر غریب اور نادار لوگوں کو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے حدیث کے پیش نظر نصف صاع دینے کی رعایت دیتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے کھاتے پیتے لوگ بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ (واللہ اعلم)

فرضیت صدقۃ الفطر

سوال علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب المحلی ص ۱۸، ج ۲ میں امام مالک رحمہ اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صدقہ فطر کی فرضیت کے قائل نہیں، اس سلسلہ میں نسائی کی ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ صدقۃ الفطر کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے نفس انسانی کے تزکیہ کے لیے اور مالی خرابی کو دور کرنے کے لیے زکوۃ فرض کی ہے، اسی طرح روزے کے دوران سرزد ہونے والے کسی لغو کام اور نامناسب بات سے روزے کی تطہیر کے لیے صدقہ فطر کو فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: "صدقۃ الفطر کی فرضیت کا بیان" [1] پھر آپ نے اپنے اسلوب کے مطابق بطور تائید ابو العالیۃ عطا رحمہ اللہ اور ابن سیرین رحمہ اللہ کا موقف پیش کیا ہے کہ یہ حضرات بھی اس کی فرضیت کے قائل تھے، بطور دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر فرض قرار دیا تھا۔ [2] امام ابن حزم رحمہ اللہ نے واقعی امام مالک رحمہ اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صدقہ فطر کی فرضیت کے قائل نہیں تھے جیسا کہ سوال میں اس کی وضاحت ہے لیکن امام ابن حزم رحمہ اللہ کی وضاحت مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ خود لکھتے ہیں: زکوۃ اہل دیہات پر بھی فرض ہے جیسا کہ شہر کے رہنے والوں کے لیے اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ [3]

اس سلسلہ میں جو روایت پیش کی جاتی ہیں وہ حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں زکوۃ اموال کا حکم نازل ہونے سے پہلے صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم دیا، جب زکوۃ کے احکام نازل ہوئے تو پھر آپ نے اس کے متعلق دوبارہ کوئی حکم نہ دیا اور نہ ہی اس کی ادائیگی سے منع فرمایا، البتہ ہم اسے ادا کرتے رہے۔ [4] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کا جواب بایں الفاظ دیا ہے: "جب صدقہ فطر پہلے فرض قرار دیا گیا تھا تو زکوۃ اموال کے حکم کے نزول کے ساتھ اس کی فرضیت منسوخ نہیں ہوگی، کیونکہ ایک فرض کا نازل ہونا دوسرے فرض کے ساقط ہونے کو مستلزم نہیں جبکہ دونوں کی حیثیت بھی الگ الگ ہے کیونکہ صدقہ فطر نفوس سے متعلق ہے جبکہ زکوۃ، اموال سے تعلق رکھتی ہے۔" [5] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ جواب عقل و نقل کے عین مطابق ہے اور اس روایت سے صدقہ فطر کی فرضیت منسوخ نہیں ہوتی، نیز اس کی ادائیگی فرض ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں صدقہ فطر کو "زکوۃ رمضان" قرار دیا ہے۔ [6] اس کے علاوہ متعدد محدثین کرام نے اس کی فرضیت کے

---

[1] صحیح بخاری، الزکوۃ، باب نمبر ۷۰۔
[2] صحیح بخاری، الزکوۃ: ۱۵۰۳۔
[3] موطا امام مالک مع تنویر الحوالك، ص ۲۰۹۔
[4] نسائی، الزکوۃ: ۲۵۰۹۔
[5] فتح الباری، ص ۴۶۳، ج ۳۔
[6] نسائی، الزکوۃ: ۲۵۰۲۔

متعلق عنوانات قائم کیے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: ① امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا عنوان اس طرح ہے: ''فرض صدقة الفطر'' صدقہ فطر کی فرضیت کا بیان۔ ② امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کا عنوان بایں الفاظ ہے۔ ''فرض زکوۃ رمضان'' زکوۃ رمضان فرض ہے۔ ③ امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس امر کی دلیل کہ زکوۃ اموال کی فرضیت سے پہلے بھی صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم تھا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نزول حکم زکوۃ اموال کے بعد بھی صدقہ فطر کی فرضیت برقرار ہے اور زکوۃ کی فرضیت کے بعد صدقہ فطر کی فرضیت کو منسوخ قرار دینا انتہائی محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

حج و عمرہ
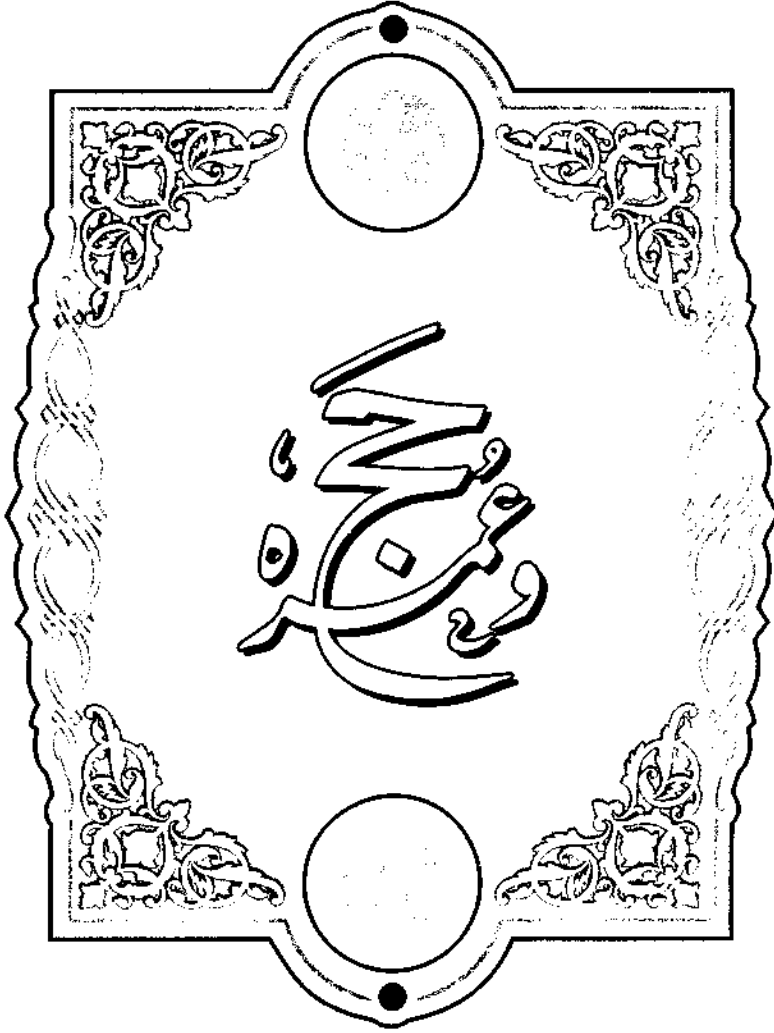
حج وعمرہ

نابالغ بچے کا حج

سوال ہم دونوں میاں بیوی امسال حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اور ہمارے ساتھ چھ سال کا بیٹا بھی ہے، کیا نابالغ بچہ بھی حج کر سکتا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب حج کی شرائط میں سے مسلمان کا بالغ ہونا بھی ہے، تاہم نابالغ بچہ بھی حج کر سکتا ہے لیکن بلوغت کے بعد اسے یہ حج کافی نہیں ہوگا بلکہ فرض کی ادائیگی کے لئے اسے حج کرنا پڑے گا۔ حدیث میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اس کے لئے حج ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس کے لئے حج ہے البتہ اس کا ثواب تمہیں ملے گا۔'' [1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ فرض کی ادائیگی کے لئے دوسرا حج کرے۔'' [2]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ بچہ حج کر سکتا ہے لیکن یہ حج فرضیت کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں ہوگا، بلوغت کے بعد اگر اس پر حج فرض ہو تو اسے از سر نو حج کے لئے رخت سفر باندھنا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

عمرہ کی ادائیگی کو بطور مہر مقرر کرنا

سوال میں نے ایک نکاح پڑھایا، اس میں حق مہر یہ طے پایا کہ خاوند اپنی بیوی کو عمرہ کرائے گا، کیا اس طرح حق مہر مقرر کیا جا سکتا ہے؟

جواب نکاح میں حق مہر کا ہونا ضروری ہے لیکن اس کی مقدار یا اس کا معیار طے شدہ نہیں، البتہ شریعت نے اہل اسلام کو اس امر کی تلقین کی ہے کہ حق مہر اتنا ہی مقرر کریں جس کی ادائیگی آسان ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کا نکاح اس شرط پر کر دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو چند سورتیں یاد کرائے گا۔ [3]

حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنے کے لئے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ مسلمان ہو جائے، اس کا اسلام لانا ہی ان کا حق مہر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو اسے آزاد کرنا ہی حق مہر تھا، ان احادیث وآثار کے پیش

---

[1] صحيح مسلم، الحج : ١٣٣٦۔ [2] سنن البيهقي ص ٣٢٥ ج ٤۔ [3] صحيح البخاري، النكاح: ٥٠٨٧۔

نظر ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی حق مہر میں بیوی کو عمرہ کی ادائیگی مقرر کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس طرح کے نکاح کو معاشرے میں رواج دینا چاہیے۔ وہ لوگ جو حق مہر کے ذریعے خاوند کو جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ انجام کے اعتبار سے انتہائی بے برکت ثابت ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں خرچ کم ہو۔'' ❶

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''بہترین نکاح وہ ہے جو (مہر کے لحاظ سے) آسان ہو۔'' ❷

بہر حال سوال میں ذکر کردہ حق مہر انتہائی بابرکت ہے، بشرطیکہ وہ اس کی استطاعت رکھتا ہو، خاوند کو چاہیے کہ نکاح کے بعد اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔

دسویں ذوالحجہ کو اعمال حج کی ترتیب

سوال حاجی کے لئے دسویں ذوالحجہ کو اعمال ادا کرنے کی کیا ترتیب ہے، اگر کسی وجہ سے یہ ترتیب برقرار نہ رہ سکے تو اس کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں، وضاحت سے لکھیں؟

جواب ذوالحجہ کی دس تاریخ کو یوم النحر ہوتا ہے یعنی اسے قربانی کا دن کہا جاتا ہے، اس دن اعمال کی ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے جمرہ عقبہ جسے بڑا شیطان کہا جاتا ہے اسے سات الگ الگ کنکریاں ماری جائیں اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہا جائے جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ ❸

اس کے بعد اگر قربانی کرنا ہے تو اسے ذبح کیا جائے کیونکہ قربانی صرف حج تمتع یا قران کرنے والے پر فرض ہے۔ قربانی سے فراغت کے بعد بال منڈوائے یا انہیں چھوٹا کرائے لیکن بالوں کا منڈوانا زیادہ بہتر ہے، اس کے بعد مکہ جا کر طواف افاضہ کرے جسے طواف زیارت بھی کہا جاتا ہے۔ اس ترتیب کو ملحوظ رکھنا افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب سے اعمال حج ادا کئے تھے لیکن اگر کسی نے یہ ترتیب برقرار نہ رکھی تو اس کی تلافی کے لئے کوئی قربانی دینا ضروری نہیں ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں لوگوں کو ان کے سوالات کا جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک شخص نے کہا: میں نے قربانی سے پہلے حلق کرا دیا ہے، آپ نے فرمایا: اب قربانی ذبح کردو، کوئی حرج نہیں ہے۔ دوسرے نے کہا: میں نے جمرہ کو کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کردی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اب رمی کرلو، کوئی حرج نہیں ہے۔ اس دن تقدیم وتاخیر کے متعلق آپ سے جو بھی سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: اب کرلو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ❹

بہر حال مذکورہ ترتیب کا خیال رکھنا چاہیے لیکن اگر کسی وجہ سے تقدیم وتاخیر ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جب شام کے بعد رمی کرے یا بھول کر یا جہالت کی وجہ سے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈوا دے تو کوئی حرج نہیں۔'' ❺

---

❶ مسند إمام أحمد ص ٨٢ ج٦۔ ❷ سنن أبي داوٗد، النكاح : ٢١١٧۔ ❸ صحيح البخاري، الحج : ١٧٥٠۔
❹ صحيح البخاري، العلم: ٨٣۔ ❺ صحيح البخاري ، الحج باب ١٣٠۔

سوال کیا عمرہ کرنے والے پر طواف وداع کرنا ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے طواف وداع کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا، وضاحت فرمائیں؟

جواب اگر کوئی آدمی مکہ میں آیا اور عمرہ کرنے کے فوراً بعد واپس نہیں ہوا بلکہ اس نے مکہ میں قیام کیا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ واپسی کے وقت طواف وداع کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی شخص کوچ نہ کرے حتیٰ کہ وہ آخری وقت بیت اللہ میں نہ گذار لے۔'' [1]

یہ حکم بھی عام ہے، اس میں عمرہ کا طواف وداع بھی شامل ہے۔ شریعت میں عمرہ بھی حج کی طرح ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حج اصغر کہا ہے چنانچہ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمرہ، حج اصغر ہے۔'' [2]

اس بنا پر اگرچہ طواف وداع کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر دیا گیا تھا لیکن عمرہ کرنے کے بعد بھی طواف وداع کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی مروی ہے: جو شخص اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اسے اپنا آخری وقت بیت اللہ میں گذارنا چاہیے۔ [3]

لیکن یہ ایک راوی حجاج بن ارطاۃ کی وجہ سے ضعیف ہے، لیکن اسے تائید کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

میت کی طرف سے حج کرنا

سوال ہمارے والد گرامی پچھلے سال فوت ہو گئے تھے، کیا ہم ان کی طرف سے حج کر سکتے ہیں، کیا ایسا کرنے سے انہیں ثواب ملے گا؟

جواب ایصال ثواب کے سلسلہ میں ہم لوگ افراط و تفریط کا شکار ہیں، کچھ لوگ تو مطلق طور پر میت کے لئے ایصال ثواب کے منکر ہیں، جبکہ کچھ حضرات نے اسے بہت عام کر دیا ہے اور ہر طرح کی عبادات کا ثواب فوت شدگان کو پہنچانے کے قائل ہیں۔ دراصل ہمارے نزدیک انسان کو مرنے کے بعد وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے زندگی میں محنت اور کوشش کی ہوگی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''اور انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے کوشش کی ہوگی۔'' [4]

قرآن کریم کی یہ آیت عام ہے اور اس سے وہ چیزیں مستثنیٰ ہوں گی جن کا اثبات احادیث صحیحہ سے ہوتا ہے۔ حج بھی ان اعمال سے ہے جس کا ثواب میت کو اس کے مرنے کے بعد پہنچتا ہے، اس کا ذکر احادیث میں ہے۔ اس سلسلہ میں ہم صرف دو احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

① حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کرنے لگی، یا رسول اللہ! میری والدہ نے حج نہیں کیا تھا، اگر میں اس کی طرف سے حج کروں تو کیا اس کی طرف سے کفایت کر جائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' [5]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کی طرف سے حج ہو سکتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، الحج: ١٥٣٦۔ [2] سنن الدارقطني ص ٢٨٥ ج٢۔ [3] سنن الترمذي، الحج: ٢٠٠٢۔
[4] النجم: ٣٩۔ [5] سنن أبي داؤد، الوصايا: ٢٨٧٧۔

② ایک طویل حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ''اگر مرنے والا مسلمان ہوتا تو تم اس کی طرف سے غلام آزاد کرتے یا صدقہ کرتے یا اس کی طرف سے حج کرتے تو اس کا ثواب اسے ضرور پہنچے گا۔'' ❶

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرنے والے نے وصیت نہ بھی کی ہو تو بھی اس کی طرف سے حج کرنا جائز ہے اور وہ اس کے ثواب سے محروم نہیں رہے گا، لہٰذا میت کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال کیا پینتالیس سال سے زائد عمر کی عورتیں محرم کے بغیر حج یا عمرہ ادا کر سکتی ہیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب وجوب حج کے لئے دیگر شرائط کے ساتھ عورت کے لئے ایک اضافی شرط بھی ہے کہ اس مبارک سفر میں اس کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی بھی عورت کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی محرم رشتہ دار کے بغیر ایک دن یا ایک رات کا سفر کرے۔ ❷

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں وضاحت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میری بیوی حج کے لئے جانا چاہتی ہے جبکہ میرا نام فلاں فلاں جنگ کے لئے لکھ دیا گیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔'' ❸

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ عورت اپنے محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی، اس میں عمر کی کوئی پابندی نہیں، بلکہ ہر عمر کی عورت کے لئے یہ پابندی کرنا ضروری ہے، لہٰذا پینتالیس سال کی عمر سے زائد خواتین بھی اس امر کی پابند ہیں کہ وہ اپنے محرم رشتہ دار کے ہمراہ حج کریں، اس کے بغیر سفر حج صحیح نہیں ہوگا۔

دوران عدت حج یا عمرہ کرنا

سوال اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ دوران عدت ہو، دوسری طرف حج کے لئے اس کے نام قرعہ نکل آیا تو کیا اس دوران وہ حج یا عمرہ کر سکتی ہے، نیز عورت کے سوگ کے کیا آداب ہیں؟

جواب شریعت کے کچھ احکام ایسے ہیں جو وقت گزرنے کے بعد بھی ادا کئے جا سکتے ہیں، مثلاً اگر کسی وجہ سے بروقت نماز نہیں پڑھی جا سکی تو وقت گزرنے کے بعد اس کی قضا دی جا سکتی ہے، روزے کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اگر اسے رمضان میں نہیں رکھا جا سکا تو آئندہ کسی بھی مہینہ میں بطور قضا روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ احکام ایسے ہیں جنہیں بروقت ہی ادا کرنا پڑتا ہے، بعد میں ان کی قضا نہیں ہوتی۔ مثلاً حج صرف ماہ ذوالحجہ میں ہی ادا ہوتا ہے اگر کسی وجہ سے حج ادا نہیں کیا جا سکتا تو اس کی قضاء کسی دوسرے مہینہ میں نہیں دی جا سکتی۔ عدتِ سوگ کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اسے خاوند کی وفات کے بعد چار ماہ دس دن تک ادا کرنا ہوتا ہے، اس کے بعد اس کی قضا نہیں۔ اس بناء پر اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ دوران عدت ہو تو اسے حج یا عمرہ دوران

---

❶ سنن أبي داؤد، الوصايا: ٢٨٨٣۔ ❷ صحيح البخاري، تقصير الصلوٰة: ١٠٨٨۔

❸ صحيح مسلم، الحج: ١٣٤١۔

عدت ادا کرنے کی اجازت نہیں بلکہ وہ عدت سے فراغت کے بعد فریضہ حج ادا کرے گی۔ کیونکہ عدت کے آداب میں سے یہ بڑا ادب ہے کہ بیوہ اپنے گھر میں رہے اور شدید مجبوری کے بغیر اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ سوگ اور عدتِ وفات کے آداب حسب ذیل ہیں:

☆ خوبصورت اور بھڑکیلا لباس زیب تن نہ کیا جائے۔ ☆ زیورات و جواہرات سے اجتناب کیا جائے۔

☆ خوشبو اور دیگر اشیاء زینت سے پرہیز کیا جائے۔ ☆ زینت کے لئے سرمہ وغیرہ بھی نہ لگایا جائے۔

باقی فون پر بات نہ کرنا، چاندنی رات میں گھر کے صحن میں نہ جانا اور غسل وغیرہ نہ کرنا، اس طرح کی باتیں خرافات ہیں، عدتِ وفات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

دورانِ احرام عورت کا پردہ

سوال ہم نے اپنے علماء سے سنا ہے کہ دورانِ احرام عورت کو پردہ کرنے کی اجازت نہیں، کیا یہ بات صحیح ہے، جبکہ پردہ کے احکام سرزمین حجاز میں نازل ہوئے ہیں، اگر عورت کو وہاں پردے کی اجازت نہیں تو وہ کہاں پردہ کرے گی، وضاحت کریں؟

جواب عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ستر و حجاب کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت کا شکار نہ ہو، خواہ وہ احرام کی حالت میں ہی کیوں نہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور اہل ایمان کی خواتین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی چادروں کے پلو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔'' [1]

پھر چہرہ ہی وہ چیز ہے جو مرد کے لئے عورت کے تمام بدن سے زیادہ پرکشش ہوتا ہے اگر اسے ننگا رکھنا ہے تو حجاب کے باقی احکام بے سود ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر پیچھے رہ گئیں تو انہوں نے حضرت صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فوراً اپنا چہرہ اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ [2]

البتہ دورانِ حج احرام کی حالت میں عورت پر یہ پابندی ہے کہ وہ نقاب نہ پہنے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''احرام والی عورت نقاب نہ پہنے اور نہ ہی دستانے استعمال کرے۔'' [3]

نقاب نہ پہننے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ احرام والی عورت غیر محرموں سے چہرہ بھی نہیں چھپائے گی بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا مخصوص سلا ہوا کپڑا جو پردہ کے لئے بنایا جاتا ہے استعمال میں نہ لائے۔ نقاب میں عورت اپنے چہرے کو باندھ لیتی ہے، اپنی ناک کے اوپر سے کپڑا گذار کر پردہ کیا جاتا ہے، صرف آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، اس قسم کا پردہ کرنے کی ممانعت ہے وہ بھی احرام کی حالت میں۔ لیکن جب اجنبی آدمی سامنے آجائے تو اپنی چادر کے ساتھ چہرہ چھپانا ہوگا جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حالت احرام میں تھیں اور قافلے ہمارے سامنے سے گذرتے تھے جب وہ ہمارے سامنے آتے تو ہم اپنی چادریں منہ پر لٹکا لیتیں اور جب وہ گذر جاتے تو منہ کھول لیتیں۔ [4]

---

[1] الاحزاب: ٥٩۔ [2] صحيح البخاري، المغازي: ٤١٤١۔
[3] مسند إمام أحمد ص ٢٢ ج ٢۔ [4] سنن أبي داؤد، المناسك: ١٨٣٣۔

ان احادیث کی روشنی میں ہمارا موقف ہے کہ عورت احرام کی حالت میں نقاب نہ پہنے البتہ اپنی چادر سے چہرہ کو ضرور چھپائے جب کوئی اجنبی آدمی سامنے ہو، بصورت دیگر منہ کھلا رکھے۔ (واللہ اعلم)

جمرات کو جوتے مارنا اور گالیاں نکالنا

سوال حج کے موقع پر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جمرہ عقبہ (بڑے شیطان) کو چھوٹی کنکریاں مارنے کے بجائے بڑے بڑے پتھر یا جوتے مارے جاتے ہیں، بعض لوگ وہاں تھوکتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں، یا کنکریاں مارتے وقت ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب حاجی کو چاہیے کہ وہ منیٰ پہنچنے سے پہلے ہی جمرات کو مارنے کے لئے راستہ سے کنکریاں اٹھائے، وہ مزدلفہ، منیٰ یا کسی اور جگہ سے بھی اٹھائی جاسکتی ہیں اور ان کا حجم لوبیے کے برابر چنے کے دانے سے ذرا بڑا ہونا چاہیے، کنکریوں کے علاوہ کوئی اور چیز کے ساتھ رمی جائز نہیں۔ چنانچہ سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس ذوالحجہ کو اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے حکم دیا کہ ''مجھے کنکریاں چن دو'' میں نے سات کنکریاں چن دیں جو انگلیوں کے پوروں میں آسکتی تھیں۔ آپ انہیں ہاتھ میں لے کر حرکت دینے لگے اور ان کی مٹی جھاڑنے لگے پھر آپ نے فرمایا: ''پس کنکریاں مارو اور اے لوگو! دین میں غلو کرنے سے بچو۔ بے شک پہلے لوگوں کو دین میں غلو نے تباہ کر دیا تھا۔'' [1]

اس حدیث کی روشنی میں بڑے شیطان کو جوتے مارنا، اس پر تھوکنا اور اسے گالیاں دینا جائز نہیں۔ اسی طرح اسے بڑے بڑے پتھر مارنا بھی جائز نہیں، یقیناً اگر کوئی ایسا کام کرتا ہے تو وہ شیطان کو خوش کرتا ہے۔ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ اسے رمی کرتے وقت اس کی خوشی کا سامان مہیا کیا جارہا ہے، مذکورہ حدیث کی روشنی میں حاجی کو چاہیے کہ وہ صرف کنکریاں مارنے پر اکتفاء کرے اور دین میں غلو سے اجتناب کرے۔ (واللہ اعلم)

معذور، صاحب استطاعت کا حج

سوال ایک آدمی مالی اعتبار سے حج کرنے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن جسمانی طور پر معذور یا اتنا کمزور ہے جو حج کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث ہے، یا اسے ایسی بیماری لاحق ہے جس سے شفا کی امید نہیں، ایسے حالات میں فرضیت حج ساقط ہے یا اس کا کوئی متبادل حل ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب حج کی ادائیگی کے لئے اللہ تعالیٰ نے استطاعت کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سواری پر بیٹھ سکتا ہو، سفر کی مشکلات برداشت کر سکتا ہو نیز حج کے لئے آنے جانے، کھانے پینے اور رہائش کا خرچا اپنے پاس رکھتا ہو، اس کے علاوہ وہ اپنے اہل وعیال کا خرچہ بھی ادا کرنے کی پوزیشن میں ہو، اس تناظر میں اگر کوئی مالی اعتبار سے صاحب استطاعت ہے لیکن جسمانی طور پر وہ حج کرنے کے قابل نہیں تو اسے چاہیے کہ کسی کو نائب بنا کر حج کے لئے روانہ کرے جو اس کی طرف سے حج کرے۔ جیسا کہ ایک

---

[1] سنن النسائي، المناسك: ٣٠٥٩۔

حدیث میں ہے: خشعم قبیلے کی ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے والد پر حج فرض ہو چکا ہے لیکن وہ اس قدر بوڑھا ہے کہ سواری پر جم کر بیٹھ نہیں سکتا تو کیا میں اسکی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! تو اس کی طرف سے حج کر سکتی ہے۔

یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔'' ❶

لیکن جس شخص کو نائب بنایا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نے پہلے اپنا حج کیا ہو، جیسا کہ دوران حج رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ کہہ رہا تھا: ''میں شبرمہ کی طرف سے حاضر ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''کیا تو نے اپنا حج کیا ہے؟'' اس نے عرض کیا: نہیں، آپ نے فرمایا: ''تم پہلے اپنا حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے حج ادا کرو۔'' ❷

اس حدیث کی روشنی میں حج بدل کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنا حج کرے پھر کسی دوسرے کی طرف سے ادا کرے۔

اگر صاحب استطاعت آدمی حج کرنے سے پہلے فوت ہو جائے

سوال ایک آدمی پر حج فرض ہو چکا تھا لیکن وہ ادائیگی حج سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو کیا اس کے ترکہ سے اس قدر رقم الگ کر لینا چاہیے جو حج کے لئے کافی ہو یا وہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

جواب جس آدمی پر حج فرض ہو چکا ہو لیکن وہ کسی وجہ سے پہلے ہی فوت ہو جائے تو اس کی جائیداد میں تقسیم سے پہلے اتنی رقم الگ کر لی جائے جس سے حج ہو سکتا ہو پھر کسی معقول شخص کو حج کے لئے بھیجا جائے جو میت کی طرف سے حج کرے بشرطیکہ جسے بھیجا جائے، اس نے پہلے اپنا حج کر لیا ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میری والدہ نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ ادائیگی سے پہلے ہی فوت ہو گئی ہے تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں، تم اس کی طرف سے حج کرو۔'' پھر فرمایا: ''اگر تیری والدہ پر کسی کا قرض ہوتا تو کیا اسے ادا کرتی؟ اس نے عرض کیا کیوں نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کا قرض بھی ادا کرو کیونکہ اس قرض کی ادائیگی زیادہ ضروری ہے۔'' ❸

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح میت کے اصل مال سے اس کے ذمے قرض کی ادائیگی ضروری ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرض بھی اس کے مال سے ادا کرنا ضروری ہے، خواہ میت نے اس کے متعلق وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ حج کی رقم منہا کرنے کے بعد باقی رقم ورثاء میں قابل تقسیم ہوگی۔ لہٰذا ایسے حالات میں میت کے ذمے حج کی ادائیگی کا بندوبست ضرور کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحيح البخاري، الحج: ١٥١٣۔ ❷ سنن أبي داؤد، المناسك: ١٨١١۔

❸ صحيح البخاري، الصيد: ١٨٥٢۔

کمزور و معذور حضرات کا قبل از وقت کنکریاں مارنا

سوال اگر معذور یا کمزور حضرات رات کے وقت ہی مزدلفہ سے واپس منیٰ آجائیں تو کیا رات کے وقت وہ کنکریاں مار سکتے ہیں؟ ایسے افراد کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں، وضاحت کریں؟

جواب حج کرنے والے کو چاہیے کہ وہ نویں ذوالحجہ کے بعد والی رات مزدلفہ میں گذارے پھر طلوع آفتاب سے قبل ہی منیٰ کو روانہ ہو جائے پھر دسویں ذوالحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارے البتہ کمزور، بوڑھے، بچے اور خواتین وغیرہ مزدلفہ میں پوری رات گذارے بغیر بھی منیٰ جا سکتے ہیں، اور طلوع آفتاب سے پہلے کنکریاں مار سکتے ہیں جیسا کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے رات کو کنکریاں ماریں پھر واپس آگئیں اور صبح کی نماز اپنے ڈیرے پر ادا کی۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ عمل کیا کرتے تھے۔ [1]

ایسا کرنا جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمزور افراد کو رات کے وقت ہی مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دیا تھا لیکن انہیں حکم دیا تھا کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں۔

ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ فجر سے پہلے کنکریاں نہیں مارنا چاہیے، البتہ کوئی عذر ہو یا ضعیف و ناتواں بوڑھے یا بچے یا خواتین کو اجازت ہے کہ وہ فجر سے پہلے رات میں بھی کنکریاں مار لیں۔ اگرچہ ان کے لئے بھی افضل اور بہتر ہے کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں۔ (واللہ اعلم)

حائضہ عورت کا طوافِ وداع

سوال ایک عورت کو دسویں ذوالحجہ کو طواف کرنے کے بعد اگر حیض آجائے تو وہ کیا کرے، کیا وہ طواف وداع کے لئے اپنے پاک ہونے کا انتظار کرے یا طواف کے بغیر ہی واپس اپنے وطن آجائے قرآن و حدیث کے مطابق ایسی عورت کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب طواف وداع کا مطلب یہ ہے کہ حج کرنے والا اپنے آخری لمحات بھی بیت اللہ کے پاس بصورت طواف گذارے لیکن جس عورت کو حیض آجائے اس کے لئے طواف وداع ضروری نہیں، طواف وداع کے بغیر مکہ مکرمہ سے اپنے وطن واپس آجائے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے وطن لوٹنے سے پہلے مکہ مکرمہ میں اپنا آخری وقت بیت اللہ کے پاس (بصورت طواف) گذاریں البتہ حائضہ عورت سے طواف وداع کے متعلق تخفیف کی جاتی تھی۔ [3]

لیکن اس رخصت کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ دسویں ذوالحجہ کو طواف افاضہ کر چکی ہو، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی

---

[1] سنن أبي داؤد، المناسك: ١٩٤٣۔ [2] سنن أبي داؤد، المناسك: ١٩٤١۔

[3] صحيح البخاري، الحج: ١٧٥٥۔

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حائضہ عورت کو مکہ مکرمہ سے نکلنے سے پہلے طواف وداع کے متعلق رخصت دی تھی، بشرطیکہ وہ طواف افاضہ کر چکی ہو۔ ❶

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سیدہ صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا طواف افاضہ کے بعد حائضہ ہو گئیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ تو ہمیں روکے رکھے گی'' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس نے جب طواف کر لیا تھا تب اسے حیض آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر وہ مکہ سے روانہ ہو اور ہمارے ساتھ چلے۔'' ❷

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا پہلے موقف یہ تھا کہ حائضہ عورت مکہ میں ٹھہرے اور جب پاک ہو جائے تو طواف وداع کر کے وطن واپس آ جائے، پھر انہوں نے اس موقف سے رجوع کر لیا تھا اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے حائضہ عورت کو طواف وداع کے متعلق رخصت دی ہے۔ ❸

بہر حال حائضہ عورت کے لئے طواف وداع کرنا ضروری نہیں بلکہ جب اس نے طواف افاضہ کر لیا ہے تو طواف وداع کئے بغیر وہ اپنے گھر واپس آ سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

ادائیگی حج کے لئے شرائط

سوال وہ کونسی شرائط ہیں جن کی موجودگی میں انسان حج کا مکلف قرار پاتا ہے نیز کیا عورت کے لیے وہی شرائط ہیں جو مردوں کے لئے ہیں یا اس کے لئے کوئی اضافی شرط بھی ہے؟

جواب حج، اللہ کی طرف سے صاحب حیثیت حضرات پر ایک اہم فریضہ ہے، اس کے فرض ہونے کی حسب ذیل پانچ شرائط ہیں:

☆ اسلام: حج کرنے والا مسلمان ہو کیونکہ کسی بھی غیر مسلم کا حج صحیح نہیں۔

☆ عقل: حج کی ادائیگی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ انسان صاحب عقل و شعور ہو، دیوانہ یا پاگل نہ ہو۔

☆ بلوغ: حج کرنے والا بالغ ہو، اگرچہ بچے کا حج بھی صحیح ہے لیکن بچپن کا حج، فرضیت حج سے کافی نہیں ہو گا۔ حدیث میں ہے: ''جس نے بچپن میں حج کیا پھر جب بالغ ہو گا تو اسے دوبارہ (صاحب استطاعت ہونے پر) حج کرنا ہو گا۔'' ❹

☆ آزادی: فرض حج کی ادائیگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کسی کا غلام نہ ہو بلکہ وہ آزاد ہو۔ اگرچہ غلام کا حج بھی صحیح ہے لیکن آزادی کے بعد اسے فرض حج دوبارہ کرنا ہو گا، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جس نے حج کیا پھر وہ آزاد ہوا تو اسے دوبارہ حج کرنا ہو گا۔'' ❺

☆ استطاعت: حج کے لئے انسان کا صاحب استطاعت ہونا بھی ضروری ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بندوں کے ذمے اللہ تعالیٰ کے لئے بیت اللہ کا حج کرنا ہو گا بشرطیکہ وہ (مکہ مکرمہ) جانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ ❻

---

❶ صحيح المسلم، الحج: ١٣٢٨۔ ❷ مسند إمام أحمد ص ٣٧٠ ج١۔ ❸ صحيح البخاري، الحج: ١٧٦١۔
❹ سنن البيهقي ص١٧٩ ج٥۔ ❺ مستدرك حاكم: ص ٤٨١ ج١۔ ❻ آل عمران: ٩٧۔

استطاعت میں حسب ذیل تین چیزیں آتی ہیں:

☆ بدنی لحاظ سے تندرست ہو، ایسا بیمار یا لاغر نہ ہو جو حج نہ کرسکتا ہو۔

☆ گھریلو اخراجات کے علاوہ وہ مکہ مکرمہ آنے جانے اور وہاں رہائش، کھانے پینے کے اخراجات کا مالک ہو، قرآن کریم میں ''سبیلا'' سے مراد زادراہ اور سواری ہے۔

جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے۔

☆ راستہ پُرامن ہو، جس میں اس کے مال اور جان وعزت کی حفاظت ہو۔

مذکورہ شرائط عورتوں کے لئے بھی ہیں، البتہ ان کے لئے ایک اضافی شرط یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا محرم موجود ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے فرمایا تھا جس کا نام جہاد میں لکھا جا چکا تھا کہ ''تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کرنے کے لئے جاؤ۔'' [1]

اگر عورت صاحب استطاعت اور تندرست ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا محرم نہیں تو وہ فرضیت حج سے مستثنیٰ ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران احرام بالوں کا گرنا

سوال اگر دوران احرام غیر شعوری طور پر سر کے بال گر جائیں تو کیا اس پر دم دینا ضروری ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب جب انسان احرام کی حالت میں ہوتا ہے تو اس پر کچھ پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے بال نہ کاٹے۔ لیکن اگر قصد وارادہ کے بغیر غیر شعوری طور پر خارش وغیرہ کرنے کی وجہ سے کچھ بال گر جائیں تو کوئی حرج نہیں اور نہ ہی اس پر دم دینا ضروری ہے، کیونکہ اس نے اپنے مقصد وارادہ سے بالوں کو نہیں گرایا۔ اسی طرح وہ تمام دیگر امور جو احرام میں ممنوع ہیں، اگر انسان ان کا جان بوجھ کر ارتکاب نہ کرے بلکہ غلطی، نسیان یا غیر شعوری طور پر ان کا ارتکاب ہو جائے تو اس میں چنداں حرج نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور جو بات تم سے غلطی کی بنا پر سرزد ہو جائے، اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں، لیکن جو تم دل سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے) اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔'' [2]

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید میں ہے: ''اے پروردگار! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیے۔'' [3]

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا، جیسا کہ احادیث میں ہے۔ دین اسلام کی بنیاد سہولت اور آسانی پر ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی استثناء کے بغیر وہ تمام امور جو محرم کے لئے ممنوع ہیں، اگر جہالت یا نسیان کی وجہ سے ان کا ارتکاب کیا جائے تو اس پر کوئی دم نہیں پڑتا اور نہ ہی اس سے حج یا عمرہ فاسد ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحيح البخاري، الجهاد: ٣٠٠٦۔ [2] الاحزاب: ٥۔ [3] ٢/ البقرة: ٢٨٦۔

حج کی شرعی حیثیت

سوال اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ حج استطاعت کے باوجود ادا نہیں کرتے، اس لئے ہمیں اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیں کہ حج فرض ہے یا ایک نفلی عبادت؟

جواب صاحب استطاعت مسلمان پر حج فرض ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر جو بیت اللہ کی طرف جانے کی استطاعت رکھتے ہیں، حج فرض کر دیا ہے اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔'' [1]

اس آیت کریمہ میں کلمہ ''علی'' سے حج کی فرضیت واضح ہوتی ہے نیز آیت کے آخری الفاظ ''جو کوئی کفر کرے'' میں تارک حج کو کافر قرار دیا گیا ہے، اس انداز سے حج کی فرضیت اور اس کی تاکید کی خوب وضاحت ہوتی ہے۔ اس بناء پر جو شخص حج کی فرضیت کا عقیدہ نہیں رکھتا وہ بالاجماع کافر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی حج بیت اللہ کو اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا ہے چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: کلمہ شہادت کہنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا بشرطیکہ وہاں جانے کی طاقت ہو۔'' [2]

واضح رہے کہ بیت اللہ تک جانے کی استطاعت سے مراد تین چیزیں ہیں:

☆ بدنی اعتبار سے تندرست ہو، ایسا بیمار یا بوڑھا نہ ہو جو حج نہ کر سکتا ہو۔

☆ گھر میں اخراجات کے علاوہ وہ مکہ مکرمہ آنے جانے اور وہاں رہائش، کھانے پینے کے اخراجات کا مالک ہو۔

☆ راستہ پرامن ہو کہ اس کے مال اور جان کے تحفظ کی گارنٹی ہو۔

☆ عورتوں کے لئے استطاعت میں ایک مزید چیز بھی شامل ہے کہ اس کے ساتھ محرم موجود ہو، اس بناء پر ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ جب اس پر حج فرض ہو جائے تو حتی الامکان اسے ادا کرنے میں جلدی کرے، اگر وہ بلا عذر تاخیر کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ (واللہ اعلم)

عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا

سوال میں سعودیہ میں کام کرتا ہوں، میری بیوی پاکستان میں ہے، میں اسے عمرہ کی غرض سے اپنے پاس بلانا چاہتا ہوں، جس کی صورت یہ ہوگی کہ میرا بڑا بیٹا لاہور ائیر پورٹ سے اسے جہاز پر سوار کر دے گا اور میں جدہ میں ائیر پورٹ پر اسے وصول کر لوں گا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی کریں کہ عورت اکیلی ہوائی جہاز کا سفر کر سکتی ہے؟

جواب عورت کے حج یا عمرہ کے لئے دیگر شرائط کے ساتھ بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ دوران سفر اس کا خاوند یا کوئی دوسرا محرم ساتھ ہو کیونکہ کوئی عورت بھی اپنے محرم کے بغیر عمرہ یا کوئی اور سفر نہیں کر سکتی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' [3]

---

[1] آل عمران: ۹۷۔ [2] صحیح مسلم، الایمان: ۱۲۔ [3] صحیح البخاري، جزء الصید: ۱۸۶۲۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک آدمی کا جہادی لشکر کے لئے نام لکھ دیا گیا جبکہ اس کی بیوی حج پر جانا چاہتی تھی، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''تم اپنی بیوی کے ساتھ جاؤ۔'' ❶

ایک روایت میں ہے کہ اس شخص نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری بیوی حج کے سفر پر روانہ ہو چکی ہے، آپ نے فرمایا جاؤ اور اس کے ساتھ حج میں شریک ہو جاؤ۔ ❷

کیا عورتیں بھی حج کے لئے اپنے بال منڈوائیں؟

سوال ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو بال منڈوانے کی کیا فضیلت ہے؟ کیا عورتیں بھی اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے اپنے بال منڈوائیں، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا حکم ہے، وضاحت کریں؟

جواب یوم النحر یعنی قربانی کے دن بال منڈوانا، ترشوانے سے افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال منڈوانے والوں کے لئے تین دفعہ اور ترشوانے والوں کے لئے ایک دفعہ دعا کی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! سر منڈوانے والوں کے لئے مغفرت فرما۔''

صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! بال ترشوانے والوں کے لئے بھی یہی دعا کریں تو آپ نے تین دفعہ بال منڈوانے والوں کے لئے بخشش کی دعا فرمائی پھر آخر میں بال ترشوانے والوں کے لئے مغفرت کی دعا کی۔ ❸

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال منڈوانے والوں کے لئے رحم کی دعا مانگی۔ ❹

اس سے معلوم ہوا کہ نحر کے دن قربانی کے بعد بال منڈوانا افضل ہے لیکن عورتیں یہ کام نہیں کریں گی کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورتوں کے لئے بال منڈوانا نہیں بلکہ صرف بال ترشوانا ہے۔'' ❺

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر اتفاق نقل کیا ہے کہ عورتیں صرف کچھ بال ترشوائیں گی۔ ❻

لہٰذا عورتوں کو انگلی کے پورے کی مقدار برابر بال خود ہی کاٹ لینا چاہئیں۔ (واللہ اعلم)

حج کرنے والے پر بال یا ناخن کاٹنے کی پابندی

سوال ہم نے حج کے لئے حرمین کا سفر کرنا ہے، کیا ہم پر بھی پابندی ہے کہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد بال یا ناخن نہ کاٹیں، کیونکہ ہم نے بھی دسویں ذوالحجہ کو قربانی کرنی ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب قربانی کرنے والے کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے، چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی قربانی کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔'' ❼

---

❶ صحيح البخاري، الصيد: ١٨٦٢۔ ❷ صحيح البخاري، الجهاد: ٣٠٠٦۔
❸ صحيح بخاري، الحج: ١٧٢٨۔ ❹ صحيح البخاري، الحج: ١٧٢٧۔
❺ سنن أبي داؤد، المناسك: ١٩٨٤۔ ❻ فتح الباري ص ٣٩٠ ج ٤۔ ❼ مسند أحمد ٣٠١ ج ٦۔

ایک کے یہ الفاظ ہیں: ''جس کے پاس قربانی کے لئے کوئی جانور ہو وہ ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد قربانی کر لینے تک اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔'' [1]

ان روایات کے پیش نظر جن حضرات نے قربانی کرنا ہے، انہیں ذوالحجہ کا چاند دیکھ لینے کے بعد اپنے بال اور ناخن نہیں کاٹنے چاہئیں۔ البتہ حجاج کرام جو قربانی کرتے ہیں وہ حج تمتع کا ایک حصہ ہے، اسے شرعی اصطلاح میں ہدی کہا جاتا ہے۔ حج کے علاوہ جو قربانی کی جاتی ہے، اس کا ہدی سے کوئی تعلق نہیں ہے چونکہ رسول اللہ ﷺ سے حج کے موقع پر ہدی کے علاوہ بھی قربانی کرنا ثابت ہے، اس لئے کوئی حاجی ہدی کے ساتھ کوئی دوسری قربانی بھی کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد اپنے ناخن اور بال نہ کاٹے لیکن جس نے صرف حج تمتع کی ہدی کرنا ہے، اس پر یہ پابندی نہیں ہے اور وہ آٹھویں ذوالحجہ کو احرام باندھنے سے پہلے بال اور ناخن کاٹ سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

کنکریاں مارنے کے لیے کسی کو وکیل بنانا

سوال میں اپنے بیٹے کے ہمراہ حج پر گئی تھی اور میں نے ہجوم کی وجہ سے خود کنکریاں مارنے کے بجائے اپنے بیٹے کو کہہ دیا کہ وہ کنکریاں میری طرف سے مار دے، حالانکہ میں خود بھی مار سکتی تھی لیکن صرف ہجوم کے ڈر سے ایسا کیا ہے، اب میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب جمرات کو کنکریاں مارنا مناسک حج سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا اور خود اس پر عمل کیا ہے، ان کے متعلق فرمان نبوی ہے: ''بیت اللہ کا طواف، صفا مروہ کی سعی اور رمی جمار کو اللہ تعالیٰ کا ذکر قائم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔'' [2]

اس لئے جمرات کو کنکریاں مارنا اللہ کی عبادت ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، اگر ہجوم کا اندیشہ ہے تو اسے مؤخر کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں نیابت صحیح نہیں ہے کہ خود مارنے کے بجائے کسی دوسرے کو یہ کام کرنے کے متعلق کہہ دیا جائے، ہاں اگر کوئی بیمار ہے یا کوئی عورت حاملہ ہو اور اسے اپنے حمل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے حالات میں کسی کو وکیل بنایا جا سکتا ہے، بصورت دیگر مرد اور عورت دونوں کو خود کنکریاں مارنی چاہئیں۔

صورتِ مسئولہ میں سائلہ نے استطاعت کے باوجود اپنے بیٹے کو کنکریاں مارنے کے لئے وکیل مقرر کیا ہے جبکہ وہ خود اس کی استطاعت رکھتی تھی، اس کے باوجود اس نے خود کنکریاں نہیں ماریں، اس لئے ہمارے رجحان کے مطابق احتیاط یہ ہے کہ اس کوتاہی کی تلافی کے لئے فدیے کا ایک جانور ذبح کر کے مکہ کے فقراء میں تقسیم کر دے جیسا کہ سورۃ مائدۃ آیت نمبر ۹۵ میں ہے۔

(واللہ اعلم)

عورت کے لئے کسی غیر محرم کو محرم بنانا

سوال ہمارے ہاں ٹریول ایجنٹ حضرات کسی اجنبی آدمی کو کاغذی کارروائی کے طور پر کسی عورت کا محرم بنا دیتے ہیں،

---

[1] مسند أحمد ۳۰۱ ج٦۔ [2] سنن أبي داؤد، المناسك : ۱۸۸۸۔

آیا ایسا کرنا جائز ہے اور ایسی عورت کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے، اس کا حج ہوگا یا نہیں کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب حج کی فرضیت کے لئے جو شرائط ہیں، ان میں عورت کے لئے ایک خاص شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس کا محرم، بھائی یا بیٹا موجود ہو کیونکہ محرم کے بغیر عورت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں خواہ وہ سفر حج ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث میں ہے:

''کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے اور کسی عورت کے پاس کوئی آدمی اس وقت تک نہ جائے جب تک اس کا کوئی محرم موجود نہ ہو۔''

ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سن کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو جہاد کرنے کے لئے لشکر کے ساتھ جا رہا ہوں اور میری بیوی حج کے لئے جانا چاہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنی بیوی کے ساتھ جاؤ۔'' [1]

اس کے علاوہ دیگر روایات بھی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا حرام ہے، اس کا مقصد خود عورت کو تحفظ دینا اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے فتنہ وفساد کے امکان کو روکنا ہے۔ واضح رہے کہ عورت کے محرم سے مراد اس کا وہ قریبی مرد رشتہ دار ہے جس کے ساتھ نسب کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکاح کرنا حرام ہو۔

البتہ کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ اگر راستہ پُرامن ہے اور گروپ میں نیک سیرت خواتین موجود ہیں تو محرم کے بغیر بھی حج کیا جاسکتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''اے عدی! اگر تیری زندگی طویل ہوئی تو ایک ایسی عورت کو دیکھے گا جو اکیلی حیرہ شہر سے سفر کرے گی حتیٰ کہ پُرامن طور پر بیت اللہ کے طواف کرے گی، اسے اللہ کے علاوہ کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔'' [2]

چنانچہ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں ایسی عورت کو دیکھا جو پُرامن طور پر اکیلی بیت اللہ کا حج کرنے کے لئے آئی، لیکن اس حدیث کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ایک پیشین گوئی سے ہے، اس سے ایک عورت کے لئے بلا محرم سفر کرنے کا مسئلہ کشید نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے عورت کے لئے محرم کے بغیر سفر کرنا ناجائز ہے اور ایجنٹ حضرات کا کارروائی کے طور پر کسی غیر محرم شخص کو عورت کا محرم قرار دینا بھی جائز نہیں بلکہ بدترین جھوٹ اور فراڈ ہے۔ تاہم اگر کوئی عورت اس قسم کے حیلے سے بیت اللہ پہنچ جاتی ہے اور حج کا فریضہ سرانجام دیتی ہے تو اس کا حج ادا ہو جائے گا لیکن محرم کے بغیر سفر کرنے سے گنہگار ہوگی۔ (واللہ اعلم)

خاوند کے روکنے کے باوجود حج کرنا

سوال میں صاحب حیثیت ہوں اور حج ادا کرنے کے قابل ہوں لیکن میرا خاوند مجھے حج کرنے کی اجازت نہیں دیتا، جبکہ میرا بھائی میرے ساتھ حج پر جانے کے لئے تیار ہے، کیا میں ایسے حالات میں اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر حج کر سکتی ہوں یا اس کی اطاعت کرتے ہوئے حج کرنے سے باز رہوں، کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں کی جاسکتی، اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔ [1]

---

[1] صحيح البخاري، جزء: ١٨٦٢۔ [2] صحيح البخاري ، مناقب : ٣٥٩٥۔

[1] صحيح البخاري، اخبار الآحاد: ٧٢٥٧۔

چونکہ عورت پر حج فرض ہونے کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں اور اس میں حج کرنے کی مالی استطاعت اور بدنی قوت بھی ہے پھر محرم بھی موجود ہے، اس لئے بلا وجہ اس کا حج نہ کرنا کبیرہ گناہ ہے اور خاوند کے لئے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بلا وجہ حج کرنے سے منع کرے، اس کے لئے شرعاً ایسا کرنا حرام ہے۔ اس بناء پر سائلہ کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ حج پر جائے اور اس فریضہ سے سبکدوش ہو، اگرچہ اس کا خاوند اس کی اجازت نہ دے تو بھی اس کی پروانہ کرے کیونکہ نماز اور روزے کی طرح اس پر حج فرض ہو چکا ہے۔ جس طرح خاوند کے منع کرنے سے نماز اور روزہ نہیں چھوڑا جا سکتا، اسی طرح حج ترک کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حق بندوں کے حق پر مقدم ہے۔ لہٰذا خاوند کو اس بات کا قطعاً حق نہیں ہے کہ وہ بلا وجہ اپنی بیوی کو فریضہ حج سے منع کرے، ہمارے رجحان کے مطابق عورت کو چاہیے کہ وہ اس فرض کی ادائیگی کے لئے اپنے خاوند کو راضی کرے اگر وہ رضامند نہیں ہوتا تو اس کی پروانہ کرتے ہوئے فریضہ حج ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں عورت کا حج

سوال ایک عورت نے اپنے خاوند کے ہمراہ حج پر جانے کی درخواست دی جو منظور ہوگئی لیکن حج پر جانے سے پہلے کسی ناگہانی مرض کی وجہ سے اس کا خاوند فوت ہوگیا، اب وہ عورت حج پر جائے یا عدت گزارنے کے لئے اپنے گھر میں رہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں، ان کی دو اقسام ہیں:

☆ ایک وہ فرض ہے جو وقت پر ادا کیا جاتا ہے اور اگر وقت پر ادا نہ ہو سکے تو وقت کے بعد اس کی قضا بھی دی جا سکتی ہے، جیسے نماز اور روزہ وغیرہ ہیں۔

☆ دوسرا وہ فرض ہے جو وقت پر ہی ادا ہو سکتا ہے اور اس کا وقت محدود ہوتا ہے، وقت گزرنے کے بعد بطور قضاء اسے پورا نہیں کیا جا سکتا۔

عورت کی عدت کا مسئلہ دوسری قسم کے فرض سے تعلق رکھتا ہے کہ اس کا وقت مقرر اور محدود ہے، وقت گزرنے کے بعد اسے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مطلقہ عورت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان کو ان کے گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ خود گھروں سے نکلیں۔'' [1]

اس طرح فوت شدہ خاوند والی عورت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ چار ماہ دس دن اپنے شوہر کے گھر میں رہے اور کسی قسم کی زیب و زینت نہ کرے، اس بناء پر عورت کے لئے خاوند کی وفات پر عدت وفات گزارنا ضروری ہے جو اس کی وفات سے شروع ہو کر چار ماہ دس دن تک ہے۔ یہ فرض اپنے وقت مقررہ کے بعد ادا نہیں ہو سکتا، لہٰذا ایسی عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہے اور اس کی حج کے لئے درخواست بھی منظور ہو چکی ہے، اس کے لئے حج کے بجائے عدتِ وفات گزارنا ضروری ہے، اسے چاہیے کہ فی الحال حج کو ملتوی کر دے اور آئندہ جب موقع ملے تو تب حج کرے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] الطلاق: ۱۔

حجر اسود کو چومنے کی حکمت

سوال حج یا عمرہ کرنے والا حجر اسود کو چومنے کا بڑا اہتمام کرتا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ آیا قرآن وحدیث میں کوئی حکمت بیان ہوئی ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انعام کی بجا آوری میں یہی حکمت کافی ہے کہ ہمارے آقا اور خالق کائنات نے یہ کام کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت فرمایا تھا: ''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے اور میرے لئے کسی قسم کے نفع یا نقصان کا مالک نہیں ہے، اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔'' [1]

ہمارے لئے تو یہ حکمت کافی ہے کہ اسے بوسہ دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اس کے علاوہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن یہ حجر اسود اس طرح آئے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن کے ذریعے یہ دیکھے گا اور زبان بھی ہوگی جس کے ذریعے بول کر ایسے شخص کے لئے گواہی دے گا جس نے حق کے ساتھ اس کا بوسہ لیا ہوگا۔ [2]

لہٰذا آرام وسکون اور محبت وچاہت کے ساتھ حجر اسود کا بوسہ لینا چاہیے۔ اس سلسلہ میں دھکم پیل سے کام نہ لیا جائے، اگر بوسہ نہ لیا جائے تو ہاتھ لگا کر اسے چوم لیا جائے، اگر ہاتھ بھی نہ لگ سکے تو دور سے اشارہ کرنے کی صورت میں ہاتھ کو چومنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا محرم بننا

سوال کیا کوئی عورت دوسری عورت کے لئے محرم بن سکتی ہے یعنی اس کے ساتھ سفر کر سکتی ہے، حج پر جا سکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کے حوالے سے جواب دیں؟

جواب اسلام نے عورت کی عزت وناموس کی حفاظت کے لئے سفر میں محرم ساتھ ہونے کی شرط لگائی ہے تاکہ وہ اسے غلط مقاصد کے حامل لوگوں سے محفوظ رکھے۔ اہل علم نے محرم ہونے کے لئے پانچ شرائط عائد کی ہیں:

① مرد ہو، ② مسلمان ہو، ③ بالغ ہو، ④ عاقل ہو، ⑤ وہ اس عورت کے لئے ابدی طور پر حرام ہو۔

واضح رہے کہ جن رشتہ داروں سے وقتی طور پر نکاح حرام ہے مثلاً بہنوئی اور پھوپھا وغیرہ وہ محرم نہیں ہیں۔ صورت مسئولہ میں کوئی عورت کسی دوسری عورت کے لئے محرم نہیں بن سکتی، اس لئے کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ (بطور محرم) سفر نہیں کر سکتی اور نہ ہی حج پر جا سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''عورت صرف محرم کے ساتھ ہی سفر کرے۔'' [3]

ہمارے رجحان کے مطابق سفر خشکی کا ہو یا ہوائی یا بحری، سب کا ایک ہی حکم ہے۔ کسی عورت کو شرعی طور پر اجازت نہیں ہے کہ

---

[1] صحيح البخاري، الحج: ١٥٩٧۔ [2] مسند أحمد ص ٢٤٧ ج ١۔ [3] صحيح البخاري، الجهاد: ٣٠٠۔

وہ محرم کے بغیر سفر کرے اور عورت کسی عورت کی محرم نہیں ہو سکتی، لہٰذا اس کے ساتھ سفر کرنا بھی ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

نابالغ بچے کا حج

سوال ہم دونوں میاں بیوی اللہ کے فضل و کرم سے اس سال حج پر جانے کا پروگرام رکھتے ہیں، اس کے لئے ہم نے درخواست بھی جمع کرا دی ہے، ہمارے ساتھ ۵ سال کا بیٹا بھی ہے، ہم اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، کیا وہ بھی مناسک حج میں شریک ہو سکے گا، وضاحت فرمائیں؟

جواب نابالغ بچہ حج کر سکتا ہے، اسے دوسرے لوگوں کی طرح احرام پہنایا جائے اور وہ مناسک حج ادا کرے، لیکن بالغ ہونے کے بعد اسے دوبارہ حج کرنا ہوگا، بچپن کا حج، بلوغت کے بعد کے لئے کافی نہیں ہوگا، اگر آئندہ کسی وقت بلوغ کے بعد اس پر حج فرض ہوتا تو اسے نیا حج کرنا ہوگا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور عرض کرنے لگی: کیا اس کے لئے حج ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں لیکن اس کا ثواب تجھے ملے گا۔'' ❶

اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ دوسرا حج کرے۔'' ❷

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ بچہ حج کر سکتا ہے اور اس کا حج صحیح ہے لیکن آئندہ بلوغ کے بعد اگر اس پر حج فرض ہوا تو بچپن کا حج اس کے لئے کافی نہیں ہوگا بلکہ اسے نیا حج کرنا ہوگا، نیز نابالغ بچہ اسی طریقہ اور انداز سے حج کرے گا جس طرح دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

عمرہ کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں

سوال حج تو ذوالحجہ کے مہینہ میں کیا جاتا ہے، کیا عمرہ کے لئے بھی کوئی وقت مقرر ہے یا جب چاہیں کر سکتے ہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب عمرہ کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ پورے سال میں کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے، البتہ رسول اللہ ﷺ نے تمام عمرے حج کے مہینوں میں ہی ادا کئے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دور جاہلیت میں کفار کی طرف سے پابندی ہوا کرتی تھی کہ حج کے مہینوں میں عمرہ نہ کیا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے اس پابندی کو عملی طور پر ختم کرنے کے لئے حج کے مہینوں میں عمرے ادا کئے تھے، لیکن امت کے لئے عمرہ کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، البتہ ماہ رمضان میں عمرہ کرنا فضیلت کا باعث ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رمضان میں عمرہ کرنا حج کے ثواب کے برابر ہے۔'' ❸

اگر انسان کے پاس فرصت ہو تو اسے یہ فضیلت ضرور حاصل کرنی چاہیے، واضح رہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عمرہ ماہ رجب میں کیا تھا۔ ❹

---

❶ صحيح مسلم، الحج: ١٣٣٦۔ ❷ سنن البيهقي ص ٣٢٥ ج ٤ ۔
❸ صحيح البخاري ، العمرة : ١٧٨٢۔ ❹ صحيح البخاري ، العمرة: ١٧٧٥۔

لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ رجب میں نہیں کیا۔'' ❶

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ماہ ذوالحجہ میں اکیلا عمرہ کیا تھا جیسا کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں حج سے پہلے عمرہ نہیں کر سکی ہوں تو آپ نے ان کے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اپنی بہن کو مقام تنعیم پر لے جاؤ، وہاں سے احرام باندھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عمرہ کرے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ❷

بہر حال عمرہ کے لئے کوئی مقررہ وقت نہیں ہے، انسان جب چاہے اسے ادا کر سکتا ہے البتہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے سے حج کے برابر ثواب ملتا ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت حج میں ''سبیل'' سے کیا مراد ہے؟

سوال سورۃ آل عمران کی ایک آیت میں فرضیت حج کا بیان ہوا ہے، اس میں لفظ ''سبیل'' سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت کر دیں؟

جواب جس آیت کریمہ کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے، درج ذیل ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھتے ہوں۔'' ❸

اس آیت میں سبیل سے مراد زاد اور راحلہ ہے۔ زاد سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس اپنے اہل وعیال کے اخراجات سے زائد اتنی رقم موجود ہو کہ وہ بیت اللہ تک آنے، واپس جانے اور اس کے کھانے پینے کے لئے کافی ہو، چونکہ قرون اولیٰ میں ہر ایک انسان اپنی سواری کا انتظام خود کرتا تھا اس لئے متقدمین کے ہاں راحلہ یعنی سواری کی شرط کا ذکر بھی ملتا ہے، اب چونکہ سرکاری طور پر اس کا انتظام کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کے پاس اتنی رقم کا ہونا ضروری ہے کہ بیت اللہ آنے جانے، وہاں کے کھانے پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے کافی ہو، ان اخراجات کے علاوہ اتنی رقم اپنے اہل وعیال کے لئے چھوڑ کر جائے جو اس کی عدم موجودگی میں ان کے اخراجات کے لئے کافی ہو ''سبیل'' کے مفہوم میں یہ تمام باتیں شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبیل سے مراد راستے کا خرچ اور سواری ہے۔'' ❹

لیکن یہ روایت ضعیف ہے، علامہ البانی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ یہ اور اس معنی کی دیگر تمام روایات ضعیف ہیں۔ ❺

بہر حال سبیل سے مراد اتنی رقم ہے جو اس کے اور اہل خانہ کے اخراجات کے لئے کافی ہو۔ (واللہ اعلم)

محرم کے بغیر عمرہ کرنا

سوال میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ عمرہ کے لئے جا رہا ہوں، ہمارے ساتھ تین مزید عورتیں عمرہ کی ادائیگی کے لئے جا رہی ہیں، ان کا کوئی محرم نہیں ہے، کیا اس حالت میں محرم کے بغیر وہ عمرہ کر سکتی ہیں، کتاب وسنت کے مطابق راہنمائی کریں؟

جواب حج اور عمرہ کے احکام ایک جیسے ہیں، حج کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ کے لئے اس گھر کا حج کرنا لوگوں

---

❶ صحيح البخاري، العمرة: ١٧٧٧۔ ❷ صحيح البخاري، العمرة: ١٧٨٤۔ ❸ آل عمران: ٩٧۔

❹ سنن الدارقطني ص ٢١٦ ج ٢۔ ❺ ارواء الغليل: ٩٨٨۔

پر فرض ہے جو اس کی طرف جانے کی طاقت رکھتا ہو۔'' ❶

عورت کے لئے دوران سفر ''محرم'' کا ہونا سبیل میں شامل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس عورت کے ساتھ محرم نہ ہو اس پر حج یا عمرہ فرض نہیں ہے، اس لئے خاوند یا کسی دوسرے محرم کے بغیر عورت کے لئے حج یا عمرے کے سفر پر جانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جو عورت اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ محرم کے بغیر ایک دن یا رات کا سفر کرے۔'' ❷

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے، یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: یا رسول اللہ! میری بیوی حج کے لئے جانا چاہتی ہے جبکہ میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں شمولیت کے لئے لکھ لیا گیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات سن کر فرمایا: ''تم جاؤ اور اپنی بیوی کے ہمراہ حج کرو۔'' ❸

ان احادیث کی بنا پر ہمارا رجحان ہے کہ صورت مسئولہ میں تین خواتین کا عمرہ کے سفر پر محرم کے بغیر جانا صحیح نہیں ہے، ہمارا یہ رجحان ان عمومی احادیث کے مطابق ہے جو عورت کے لئے خاوند یا کسی دوسرے محرم کے بغیر سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اگرچہ کچھ اہل علم اس کے متعلق نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس اپنے موقف کے لئے کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ شریعت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔ آمین!

دوران احرام نقاب پہننا

سوال میں نے عمرہ کرنے کی نیت کی، میں نے مسائل کی عدم واقفیت کی وجہ سے عمرہ کرنے کے دوران نقاب اوڑھے رکھا، اب میرے لئے کیا حکم ہے، کیا مجھے کوئی فدیہ وغیرہ دینا پڑے گا؟

جواب عورت کو دوران احرام نقاب اوڑھنے کی پابندی نہیں ہے، وہ دستانے وغیرہ بھی نہیں پہن سکتی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورت دوران احرام نقاب اور دستانے نہیں پہن سکتی۔'' ❹

اس حدیث کے پیش نظر عورت احرام میں برقعہ یا نقاب نہیں پہن سکتی، البتہ اسے اجنبی حضرات سے پردہ ضرور کرنا ہوگا، نقاب نہ پہننے کی پابندی کا مطلب پردے کے احکام میں نرم کرنا نہیں ہے، ہاں اگر کوئی عورت دوران احرام نقاب اوڑھ لیتی ہے تو اس پر فدیہ واجب ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے: ① ایک جانور (بکری) ذبح کی جائے۔ ② چھ مساکین کو کھانا کھلایا جائے۔ ③ تین دن کے روزے رکھے جائیں، ان میں کسی ایک کو عمل میں لایا جائے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اسے مسئلے کا علم ہو اور جانتے بوجھتے ہوئے اس پابندی کی خلاف ورزی کرے، اگر کسی عورت نے شرعی حکم سے عدم واقفیت کی بنا پر جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے یا احرام کی حالت کو بھول کر یا ممنوعات احرام کو بھول کر برقعہ اوڑھ لیا تو ان صورتوں میں اس پر کوئی فدیہ نہیں ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ہمارے رب! اگر ہم بھول گئے ہوں یا ہم نے کوئی خطا کی ہو تو ہمیں اسکے متعلق مواخذہ نہ کرنا۔'' ❺

---

❶ آل عمران: ۹۷۔ ❷ صحیح البخاري، الحج: ۱۰۸۸۔ ❸ صحیح مسلم، المناسك: ۱۳۴۱۔
❹ صحیح البخاري، الحج: ۱۸۳۸۔ ❺ ۲/ البقرة: ۲۸۶۔

بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں عورت پر کوئی فدیہ وغیرہ نہیں ہے کیونکہ فدیہ جان بوجھ کر کام کرنے والے پر ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران حج ایام آنا

سوال میں اس سال حج کے لئے گئی، مزدلفہ سے واپسی کے بعد ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو طواف کر رہی تھی کہ مجھے ایام سے دو چار ہونا پڑا، شرم کی وجہ سے میں اپنے بھائی کو بھی نہ بتا سکی جو میرے ساتھ محرم کی حیثیت سے تھا۔ اسی طرح میں نے طواف اور دیگر مناسک حج کئے، اب میں واپس پاکستان آچکی ہوں، میرے لئے شرعی طور پر کیا حکم ہے؟

جواب طواف افاضہ جو دسویں ذوالحجہ کو کیا جاتا ہے، حج کا رکن ہے، اس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیوی سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق فرمایا تھا جب کہ وہ حائضہ ہوگئی تھیں: ''کیا یہ ہمیں روکے رکھے گی؟ دیگر اہل خانہ نے عرض کیا کہ وہ طواف افاضہ کر چکی ہیں تو آپ نے فرمایا: تب کوئی حرج نہیں۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد: ''کیا یہ ہمیں روکے رکھے گی'' اس بات کی دلیل ہے کہ وہ طواف افاضہ کے بغیر حج نہیں ہوتا ہے، اگر کسی عورت کو طواف افاضہ کے دوران ایام آجائیں اور وہ اسی حالت میں طواف کرتی رہے تو اس کا طواف صحیح نہیں اور نہ ہی اس کا حج مکمل ہے، اگر اسباب و وسائل مہیا ہوں تو سائلہ اپنے محرم کے ہمراہ دوبارہ مکہ مکرمہ جائے اور میقات سے عمرہ کا احرام باندھے، عمرہ کی ادائیگی میں طواف کعبہ و صفا مروہ کی سعی اور اپنے سر کے بالوں کو کاٹنا ہوگا، اس کے بعد وہ طواف افاضہ کرے گی۔ اگر یہ خون شدتِ گھبراہٹ، انتہائی زیادہ بھیڑ یا کسی اور وجہ سے آیا ہے تو سائلہ کا ادا کردہ طواف اس شخص کے نزدیک تو صحیح ہوگا جو طواف کے لیے طہارت کی شرط عائد نہیں کرتا۔ البتہ ہمارے رجحان کے متعلق اسے دوبارہ سفر کرنا ہوگا، اگر دوبارہ جانا ممکن نہیں ہے تو اس نے جو کچھ کر لیا ہے وہ صحیح اور درست ہے کیونکہ وہ اس سے زیادہ کی استطاعت نہیں رکھتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔'' [2]

مگر استطاعت نہ ہونے کا فیصلہ نہایت نیک نیتی سے کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے۔ (واللہ اعلم)

عمرہ کے لئے طواف وداع

سوال کیا عمرہ کرنے والے پر طواف وداع کرنا ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے طواف وداع کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا، وضاحت فرمائیں؟

جواب اگر کوئی آدمی مکہ مکرمہ میں آیا اور عمرہ کرنے کے فوراً بعد واپس نہیں ہوا بلکہ اس نے مکہ میں قیام کیا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ واپسی کے وقت طواف وداع کرے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی شخص کوچ نہ کرے حتیٰ کہ وہ آخری وقت بیت اللہ میں نہ گذار لے۔'' [3]

---

[1] صحيح البخاري، الحج: ١٧٥٧۔ [2] ٢/البقرة: ٢٨٦۔ [3] صحيح مسلم، الحج: ١٣٢٧۔

اس حدیث کا عموم عمرہ کو شامل ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: اپنے عمرہ میں بھی تم اسی طرح کرو جس طرح تم اپنے حج میں کرتے ہو۔ ❶

یہ حکم بھی عام ہے، اس میں عمرہ کا طواف وداع بھی شامل ہے۔ شریعت میں عمرہ بھی حج کی طرح ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حج اصغر کہا ہے چنانچہ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمرہ، حج اصغر ہے۔'' ❷

اس بنا پر اگرچہ طواف وداع کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر دیا گیا تھا لیکن عمرہ کرنے کے بعد بھی طواف وداع کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی مروی ہے: جو شخص اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اسے اپنا آخری وقت بیت اللہ میں گذارنا چاہیے۔ ❸

لیکن یہ ایک راوی حجاج کی وجہ سے ضعیف ہے، لیکن اسے تائید کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

احرام کی دو رکعت

سوال ہمارے ہاں عام طور پر احرام باندھنے کے بعد دو رکعت پڑھی جاتی ہیں، میں نے کچھ علماء سے سنا ہے کہ احرام کی مخصوص دو رکعت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے؟

جواب احرام کے لئے دو رکعت پڑھنے کی مشروعیت کسی صحیح حدیث میں منقول نہیں ہے، ہمارے ہاں یہ غلط طور پر مشہور ہو چکا ہے کہ احرام باندھنے کے بعد دو رکعت پڑھنا چاہئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھ کر جو دو رکعت ادا کی تھیں وہ احرام کی نہیں بلکہ نماز عصر کی دو رکعت (قصر) تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے احرام باندھتے وقت کوئی نماز مشروع قرار دی ہو، اس کی وضاحت کسی حدیث میں نہیں ہے، اس کے متعلق نہ تو آپ کا کوئی قول مروی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی عملی ثبوت ملتا ہے۔ اگر احرام باندھتے وقت کسی نماز کا وقت ہو جائے تو اسے ادا کیا جا سکتا ہے لیکن اس نماز کا احرام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تلبیہ کب بند کیا جائے

سوال عمرہ یا حج کرنے والے کو تلبیہ کب بند کر دینا چاہیے؟

جواب عمرہ کرنے والا جب بیت اللہ کا طواف شروع کرے تو اسے تلبیہ بند کر دینا چاہیے، چنانچہ حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عمرہ میں تلبیہ سے اس وقت رک جاتے جب وہ حجر اسود کو بوسہ دیتے۔ ❹

اور عمرہ کے آغاز میں حجر اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حج کرنے والا اس وقت تلبیہ بند کر دے جب وہ عید کے دن بڑے شیطان کو کنکریاں مار لے۔

چنانچہ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ کہتے رہتے۔ ❺

---

❶ صحيح البخاري، الحج: ١٥٣٦۔ ❷ سنن الدارقطني ص ٢٨٥ ج٢۔ ❸ سنن الترمذي، الحج: ٢٠٠٢۔
❹ سنن أبي داؤد، المناسك: ١٨١٧۔ ❺ صحيح البخاري، الحج: ١٥٤٣۔
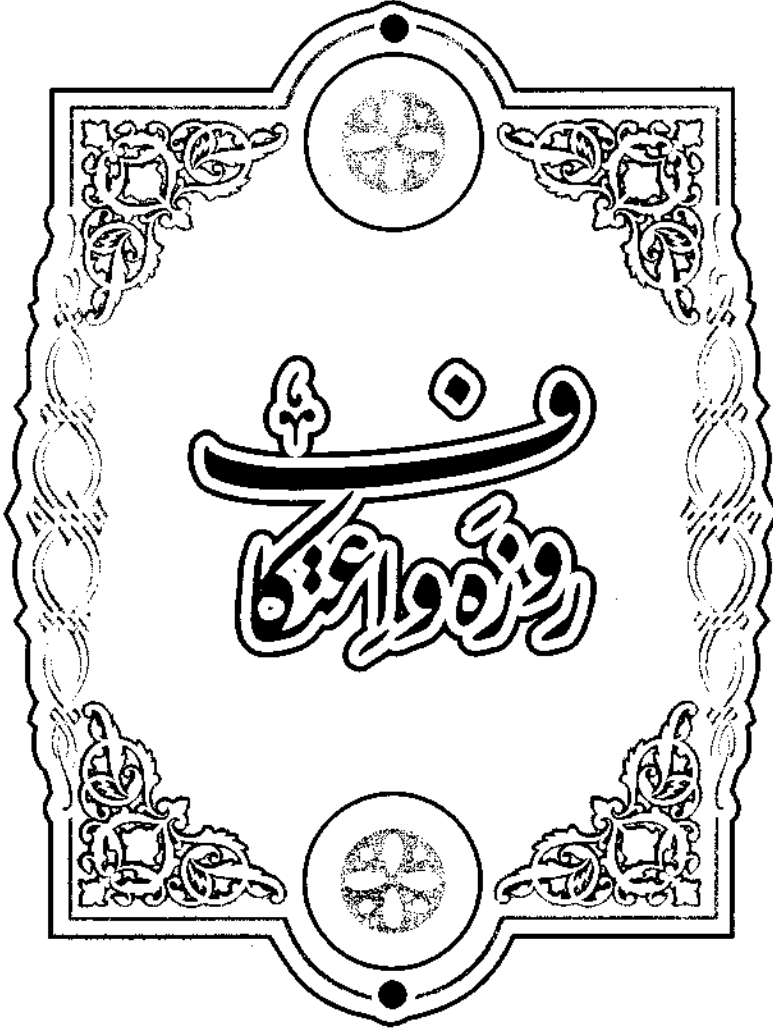
روزہ واعتکاف

روزہ و اعتکاف

بحالتِ روزہ آنکھوں میں دوائی ڈالنا

سوال روزہ کی حالت میں آنکھ میں دوائی ڈالنا یا سرمہ لگانا کیا حکم رکھتا ہے، اس سلسلہ میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ روزہ دار کو سرمہ نہیں لگانا چاہیے، اس کی کیا حیثیت ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب روزے کی حالت میں آنکھ میں دوائی ڈالی جا سکتی ہے اور سرمہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت روزہ اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ [1]

اس حدیث سے واضح طور پر دوران روزہ دار کو سرمہ لگانے کا جواز نکلتا ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، اس کے باوجود کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سرمہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی ممانعت کے متعلق ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روہ دار کو سرمہ لگانے سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔ [2] لیکن اس حدیث کے متعلق امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے کہ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے مجھ سے کہا: ''یہ حدیث ضعیف ہے۔'' [3] بہر حال روزہ دار کو آنکھ میں دوائی ڈالنے اور سرمہ لگانے کی اجازت ہے، اس کے متعلق کوئی ممانعت احادیث میں نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

احتیاطاً افطاری میں تاخیر

سوال کچھ لوگ احتیاط کے طور پر سورج غروب ہونے کے بعد چند منٹ تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں، اس قسم کی احتیاط کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب سورج غروب ہونے کے بعد روزہ جلدی افطار کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے، ایسے حالات میں احتیاط کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں یہ عمل ایک دوسرے انداز سے بیان ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''لوگ روزہ افطار کرنے میں جب تک جلدی کرتے رہیں گے دین ہمیشہ غالب رہے گا کیونکہ یہودی اور عیسائی روزہ تاخیر سے افطار کرتے ہیں۔ [4]

ان احادیث کے پیش نظر سورج غروب ہونے کے بعد روزہ جلدی افطار کرنا چاہیے، مزید احتیاط کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابن ماجه : الصيام: ١٦٧٨۔
[2] بيهقى: ص ٢٦٢، ج ٤۔
[3] ابو داؤد، الصوم: ٢٣٧٧۔
[4] ابو داؤد، الصوم: ٢٣ ٥٣۔

روزے دار کا بھول کر کھانا

سوال کیا بھول کر کھانے پینے سے روزہ خراب ہو جاتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب طلوع فجر سے غروب آفتاب تک دانستہ کھانے پینے اور تعلقات زن وشوہر سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے جب کہ بھول کر کھانے پینے سے روزہ خراب نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو روزہ دار بھول کر کچھ کھا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔'' [1]

ایک روایت میں ہے کہ یہ ایسا رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے پہنچایا ہے۔ [2]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی بھول کر رمضان میں روزہ کھول لے تو اس پر کسی قسم کی قضا یا کفارہ نہیں ہے۔ [3]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر بھول کر کوئی ایسا عمل کر لیا جائے جو روزہ کو باطل کر دینے والا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور نہ ہی قضا یا کفارہ واجب ہوتا ہے، البتہ دانستہ ایسا کام کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

اذان کے بعد سحری کھانا

سوال میں جب صبح بیدار ہوا تو اذان ہو رہی تھی، میں نے جلدی جلدی کھانا کھا کر روزہ رکھ لیا اور بیوی نے تو اذان کے بعد پانی پی کر روزہ رکھا۔ ایسے حالات میں ہمیں کیا حکم ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب قرآن کریم نے روزے دار کے لیے کھانے پینے کی حد بایں الفاظ بیان کی ہے: ''تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے نمایاں ہو جائے پھر رات تک اپنے روزے کو پورا کرو۔'' [4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد کھانا پینا روزے کو باطل کر دیتا ہے ہاں اگر کھانے کے دوران اذان شروع ہو جائے تو اپنا کھانا وغیرہ پورا کر لینے میں چنداں حرج نہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اذان سنے اور کھانے کا برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو اسے اپنی حاجت کو پورا کر لینا چاہیے۔ [5]

یہ بھی اس صورت میں ہے جب مؤذن نے صحیح وقت پر اذان دی ہو، اگر مؤذن نے دیر سے اذان دی ہے تو اسے رخصت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے، لیکن اذان مکمل ہونے کے بعد جلدی جلدی کھانا پینا یا صرف پانی پی کر روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ ایسے انسان کو چاہیے کہ وہ اگر ہمت رکھتا ہے تو کچھ کھائے پیے وغیر روزہ رکھ لے کیونکہ روزہ کے لیے سحری مستحب عمل ہے اگر کبھی سحری کے بغیر روزہ رکھ لیا جائے تو اس سے روزے میں کوئی نقص نہیں پڑتا۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''سحری بابرکت کھانا ہے لیکن واجب نہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ اگرچہ سحری کے لیے رسول اللہ ﷺ کا امر مروی ہے لیکن یہ امر وجوب کے لیے

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۳۳۔ [2] ترمذی، الصوم: ۷۱۷۔ [3] مستدرک حاکم: ص ۴۳۰، ج ۱۔
[4] البقرۃ: ۱۸۷۔ [5] مسند امام احمد، ص ۵۱۰، ج ۲۔

نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے وصال کرنے والوں کو تنبیہ تو کی ہے لیکن ان کے روزے کو باطل قرار نہیں دیا۔ بہر حال اذان کے بعد کچھ کھا پی کر روزہ رکھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اذان ہوتے ہوئے بھی کھانے پینے کی ابتدا کرنا محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

دورانِ ایام فوت شدہ روزوں کی قضاء

سوال ایام کی حالت میں جو روزے رہ جائیں، انہیں رمضان کے بعد کس حد تک مؤخر کیا جا سکتا ہے؟ کیا انہیں مسلسل رکھنا ہوتا ہے یا متفرق طور پر بھی رکھے جا سکتے ہیں؟ قرآن وحدیث میں ان کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب ایام کے دوران جو روزے رہ جائیں ان کی قضا ضروری ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ''ہمیں روزوں کی قضاء کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ [1]

اگر روزے کے دوران حیض شروع ہو جائے تو اس سے بھی روزہ ختم ہو جاتا ہے، جس کی قضا بعد میں دینا ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت حائضہ ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے۔ [2]

قضاء شدہ روزوں کے متعلق بہتر ہے کہ انہیں آئندہ رمضان سے پہلے پہلے پورا کر لیے جائیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میرے ذمہ رمضان کے روزے ہوتے تھے تو میں ماہ شعبان کے علاوہ ان کی قضاء کے متعلق طاقت نہ رکھتی تھی۔ [3]

راوی حدیث نے اس کی وجہ بایں الفاظ بیان کی ہے۔: میں رسول اللہ ﷺ سے مصروفیت کی وجہ سے ایسا نہ کر پاتی تھی۔ [4]

ہمارے رجحان کے مطابق حق بات یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو تو جلدی قضاء دینا ضروری ہے کیونکہ زندگی کے ایام مستعار ہیں، ان کے ختم ہونے کا علم نہیں، اس لیے اس قسم کا قرض چکانے میں جلدی کرنا چاہیے۔ نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف جلدی کرو۔'' [5]

قضا شدہ روزوں کو مسلسل رکھنا ضروری نہیں بلکہ انہیں متفرق طور پر بھی رکھا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رمضان میں قضاء شدہ روزوں کو اگر الگ الگ رکھ لیا جائے تو چنداں حرج نہیں۔ (بخاری، معلقاً) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس قسم کا فتویٰ مروی ہے۔ [6] مسلسل رکھنے کے متعلق جو روایت پیش کی جاتی ہے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا گھر میں اعتکاف کرنا

سوال آج کل پر فتن دور میں اگر عورت اپنے گھر میں اعتکاف بیٹھ جائے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

---

[1] صحیح مسلم، الحیض: ۳۳۵۔　[2] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۱۔
[3] مسند امام احمد: ص ۱۲۴، ج ۶۔　[4] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۰۔
[5] آل عمران: ۱۳۳۔　[6] دار قطنی: ص ۱۹۳، ج ۲۔

جواب قرآن وحدیث کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے، اس حکم میں مرد اور عورتیں سب برابر ہیں۔ گھر میں اعتکاف کرنے کی قرون اولیٰ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہمارے رجحان کے مطابق اگر حالات سازگار ہوں تو عورت کو گھر کے بجائے مسجد میں ہی اعتکاف کرنا چاہیے کیونکہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے انہیں اجازت دے دی، چنانچہ ان کے لیے وہاں خیمہ لگا دیا گیا جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو علم ہوا تو انھوں نے بھی اپنا خیمہ لگا لیا، ان کی دیکھا دیکھی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے بھی خیمہ لگا لیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیمے دیکھے تو فرمایا یہ کیا ہے؟ کیا اس سے نیکی کمانے کا ارادہ رکھتی ہیں، میں تو اس سال اعتکاف نہیں کروں گا۔ [1] ایک روایت میں ہے کہ آپ نے تمام خیموں کو اکھاڑ دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام خیموں کو آپ کے حکم کے مطابق ختم کر دیا گیا۔ [2]

ازواج مطہرات شرم و حیا کے باوجود مسجد میں ہی اعتکاف کرتی تھیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کو گھروں میں اعتکاف بیٹھنے کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کے خیمے اکھاڑ کر اعتکاف کا پروگرام ہی ختم کر دیا، اگر گھر میں اعتکاف کرنا جائز ہوتا تو آپ انہیں گھر میں اعتکاف بیٹھنے کا حکم دیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں ہی اعتکاف کرنا ہوگا، اگر مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کے لیے حالات سازگار نہ ہوں تو گھر میں اعتکاف نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک فتویٰ ہے، آپ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کو بدعات کے ارتکاب سے بہت ناراضگی ہوتی ہے اور یہ بھی بدعت ہے کہ ان مساجد میں اعتکاف کیا جائے جو گھروں میں بنی ہوتی ہیں۔'' [3]

لہٰذا عورتوں کو بھی مسجد میں ہی اعتکاف کرنا چاہیے، ان کا گھر میں اعتکاف کرنا صحیح نہیں۔ (واللہ اعلم)

روزے کی نیت

سوال رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کی نیت کیسے ہو، کیا زبان سے نیت کی جا سکتی ہے؟ ہمارے ہاں عام کتابوں میں روزے کی نیت کے الفاظ ملتے ہیں، کتاب وسنت کے مطابق اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب نیت دل کا فعل ہے، دل میں روزہ رکھنے کا عزم کرنا نیت کہلاتا ہے۔ رمضان میں فرض روزے کے لیے یہ عزم طلوع فجر سے پہلے کرنا چاہیے جیسا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص طلوع فجر سے پہلے رات کے وقت روزے کی نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہوتا۔'' [4]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے کر لینا ضروری ہے گویا غروب آفتاب کے بعد سے صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک نیت کی جا سکتی ہے، البتہ نفلی روزے کی نیت دن کے وقت کسی موقع پر بھی کی جا سکتی ہے اور اس کی احادیث میں صراحت ہے۔ [5] لیکن عام کتابوں یا کیلنڈروں پر روزے کی نیت کے

---

[1] صحیح بخاری، الاعتکاف: ٢٠٤٥۔ [2] صحیح بخاری، الاعتکاف: ٢٠٤١۔

[3] بیہقی: ص٣١٦، ج ٤۔ [4] نسائی، الصیام: ٢٣٣٣۔ [5] نسائی، الصیام: ٢٣٢٦۔

الفاظ لکھے ہوتے ہیں، وہ انتہائی محل نظر ہیں، الفاظ یہ ہیں: ''وبصوم غدٍ نویت من شھرِ رمضان'' اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''میں آئندہ کل کے روزے کی نیت کر رہا ہوں۔''

عربی زبان کے لحاظ سے بھی یہ نیت درست نہیں کیونکہ روزہ آج کا رکھا جا رہا ہے اور نیت آئندہ کل کے روزے کی کی جا رہی ہے۔ بہر حال یہ الفاظ شرعاً درست نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس طرح کے الفاظ ثابت نہیں، نیت چونکہ دل کا فعل ہے، اس لیے دل میں عزم کر لینا ہی کافی ہے، زبان سے اس کی ادائیگی ضروری نہیں۔ (واللہ اعلم)

سحری دیر سے کرنا

سوال ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو طلوع فجر سے کافی وقت پہلے سحری کھا کر سو جاتے ہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں اس عمل کی کوئی گنجائش ہے؟

جواب روزہ کے متعلق عام اصول یہ ہے کہ افطاری میں جلدی اور سحری میں تاخیر ہونی چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں حضرت ابو عطیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا، ہم میں رسول اللہ ﷺ کے دو صحابی موجود ہیں، ان میں سے ایک روزہ جلدی کھولتے ہیں اور سحری تاخیر سے کھاتے ہیں اور دوسرے صحابی افطار دیر سے کرتے ہیں اور سحری جلدی کھا لیتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: ان میں افطار اول وقت اور سحری آخر وقت کرنے والا کون ہے؟ میں نے عرض کیا وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں، انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول بھی یہی تھا۔ [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سحری میں دیر کرنی چاہیے، اسے جلدی کھا کر سو جانا مستحسن امر نہیں کیونکہ ایسا کرنے میں درج ذیل قباحتیں ہیں۔

① یہ لوگ وقت سے پہلے روزہ رکھ لیتے ہیں۔ ② اکثر نماز فجر باجماعت ادا نہیں ہوتی۔ اس طرح فرض نماز باجماعت چھوڑنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ ③ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ نماز فجر طلوع آفتاب کے بعد ادا کرتے ہیں جو گناہ اور جرم ہے۔

ہاں اگر کوئی مجبور ہو تو الگ بات ہے عام حالات میں سحری میں تاخیر کرنا ہی مستحب ہے، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا کہ افطاری آفتاب غروب ہوتے ہی جلدی کرتے اور سحری آخر میں کھاتے تھے۔ (واللہ اعلم)

ترک شدہ روزوں کا فدیہ

سوال ایک آدمی فوت ہوا اور اُس کے ذمے رمضان کے پانچ روزے تھے، اب اس کی طرف سے ترک شدہ روزوں کا فدیہ دیا جائے یا کوئی عزیز رشتہ دار اس کی طرف سے فوت شدہ روزوں کو رکھے، کتاب و سنت کے مطابق اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب روزہ ایک عبادت ہے اور عبادات میں نیابت نہیں ہوتی بلکہ اسے انسان نے خود ہی ادا کرنا ہوتا ہے ہاں اگر کسی عبادت میں قرآن و حدیث سے نیابت ثابت ہو تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے بصورت دیگر توقف کرنا ہوگا مثلاً کسی انسان کی ترک کردہ

---

[1] نسائی، الصیام: ۲۱۶۰۔

نماز کو دوسرا ادا نہیں کر سکتا، البتہ روزہ میں نیابت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جو انسان فوت ہو گیا اور اس کے ذمے کچھ روزے ہوں۔'' [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس عنوان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: کیا اس کی طرف سے روزے رکھنا مشروع ہے یا نہیں؟ کیا ہر قسم کے روزوں کو یہ حکم شامل ہو گا یا یہ حکم خاص روزوں سے متعلق ہے؟ کیا روزے ہی رکھے جائیں یا کھانا بھی کھلایا جاسکتا ہے؟ کیا یہ کام ولی یا سرپرست ہی کر سکتا ہے یا دوسرے بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ [2]

اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص فوت ہو گیا اور اس کے ذمے کچھ روزے تھے تو اس کا سرپرست اس کی طرف سے روزے رکھے۔'' [3] وضاحت کرتے ہوئے ایک اور حدیث پیش کی جاتی ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: یا رسول اللہ! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس کے ذمے روزے تھے، کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! اللہ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔'' [4]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فوت شدہ شخص کے ذمے اگر روزے ہوں تو اس کے وارث اس کی طرف سے روزے رکھیں، وہ روزے خواہ رمضان کے ہوں یا نذر کے یا کفارہ کے، سب کا ایک ہی حکم ہے کیونکہ یہ سب اللہ کا قرض ہے جسے ادا کرنا ضروری ہے، اگر اس کا سرپرست اس کی طرف سے روزے نہ رکھے تو ہر دن کے روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا جائے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''جو شخص اس حالت میں فوت ہو گیا کہ اس کے ذمے مہینہ بھر کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے ہر دن کے روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا جائے۔'' [5] یہ روایت اگرچہ مرفوعاً ضعیف ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً صحیح ہے۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ اس کی طرف سے ہر دن کے روزے کے بدلے نصف صاع گندم دی جائے۔ [6]

امام بخاری رحمہ اللہ اس مسئلہ میں مزید توسیع کے قائل ہیں۔ انھوں نے امام حسن بصری رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر میت کی طرف سے تیس آدمی ایک ہی دن روزہ رکھ لیں تو جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے روزہ

سوال حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے متعلق روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے، کیا وہ بعد میں بطور قضاء روزہ رکھیں گی یا انہیں معاف ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

---

[1] بخاری، الصوم باب نمبر ٤٢۔ [2] فتح الباری، ص ٢٤٥، ج ٤۔

[3] صحیح بخاری، الصوم: ١٩٥٢۔ [4] صحیح بخاری، الصوم: ١٩٥٣۔

[5] ابن ماجه، الصیام: ١٧٥٧۔ [6] صحیح ابن خزیمه، [illegible] نمبر ٢٠٥٧۔

جواب حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ عذر کے بغیر رمضان کے روزے ترک کریں۔ اگر کسی وجہ سے انہیں رمضان میں روزہ چھوڑنے کی ضرورت پڑے تو یہ دونوں قسم کی عورتیں مریض کے حکم میں ہیں، وہ عذر یہ ہوسکتا ہے کہ انہیں روزہ رکھنے کی وجہ سے اپنے یا اپنے بچے کے متعلق نقصان کا اندیشہ ہو۔ لیکن انہیں جب فرصت ملے وہ ترک کردہ روزوں کی قضا دیں۔ مریض کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو شخص تم میں سے بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کر لے۔'' [1]

کچھ اہل علم نے روزوں کی قضا کے ساتھ ساتھ ان پر فدیہ بھی لازم قرار دیا ہے کہ وہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائیں لیکن ہمارے رجحان کے مطابق یہ قول مرجوح ہے کیونکہ وجوب فدیہ کے متعلق کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ احادیث میں حاملہ، دودھ پلانے والی اور مسافر کے لیے رخصت کا اکٹھا بیان ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مسافر سے روزہ اور نصف نماز نیز حاملہ اور دودھ پلانے والی خاتون سے روزہ ساقط کیا ہے۔'' [2]

اس حدیث کے پیش نظر حاملہ اور دودھ پلانے والی خاتون کو رمضان میں روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے لیکن رمضان کے بعد جب انہیں فرصت کے ایام میں میسر آئیں تو ترک کردہ روزوں کی قضا دینا ضروری ہے۔ ترک کردہ روزے انہیں معاف نہیں ہیں، صرف رمضان میں انہیں چھوڑ دینے کی اجازت ہے۔

سحری کرتے کرتے اگر اذان شروع ہو جائے

سوال ماہ رمضان میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں کہ اس دوران اذان شروع ہو جاتی ہے تو کیا اپنی سحری کو مکمل کر لیا جائے یا اذان سنتے ہی کھانا بند کر دیا جائے، وضاحت کریں۔

جواب روزہ دار کے لیے ضروری ہے کہ جب طلوع فجر ہو جائے تو کھانا پینا بند کر دے۔ ارشاد باری تعالیٰ: ''اور کھاؤ، پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری، سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے پھر اپنے روزے کو رات تک پورا کرو۔ [3]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص سحری کر رہا ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ فجر طلوع ہو چکی ہے تو کھانا پینا بند کر دے، ہاں اگر مؤذن طلوع فجر سے پہلے اذان دے رہا ہو تو کھانے پینے سے رک جانا ضروری نہیں ہے، لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کھانے کے دوران اذان شروع ہو جائے اور روزہ رکھنے والے کو ابھی کھانے پینے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی ضرورت پوری کر لے جیسا کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی جب اذان فجر سنے اور برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو اسے رکھنے سے پہلے اپنی ضرورت پوری کر لے۔'' [4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سحری کا وقت تنگ ہو رہا ہو اور اذان فجر اپنے وقت پر شروع ہو جائے تو اجازت ہے کہ روزہ رکھنے والا پانی پی لے اور دو چار لقمے لے لے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص روزہ رکھنا چاہتا ہو اور

---

[1] البقرة: ۱۸٤۔ [2] مسند امام احمد: ص ۳٤۷، ج ٤۔ [3] البقرة: ۱۸۷۔

[4] ابو داؤد، الصیام: ۲۳۵۰۔

اس کے ہاتھ میں پانی پینے کا برتن ہوتا کہ وہ اسے نوش کرے، اس دوران اذان شروع ہو جاتی ہے تو وہ کیا کرے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایسی حالت میں رسول اللہ ﷺ نے پانی پینے کی اجازت دے دی۔ [1] ایسی حالت میں تھوڑا بہت کھانا اور پانی پینے کی اجازت ہے مگر چائے کی طرح مشروب کی چسکیاں لینا درست نہیں ہے اور نہ ہی ایسی حالت میں سگریٹ کے کش بھرنا جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

افطاری کے وقت کھانے پینے میں لگے رہنا

سوال افطاری کے وقت بعض لوگ کھانے میں اس قدر مگن رہتے ہیں کہ وہ نماز مغرب کی ادائیگی میں بہت دیر کر دیتے ہیں، اس عمل کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب سوال میں ذکر کردہ صورت حال انتہائی افسوس ناک ہے کیونکہ جو روزہ انسان کے لیے واجبات چھوڑنے کا باعث ہو وہ بھوک اور پیاس کے علاوہ کچھ فائدہ نہیں دیتا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ روزہ داروں کو روزے سے بھوک کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا اور بعض قیام والوں کو قیام سے بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ [2]

اس بنا پر ہمیں چاہیے کہ افطاری کے وقت نماز با جماعت بروقت ادا کرنے کا اہتمام کریں۔ ہمارے رجحان کے مطابق بہتر یہی ہے کہ نماز مغرب سے پہلے روزہ کھولتے وقت پھل اور مشروبات وغیرہ سے افطاری کر لی جائے پھر جماعت کے ساتھ نماز مغرب ادا کی جائے، اس کے بعد تسلی سے کھانا کھایا جائے، ہاں اگر بھوک سخت لگی ہو جس کی وجہ سے نماز میں خشوع خضوع کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تو نماز مغرب سے پہلے کھانا کھایا جا سکتا ہے لیکن تین باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

① نماز مغرب کے وقت کا خیال رکھا جائے، ایسا نہ ہو کہ کھانا کھاتے کھاتے اس کا وقت بھی فوت ہو جائے۔

② کھانا وغیرہ تیار ہو، اس کے تیار ہونے کے انتظار میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔

③ پھر تیار شدہ کھانا سامنے آ جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب رات کا کھانا سامنے آ جائے تو نماز مغرب سے پہلے کھانا کھالو اور اس سے فراغت میں جلدی سے کام نہ لو۔ [3]

ان شرائط کی موجودگی میں نماز مغرب سے پہلے کھانا کھایا جا سکتا ہے بصورت دیگر افطاری کے بعد تسلی کے ساتھ نماز مغرب ادا کی جائے اور اس کے بعد آرام و سکون سے کھانا کھایا جائے۔ (واللہ اعلم)

ترک کردہ روزوں کی قضا کا طریقہ

سوال رمضان المبارک میں جو روزے کسی عذر کی وجہ سے ترک ہو جائیں، انہیں بعد میں مسلسل رکھنا چاہیے یا انہیں متفرق طور پر رکھا جا سکتا ہے؟ اس کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

---

[1] مسند امام احمد، ص ۳٤۸، ج ۳۔ [2] ابن ماجه، الصيام: ۱٦۹۰۔

[3] صحيح بخاري، الاذان: ٦۷۲۔

جواب رمضان میں ترک کردہ روزوں کی قضا مسلسل اور الگ الگ دونوں طرح سے جائز ہے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف ہے کہ قضا رمضان کے روزے مسلسل رکھے جائیں کیونکہ قضا کی صورت ادا جیسی ہونی چاہیے۔ پھر قرآن کی جس آیت میں قضا کا ذکر ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قرأت میں بایں الفاظ مروی ہے: ''**فعدة من ایام اخر متتابعات**'' یعنی وہ دوسرے مسلسل ایام سے اس گنتی کو پورا کرے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے ذمے رمضان کے روزے ہوں وہ انہیں مسلسل رکھے، علیحدہ علیحدہ نہ رکھے۔ [1] لیکن یہ روایت ضعیف ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس کے ضعف کو برقرار رکھا ہے۔ [2]

جب کہ اس سلسلہ میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا موقف نقل کیا ہے کہ رمضان میں ترک کردہ روزوں کی قضا متفرق طور پر بھی دی جاسکتی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جس کے روزے رہ جائیں وہ دوسرے دنوں میں ان کی گنتی پوری کر لے۔'' [3] اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنے کا حکم دیا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ تم پے درپے روزے رکھو۔ اس آیت کے پیش نظر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رمضان کی قضا مسلسل نہیں بلکہ اگر الگ الگ روزے رکھ کر بھی دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (**صحیح بخاری، الصوم، باب شی یقضی قضا، رمضان**) امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو معلق بیان کیا ہے جبکہ مصنف عبدالرزاق میں اسے متصل سند سے ذکر کیا گیا ہے۔ [4] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبیدہ بن جراح اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم کا بھی یہی موقف بیان کیا ہے۔ [5] اس سلسلہ میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمضان کی قضا کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اگر چاہے تو الگ الگ روزے رکھ لے اور اگر کوئی چاہے تو مسلسل رکھ لے۔ [6] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [7]

تاہم قرآن کی پیش کردہ آیت اس سلسلہ میں مطلق ہے جو اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ رمضان میں ترک شدہ روزوں کی قضا دونوں طرح درست ہے کیونکہ مقصود گنتی پوری کرنا ہے اور یہ مقصد دونوں طرح سے حاصل ہوجاتا ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق رمضان کے روزوں کی قضا دونوں طرح سے دی جاسکتی ہے، اس سلسلہ میں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قرأت نقل کی گئی ہے، اس کے آخر میں متتابعات کے الفاظ حذف کر دیئے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مسلسل روز رکھنا ضروری تھے لیکن بعد میں اس پر پابندی کو ختم کر دیا گیا۔ [8]

شک کے دن کا روزہ رکھنا

سوال شک کے دن روزہ رکھنے سے کیا مراد ہے؟ کیا اس دن کا روزہ نہیں رکھا جاسکتا؟ اس کے متعلق کوئی حدیث ہے تو نشاندہی کریں۔

---

[1] دار قطنی، ص۱۹۱، ج۲۔ [2] تمام المنہ: ص۴۲۲۔ [3] البقرہ: ۱۸۴۔
[4] فتح الباری: ص۲۴۱، ج۴۔ [5] فتح الباری، ص۲۴۱، ج۴۔ [6] دار قطنی: ص۱۹۳، ج۲۔
[7] تلخیص الحبیر، ص۳۹۴، ج۲۔ [8] فتح الباری ص۲۴۱، ج۴۔

جواب حدیث کے مطابق ماہ رمضان کا تین طریقوں سے پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ① رمضان کا چاند خود دیکھ کر۔ ② کسی با اعتماد عادل شخص کی گواہی پر۔ ③ اگر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو ماہ شعبان کے تیس دن پورے کر لینے سے، اگر انتیس تاریخ کو مطلع ابر آلود ہونے کی بنا پر چاند نظر نہ آسکے تو احتیاط کے پیش نظر اگلے دن کا روزہ رکھنا شک کے دن کا روزہ رکھنا ہے۔ اہل علم کا رجحان یہ ہے کہ اس دن کا روزہ رکھنا حرام ہے کیونکہ رمضان کی آمد یقینی نہیں بلکہ اس کی بنیاد محض شک اور احتیاط پر ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیق کے طور پر حضرت عمار سے بیان کیا ہے کہ جس نے شک کے دن کا روزہ رکھا، اس نے ابو القاسم ﷺ کی نا فرمانی کی۔ [1]

حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ با سند بیان ہوئی ہے، حضرت صلہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھے اور چاند نظر آنے کی خبر واضح نہ ہونے کی وجہ سے وہ دن مشکوک تھا، ہمارے سامنے بکری کا گوشت پیش کیا گیا تو مجلس میں سے کچھ لوگ ایک طرف ہو گئے، اس وقت حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے اس دن کا روزہ رکھا ہے اس نے حضرت ابو القاسم ﷺ کی نافرمانی کی ہے۔'' [2]

اس حدیث سے یوم الشک کی وضاحت ہو جاتی ہے نیز پتہ چلتا ہے کہ اس دن کا روزہ رکھنا حرام اور ناجائز ہے کیونکہ اس میں رمضان کی آمد یقینی نہیں۔ (واللہ اعلم)

ماہ رمضان میں وفات پانے والا

سوال ہم نے علماء سے سنا ہے کہ ماہ رمضان میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں تو کیا ماہ رمضان میں فوت ہونے والا شخص حساب کے بغیر جنت میں جائے گا؟

جواب ماہ رمضان کے بے شمار فضائل ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب ماہ رمضان کی آمد ہوتی ہے تو جنت کے تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے نیز شیاطین کو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ [3]

لیکن اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ رمضان میں فوت ہونے والا شخص حساب کے بغیر جنت میں جائے گا بلکہ علماء نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ماہ رمضان میں عمل کرنے والوں کے اندر شوق ونشاط پیدا کرنے کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں تاکہ ان کے لیے اس میں داخلہ آسان ہو اور جہنم کے دروازے اس لیے بند کر دیے جاتے ہیں کہ اہل ایمان گناہوں سے باز رہیں اور ان دروازوں سے جہنم میں داخل نہ ہو سکیں۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں جو سوال میں بیان کیا گیا ہے کہ رمضان میں فوت ہونے کی وجہ سے حساب نہیں ہوگا، بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونے والوں کے اوصاف رسول اللہ ﷺ نے بایں الفاظ بیان کیے ہیں۔ ''وہ ناجائز دم جھاڑ نہیں کرائیں گے، نہ وہ بدشگونی لیں گے نیز وہ علاج کے لیے آگ سے داغ نہیں لیں گے اور

---

[1] بخاري، الصوم، باب نمبر ١١۔ [2] أبو داؤد، الصيام: ٢٣٣٤۔

[3] صحيح بخاري، الصوم: ١٨٩٩۔

اپنے رب پر توکل کریں گے۔'' [1] اس کے علاوہ ان پر جو اعمال واجب ہیں ان کی بھی بجا آوری کریں گے، لہٰذا رمضان میں فوت ہونے والے کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ بغیر حساب جنت میں جائے گا درست نہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ماہِ رمضان میں متعدد کافر بھی موت سے دوچار ہوتے ہیں، کیا وہ بھی حساب سے بچ جائیں گے؟ (واللہ اعلم)

نماز تراویح اور خواتین

سوال کیا خواتین اس پرفتن دور میں نماز تراویح با جماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں جاسکتی ہیں، شریعت کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

جواب مردوں کی طرح خواتین بھی نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے مساجد میں جاسکتی ہیں، اگرچہ ان کا گھر میں نماز ادا کرنا زیادہ بہتر ہے تاہم اگر کوئی خاتون مسجد میں نماز تراویح با جماعت ادا کرنے کا شوق رکھتی ہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اگر تم میں سے کسی کی بیوی مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو وہ اسے منع نہ کرے۔'' [2]

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں جانے سے مت روکو۔'' [3]

ایک روایت میں ہے کہ وہ زیب و زینت کے بغیر سادہ کیفیت میں آئیں۔ [4]

بہر حال عورتوں کا مساجد میں آنا ان کے اپنے شوق پر مبنی ہے، صحابیات مسجد میں نماز کے لیے آیا کرتی تھیں تاہم افضل یہی ہے کہ وہ گھر میں باپردہ ہو کر نماز ادا کریں جیسا کہ ایک روایت میں صراحت ہے کہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔ [5]

ہمارے اس پُرفتن دور میں عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کا فرمان اور اللہ کی شریعت ہر چیز سے مقدم ہے لیکن عورتوں کو چاہیے کہ وہ جب نماز کے لیے مسجد میں آئیں تو درج ذیل امور کا خیال رکھیں۔

1. مکمل پردے کے ساتھ آئیں، بے پردگی اختیار نہ کریں۔
2. خوشبو استعمال کر کے نہ آئیں اور نہ ہی اپنی زیب و زینت کی نمائش کریں۔
3. عورتوں کی صف کسی صورت میں امام کے آگے نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے رہے۔
4. مسجد کی صفائی کا خیال رکھیں اور اس میں گندگی پھیلانے سے گریز کریں۔
5. ان بچوں کو ہمراہ نہ لائیں جو شور و غل کرنے کے عادی ہیں۔

اگر حالات خراب ہوں اور فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو تو ان کا اپنے گھروں میں تراویح پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)

بھول کر کھانے پینے والے کو یاد دلانا

سوال عام لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر روزہ دار بھول کر کھاتا یا پیتا ہے تو اسے یاد نہیں دلانا چاہیے کہ تم روزے سے ہو، کیونکہ اللہ ہی کھلاتا اور پلاتا ہے، شرعی طور پر اس کی کیا حیثیت ہے، وضاحت کریں۔

---

[1] صحیح بخاری، الطب: ۵۷۰۵۔ [2] بخاری، النکاح: ۵۲۳۸۔ [3] مسلم، الصلوۃ: ۴۴۲۔
[4] ابو داؤد، الصلوۃ: ۵۶۵۔ [5] ابو داؤد، الصلوۃ: ۵۶۷۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو روزے دار بھول کر کھا پی لے تو اسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیے کیونکہ اسے تو اللہ نے کھلایا اور پلایا۔'' [1]

لیکن اللہ تعالیٰ کے کھلانے پلانے کا یہ مطلب نہیں کہ روزے دار کو متنبہ نہ کیا جائے کیونکہ رمضان میں کھانا پینا یا ایسا کام کرنا جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہو، یہ ایک منکر کام ہے، جس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے بلکہ روزے دار کو یاد دلا کر اس منکر کام کی روک تھام ضروری ہے، اگرچہ روزہ دار ذاتی طور پر معذور ہے اور بھول کر کھانے پینے سے اس کا روزہ متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس پر کوئی تاوان یا قضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسافر آدمی جسے روزہ رکھنا ضروری نہیں اسے بھی بر سر عام کھانے پینے کی اجازت نہیں، اسے بھی دوسروں سے چھپ کر کھانا پینا چاہیے تاکہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ کھانے پینے کی جرأت نہ کریں۔ بہرحال جو روزہ دار بھول کر کھاتا پیتا ہے اسے یاد دلانے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اسے خبردار کرنا ضروری ہے تاکہ دوسرے لوگ ماہ رمضان میں دن کے وقت ایسے کام کرنے کی جسارت نہ کریں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ماہ شوال کے ابتدائی روزوں سے پہلے رمضان کی قضا

سوال ایک عورت کے ذمے رمضان کے روزوں کی قضا باقی ہے اور وہ ماہ شوال کے چھ روزے بھی رکھنا چاہتی ہے تو کیا رمضان کی قضا پہلے دینا ہوگی یا ماہ شوال کے چھ روزے پہلے رکھ لیے جائیں، بعد میں رمضان کے روزے رکھ لیے جائیں۔

جواب ماہ رمضان کے فوت شدہ روزوں کی قضا فرض ہے، اسے پہلے ادا کرنا چاہیے، اس کے بعد ماہ شوال کے نفلی روزے رکھے جائیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے پیچھے شوال کے چھ روزے رکھے۔ گویا اُس نے سال بھر کے روزے رکھے۔'' [2]

اگر کوئی عورت یا مرد فوت شدہ روزوں کی قضا دینے سے قبل ماہ شوال کے روزے رکھے گا تو اسے رمضان کے بعد رکھنے والی بات حاصل نہ ہوگی جیسا کہ حدیث میں فضیلت کو اس سے مشروط کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمارے رجحان کے مطابق صورت مسؤلہ میں پہلے رمضان کے روزوں کی قضا دے اور اس کے بعد ماہ شوال کے چھ روزے رکھے۔

سحری کا وقت

سوال شریعت میں سحری کی کیا حیثیت ہے، کیا سحری کے بغیر روزہ ہو جاتا ہے، کچھ لوگ اذان فجر سے بہت پہلے سحری کھا کر سو جاتے ہیں، اس کا کہاں تک جواز ہے نیز اس وقت کے بارے میں بھی آگاہ کریں۔

جواب سحری کا لفظ سحر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے رات کا آخری حصہ، اس لغوی معنی کے پیش نظر سحری وہ ہے جو رات کے آخری حصہ یعنی طلوع فجر سے عین پہلے کھانا کھایا جائے۔ بہت زیادہ پہلے کھانا عام کھانا تو ہو سکتا ہے لیکن اسے سحری کا نام دینا محل نظر ہے۔ چنانچہ حضرت زر بن حبیش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ سحری کھائی، پھر ہم نماز کے لیے نکلے،

---

[1] صحیح بخاری، الصوم ۱۹۳۳۔ [2] ابو داؤد، الصیام: ۲۴۳۳۔

جب ہم مسجد میں آئے تو دو رکعت (سنت) ادا کیں، اتنے میں جماعت کھڑی ہوگئی۔ سنتوں اور اقامت کے درمیان بالکل معمولی وقفہ تھا۔ ❶

اسی طرح حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر ہم نماز کے لیے اٹھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: درمیان میں کتنا فاصلہ تھا تو انھوں نے فرمایا: اس قدر کہ آدمی پچاس آیات پڑھ سکے۔ ❷

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''سحری اور نماز فجر کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیے۔'' ❸ اطمینان اور سکون کے ساتھ پچاس آیات پڑھنے میں کم از کم دس پندرہ منٹ تو ضرور صرف ہوتے ہیں۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں سحری کرتا پھر میں جلدی سے مسجد کی طرف جاتا تاکہ نماز فجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ادا کرلوں۔ ❹

ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ سحری میں تاخیر کرنا افضل ہے۔ اہل علم اس تاخیر کی یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ ایسا کرنا انسانی طبیعت کے مطابق ہے۔ کیونکہ سارا دن مغرب تک بھوکا پیاسا رہنا ہوتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ عین آخری وقت میں سحری کی جائے تاکہ عبادات میں سہارا رہے۔ سحری بہت ہی بابرکت کھانا ہے بلکہ امت محمدیہ کا یہ ایک امتیاز ہے اور امتیازات کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ سحری برکت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف تمھیں عطا فرمائی ہے لہٰذا تم اسے مت چھوڑو۔'' ❺

سحری کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے ترک کرنے سے یہود و نصاریٰ سے مشابہت کا اندیشہ ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ہمارے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کھانا ہے۔'' ❻

بہرحال سحری کھانا باعث برکت ہے اور اس کے تناول کرنے پر بہت تاکید ہے اگر کبھی مجبوراً چھوٹ جائے تو چنداں حرج نہیں، مثلاً اگر کوئی بروقت بیدار نہیں ہوسکا تو وہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''سحری باعث برکت ضرور ہے لیکن واجب نہیں۔'' ❼

تفصیلات بالا سے معلوم ہوا کہ جو لوگ آدھی رات سحری کھا کر سو جاتے ہیں ان کا یہ عمل قطعاً قابل ستائش نہیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ نماز فجر بروقت ادا نہ کرسکیں یا پھر نماز باجماعت ادا نہ ہوسکے۔ بہرحال سحری کا کھانا ضرور کھایا جائے اور اسے اذان فجر سے تھوڑا سا وقت پہلے کھانا چاہیے۔ بالکل نہ کھانا برکت سے محرومی اور بہت پہلے کھانے سے نماز فجر باجماعت یا بروقت ادا نہ کرسکنے کا خطرہ ہے۔

---

❶ ابن ماجہ، الصیام: ۲۱۵۵۔ ❷ بخاری، الصوم: ۱۹۲۱۔ ❸ بخاری، الصوم باب نمبر ۱۹۔
❹ بخاری، مواقیت الصلوۃ: ۵۷۷۔ ❺ نسائی، الصیام: ۲۱٦٤۔ ❻ مسلم، الصیام: ۱۰۹٦۔
❼ صحیح بخاری، الصوم باب نمبر ۲۔

حمل والی عورت کا روزہ

سوال ماہ رمضان کی آمد آمد ہے، میری بیوی حاملہ ہے، اس کے متعلق رمضان کے روزوں کا کیا حکم ہے؟ تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف کردی ہے اور مسافر، حاملہ اور دودھ پلانے والی کو روزے معاف کر دیے ہیں۔[1]

اس حدیث میں مسافر، بچے کو دودھ پلانے والی اور حاملہ کے لیے رعایت کو ایک ہی سیاق میں بیان کیا گیا ہے مگر ان کی تفصیل میں کچھ فرق ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مسافر کو روزہ معاف ہے مگر قضا دینا واجب ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کے متعلق علمائے امت کی چار آراء حسب ذیل ہیں:

① ان کے لیے فدیہ طعام ہی کافی ہے، بعد میں قضا کی ضرورت نہیں۔

② ان پر نہ قضا ضروری ہے اور نہ ہی ان پر فدیہ لازم ہے۔

③ یہ دونوں فدیہ طعام کے علاوہ بعد میں قضا کے طور پر روزے بھی رکھیں گی۔

④ وہ مریض کے حکم میں ہیں، وہ رزہ چھوڑ دیں، بعد میں قضا دیں لیکن فدیہ طعام کی انہیں ضرورت نہیں۔

ہمارے رجحان کے مطابق حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ ترک کر دیں، اگرچہ وہ دونوں بیمار نہ ہوں کیونکہ حدیث میں ان دونوں عورتوں کو مسافر کی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن ان کے متعلق مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

① جب انہیں روزہ رکھنے میں کوئی مشقت نہ ہو تو انہیں روزہ رکھنا لازم اور اسے ترک کرنا حرام ہے کیونکہ روزہ چھوڑنے کے لیے ان کے پاس کوئی عذر نہیں۔

② جب انہیں روزہ رکھنے میں مشقت ہو لیکن روزہ ان کے لیے نقصان دہ نہ ہو تو ان کے لیے روزہ چھوڑ دینا جائز ہے۔

دوران سفر روزہ رکھنا

سوال آج کل دوران سفر سہولیات میسر ہوتی ہیں، ایسے حالات میں دوران سفر اگر روزہ رکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب روزہ کی فرضیت کے متعلق چند ایک شرائط ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان حالتِ حضر میں ہو کیونکہ مسافر کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر کوئی بیمار ہو یا سفر کے دوران ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر سکتا ہے۔''[2]

جمہور اہل علم کا یہی فتویٰ ہے کہ مسافر کے لیے حالتِ سفر میں روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ اسے چھوڑ دینے کی اجازت ہے لیکن بعد میں اسے متروکہ روزے رکھنا ہوں گے۔ اگر وہ دوران سفر روزہ رکھنے کی ہمت پاتا ہے تو روزہ رکھ لے۔ چنانچہ ارشاد گرامی ہے:

---

[1] ابن ماجه، الصيام:١٦٦٧۔ [2] البقرہ: ١٨٥۔

حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: آیا میں دوران سفر روزہ رکھ سکتا ہوں کیونکہ وہ اکثر روزے رکھا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: ''گر تو چاہے تو روزہ رکھ لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔'' ❶

ہمارے رجحان کے مطابق مسافر کے لیے روزہ رکھنے یا چھوڑنے کے متعلق کچھ تفصیل ہے:

اگر مسافر کے لیے روزہ رکھنا اور چھوڑ دینا دونوں برابر ہوں تو ایسی صورت میں روزہ رکھ لینا بہتر ہے کیونکہ ایسا کرنے سے بروقت فرض کی ادائیگی بھی ہو جائے گی پھر رمضان میں رکھا جانے والا روزہ غیر رمضان کے روزہ سے افضل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دوران سفر سخت گرمی کے دنوں میں روزہ رکھنا ثابت ہے بلکہ بعض صحابہ کرام بھی آپ کے ساتھ بحالت روزہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

''ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سخت گرمی کے دنوں میں سفر کے لیے نکلے، گرمی اس قدر تھی کہ آدمی شدت حرارت کی وجہ سے اپنا ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے اس دوران رسول اللہ ﷺ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ روزہ رکھتے تھے، ان کے علاوہ اور کوئی روزہ نہیں رکھتا تھا۔'' ❷

اگر دوران سفر روزہ رکھنا باعث مشقت ہو تو ایسی حالت میں روزہ نہ رکھنا بہتر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ہمراہ سفر میں تھے، آپ کو اطلاع دی گئی کہ لوگوں پر دوران سفر روزہ رکھنا بہت مشکل اور تکلیف کا باعث ہے تو آپ نے سنتے ہی پانی منگوایا اور لوگوں کے سامنے اسے نوش فرمایا تاکہ لوگ اس سلسلہ میں آپ کی اقتداء کر سکیں، پھر آپ کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ ابھی بھی بحالت روزہ ہیں تو آپ نے ان کے متعلق فرمایا: ''یہی لوگ نافرمان ہیں، یہی لوگ نافرمان ہیں۔'' ❸

اگر روزہ رکھنے میں ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں روزہ رکھنا حرام اور باعث گناہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔'' ❹

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ دوران سفر تھے، آپ نے لوگوں کا ہجوم دیکھا نیز وہاں ایک شخص تھا جس پر سایہ کیا جا رہا تھا، آپ نے پوچھا اسے کیا ہو؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ روزہ رکھے ہوئے ہے، آپ نے فرمایا: ''دوران سفر روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں۔'' ❺

اگر دوران سفر روزہ رکھنے سے سفر میں مشقت ہو سکتی ہے یا ایسی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے جو ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے تو روزہ رکھنا ناجائز اور حرام ہے۔ (واللہ اعلم)

مسنون افطاری

سوال سنت کے مطابق روزہ کس چیز سے افطار کرنا چاہیے؟

---

❶ بخاری، الصوم: ۱۹۴۳۔ ❷ بخاری الصوم: ۱۹۴۵۔ ❸ مسلم الصیام: ۱۱۱۴۔
❹ النساء: ۲۹۔ ❺ بخاری، الصوم: ۱۹۴۶۔

جواب حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز سے پہلے تازہ کھجوروں سے روزہ افطار فرماتے، اگر تازہ کھجوریں نہ ملتیں تو خشک کھجور تناول فرمالیتے، یہ بھی میسر نہ ہوتیں تو پانی کے چند گھونٹ پی لیا کرتے تھے۔ [1]

ہمیں چاہیے کہ اس سنت کا احیا کریں، کھجور جیسے مبارک پھل کو اپنے دستر خوان کا جزو بنانے کا اہتمام کریں۔ کھجور صرف پھل ہی نہیں بلکہ کھانے کا قائم مقام بھی ہے اگرچہ مغربی تہذیب نے سیب کو بہت شہرت دی ہے جو یقیناً اللہ کی نعمت ہے لیکن ہمیں کھجور کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

آیت کا مفہوم

سوال قرآن کریم میں ہے ''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں، وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔'' (البقرۃ: ۱۸۴) اس آیت کی رو سے تندرست اور طاقتور شخص کو روزہ رکھنے نہ رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے، جبکہ ہمارے ہاں معمول اس کے خلاف ہے، اس کی وضاحت کریں۔

جواب فرضیت روزہ کے ابتدائی دور میں روزہ فرض تو تھا مگر کوئی شخص بلا عذر روزہ چھوڑنا چاہتا تو اسے اجازت تھی کہ روزہ نہ رکھے۔ لیکن اس صورت میں اسے فدیہ دینا پڑتا تھا جیسا کہ ابن ابی لیلیٰ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

''جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، پھر اگر کوئی مالدار ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا تو وہ روزہ نہ رکھتا، انہیں اس امر کی رخصت تھی۔'' [2]

لیکن اس کے بعد دوسری آیت اتری تو اس رخصت کو ختم کر دیا گیا جیسا کہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

جب یہ آیت اتری ''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ روزہ کے بدلے کسی محتاج کو کھانا کھلا دیں۔'' [3]

تو ہم میں سے جو شخص روزے نہ رکھنا چاہتا وہ فدیہ دے دیتا حتیٰ کہ اس کے بعد والی آیت اتری تو اس نے اس رخصت کو منسوخ کر دیا۔'' [4]

وہ آیت یہ ہے: (ترجمہ) ''تم میں سے جو شخص اس مہینے میں موجود ہو وہ لازماً روزہ رکھے۔'' اس آیت کریمہ کے ذریعے ہر تندرست اور گھر میں موجود شخص کے لیے روزہ رکھنا لازم ہو گیا۔ البتہ یہ رخصت اس شخص کے لیے باقی ہے جو انتہائی ضعیف ہونے کی وجہ سے روزہ نبھا نہیں سکتا اور اس کی بحالی صحت کی بھی کوئی امید نہیں۔ مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ انتہائی ذہین و فطین تھے اور انہیں فہم قرآن کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی خصوصی دعا بھی حاصل تھی۔ انھوں نے اس آیت کا مفہوم بایں طور بیان کیا ہے، جس میں نسخ وغیرہ کا شبہ نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ اس سے مراد انتہائی بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، ان کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ ہر دن کسی محتاج اور مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ [5]

---

[1] أبو داؤد، الصیام: ۲۳۵۶۔ [2] بخاری، الصوم باب نمبر ۳۹۔ [3] البقرۃ: ۱۸۴۔
[4] نسائی، الصیام: ۲۳۱۸۔ [5] بخاری، الصوم: ۴۵۰۵۔

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بوڑھے ہو گئے تو رمضان میں روزہ نہ رکھتے اور اس کے بدلے ایک مسکین کو ہر دن کھانا کھلا دیتے تھے۔ ❶

ایک دوسری روایت میں اس کی مزید وضاحت ہے، آپ فرماتے ہیں:

آیت کریمہ میں ''علی الذین یطیقونہ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھنے میں انتہائی مشقت محسوس کریں، وہ روزہ رکھنے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیں اور اس سے اگلے الفاظ ''جو شخص خوشی سے نیکی کرے تو اچھی بات ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایک سے زائد مسکین کا کھانا فدیہ میں دے دے تو بہت اچھا ہے۔ بہر حال یہ آیت منسوخ نہیں، بلکہ یہ رخصت اس شخص کو ہے جو انتہائی بڑھاپے کی وجہ سے روزہ برداشت نہیں کر سکتا یا وہ مریض جس کی صحت یابی کی کوئی امید نہیں۔ ❷

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو معنی بیان کیا ہے وہ عربی لغت سے بھی ثابت ہے۔ جیسا کہ خاصیات ابواب میں ایک خاصہ ''سلب ماخذ'' ہے جیسا کہ اشکیت کا معنی شکایت کو دور کرنا ہے، اسی طرح یطیقونہ کا معنی یہ ہے کہ جو روزے رکھنے کی طاقت اور ہمت نہیں رکھتے۔ لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر اپنی جگہ درست ہے، آیت میں دونوں معانی کا احتمال موجود ہے۔ اگر پہلا معنی مراد لیں تو یہ آیت منسوخ ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ اگر دوسرا معنی مراد لیا جائے تو اس آیت کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا موقف ہے۔

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے روزے

سوال حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو روزہ معاف ہے یا اسے بعد میں قضا دینا ہوگی، اس کے متعلق صحیح موقف کی وضاحت فرمائیں۔

جواب حاملہ اور اپنے بچے کو دودھ پلانے والی عورت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز اور روزہ معاف کر دیا ہے، اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی۔'' ❸

امام ابن حزم رحمہ اللہ کا یہ موقف ہے کہ جب حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اللہ تعالیٰ نے روزہ معاف کر دیا ہے تو اسے قضا یا فدیہ دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان پر قضا اور فدیہ واجب کرنا ایسا فیصلہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ قضا تو صرف مریض، مسافر، حائضہ اور نفاس والی عورت کے ذمے ہے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اس کی ضرورت نہیں۔ ❹

لیکن جمہور اہل علم نے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا، ان کے نزدیک حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اگر بچے کے نقصان کا اندیشہ ہو تو روزہ چھوڑ سکتی ہے۔ ترک کردہ روزہ کے بدلے وہ فدیہ دے دے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا موقف ہے اور صحابہ میں ان کا کوئی مخالف بھی نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنی حاملہ لونڈی کو حکم دیتے تھے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور اس کے بدلے فدیہ دے دے۔ ❺

---

❶ فتح الباری ص۲۲۵، ج۸۔ ❷ نسائی، الصیام:۲۳۱۹۔ ❸ نسائی، الصیام:۲۲۷۶۔

❹ محلی ابن حزم، ص ۲۶۵، ج۶۔ ❺ دار قطنی، ص ۲۰۶، ج ۲۔

اسی طرح حضرت نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی شادی شدہ بیٹی حاملہ تھیں تو انھوں نے فرمایا: ''تم روزہ چھوڑ دو اور اس کے بدلے ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کرو۔ ❶

بہر حال حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو روزہ معاف نہیں بلکہ اسے چھوڑ دینے کی اجازت ہے لیکن اسے ترک کردہ روزوں کا فدیہ دینا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

روزہ کے متعلق حیض کے مسائل

سوال مندرجہ ذیل سوالات کا کتاب و سنت کی روشنی میں جواب درکار ہے۔ ① اگر کوئی عورت دن کے وقت حیض سے پاک ہو جائے تو کیا اسے شام تک کچھ کھانا پینا نہیں چاہیے؟ ② اگر کوئی فجر سے پہلے پاک ہو جائے تو کیا اسے روزہ رکھنا ضروری ہے؟ ③ اگر کسی عورت کو افطار سے چند منٹ پہلے حیض آجائے تو اس کا روزہ ختم ہو جاتا ہے؟

جواب ترتیب وار جوابات حسب ذیل ہیں۔

① اگر کوئی عورت رمضان المبارک میں دن کے وقت حیض سے پاک ہوتی ہے تو وہ بقیہ دن کھا پی سکتی ہے، اس پر ضروری نہیں کہ وہ روزہ کی نیت سے بقیہ دن کھائے پیئے بغیر گزارے۔ کیونکہ اسے ایک مجبوری کی وجہ سے روزہ ترک کرنا ضروری تھا، اس لیے وہ روزے کی حالت میں نہیں اگرچہ اس کی مجبوری ختم ہو گئی ہے، اس پر باقی ماندہ دن میں کھانے پینے کے متعلق پابندی عائد کرنا کتاب و سنت کے خلاف ہے۔

② اگر کسی عورت کو طلوع فجر سے اتنا وقت پہلے طہارت حاصل ہو گئی کہ وہ کھا پی سکتی ہے تو اگر وہ روزے کی نیت کرے تو اس کا روزہ صحیح ہے اور فجر کے بعد غسل کر لے اور نماز ادا کرے۔ بہر حال ایسی حالت میں اس کا روزہ صحیح ہوگا، اگرچہ اس نے رات کی وقت روزہ کی نیت نہ کی تھی کیونکہ اس وقت وہ روزہ رکھنے کی حالت میں نہ تھی۔

③ حیض، روزے کے منافی ہے، اس حالت میں روزہ رکھنا جائز نہیں، اگر کسی عورت نے روزہ رکھا تھا اور غروب آفتاب سے چند منٹ پہلے حیض آ گیا تو اس کا روزہ ختم ہے، وہ اس حالت میں اسے پورہ کرنے کی کوشش نہ کرے اس کا روزہ خود بخود ختم ہو چکا ہے۔ اس قسم کے روزے کی اسے بعد میں قضا دینا ہو گی جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: ''ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جب حیض آتا تو ہمیں روزہ قضا کرنے کا حکم دیا جاتا لیکن نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔'' ❷

فوت شدہ روزوں کی قضا

سوال فوت شدہ روزوں کی قضا کس طرح دی جائے، کیا وقت ملنے پر فوراً رکھنے چاہئیں یا انہیں مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے۔ نیز انہیں مسلسل رکھنا ہو گا یا متفرق طور پر بھی انہیں رکھا جا سکتا ہے؟

جواب فوت شدہ روزوں کی قضا وقت ملنے پر فوراً ضروری نہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''مجھ پر رمضان

---

❶ دار قطنی، ص ۲۰۷، ج۲۔ ❷ مسلم، الصیام: ۳۳۵۔

کے فوت شدہ روزوں کی قضا ہوتی تھی لیکن میں ماہ شعبان میں انہیں رکھا کرتی تھی۔'' ❶

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس حدیث کے پیش نظر رمضان کے فوت شدہ روزوں کی قضا کو مؤخر کیا جا سکتا ہے یہ تاخیر کسی عذر کی بنا پر ہو یا کسی عذر کے بغیر تاخیر ہو۔ ❷

لیکن بہتر ہے کہ فوت شدہ روزوں کی قضا میں تاخیر نہ کرے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کی طرف دوڑ جانے والے ہیں۔'' ❸

فوت شدہ روزوں کی قضا مسلسل ضروری نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تو وہ دوسرے دنوں میں اس کی گنتی پوری کرے۔'' ❹

اللہ تعالیٰ نے فوت شدہ روزوں کی گنتی پورا کرنے کا حکم دیا ہے، ان میں تسلسل ضروری نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''متفرق طور پر روزے رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔'' ❺

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس معلق روایت کو صحیح سند کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ❻

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہے تو انہیں مسلسل رکھ لے اور اگر چاہے تو متفرق طور پر رکھ لے۔ ❼

اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو بیان کیا جاتا ہے کہ فوت شدہ روزوں کو مسلسل رکھنا چاہیے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ (مغنی، ص ۴۳، ج ۳) واللہ اعلم

روزہ کے لیے مانع حیض گولیوں کا استعمال

سوال اکثر دین دار خواتین رمضان المبارک میں مانع حیض گولیاں استعمال کرتی ہیں تاکہ رمضان میں مکمل ماہ کے روزوں کی سعادت حاصل کر سکیں، کیا کتاب و سنت کی روشنی میں ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب اگر کوئی عورت رمضان میں حالتِ ایام میں ہے تو اس پر روزہ ترک کرنا لازم ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''کہ جب عورت حالتِ حیض میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ ہی روزہ رکھتی ہے، یہ اس کے دین کا نقصان ہے۔'' ❽

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''حائضہ عورت کو روزہ اور نماز چھوڑ دینا چاہیے۔''

اس کے علاوہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جب حیض آتا تو ہمیں روزہ قضا کرنے کا حکم دیا جاتا اور نماز کی قضا کا نہیں کہا جاتا تھا۔'' ❾

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حائضہ عورت پر ماہ رمضان میں روزہ رکھنا ضروری نہیں بلکہ روزہ ترک کرنا واجب ہے اور

---

❶ صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۰۔ ❷ فتح الباری، ص ۱۹۱، ج ۴۔ ❸ المؤمنون: ۶۱۔
❹ البقرۃ: ۱۸۴۔ ❺ بخاری تعلیقاً۔ ❻ بیہقی، ص ۲۵۸، ج ۴۔
❼ بیہقی، ص ۲۵۸، ج ۴۔ ❽ بخاری، الصوم: ۱۹۵۱۔ ❾ مسلم، الصیام، ۳۳۵۔

بعد میں متروکہ روزوں کی قضا دینا ہوگی۔ کیونکہ حیض ایک ایسا معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنات آدم پر رکھ دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں خواتین اسلام اس کا تکلف نہیں کرتی تھیں کہ ماہ رمضان کے روزے رکھنے کے لیے اپنے حیض کو روکنے کا بندوبست کرتیں۔

اس بنا پر ہمارا موقف یہ ہے کہ عورتوں کے لیے شوق عبادت میں اپنے حیض کو روکنے کی تدابیر کرنا مستحسن اقدام نہیں، اس کے علاوہ اسے روکنے سے نقصانات کا بھی اندیشہ ہے۔ ہاں اگر کوئی عورت مانع حیض گولیاں استعمال کرتی ہے اور اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا اور اس کا حیض بھی رُک جاتا ہے تو ایسے حالات میں اسے پاک ہی شمار کیا جائے گا، اسے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کے روزوں کا اعادہ ضروری نہیں، تاہم خواتین کو اس قسم کے اقدام سے باز رہنا چاہیے۔ کیونکہ اسلاف خواتین سے اس قسم کا کوئی عمل ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

ہلالِ رمضان کے لیے گواہی

سوال رمضان کے چاند کے لیے کتنے آدمیوں کی گواہی کا اعتبار کیا جائے گا، نیز عید الفطر بھی کسی کی گواہی پر کی جاسکتی ہے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب رمضان المبارک کا چاند دیکھنے میں ایک آدمی کی گواہی کافی ہے۔ جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے کہ رمضان المبارک کے لیے ایک مسلمان کی گواہی کافی ہے، البتہ اس مسلمان کا قابل اعتبار ہونا ضروری ہے یعنی وہ جھوٹ بولنے میں معروف نہ ہو، اس کے علاوہ وہ فرائض شرع کا پابند ہو اور دین اسلام کو مذاق نہ بناتا ہو۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ لوگوں نے (رمضان کا) چاند دیکھنے کی کوشش کی، میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے تو آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کے چاند کے لیے قابل وثوق ایک مسلمان کی گواہی کافی ہے۔ اگرچہ کچھ فقہا کا خیال ہے کہ ماہ رمضان کے لیے بھی دیگر مالی معاملات کی طرح دو مسلمانوں کی گواہی ضروری ہے لیکن یہ موقف مرجوح ہے۔ ایک مسلمان کی گواہی کافی ہونے کے لیے کچھ روایات دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہیں۔ جیسا کہ (ابوداؤد، الصیام: ۲۳۴۱-۲۳۴۰) میں ہے۔ لیکن یہ روایات ضعیف ہیں۔ البتہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت صحیح سند سے ثابت ہے۔ البتہ عید کے بارے میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ اس کے لیے کم از کم دو مسلمانوں کی گواہی ضروری ہے کیونکہ عید میں لوگوں کا ذاتی مفاد بھی ہوتا ہے لہٰذا حقوق العباد کی طرح اس میں کم از کم دو گواہ ہونے چاہئیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''چاند دیکھ کر روزے رکھنا شروع کرو اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا بند کرو نیز چاند دیکھ کر ہی حج اور قربانی کرو اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرلو۔ اگر دو شخص چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو بھی روزے رکھنا شروع یا بند کردو۔ [2]

---

[1] ابو داؤد، الصیام: ۲۳۴۲۔ [2] نسائی، الصیام: ۲۱۱۸۔
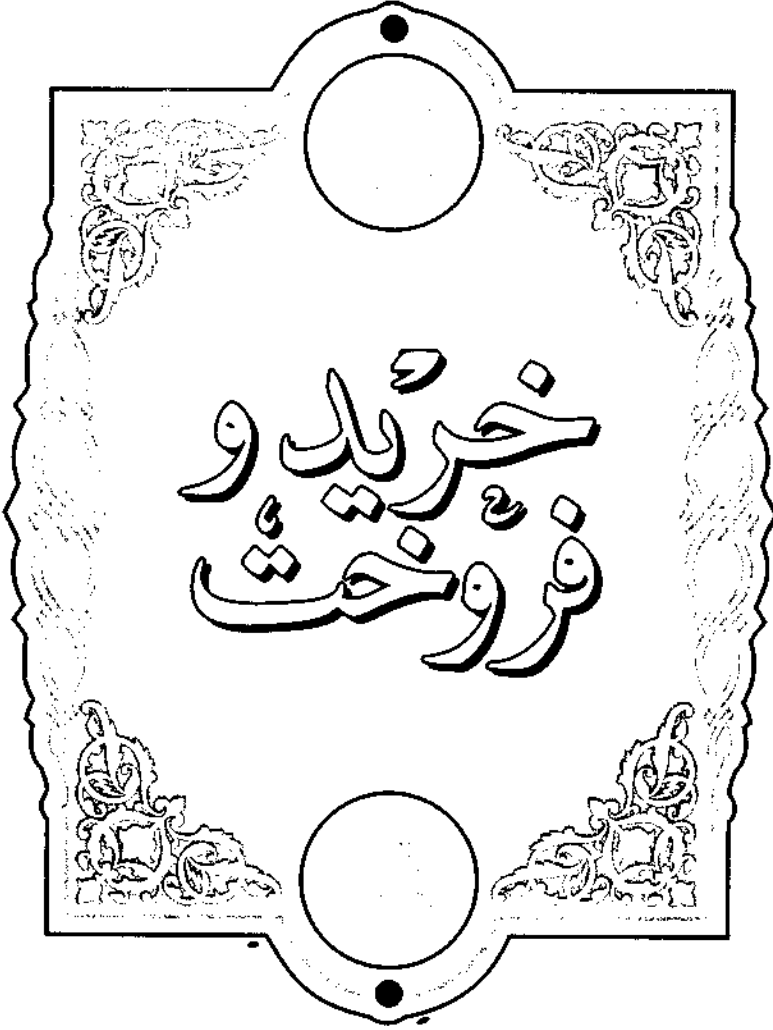
خرید و فروخت

خرید وفروخت

قسم اٹھا کر مال فروخت کرنا

سوال میرے ایک دوست کی عادت ہے کہ وہ قسم اٹھا کر اپنا مال فروخت کرتا ہے، کیا اس کی کمائی حلال ہے، میں اس کے ہاں کھا پی سکتا ہوں، وضاحت فرمائیں۔

جواب کاروبار میں قسم اٹھا کر سودا فروخت کرنا بہت مذموم حرکت ہے، اس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تجارت میں بہت زیادہ قسمیں اٹھانے سے اجتناب کرو کیونکہ قسم اٹھانے سے سودا تو فروخت ہو جاتا ہے لیکن اس کی برکت ختم کر دی جاتی ہے۔'' [1]

قسم اٹھا کر کمائی کرنے سے اگرچہ برکت اٹھالی جاتی ہے تاہم وہ حرام نہیں ہوتی، اسے استعمال میں لانا جائز ہے۔ اس کے حصول کا گناہ اپنی جگہ پر رہے گا تاہم وہ کمائی حلال ہے بشرطیکہ اس میں اور کوئی خرابی نہ ہو، ایسے آدمی کو وعظ و نصیحت کے ذریعے زیادہ قسمیں اٹھانے سے باز رکھنا چاہیے۔

مجبوری کے وقت سودی قرض

سوال میرے والد گرامی جیل میں ہیں، ان کی رہائی کے لیے ایک لاکھ روپیہ درکار ہے، اگر یہ رقم نہیں دی جاتی تو مزید دو سال قید بڑھ سکتی ہے، میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے اور مجھے کوئی قرض بھی نہیں دیتا، ایک شخص اس شرط پر قرض دینے کے لیے تیار ہے کہ تین سال کے بعد اسے دو لاکھ واپس کیے جائیں، کیا اس قسم کی مجبوری کے پیش نظر سود پر قرض لیا جا سکتا ہے؟

جواب سودی کاروبار یا لین دین اس قدر سنگین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کام کرنے والے کو سخت وارننگ دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم اس سودی لین دین سے باز نہیں آؤ گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' [2]

اور احادیث میں سود لینے اور دینے کو اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے لہٰذا ایک مسلمان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اسے کسی صورت میں اختیار نہ کرے، صورت مسئولہ میں کوئی ایسا عذر نہیں جس کی بنیاد پر سود پر قرض لینے کو جائز قرار دیا جائے، جان بچانے کے لیے مردار کھانے کی اجازت قرآن نے دی ہے، لیکن صورت مسئولہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] صحیح مسلم، البیوع: ۱۶۰۸۔ [2] البقرۃ: ۲۷۹۔

ہمارے رجحان کے مطابق کسی مالدار سے قرض لے کر اپنے باپ کی رہائی دلائی جا سکتی ہے لیکن اس رہائی کے لیے سود پر قرض لینا شرعاً درست نہیں ہے، ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ دو سال تک مزید قید برداشت کر لی جائے لیکن اس حرام کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

بینک سے مالی معاملات کرنا

سوال میرے ایک دوست کی پراپرٹی کروڑوں روپے مالیت کی ہے لیکن وہ مستقبل میں اس کے مصرف میں نہیں آسکتی، وہ اسے فروخت کرنا چاہتا ہے لیکن جب بھی کسی سے اس زمین کی فروخت کا معاملہ شروع کیا جاتا ہے تو والدین درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں، کیا وہ اس زمین کے عوض بنک سے قرضہ لے سکتا ہے، جبکہ اس کا قرض کی ادائیگی کا کوئی پروگرام نہیں بلکہ اس کی نیت ہے کہ نادہندہ ہونے کی صورت میں بنک خود ہی اسے فروخت کرنے کا مجاز ہوگا، کیا ایسا کرنا ناجائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں میرے دوست کی راہنمائی کریں۔

جواب آدمی جس چیز کا مالک ہو وہ اس میں تصرف کرنے کا مختار ہے، اسے فروخت کرے یا کسی کو ہبہ کر دے، کسی کو درمیان میں حائل نہیں ہونا چاہیے، لیکن والدین اپنی اولاد کے خیر خواہ ہوتے ہیں، ان کی صوابدیدی رائے کو یوں ہی رد نہیں کیا جا سکتا، لڑکے کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ بیٹھے اور ان سے مشاورت کرے، انہیں قائل کرے کہ مستقبل قریب میں یہ پراپرٹی میرے کسی کام نہیں آسکتی، اگر اسے فروخت کر دیا جائے تو حاصل ہونے والی رقم سے کاروبار کیا جا سکتا ہے اور اس سے نفع حاصل ہونے کی امید بھی کی جا سکتی ہے۔ بہر حال والدین کو قائل کیا جا سکتا ہے، یہ مسئلہ کوئی ایسا نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے۔ اگر والدین اس پر آمادہ نہ ہوں تو ان کے موقف پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا جائے، اگر اسے فروخت کیے بغیر کوئی اور چارہ نہیں ہے تو کسی بھی پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے اسے فروخت کیا جا سکتا ہے، امید ہے کہ یہ کام والدین کی نافرمانی کے زمرے میں نہیں آئے گا لیکن بنک کے ساتھ حیلہ گری کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے کہ وہ بینک سے اس پراپرٹی کے عوض قرض لے اور قرض واپس کرنے کی نیت نہ ہو، شرعی طور پر اس نیت سے قرض لینا جائز نہیں ہے، ہمارا تو یہ موقف ہے کہ بنک کے ساتھ اس طرح کا مالی معاملہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ بنک کی بنیاد سود لینے اور سود دینے پر ہے، پاکستان میں تمام بنک حکومتی بنک، یعنی سٹیٹ بنک کے ممبر ہوتے ہیں اور حکومتی بنک آگے عالمی بنک یعنی ورلڈ بنک کے ممبر ہوتے ہیں اور سودی کاروبار کرتے ہیں۔ سودی معاملات میں ان سے تعاون کرنا یا ان سے قرض لینے سے یا انہیں قرض دینے کا معاملہ کرنا محل نظر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''نیکی اور پرہیز گاری کے معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کرو لیکن گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''[1] لہٰذا ہمارا رجحان یہ ہے کہ بنک سے بامر مجبوری تو کوئی مالی معاملہ کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اس کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے تو بنک کے ساتھ مالی معاملات کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

---

[1] المائدہ: ۲۔

بلی کی خرید وفروخت

سوال ہمارے پڑوسی برطانیہ سے بلی لائے ہیں جس کی قیمت پاکستانی پچاس ہزار روپے ہے، میں نے انہیں بتایا کہ اس کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے، انھوں نے مجھ سے دلیل کا مطالبہ کیا تو میں خاموش ہوگیا، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب شریعت نے کتے اور بلی کو حرام کہا ہے کیونکہ یہ درندے ہیں اور مردار کھاتے ہیں اور جو جانور حرام ہیں ان کی قیمت بھی حرام ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر کوئی چیز کھانا حرام قرار دے دیتے ہیں تو اس کی قیمت بھی حرام کر دیتے ہیں۔'' [1]

بلی اور کتے کے متعلق تو خاص طور پر احادیث میں آیا ہے کہ اس کی قیمت حرام ہے جیسا کہ ابوزبیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بلی اور کتے کی قیمت کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے جھڑکا ہے۔ [2] ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے اور بلی کی قیمت سے منع فرمایا۔'' [3] اس حدیث کے مطابق کتے کا لفظ عام ہے، شکاری ہو یا غیر شکاری یا جاسوسی وغیرہ کے لیے ہو، اس عموم کے پیش نظر ہر قسم کے کتوں کی خرید وفروخت نہیں ہونا چاہیے لیکن دوسرے دلائل کی بنا پر وہ کتے مستثنیٰ ہیں جن کے رکھنے کو احادیث میں جائز قرار دیا گیا ہے جیسا کہ شکار کے لیے، رکھوالی کے لیے یا جیسے آج کل جاسوسی کے لیے کتے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب ان کا رکھنا جائز ہے تو ان کی خرید وفروخت بھی یقیناً جائز ہوگی کیونکہ اس کے بغیر مذکورہ کاموں کے لیے کتوں کا ملنا ناممکن ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں استثناء بھی آیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے اور بلی کی قیمت سے منع فرمایا ہے لیکن شکاری کتا اس سے مستثنیٰ ہے۔ [4]

اس کے جواز کی علت اس کا انتفاع ہے، اسی وجہ سے رکھوالی اور جاسوسی وغیرہ جیسے مقاصد کے لیے بھی کتوں کی خرید وفروخت جائز ہوگی لیکن بلی کے متعلق کسی قسم کا استثنیٰ احادیث میں مروی نہیں ہے، اس لیے بلی خواہ کسی مقصد کے لیے ہو اس کی خرید وفروخت کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ بیش بہا قیمت کی وجہ اس کی خوبصورتی بتائی جاتی ہے لیکن اس وجہ سے اس کی خرید وفروخت کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (واللہ اعلم)

قبضہ سے پہلے چیز فروخت کرنا

سوال منڈیوں میں خرید وفروخت کی اکثر یہ صورت سامنے آتی ہے کہ آدمی کوئی چیز خریدتا ہے اور اسے مالک کے پاس ہی چھوڑ دیتا ہے، اسی حالت میں اس کو آگے فروخت کر دیا جاتا ہے، کیا اس طرح خرید وفروخت کرنا جائز ہے، اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

---

[1] مسند امام احمد:ص۳۱۷، ج۳۔ [2] صحیح مسلم، المساقاة:۷۵٦۹۔

[3] ابو داؤد، الاجارة:۳۴۹۷۔ [4] سنن النسائي، البیوع:٤٦۷۲۔

جواب تمام فقہاء عظام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کسی چیز کو خریدنے کے بعد اس پر قبضہ کرنے سے پہلے پہلے اسے فروخت کرنا ناجائز ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے اناج خریدا وہ اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک اسے ناپ تول کر پورا نہ کر لے۔'' [1]

ایک روایت میں وضاحت ہے کہ اسے اپنے قبضے میں لیے بغیر آگے فروخت نہ کرے۔ [2]

اس حدیث میں اناج اور غلے کا حکم بیان ہوا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کھانے کی اشیا کے علاوہ ہر چیز کا یہی حکم ہے۔ [3]

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرمایا ہے: ''تم جب بھی کوئی چیز خریدو تو اس پر قبضہ کیے بغیر آگے فروخت نہ کرو۔'' [4]

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس روایت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ میں جہاں سے سامان خریدا ہے وہیں پر بیچنے سے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ تاجر حضرات اپنا سودا اٹھا کر اپنے اپنے گھروں میں لے جائیں۔ [5] امام ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''خریدی ہوئی چیز کو قبضے میں لینے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ خریدار ایسی صورت میں اسے قبضے میں لینے سے عاجز ہوتا ہے، ممکن ہے فروخت کنندہ اس چیز کو اس کے حوالے کرے یا نہ کرے، خاص طور پر جب وہ دیکھ رہا ہو کہ خریدار کو اس سے بہت نفع ہو رہا ہے تو وہ اس بیع کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا، خواہ انکار کرے یا فسخ بیع کے لیے کوئی حیلہ تلاش کرے۔'' [6]

بہر حال آج کل منڈیوں میں جس طرح خرید وفروخت ہوتی ہے کہ ایک چیز خرید کر وہیں اسے آگے فروخت کر دیا جاتا ہے، خریدار اس پر قبضہ نہیں کرتا، یا اصل مالک سے پرچی حاصل کر کے اسے فروخت کر دیا جاتا ہے، شرعی طور پر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

گروی چیز سے فائدہ حاصل کرنا

سوال ہم نے ایک لاکھ روپیہ کسی سے قرض لیا ہے اور اس کے عوض اپنا مکان گروی رکھا ہے، ہمیں رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا، اس لیے ہم اس مکان میں رہتے ہیں اور جس سے قرض لیا اسے ہر ماہ اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب کوئی چیز گروی رکھ کر قرض یا کوئی اور چیز آئندہ کی ادائیگی پر ادھار لی جا سکتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے چند وسق جو لیے اور اسکے پاس اپنی زرہ گروی رکھی۔ [7] لیکن اس گروی شدہ چیز سے صرف اتنا فائدہ اٹھانے کی اجازت

---

[1] بخاری، البیوع: ۲۱۲۶۔ [2] مسلم، البیوع: ۱۵۲۵۔ [3] جامع ترمذی، البیوع: ۱۲۹۱۔

[4] مسند امام احمد: ص۴۰۲، ج۲۔ [5] ابو داؤد، البیوع: ۳۴۹۸۔

[6] اعلام الموقعین، ص۱۳۴، ج۳۔ [7] (صحیح بخاری، الرهن: ۲۵۰۹)

ہے جس قدر اس پر اخراجات اٹھتے ہوں مثلاً بکری کو اگر چارہ ڈالنا ہے تو اس کا دودھ حاصل کر لیا جائے اور اگر سواری کا جانور ہے تو چارہ وغیرہ ڈالنے کے عوض اس پر سواری کر لی جائے۔ دور حاضر میں اگر کسی نے گاڑی گروی رکھی ہے تو اپنا پٹرول ڈال کر اس پر سفر کیا جا سکتا ہے لیکن گروی میں زمین لے کر اسے کاشت کرنا اور پیداوار خود اٹھانا یا مکان کے عوض خود رہائش رکھنا یا کسی کو کرایہ پر دے کر خود کرایہ وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ صورت مسؤلہ میں جس شخص کا مکان ہے وہ خود ہی کرایہ دار کی حیثیت سے اس مکان میں رہائش رکھے ہوئے ہے، ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اگر اس کے کرایہ کو اصل قرض سے منہا کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح زمین کی پیداوار کو بقدر حصہ اگر قرض سے منہا کر دیا جائے تو گروی شدہ زمین کو کاشت کیا جا سکتا ہے بصورت دیگر گروی چیز سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بینک کا نفع

سوال بنک والے سیونگ کھاتے میں رکھے ہوئے سرمایہ پر نفع دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ اسے کاروبار میں لگاتے ہیں، کیا یہ منافع بھی سود کے ضمن میں آتے ہیں، اس کے متعلق تفصیلی فتویٰ درکار ہے۔

جواب بنک میں عام طور پر ہر دو قسم کے کھاتے ہوتے ہیں، ایک کرنٹ کھاتہ اور دوسرا سیونگ کھاتہ، کرنٹ میں رکھی گئی رقم پر بنک کسی قسم کا نفع نہیں دیتا اور نہ ہی اس سے زکوۃ کی رقم کاٹی جاتی ہے، البتہ بنک اس رقم کو اپنے استعمال میں ضرور لاتا ہے اور اسے دوسروں کو سود پر دیتا ہے، ہمارے رجحان کے مطابق اس کھاتے کے ذریعے گناہ اور ظلم پر بنک کا تعاون کیا جاتا ہے جس کی قرآن میں ممانعت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو، ظلم اور گناہ میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔'' [1]

اگرچہ کرنٹ کھاتے میں رکھی ہوئی رقم پر اس کے اصل مالک کو کچھ نہیں دیا جاتا تاہم اس رقم کو سودی کاروبار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بنک میں دوسرا کھاتہ سیونگ کہلاتا ہے، اس رقم پر اصل مالک کو سود بھی دیا جاتا ہے جسے بنک والے منافع کا نام دیتے ہیں۔ لیکن نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جاتی، لوگوں کو پھانسنے کے لیے اس کھاتے کے مختلف نام ہیں۔ مثلاً شراکتی کھاتہ، نفع اور نقصان کی بنیاد پر شراکت داری، اس کا مشہور نام (P.L.S) ہے، اس کھاتے میں رکھی ہوئی رقم کو آگے بھاری سود پر دوسروں کو دیا جاتا ہے، پھر اس سود کو ایک خاص شرح سے اصل مالک کے کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے، اگرچہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کھاتے میں جمع شدہ رقم کو کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اکاؤنٹ ہولڈر کی حیثیت ایک شریک کی ہوتی ہے لیکن زمینی حقائق اس دعویٰ کے منافی ہیں، کیونکہ اس میں سودی رقم کو مارک اپ جیسے حسین الفاظ کا نام دیا گیا ہے، بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق سیونگ کھاتے میں رکھی ہوئی رقم پر ملنے والے ''منافع'' سود ہی ہیں، ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، اگر حکومت واقعی غیر سودی نظام ختم کرنا چاہتی ہے تو نیک نیتی کے ساتھ اس پورے نظام کو بدلنے کا تہیہ کرے جو خالص سود پر مبنی ہے تاکہ مسلمان پوری یکسوئی کے ساتھ غیر سودی بینکاری کو کامیاب بنانے میں حصہ لیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

---

[1] المائدہ: ۲۔

بیعانہ کی شرعی حیثیت

سوال خرید وفروخت کرتے وقت جب سودا طے کرلیا جاتا ہے تو خریدار، فروخت کنندہ کو کچھ رقم موقع پر ادا کردیتا ہے تاکہ فروخت کنندہ اس چیز کو آگے فروخت نہ کرے، اس وقت فریقین یہ شرط طے کرتے ہیں کہ اگر خریدار نے بقیہ رقم ادا کرکے یہ چیز اپنے قبضہ میں نہ لی تو اس کی پیشگی ادا کردہ رقم ضبط کرلی جائے گی اور اگر فروخت کنندہ اس سے منحرف ہوا تو اسے پیشگی رقم کا دوگنا ادا کرنا ہوگا، اس طرح جو رقم پہلے ادا کی جاتی ہے اسے بیعانہ کہتے ہیں، اس خرید وفروخت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اس شرط پر خرید وفروخت کرنا کہ اگر بقیہ رقم ادا کرکے چیز کو اپنے قبضہ میں نہ لیا گیا تو پیشگی دیا ہوا بیعانہ مارلیا جائے گا، جائز نہیں ہے۔ اس قسم کی خرید وفروخت کو شرع نے حرام قرار دیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے۔ [1] حدیث میں بیع عربان کی وضاحت بایں طور کی گئی ہے کہ آدمی کسی چیز کا سودا کرے اور فروخت کنندہ کو کچھ رقم پیشگی ادا کرکے کہے ''اگر میں نے یہ چیز لے لی تو ٹھیک بصورت دیگر ادا کردہ پیشگی رقم تیری ہوگی۔'' اس قسم کی خرید وفروخت کے متعلق اگرچہ فقہا کا اختلاف ہے تاہم ہمارا رجحان یہ ہے کہ ناجائز شرط اور دھوکے کی وجہ سے اس قسم کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے اور یہ کسی کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے میں شامل ہے۔ نیز بیع فسخ ہونے کی صورت میں بیچنے والا جو رقم ضبط کرتا ہے اس کے عوض وہ خریدار کو کوئی مال یا فائدہ مہیا نہیں کرتا اور بغیر معاوضے کے کسی کا مال لینا جائز نہیں۔ علاوہ ازیں کسی معقول وجہ کی بنیاد پر بیع واپس لینا ثواب کا کام ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جو شخص کسی مسلمان کی بیع واپس کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ معاف فرمادے گا۔'' [2] اس حدیث کی سند کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ [3]

لیکن بیعانہ کی شرط اس لیے عائد کی جاتی ہے کہ خریدار، خریدی ہوئی چیز واپس نہ کردے، اگر ایسا کرتا ہے تو اس کی پیشگی ادا کردہ رقم ضبط کرلی جاتی ہے، ایسا کرنا نیکی سے پہلوتہی ہے جسے کسی بھی صورت میں اچھا نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ بھلے وقتوں کی بات ہے جب لوگ سادہ مزاج اور امانت دار تھے، اب ہمارے اس پُرفتن دور میں جھوٹ، فریب، دغابازی، ہوشیاری اور چالاکی لوگوں کے رگ وریشہ میں رچی بسی ہے، اکثر طور پر اس سلسلہ میں درج ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں:

① ایک آدمی کسی سے تین ماہ تک رقم کی ادائیگی پر کوئی چیز خرید لیتا ہے اور فروخت کنندہ کو زر بیعانہ بھی ادا کردیتا ہے تاکہ وہ اس چیز کو آگے فروخت نہ کرے لیکن ایک ماہ بعد اس چیز کا بھاؤ چڑھ جاتا ہے۔ اتفاق سے اسے کوئی گاہک بھی میسر آجاتا ہے، وہ اپنے پہلے وعدے سے منحرف ہوکر دوسرے گاہک کو چیز فروخت کردیتا ہے اور زر بیعانہ دوگنا کرکے پہلے شخص کو ادا کردیتا ہے، اس کے باوجود اسے بچت ہوجاتی ہے۔

② بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی تیسرا آدمی خریدار کو خراب کرنا چاہتا ہے، وہ فروخت کنندہ کے پاس آکر کہتا ہے کہ تم اتنی قیمت میں وہ چیز مجھے دے دو، میں تمہیں پہلے خریدار کا زر بیعانہ بھی ادا کردیتا ہوں حالانکہ پہلے خریدار کو وہی چیز اس سے ارزاں نرخ پر ملتی تھی لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم ہے، اس طرح خریدار کو نقصان ہوتا ہے۔

---

[1] ابن ماجہ، التجارات: ۲۱۹۳۔ [2] ابو داؤد، البیوع: ۳۴۶۰۔ [3] ارواء الغلیل، حدیث نمبر ۱۳۳۴۔

③ ایک آدمی نے کسی دوسرے شخص کو کوئی چیز فروخت کی، دو تین ماہ تک اس کی قیمت وصول کرنے کی شرط کر لیتا ہے اور خریدار سے کچھ زر بیعانہ بھی وصول کر لیتا ہے، اس دوران خریدار کو وہی چیز کسی دوسرے سے ارزاں قیمت پر مل جاتی ہے تو وہ اپنے زر بیعانہ کی پروا کیے بغیر اپنے وعدے سے منحرف ہو کر کسی دوسرے شخص سے وہ چیز خرید لیتا ہے۔

④ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی تیسرا آدمی فروخت کار کو خراب کرنا چاہتا ہے، وہ خریدار کے پاس آ کر کہتا ہے کہ میں تجھے وہی چیز اس سے ارزاں قیمت پر مہیا کرتا ہوں، تم اپنا زر بیعانہ میرے کھاتے میں ڈال کر مجھ سے وہ چیز خرید لو، اس طرح وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو جاتا ہے حالانکہ فروخت کنندہ کو اس دوران فروخت کردہ چیز کی زیادہ قیمت ملتی تھی، لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم رہا، اس طرح فروخت کنندہ کو نقصان ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں کیا کیا جائے؟ آیا خریدار یا فرخت کار کو اس طرح دھوکہ، فراڈ اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے یا ان کا کوئی باعزت حل نکالا جائے تاکہ مظلوم اور ستم زدہ انسان کے نقصان کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو۔ حالات کے تبدیل ہونے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں، ہمارے رجحان کے مطابق ایسے حالات میں جب ایک دوسرے پر ظلم ہو رہا ہو، خریدار کا بیعانہ ضبط ہونا چاہیے، اسی طرح فروخت کنندہ سے دوگنا زر بیعانہ وصول کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر کسی مجبوری کی وجہ سے سودا فسخ کرنا پڑے تو فریقین کو فراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو فروخت کرتے وقت نرمی کرتا ہے، خریدتے وقت نرمی کرتا ہے اور جب تقاضا کرتا ہے تو بھی نرمی کرتا ہے۔ ❶ فروخت کار کی نرمی یہ ہے کہ اگر خریدار اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے سودا فسخ کرنا چاہے تو وہ اس کا زر بیعانہ فراخ دلی کے ساتھ واپس کر دے۔ ''بحق نقصان'' ضبط نہ کرے، اسی طرح خریدار کی طرف سے نرمی یہ ہے کہ اگر حالات سے مجبور ہو کر فروخت کنندہ اس بیع کو ختم کرنا چاہے تو فراخدلی کے ساتھ اس سودے کو ختم کر دے اور اس سے دوگنا زر بیعانہ کا مطالبہ نہ کرے بلکہ صرف اپنی دی ہوئی رقم ہی واپس لے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے کاروباری معاملات صحیح طریقہ سے چلانے کی توفیق دے۔ آمین

بینک میں ملازمت کرنا

سوال مجھے بینک میں ملازمت مل رہی ہے جب کہ میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ بینک میں ملازمت شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس کے متعلق میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب بینک خواہ ''اسلامی'' ہوں یا غیر اسلامی، ان کی بنیاد سودی کاروبار پر ہے اور سودی لین دین اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے خلاف کھلی جنگ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اگر واقعی تم مومن ہو تو جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' ❷

احادیث میں بھی اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود

---

❶ صحیح بخاری، البیوع:۲۰۷۶۔ ❷ البقرۃ: ۲۷۹۔

کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [1] نیز رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی ہے: ''یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں (حوالہ مذکور) لہٰذا ایک باغیرت مسلمان کو چاہیے کہ وہ بینک کی ملازمت سے اجتناب کرے خواہ وہ درجہ چہارم میں ہی کیوں نہ ہو۔

بعض روشن خیال حضرات کا خیال ہے کہ قرآن کریم نے جس سود کو حرام کیا ہے وہ مہاجن قرضہ ہے اس پر سود لینا حرام ہے لیکن جو صنعتی قرضے ہیں یا جو تجارت کے لیے قرضہ لیا جائے، اس پر سود لینا دینا حرام نہیں ہے بلکہ تجارتی سود اس سے مستثنیٰ ہے، حالانکہ اس استدلال کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ قرآن کریم نے علی الاطلاق ربا کو حرام قرار دیا ہے خواہ وہ تجارت کے لیے ہو یا ذاتی ضروریات کے لیے ہو، نیز رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بھی تجارتی سود رائج تھا، چنانچہ حرمت سے قبل حضرت عباس رضی اللہ عنہ تجارتی سود کا لین دین کرتے تھے۔

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق بینک میں ہر طرح کی ملازمت ناجائز ہے، اس کے علاوہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔'' [2]

اس آیتِ کریمہ کا بھی تقاضا ہے کہ بینک کی ملازمت نہ کی جائے کیونکہ بینک میں ملازمت کرنا سودی کاروبار میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ (واللہ اعلم)

تکافل کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے ملک میں کچھ تجارتی کمپنیاں بیمہ کا متبادل تکافل کے نام سے متعارف کرا رہی ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ ہمارا نظام شرعی اصولوں کے عین مطابق ہے، اس سلسلہ میں علما کبار کے فتاویٰ کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

جواب عربی زبان میں تکافل کا معنی کفالت کرنا اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کرنا ہے۔ قرآن و حدیث میں اگرچہ یہ لفظ استعمال نہیں ہوا تاہم اسلام نے ہمیں ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھنے، خیر خواہی اور تعاون کرنے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ زکوٰۃ، عشر، صدقہ فطر اور دیگر خیرات اسی امر کو یقینی بنانے کے لیے ہیں۔ اگر ہم صدق دل سے ان پر عمل پیرا ہو جائیں تو معاشرہ میں تمام محتاجوں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں لیکن ہمارے ہاں جو تکافل کا نظام متعارف کروایا جا رہا ہے اس کا مقصد ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کرنا ہر گز نہیں بلکہ اس میں اپنے مستقبل کے خطرات کا تحفظ اور نقصانات کی تلافی ہے۔ اس نظام کے تحت یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہم آپ کے بیوی بچوں کی مدد تب کریں گے جب آپ اتنے سالوں تک ہر ماہ ایک متعین رقم دیں گے اور ہمارے قائم کردہ وقف فنڈ میں اتنی رقم بطور چندہ دیں گے اور اس نظام کو بیمہ کے متبادل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس تکافل اور عام بیمہ میں فرق ہے: مثلاً نظام تکافل میں شریک ہونے والا جو بالاقساط رقم جمع کرتا ہے اس کی حیثیت عام صارف کی نہیں جیسا کہ بیمہ کرانے والے کی ہوتی ہے بلکہ وہ مجموعی رقم میں شریک بن جاتا ہے۔ تکافل میں جمع شدہ رقم پر جو منافع آتا ہے اسے

---

[1] صحیح مسلم، البیوع: ۴۰۹۳۔ [2] المائدہ: ۲۔

تمام شرکا، شراکت کے تناسب سے تقسیم کرتے ہیں جبکہ بیمہ کمپنیاں ان منافع کو اپنے پاس رکھتی ہیں، صارف کو نہیں دیتیں۔ تکافل میں مدت پوری ہونے کے بعد رقم واپس مل سکتی ہے جبکہ بیمہ کرانے والے کو اس کی جمع شدہ رقم پوری کی پوری واپس نہیں ہوتی، اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک تجارتی معاہدہ ہے، اس کی بنیاد محض تعاون نہیں ہے جیسا کہ باور کرایا جاتا ہے کیونکہ تعاون کی نیت سے اگر کوئی ادائیگی کرتا ہے تو وہ مال اس کی ملکیت سے نکل جاتا ہے، اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا یا اس پر نفع طلب کرنا انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اپنے دیئے گئے عطیے میں لوٹنے والا ایسے ہے جیسے ایک کتا قے کرے پھر اسے چاٹ لے۔''[1] جبکہ تکافل میں مدت پوری ہونے کے بعد اور کسی قسم کا نقصان نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنا مال واپس لے سکتا ہے، ایسے حالات میں اسے تعاون کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے رجحان کے مطابق تکافل میں غرر، سود اور جوا تینوں چیزیں موجود ہیں جن کی بنا پر اسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

غرر اس طرح ہے کہ جس نقصان کے ازالہ کے لیے پالیسی ہولڈر نے پالیسی خریدی ہے وہ پیش ہی نہ آئے، اس طرح اس کی ادا کردہ رقم ضائع ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ کوئی حادثہ پیش آ جائے پھر نقصان کی صورت میں اس کی تلافی کے لیے کمپنی کے ذمے اس کی ادائیگی لازم ہو جائے۔

تکافل میں شریک قسطیں ادا کرتا ہے، اگر اس کا نقصان ہو گیا تو تکافل کمپنی کی طرف سے اس کا طے شدہ معاوضہ دیا جاتا ہے جو ادا کردہ قسطوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، سود بھی اسی کا نام ہے کہ تبادلہ کی صورت میں ایک طرف سے زیادہ ادا کرنا، اسے ہم زیادتی کا سود کہتے ہیں۔

جوا اس طرح ہے کہ رقم جمع کرانے میں تمام افراد شریک ہیں لیکن ایک کو حادثہ پیش آتا ہے تو تکافل کمپنی کی طرف سے اس کی تلافی کر دی جاتی ہے اور جس کو حادثہ پیش نہیں آتا اسے صرف اصل رقم ہی واپس ملتی ہے، یہ ایک طرح کا نقصان ہے اور جوا اسی کا نام ہے۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ جن خرابیوں کی بنا پر بیمہ حرام ہے، موجودہ تکافل ان سے پاک نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جن علماء کبار کے فتویٰ کا حوالہ دیا جاتا ہے ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے سامنے جو صورت بیان کر کے فتویٰ لیا گیا ہے وہ موجودہ تکافل سے قطعی مماثلت نہیں رکھتی۔ سعودی عرب کے علما کمیٹی نے اپنے حالیہ فتویٰ میں موجودہ تکافل کو حرام قرار دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''گزشتہ کچھ عرصہ سے کچھ اداروں اور کمپنیوں کی طرف سے لوگوں کے سامنے معاملات کو خلط ملط کرنے اور حقائق کو الٹ پلٹ کرنے کا سلسلہ جاری ہے، ان اداروں نے تجارتی بیمہ کو تعاونی بیمہ (تکافل) کا نام دیا ہوا ہے اور لوگوں کو دھوکہ دہی پھر خود کو سہارا دینے کے لیے اس کے جواز کو علما کمیٹی کی طرف منسوب کرتے ہیں جب کہ علما کمیٹی اس سے مکمل طور پر بری ہے۔ ہم نے پہلے ہی تجارتی بیمہ اور تعاونی بیمہ (تکافل) کے درمیان فرق کو واضح کر دیا ہے لہٰذا نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی، اسی لیے علما کمیٹی نے حقائق کو ظاہر کرنے اور عوام کو اس دھوکہ سے خبردار کرنے کے لیے یہ فتویٰ جاری کیا ہے۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک تکافل ایک غیر شرعی تجارتی معاہدہ ہے جسے تعاون کا لبادہ پہنا کر عوام کو پھانسنے کی کوشش کی

---

[1] صحیح بخاری، الهدیه:۲۵۸۹۔ [2] فتاویٰ اللجنة الدائم نمبر ۱۹۴۰۶۔

جاتی ہے اور اس میں موجود غیر شرعی اور حرام معاملات کو جائز کہا جاتا ہے، ایسا کرنا حرام کو حلال کہنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق دے۔ آمین۔

بیمہ کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے ملک میں مختلف بیمہ کمپنیاں سرگرم عمل ہیں جو بیمہ کے جواز میں بڑے بڑے جید علما کے فتوے پیش کرتی ہیں، کیا ایسی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب بیمہ نظریے اور نظام کے اعتبار سے باہمی امداد اور تعاون محض پر قائم ہے لیکن اس کی ترویج کے لیے جو وسائل و ذرائع استعمال کیے گئے ہیں وہ خود اس نظریے کی نفی کرتے ہیں کیونکہ جب اسے کاروباری شکل دی گئی تو اس میں سود، دھوکہ اور جوئے جیسے بدترین عوامل کو شامل کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ بیمہ اشخاص اور کمپنیوں کے درمیان ایک خاص عقد کا نام ہے اس کی تعریف عام طور پر درج ذیل کی جاتی ہے۔

''یہ ایک تجارتی معاہدہ ہے جس میں ایک طرف صارف مقررہ مدت تک طے شدہ رقم اقساط کی صورت میں یا ایک ہی دفعہ ادا کر دیتا ہے، دوسری طرف ایک کمپنی ہوتی ہے جو اس ادا کردہ رقم کے عوض صارف کو ایک مقررہ مدت میں کچھ خاص چیزوں کی ضمانت دیتی ہے کہ اگر اس صارف کو کسی قسم کا نقصان ہوا تو کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی، اگر نقصان نہ ہوا تو کمپنی مدت ختم ہونے کے بعد مکمل رقم یا کچھ رقم رکھ لیتی ہے اگر صارف قسطیں نہ ادا کر سکے تو معاہدہ ختم اور ادا کردہ رقم ضبط کر لی جاتی ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق اس قسم کا معاہدہ درج ذیل اسباب کی بنا پر حرام اور ناجائز ہے: اس معاہدہ میں دھوکہ اور لاعلمی ہے جسے عربی میں غرر کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس بیع سے منع کیا ہے جس میں دھوکہ کا عنصر شامل ہو۔ [1]

علماء کرام نے غرر کی تعریف بایں طور کی ہے کہ ہر غیر معمولی، غیر طبعی اور غیر یقینی صورت حال غرر ہے جس کے پیش نظر کسی معاملہ یا لین دین کے ضروری پہلو متعین نہ کیے جا سکیں اور فریقین آخر وقت تک اس معاملہ میں غیر یقینی صورت حال سے دو چار رہیں کہ ان کے معاملہ کی اصل صورت بالآخر کیا ہوگی۔

بیمہ میں دھوکہ اس طرح ہے کہ جس نقصان کی ادائیگی طے کی گئی ہے اس کے ہونے نہ ہونے کے دونوں پہلو ہیں، وہ نقصان یا حادثہ مقررہ مدت میں ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا، صارف کو آخر وقت تک وہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ اقساط ادا کرتا ہے اگر مدت ختم ہوگئی اور حادثہ پیش آیا نہ تو اس کی ادا کردہ اقساط ضبط کر لی جائیں گی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی ایک ہی قسط وصول کرنے کے بعد حادثہ پیش آنے کی صورت میں نقصان کی تلافی کرنے پر مجبور ہوتی ہے، بعض اوقات پوری اقساط وصول کر لیتی ہے لیکن حادثہ پیش نہیں آتا۔ بہر حال یہ معاملہ سراسر ایک ''اندھا سودا'' ہے جس میں دھوکے کا پہلو نمایاں طور پر موجود ہے۔

اس معاہدہ میں جوا پایا جاتا ہے اور جوا کی تعریف یہ ہے کہ ایسا معاہدہ جس میں دو یا دو سے زیادہ آدمی شریک ہوں، ان میں

---

[1] صحیح مسلم، البیوع: ۳۸۰۸۔

سے صرف ایک کو نفع ہو اور باقی نقصان میں رہیں اور اس نفع کا مدار بھی محض اتفاق ہو، جوا میں کسی کو علم نہیں ہوتا کہ کون نقصان میں رہے گا اور کسے نفع ملے گا، بیمہ کا معاہدہ بھی یہی ہوتا ہے اس معاملہ میں دو شریک ہیں ایک صارف اور دوسرا کمپنی، ان میں سے کسی کو علم نہیں ہوتا کہ کون نفع لے گا اور کسے نقصان پہنچے گا، اگر معاہدہ ہوتے ہی نقصان ہو گیا تو کمپنی کی طرف سے خطیر رقم مل جاتی ہے جو اس نے ادا نہیں کی ہوتی۔ اس طرح اگر مدت پوری ہونے کے بعد حادثہ نہ ہوا تو صارف کی ادا کردہ رقم ضائع اور تمام رقم کمپنی کو مل جائے گی اور صارف کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس کاروبار کی بنیاد حادثہ ہے جو ایک اتفاقی چیز ہے۔ یہی معاملہ جوئے میں ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک کام اور شیطانی عمل ہیں، ان سے اجتناب کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔'' [1]

اس کاروبار کے حرام ہونے کا تیسرا سبب یہ ہے کہ اس میں سود شامل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سارا معاہدہ ہی سود پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ صارف جو رقم اقساط کی صورت میں ادا کرتا ہے، حادثہ کے وقت اسے ادا کردہ رقم سے کہیں زیادہ مل جاتی ہے اور اسی کا نام سود ہے کیونکہ صارف کو زائد رقم اس رقم کے عوض ملتی ہے جو اس نے اقساط کی صورت میں ادا کی تھی۔ سود میں بھی یہی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کچھ رقم دوسرے کو دیتا ہے پھر خاص مدت کے بعد اس رقم کے عوض کچھ زائد رقم وصول کرتا ہے، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم توبہ کر لو تو صرف اپنی رقم کے حقدار ہو۔'' [2]

یہ کاروبار اس لیے بھی ناجائز ہے کہ اس پر عمل کرنے سے اسلام کا ضابطہ وراثت مجروح ہوتا ہے کیونکہ مرنے کی صورت میں زر بیمہ کا مالک وہ نامدار شخص بن جاتا ہے جو صارف نے اپنی زندگی میں نامزد کیا ہوتا ہے باقی ورثا اس سے محروم ہوتے ہیں، حالانکہ ضابطہ وراثت کے مطابق تمام شرعی ورثا اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بیمہ کا کاروبار قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہے کیونکہ یہ دھوکے، جوا، سود اور دیگر قباحتوں پر مشتمل ہے، اس لیے ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بیمہ کے حرام ہونے کے متعلق ہم نے ایک تفصیلی فتویٰ جاری کیا تھا جو فتاویٰ اصحاب الحدیث (ص ۴۰۷ ج ۱) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

لکی کمیٹی کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے علاقہ میں لکی کمیٹی کا کاروبار عروج پر ہے، چند ساتھی مل کر ماہانہ کمیٹی ڈالتے ہیں پھر قرعہ اندازی کے ذریعے جس کا نام نکل آتا ہے، اسے موٹر سائیکل دی جاتی ہے اور اس کے بعد وہ کوئی قسط وغیرہ بھی ادا نہیں کرتا، اس کے متعلق کچھ علما کا موقف ہے کہ ایسا کاروبار ناجائز ہے جبکہ کچھ اہل علم حضرات اسے جائز کہتے ہیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے حلال و حرام کے متعلق تمیز نہ کرنے کی جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ دور حاضر میں حقیقت کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آ رہی ہے، آپ نے فرمایا تھا ''میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے درمیان حلال و حرام کی تمیز اٹھ جائے گی، انسان اس بات کی پروا نہیں کرے گا کہ وہ حلال استعمال کرتا ہے یا حرام کھا رہا ہے۔'' [3]

ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ بڑی لاپروائی اور ڈھٹائی کے ساتھ حرام کھا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ بایں الفاظ

---

[1] المائدہ: ۹۰۔ [2] البقرۃ ۲۷۹۔ [3] صحیح بخاری، البیوع: ۲۰۵۹۔

اس بے حسی کے متعلق فرمایا: ''ایک وقت آئے گا کہ لوگ سود خوری میں مبتلا ہوں گے، عرض کیا گیا کہ سب لوگ اس میں مبتلا ہوں گے، فرمایا جو اس سود سے بچنے کی کوشش کریں گے انہیں بھی سود کی گرد و غبار اور اس کا دھواں ضرور پہنچے گا۔'' ❶ چنانچہ ہمارے معاشرے میں ایسی ایسی سودی سکیمیں رائج ہو رہی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد ہم تفصیل کے ساتھ صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں، ہمارے ہاں کمیٹی سسٹم تین طرح کا ہے، یعنی سادہ کمیٹی، بولی والی کمیٹی اور لکی کمیٹی

سادہ کمیٹی: چند احباب مل کر اپنی تھوڑی تھوڑی پس انداز رقم کو ماہ بماہ کسی کے پاس جمع کرتے رہتے ہیں پھر ہر مہینے پہلے سے طے شدہ پروگرام یا قرعہ اندازی کے ذریعے تمام جمع شدہ رقم ممبران میں سے کوئی ایک لے لیتا ہے یہ جسے رقم مل جاتی ہے، اس کا نام آئندہ طے شدہ پروگرام یا قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیا جاتا، البتہ اپنی پس انداز رقم ہر ماہ ادا کرتا رہتا ہے، اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ یہ ایک امداد باہمی کا ذریعہ ہے، اس طریقہ سے تھوڑی تھوڑی رقم یکمشت مل جاتی ہے جسے کسی ہنگامی مصرف میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔

بولی والی کمیٹی: اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ چند آدمی مل کر کمیٹی ڈالتے ہیں، پھر ایک مقررہ تاریخ پر اس جمع شدہ رقم کی بولی لگائی جاتی ہے، جو ممبر سب سے کم بولی لگائے اسے جمع شدہ رقم دے دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر جمع شدہ رقم پچاس ہزار روپیہ ہے تو اس کی چالیس ہزار بولی لگانے والے کو چالیس ہزار دے دیا جاتا ہے، باقی دس ہزار رقم تمام ممبران آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، اس کے ناجائز اور حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ یہ ایک کاروبار ہے، اس میں امداد باہمی کا جذبہ نہیں پایا جاتا، یہ کاروبار اس لیے ناجائز ہے کہ اس کی بنیاد ناجائز ذرائع سے مال کھانے پر ہے، جس کی حرمت اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ بیان فرمائی ہے۔

''اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ۔'' ❷

مذکورہ کمیٹی کا کاروبار اس لیے ناجائز ہے کہ نقد تھوڑی سی رقم وصول کر کے آئندہ زیادہ رقم ادا کرنا ہے، سود بھی یہی ہے کہ ایک آدمی تھوڑی رقم نقد وصول کر کے آئندہ معین مدت پر زیادہ رقم ادا کرتا ہے، چونکہ یہ ایک کاروبار ہے اور کاروبار میں جب کرنسی کا تبادلہ ہوتا ہے تو مساویانہ طور پر ہونا چاہیے، کمی بیشی کے ساتھ ایک ہی جنس کا تبادلہ شرعاً حرام ہے جس کی حرمت صریح اور واضح نصوص سے ثابت ہے۔

لکی کمیٹی: اس میں چند ممبران کمیٹی ڈالتے ہیں اور کمیٹی کا اہتمام کرنے والے کی طرف سے یہ پیشکش ہوتی ہے کہ قرعہ اندازی کے ذریعے جس کا پہلے نام نکل آیا اسے موٹر سائیکل دی جائے گی اور آئندہ اسے کمیٹی جمع کرانے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا، اس طرح طے شدہ ایک حد تک اس پیشکش سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس کے ناجائز ہونے میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ اگر دو ہزار ماہانہ کمیٹی ہے اور کسی کا نام پہلی ہی کمیٹی کی ادائیگی پر نکل آتا ہے تو اسے ساٹھ ہزار کی موٹر سائیکل صرف دو ہزار روپیہ جمع کرانے میں مل جاتی ہے، اسے یہ فائدہ ایک اتفاقی طور پر ملا ہے حالانکہ تمام ممبران اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

---

❶ مسند احمد، ص ٤٩٤، ج٢۔ ❷ النساء: ٢٩۔

یہ جوئے کی ایک شکل ہے جسے قرآن کریم نے واضح طور پر حرام کیا ہے، دور جاہلیت میں تیروں (ازلام) کے ذریعے قسمت آزمائی کی جاتی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ آیت نمبر ۹۰ میں حرام کیا ہے اور لکی کمیٹی میں قرعہ اندازی کے ذریعے جوا کھیلا جاتا ہے لہٰذا اس قسم کے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

گڑیوں کی خرید وفروخت

سوال بازار میں بچوں کے کھلونے دستیاب ہیں، ان میں متحرک کھلونے بھی ہیں، مثلاً گڑیاں وغیرہ کیا ان کی خرید وفروخت جائز ہے اور انہیں گھر میں رکھا جاسکتا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب بچوں کے لیے کھلونے بنانا اور انہیں بازار میں فروخت از خود نا جائز نہیں، بشرطیکہ ان میں کوئی قباحت موجود نہ ہو۔ بچوں کے لیے گڑیوں کی دو صورتیں ہیں: ① انہیں پوری باریکی سے تمام خدوخال کے ساتھ بنایا گیا ہو، جو نقل مطابق اصل ہوتی ہے، ان کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ انہیں بنانا، ان کی خرید وفروخت کرنا اور انہیں گھروں میں رکھنا جائز نہیں۔ یہ ان ممنوعہ تصاویر سے ہیں جنہیں بنانے یا گھر میں رکھنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔

محض ایک سرسری سا ڈھانچہ جو کسی جاندار کا ہوتا ہے جیسے لکڑی کے گھوڑے یا کپڑے کی گڑیاں۔ ان کے خدوخال نمایاں نہیں ہوتے، بلکہ عام طور پر گھروں میں بچیاں اپنے طور پر ہاتھ سے گڑیاں وغیرہ بنالیتی ہیں، اس قسم کی گڑیاں بنائی جاسکتی ہے، انہیں بیچنا اور خریدنا بھی جائز ہے اور گھر میں رکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ [1] ایک روایت میں صراحت ہے کہ یہ گڑیاں کھلونوں کی قسم سے تھیں۔ [2]

دیگر روایات میں ہے کہ ان کھلونوں میں کپڑے کا ایک گھوڑا بھی تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور اس کے دو پر بھی تھے۔ [3]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن گڑیوں کے خدوخال نمایاں نہ ہوں اور وہ بچیوں کے امور خانہ داری سکھانے کے لیے کارآمد ہوں تو انہیں بازار سے خریدنے یا خود تیار کرنے میں چنداں حرج نہیں لیکن دور حاضر میں کھلونوں کی جو ترقی یافتہ صورت ہے کہ پلاسٹک، کپڑے اور پتھر وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں جو اصل کے ہو بہو مشابہت رکھتے ہیں، ایسے کھلونوں سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی طرح گھروں میں کچھ جانوروں کی تصاویر بطور آرائش رکھی جاتی ہیں اور انہیں کھلونوں کا نام دیا جاتا ہے، انہیں رکھنے کی بھی کسی طرح اجازت نہیں دی جاسکتی۔ (واللہ اعلم)

شفعہ کی شرعی حیثیت

سوال کیا شفعہ صرف زمین یا مکان میں ہوتا ہے؟ نیز شفعہ کا حقدار کون ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

---

[1] بخاري الادب: ٦١٣٠۔ [2] صحيح مسلم، فضائل الصحابة: ٦٢٨٨۔ [3] ابو داؤد، الادب: ٤٩٣٢۔

جواب شریک کے اس حصے کو مقررہ معاوضہ کے بدلے شریک کی طرف منتقل کرنا جو اجنبی کی طرف منتقل ہو گیا تھا، شفعہ کہلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: شفعہ ہر مشترک چیز میں ہے خواہ زمین یا مکان یا باغ وغیرہ۔ ❶ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس چیز میں شفعہ کا فیصلہ دیا ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہے۔ ❷ شفعہ کا سبب صرف شراکت ہے اور وہ ہر چیز میں عام ہے، زمین ہو یا گھر یا پانی کی ندی ہو، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر چیز میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا ہے۔ ❸

احادیث کی رو سے پڑوسی کے لیے شفعہ کا حق ہے بشرطیکہ ان کے گھر کا راستہ ایک ہو جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمسایہ اپنے ہمسائے کا شفعہ میں زیادہ حقدار ہے، شفعہ کی وجہ سے اس کا انتظار کیا جائے گا اگرچہ وہ غائب ہو بشرطیکہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔ ❹

یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ مجرد ہمسائیگی کے ذریعے حق شفعہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے مشترک راستہ ہونا ضروری ہے، اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے: ''جب حد بندی ہو جائے اور راستے جدا جدا ہو جائیں تو پھر شفعہ کا استحقاق نہیں ہوتا۔ ❺

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' جب گھر تقسیم کر دیا جائے اور اس کی حد بندی کر دی جائے تو اس میں کوئی حق شفعہ نہیں۔ ❻ ہمارے ہاں یہ غلط رواج ہے کہ اگر کسی نے گھر یا پلاٹ خریدا ہے تو کھیوٹ کھتونی میں شراکت رکھنے والا کوئی بھی شفعہ کر سکتا ہے اگرچہ وہ اس کا ہمسایہ نہ ہو، بہرحال اگر گھر یا پلاٹ کی حد بندی ہو چکی ہو اور راستے متعین ہوں تو اس میں شفعہ نہیں ہو سکتا۔ (واللہ اعلم)

ایک جنس کی اشیا کا تبادلہ

سوال ہمارے معاشرے میں کچھ عورتیں اپنی پڑوسن سے بوقت ضرورت آٹا لے لیتی ہیں، پھر چند دنوں کے بعد واپس کر دیتی ہیں، ایک عالم دین نے مسئلہ کیا ہے کہ ایسا کرنا سود ہے، براہ کرم اس کی وضاحت کریں۔

جواب خرید و فروخت کرتے وقت اگر ایک ہی جنس کی دو اشیا کا تبادلہ کیا جائے تو دو چیزوں کا خیال رکھا جائے۔

① کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ نہ ہو۔

② دونوں طرف سے نقد ہو۔

اگر کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کیا یا ایک طرف ادھار اور دوسری طرف سے نقد تو ایسی دونوں صورتیں سود ہیں، جیسا کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونا، سونے کے بدلے۔ چاندی، چاندی کے بدلے۔ جو، جو کے بدلے۔ کھجور، کھجور کے بدلے اور نمک، نمک کے بدلے یہ تمام اشیا برابر، برابر اور نقد بنقد فروخت کی جائیں، پھر جو زیادہ لے یا

---

❶ مسند احمد، ص ۲۱۶، ج ۳۔ ❷ صحیح بخاری، الشفعہ: ۲۲۵۷۔ ❸ ابو داؤد، البیوع: ۳۵۱۳۔
❹ ابو داؤد، البیوع: ۳۵۱۸۔ ❺ صحیح بخاری، الشفعہ، ۲۲۵۷۔ ❻ ابو داؤد، البیوع: ۳۵۱۵۔

زیادہ دے تو اس نے سودی کاروبار کیا۔ سود لینے والا اور سود دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ [1]

واضح رہے کہ تجارت میں سود کی دو قسمیں ہیں:

① ربا الفضل: ایک جنس کی دو اشیاء کو کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا۔

② ربا النسیئہ: اس میں کمی بیشی تو نہ ہو لیکن ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار کا معاملہ ہو، سود کی یہ دونوں اقسام خرید و فروخت سے متعلق ہیں۔

البتہ معاشرتی طور پر ایک گھر والا اپنے پڑوسی سے وقتی طور پر کوئی چیز لیتا ہے، مثلاً گندم، آٹا، گھی اور چینی وغیرہ اور پھر چند دنوں بعد میسر آنے پر اسے واپس کر دیتا ہے تو یقیناً خرید و فروخت نہیں بلکہ تعاون باہمی کا ایک طریقہ ہے، اسے کسی صورت میں ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ (واللہ اعلم)

سودی اور غیر سودی مخلوط کمائی

سوال میرے ایک دوست کے والد بینک میں ملازم ہیں جبکہ میرا دوست کسی کمپنی میں کام کرتا ہے، وہ دونوں باپ بیٹا اپنی کمائی سے گھر کے اخراجات پورے کرتے ہیں، ایسے حالات میں میرے دوست کے لیے شرعی حکم کیا ہے، کیا وہ اپنی کمائی والد کی آمدنی سے الگ کرے یا اسی طرح گھر کا نظام چلتا رہے؟

جواب سودی کاروبار میں ملوث ہونے کی بنا پر بینک کی ملازمت جائز نہیں اور نہ ہی اس سے ملنے والی کمائی حلال اور پاکیزہ ہے۔ سودی کاروبار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ لڑنے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہو۔'' [2]

اس قسم کے رزقِ حرام کے بہت سے نقصانات ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق حرام استعمال کرنے والے کی نیکیاں قبول نہیں کرتا اور اگر رزق حلال میں حرام کی ملاوٹ ہو جائے تو اس قسم کی کمائی استعمال کرنے سے بھی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اگر ایک شخص دس درہم کا کپڑا خریدتا ہے اور اس میں ایک درہم حرام کی کمائی کا شامل کر لیتا ہے جبکہ باقی نو درہم حلال کے ہیں تو اللہ رب العزت اس کے ایک بار لباس پہننے سے چالیس دن تک اس کی کوئی نیکی قبول نہیں کرے گا۔'' [3]

اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال رزق میں حرام کی ملاوٹ کس قدر خطرناک امر ہے اگرچہ غلبہ حلال کا ہو اس کی کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ لیکن جس کا تمام سرمایہ حرام کا ہو اور اس کی معیشت کی بنیاد ہی رزق حرام ہو، اس کا انجام کیا ہوگا؟

صورت مسئولہ میں ہم آپ کے دوست کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے والد گرامی کو اچھے انداز سے رزق حرام کی سنگینی کے متعلق آگاہ کرتا رہے، اگر وہ شادی شدہ ہے تو کسی خاص حکمت عملی کو اختیار کرلے لیکن والدین کی خدمت اور حسن سلوک میں کمی نہ

---

[1] صحیح مسلم، المساقاۃ: ۱۵۸۴۔ [2] البقرۃ: ۲۷۸۔۲۷۹۔ [3] مسند احمد: ص۹۸، ج۲۔

آنے دے اور اگر شادی شدہ نہیں تو اپنے والد کے ساتھ ہی رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ وہ رزق حرام سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا فرمائے۔ (واللہ اعلم)

اسٹیٹ بینک میں ملازمت کرنا

سوال کیا اسٹیٹ بینک میں ملازمت کرنا بھی ایسے ہی ناجائز ہے جس طرح دیگر کمرشل بینکوں میں ناجائز ہے، وضاحت کریں۔

جواب ہمارے ہاں اسٹیٹ بینک حکومت پاکستان کے تحت ایک خود مختار ادارہ ہے جو اپنے لیے خود ہی قواعد وضوابط وضع کرتا ہے، حکومت کے تمام مالی معاملات کو کنٹرول کرنا اور ان کا حساب رکھنا اسی کے ذمے ہے۔ زرمبادلہ کے ذخائر بھی اس کے پاس ہوتے ہیں اور ملکی کرنسی جاری کرنا بھی اسی کے دائرہ اختیار میں ہے۔ یہی بینک قرضوں پر شرح سود کا اعلان کرتا ہے، دیگر تمام کمرشل بینک اس کی تعین کردہ شرح سود کے مطابق کام کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ نیز حکومتی معاملات چلانے کے لیے جو رقم درکار ہوتی ہیں وہ رقم بھی یہی اسٹیٹ بینک جاری کرتا ہے اور اس پر وہ سود بھی وصول کرتا ہے۔ بہر حال یہ بینک بھی سودی معاملات سے خالی نہیں بلکہ دوسرے بینکوں کے لیے سودی پالیسی یہی اسٹیٹ بینک وضع کرتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ سود کی لپیٹ میں درج ذیل قسم کے لوگ آتے ہیں۔

① سود دینے والا ② سود لینے والا ③ سود لکھنے والا ④ سودی معاملات میں گواہ بننے والا۔ یہ لوگ تو بلا واسطہ سود کی لپیٹ میں آتے ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، کھاتے بنانے والے اور سودی معاملات پر گواہ بننے والے، سب پر لعنت فرمائی ہے، نیز فرمایا کہ یہ سب لوگ گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ [1]

بینک میں کام کرنے والے کچھ لوگ بالواسطہ طور پر اس لعنت زدہ زندگی کی لپیٹ میں آتے ہیں مثلاً بینک کو سہولیات فراہم کرنے والے چوکیدار اور درجہ چہارم کے ملازمین وغیرہ۔ اس بنا پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک کے اس شعبہ میں ملازمت نہ کی جائے جو سودی کاروبار یا سودی پالیسی وضع کرنے سے متعلق ہے البتہ دیگر شعبہ جات مثلاً نوٹ چھاپنے کے شعبہ میں ملازمت کر لی جائے تو چنداں حرج نہیں۔ بہتر ہے کہ زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کر لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

اسلامی بینک میں ملازمت کرنا

سوال کیا کسی بھی اسلامی بینک میں کسی بھی نوعیت کی ملازمت کی جا سکتی ہے، اگر ملازمت اس شرط پر ہو کہ ملازم، بینک کے غیر شرعی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی قسم کا ناجائز ''پرافٹ'' لے گا تو کیا پھر بھی ناجائز ہے؟

جواب ہمارے رجحان کے مطابق کوئی بینک بھی سودی معاملات سے محفوظ نہیں خواہ وہ اپنے نام کے ساتھ ''اسلامی'' ہونے کا لیبل ہی کیوں نہ لگا لے۔ کیونکہ ہمارے ملک پاکستان میں جتنے بینک ہیں وہ حکومتی بینک (اسٹیٹ بینک) کے ماتحت

---

[1] مسلم، المساقاۃ:۴۰۹۳۔

ہوتے ہیں اور حکومتی بینک کے ساتھ انہیں روزانہ کاروبار اور لین دین کرنا پڑتا ہے نیز ذیلی بینک، حکومتی بینک کو بھاری رقم پُرکشش اور بھاری شرح سود پر فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومتی بینک کا تعلق ورلڈ بینک (عالمی بینک) سے ہوتا ہے، تمام حکومتی بینک، ورلڈ بینک کے ممبر اور اس کے ماتحت ہوتے ہیں اور اسے بھاری سرمایہ، بھاری شرح سود پر دیتے ہیں۔ اسی طرح ورلڈ بینک سے جو سود ملتا ہے وہ حکومتی بینک کی وساطت سے حصہ، رسدی کے طور پر پاکستان کے تمام ''اسلامی'' اور غیر اسلامی بینکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ بینک کے معاملات کی یہ مختصر وضاحت ہے، ایسے حالات میں کسی بھی نوعیت کی ملازمت کرنا جائز نہیں۔ خواہ ملازمت کے وقت یہ شرط ہی کیوں نہ کر لی جائے کہ ملازم بینک کے دیگر غیر شرعی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا اور نہ ہی اس سے کوئی ناجائز پرافٹ حاصل کرے گا۔

ایک مسلمان اس امر کا پابند ہے کہ وہ اس عالم رنگ و بو میں زندگی کے چند روز گزارنے کے لیے ایسی حلال، صاف ستھرے اور پاکیزہ کمائی استعمال کرنے کا اہتمام کرے جس پر کسی قسم کی حرام کاری کا داغ دھبہ لگا ہوا نہ ہو۔ شریعت نے ہمیں ایسی مشتبہ قسم کی چیزوں کے اردگرد گھومنے سے بھی منع کیا ہے جو بالآخر ایک مسلمان کو حرام اور ناجائز کھائی میں گرا دینے کا باعث ہوں۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''تم ایسی چیز کو اختیار کرو جس کے متعلق کسی قسم کے شک وشبہ کا داغ دھبہ نہ ہو اور جو چیز تمہیں شکوک وشبہات میں ڈال دے اسے چھوڑ دو۔'' [2]

ان احادیث کے پیش نظر ہمارا رجحان یہ ہے کہ بینک اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس میں ملازمت کرنے سے اجتناب کیا جائے کیونکہ یہ بینک سودی کاروبار سے محفوظ نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

بینک کی ATM مشین درست کرنا

سوال ایک شخص بینک میں کاروبار نہیں کرتا لیکن (ATM) مشین کے ٹیکنیکل نقص دور کرتا ہے اور اس پر اجرت وصول کرتا ہے، اس کام اور اس پر ملنے والے اجرت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب بینک اپنے صارفین کو بہت سی سہولیات فراہم کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک کارڈ کے ذریعے جب چاہے ATM مشین سے ایک خاص مقررہ حد تک بوقت ضرورت رقم حاصل کر سکتا ہے۔ اس مشین کے ذریعے رقم حاصل کرنا اگرچہ سودی کاروبار سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا تاہم بینک کا ایک حصہ ضرور ہے۔ اس معاملے میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ اس مشین کی خرابی دور کرنے میں چنداں حرج نہیں اور اس کی اجرت لینا بھی جائز ہے لیکن جو چیز باعث خلش ہے وہ یہ کہ مزدوری، سودی کاروبار سے حاصل ہونے والی رقم سے ہی ادا کی جائے گی جو حلال اور پاکیزہ نہیں۔ اس لیے تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کا ہنر پیشہ چھوڑ کر انسان کوئی دوسرا ہنر سیکھ لے اور اسے اپنا ذریعہ معاش بنا لے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو وہ اس کے رنج وغم سے نجات کے لیے کوئی صورت پیدا کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق

---

[1] بخاری، البیوع، ۲۰۵۱۔ [2] مسند امام احمد، ص ۱۳۵، ج۳۔

دے گا جہاں اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوگا۔'' ❶

بہر حال صورت مسئولہ میں ایسے کام پر اجرت لینا جائز ہے اور شرعاً اس کی گنجائش موجود ہے، اگرچہ بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

سونے کا ادھار کاروبار کرنا

سوال کیا سونے کا کاروبار ادھار میں کرنا جائز ہے، اس میں اگر کوئی شرعی قباحت ہے تو اس کی وضاحت کریں۔

جواب کاروبار کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ① اشیا کا باہمی تبادلہ ② قیمت ادا کر کے خرید وفروخت کرنا

اشیا کے باہمی تبادلہ کی مزید دو صورتیں حسب ذیل ہیں:

① ایک ہی جنس کی دو اشیا کا تبادلہ۔ اس کے جائز ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ دونوں برابر، برابر ہوں اور دوسری یہ کہ نقد بنقد سودا ہو۔ جیسا کہ حدیث میں ''سونا، سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے اور نمک نمک کے بدلے، یہ تمام اشیا برابر برابر اور نقد بنقد فروخت کی جائیں، جو زیادہ لے یا زیادہ دے تو اس نے سودی کاروبار کیا، سود لینے والے یا دینے والے دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ ❷

② مختلف اجناس کی دو اشیا کا تبادلہ۔ اس کے جائز ہونے کی شرط یہ ہے کہ نقد بنقد سودا ہونا چاہیے البتہ اس میں کمی بیشی جائز ہے۔ حدیث میں ہے: ''اگر اجناس مختلف ہوں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو مگر یہ سودا نقد بنقد ہونا چاہیے۔ ❸

سونے کا کاروبار اگر باہمی تبادلہ کی صورت میں ہے تو ناجائز ہے ہاں اگر نقدی کی صورت میں قیمت ادا کر کے خرید وفروخت کرتا ہے تو جائز ہے، جس طرح دوسری اشیاء میں ادھار ہو سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

نئے نوٹ لینے کے لیے زائد رقم دینا

سوال اسٹیٹ بینک کے ملازمین کرنسی کے نئے نوٹ تبدیل کرنے کے زائد پیسے لیتے ہیں، کیا شرعی طور پر ایسا کیا جا سکتا ہے؟

جواب ایک ملک کے کرنسی نوٹوں کا تبادلہ مساوات اور برابری کی بنیاد پر کرنا جائز ہے کیونکہ نئے اور پرانے نوٹوں کی حیثیت اور مالیت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر نئے نوٹوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کیا جائے تو ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے، شریعت نے اسے صریح سود قرار دیا ہے۔ مثلاً ۱۱۰ روپے کے عوض ۱۰۰ روپے کے نئے نوٹ لینا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ایک ہی جنس کے تبادلہ میں کمی بیشی کرنا ہے جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک ہی قسم کی کھجوروں کو دوسری قسم کی کھجوروں کے ساتھ اضافہ سے تبادلہ کرنا ناجائز ہے۔ ❹

بلکہ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اسے صریح سود قرار دیا ہے۔ ❺ چنانچہ جہاں مقدار کا اعتبار ہوتا ہے

---

❶ الطلاق:۲،۳۔ ❷ مسلم، المسا قاۃ:۱۵۸٤۔ ❸ مسلم المساقاۃ:۱۵۸۷۔
❹ بخاری، البیوع، ۲۲۰۳۔ ❺ بخاری، الو کالہ:۲۳۱۲۔

وہاں دیگر اوصاف (نئے اور پرانے ہونے) کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔لہٰذا ایک روپیہ کا سکہ یا نوٹ خواہ وہ کتنا ہی نیا اور چمکدار ہو اس کی قیمت ایک روپیہ ہی رہے گی۔اس طرح وہ سکہ یا نوٹ خواہ کتنا ہی پرانا اور میلا کچیلا ہو جائے اس کی قیمت بھی ایک روپیہ سے کم نہیں ہوگی حالانکہ دونوں کے اوصاف میں زمین و آسمان کا فرق ہے، بازاری اصطلاح میں بھی یہ فرق کالعدم ہو چکا ہے۔اس بنا پر اگر ایک روپیہ کو دو روپیہ کے عوض فروخت کیا جائے تو شرعاً ناجائز اور صریح سود ہوگا۔ہاں اگر نوٹ یا سکہ کی حیثیت ختم ہو جائے اور وہ بذات خود بحیثیت مادہ مقصود ہوں اور ان کی ظاہری قیمت کالعدم ہو جائے مثلاً ہمارے ہاں آج کل ایک روپیہ، دو روپیہ اور پانچ روپیہ کا نوٹ ختم ہو چکا ہے، اگر کوئی ان نوٹوں کو بطور یادگار خریدتا ہے اور زیادہ قیمت ادا کرتا ہے تو بظاہر اس قسم کی کمی بیشی کی گنجائش ہے۔اس طرح ہمارے ہاں سوراخ والا تانبے کا پیسہ بھی ختم ہو چکا ہے، اسی طرح تانبے کا روپے والا سکہ بھی ناپید ہے، اگر کوئی زرگر انہیں زیادہ قیمت ادا کر کے خریدتا ہے تاکہ سونا میں ملاوٹ یا ٹانکہ لگانے میں استعمال کرے تو شرعاً ایسا جائز ہے۔لیکن سدِ باب کے طور پر اسے بھی گریز کرنا چاہیے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نئے نوٹوں کے پانچ (۵۰۰) سو روپے والا بنڈل پانچ سو پچاس (۵۵۰) روپے میں فروخت کرنا یا اسے خریدنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔کیونکہ اس میں مساوی جنس کا تبادلہ مساوی جنس سے اضافہ کے ساتھ کیا جاتا ہے، احادیث میں اسے صریح سود سے تعبیر کیا گیا ہے۔(واللہ اعلم)

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے ہاں رائج کرنسی نوٹ پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ ’’بینک دولت پاکستان ایک ہزار روپیہ حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا۔‘‘ اس عبارت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ہزار روپے کا نوٹ ایک رسید ہے، اس کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں، اس کے متعلق وضاحت کریں کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، آیا یہ رسید ہے یا واقعی ہزار روپیہ ہے؟

جواب کاغذی نوٹ پر کئی ایک ادوار گزرے ہیں، پہلے اس کے پیچھے مکمل طور پر سونا ہوتا تھا پھر ایک وقت آیا کہ اس کے پیچھے مکمل طور پر تو سونا نہیں ہوتا تھا لیکن ایک مخصوص تعداد میں سونا ضرور ہوتا تھا، اس کے بعد کرنسی نوٹ کو ڈالر سے وابستہ کر دیا گیا اور ڈالر سونے سے وابستہ تھا۔۱۹۷۱ء کے بعد امریکہ نے بھی سونا دینے سے انکار کر دیا، اب ہمارے ہاں رائج کرنسی کے پیچھے کوئی چیز نہیں۔نوٹ پر لکھی ہوئی عبارت ’’حامل ہذا کو عند الطلب اتنے روپے ادا کیے جائیں گے‘‘ بے معنی اور بے حقیقت ہے۔اب یہ نوٹ محض آلہ تبادلہ کا کام دیتے ہیں، ایسی صورت حال کے پیش نظر اس کاغذی نوٹ کے متعلق حسب ذیل دو تشریحات کی جاتی ہیں:

① یہ نوٹ سند حوالہ اور ایک رسید کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو یہ نوٹ دیا جاتا ہے، اس کی یہ رقم جو نوٹ پر لکھی ہوتی ہے بینک دولت پاکستان کے ذمے ایک قرض ہے یعنی جو شخص ہزار روپے کے نوٹ کے ذریعے جو چیز خریدتا ہے وہ دوکاندار کو بینک پر حوالہ کرتا ہے کہ بینک کے ذمے جو میرا قرض ہے وہ اس نوٹ کی وساطت سے بینک سے وصول کرے۔اس کا

مطلب یہ ہے کہ یہ نوٹ خود مال نہیں بلکہ مال کی ایک رسید ہے۔

② دوسری رائے یہ ہے کہ کرنسی نوٹ کو زر اصطلاحی اور ثمن عرفی قرار دیا جائے یعنی اس کاغذی نوٹ کی اگرچہ ذاتی کوئی قدر و قیمت نہیں لیکن اصطلاحی طور پر اسے مخصوص مالیت کا آلہ تبادلہ قرار دے دیا گیا ہے۔ اب ان کاغذی نوٹوں کی باقاعدہ رسیدیں جاری کی جاتی ہیں مثلاً چیک اور ڈرافٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں جو ان کرنسی نوٹوں کی رسیدیں ہوتی ہیں۔ اب زکوۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلہ میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے، اب جو شخص نصاب کے بقدر ان نوٹوں کا مالک بن جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر زکوۃ واجب ہو جائے گی۔

ہمارا ذاتی رجحان اس دوسری رائے کی طرف ہے، چنانچہ احمد عبد الرحمن البنا الساعاتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک صحیح بات جس پر میں اللہ کے حضور جوابدہ ہوں وہ یہ ہے کہ زکوۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلہ میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے۔ اسی لیے لوگوں میں ان نوٹوں کا لین دین بالکل اسی طرح جاری ہے جس طرح سونے چاندی کا لین دین رائج ہے اور نوٹوں کے مالک کو اس کا بالکل اختیار ہے کہ جس طرح چاہے ان کو خرچ کرے اور ان کے ذریعے اپنی ضروریات کو پورا کرے۔ لہٰذا جو شخص نصاب کے مقدار ان نوٹوں کا مالک بن جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوۃ واجب ہو جائے گی۔'' [1]

جن حضرات نے انہیں سند حوالہ یا رسید قرار دیا ہے وہ ان کی پہلی حالت کے پیش نظر ہے، موجودہ صورت حال کے پیش نظر یہ رسید نہیں بلکہ ثمن عرفی کی حیثیت سے متعارف ہو چکے ہیں۔

ناچ گانے کی ویڈیو اور اس کا کاروبار

سوال ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر ناچ گانے کی فلم تیار کی جاتی ہے، اس طرح ویڈیو بنانے کا کاروبار کیا جاتا ہے، اس قسم کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب شادی بیاہ کے موقع پر عورتوں کا گانا بجانا اور ناچنا تھرکنا حرام اور ناجائز ہے پھر اس کی فلم یا ویڈیو تیار کرنا اس حرمت کو مزید سنگین کر دیتا ہے۔ اسے پیشے کے طور پر اختیار کرنا درج ذیل آیت کے پیش نظر ناجائز اور قابل نفرت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بلاشبہ جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔'' [2]

ناچ گانے کی عکس بندی کرنا بے حیائی اور فحاشی کو فروغ دینا ہے، ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ اس قسم کا کاروبار کرے جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی ہو۔ چنانچہ سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اس دوران ایک آدمی آیا اور عرض کرنے لگا: ''اے ابن عباس! ہاتھ کی فنکاری میرا ذریعہ معاش ہے اور اپنے ہاتھ سے تصویریں بنا کر فروخت کرتا ہوں۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں اس کے متعلق ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے بھی کوئی تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اسے اس وقت

---

[1] الفتح الربانی، ص ۲۵۱، ج ۸۔ [2] النور: ۱۹۔

تک عذاب میں مبتلا رکھے گا، جب تک وہ شخص بنائی ہوئی تصویر میں روح نہ ڈال دے اور وہ کبھی اس میں جان نہیں ڈال سکے گا۔''
یہ حدیث سن کر اس شخص پر کپکپی طاری ہوگئی اور اس کا رنگ فق ہو گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''اگر تم تصویریں بنانا ہی چاہتے ہو تو ان درختوں کی اور ہر چیز کی جس میں روح نہیں، بنا سکتے ہو۔'' [1]

اس حدیث کی بنا پر ہر وہ کاروبار ناجائز اور حرام ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر مبنی ہو۔ لہٰذا اس قسم کے کاروبار سے ایک مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

سود کی انواع

سوال اکثر کہا جاتا ہے کہ آج ہر شخص شعوری یا لاشعوری طور پر سودی معاملات میں ملوث ہے، براہ کرم ہمیں ایسے معاملات سے آگاہ کریں جو سود پر مبنی ہیں تاکہ ہم ان سے بچنے کی کوشش کریں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں حرص، طمع اور لالچ نے اس قدر جڑیں مضبوط کر رکھی ہیں کہ ہم باہمی لین دین کے معاملات میں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حالات کے متعلق ہی بطور پیشین گوئی فرمایا تھا: ''لوگوں پر ایسا وقت آنے والا ہے کہ انسان اپنی روزی کے متعلق حلال وحرام کی پروا نہیں کرے گا۔'' [2]

حرام کمائی کی ایک سنگین صورت سود کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''لوگوں پر وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ بلا دریغ سود کو استعمال کریں گے، عرض کیا گیا کہ آیا سب لوگ اس وبا میں مبتلا ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: ''جو سود نہیں کھائے گا، اسے سود کا غبار ضرور اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔'' [3]

اس حدیث کی روشنی میں جب ہم اپنے گرد وپیش کا جائزہ لیتے ہیں تو پوری دنیا کے لوگوں میں سود کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان پوری نیک نیتی کے ساتھ سود سے بچنا چاہے تو اسے کئی ایک مقامات پر الجھن پیش آتی ہے۔ مثلاً:

① سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں ملازمین کو ملنے والے جی پی فنڈ میں سود کا عنصر شامل ہوتا ہے۔

② کاروباری حضرات بینک سے تعلق رکھے بغیر اپنا مال برآمد یا درآمد نہیں کر سکتے جہاں سودی کاروبار کھلے عام ہوتا ہے۔

③ بینک کے شراکتی کھاتوں میں ''مارک اَپ'' کی حسین اصطلاح سود ہی کا متبادل نام ہے، نام تبدیل کرنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔

④ بینک کے چالو کھاتے میں رقم جمع کرانے پر بینک سے گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون کیا جاتا ہے کیونکہ بینک ہماری رقم کو استعمال ضرور کرتا ہے۔

⑤ ہمارے ہاں بیمہ کمپنیاں جو مختلف صورتوں میں تعاون پیش کرتی ہیں، اس میں سود، جوا اور دھوکہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے، آج کل اسے تکافل کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔

⑥ پرائز بانڈز پر ملنے والے انعامات بھی دراصل سود اور جوئے کے پرکشش نام ہیں، یہ کاروبار آج کل بہت عروج پر ہے۔

---

[1] صحیح البخاری: البیوع: ۲۲۲۵۔ [2] نسائی، البیوع: ۴۴۵۹۔ [3] مسند امام احمد ص ۴۹۴، ج ۲۔

⑦ مکانات کی تعمیر میں جو ہاؤس فنانس سکیم سے تعاون ملتا ہے اس پر کرایہ کے نام سے سود ہی وصول کیا جاتا ہے۔

الغرض سودی دھندا کرنے والے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں اور انھوں نے پھنسانے کے لیے ہم رنگ زمین جال بچھا رکھے ہیں، ان سے بچاؤ کی صورت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضروری ہے، ہمیں ان سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنا چاہیے۔

جانور کی پرورش اور منافع

سوال ایک آدمی کوئی جانور خرید کر دوسرے شخص کو دیتا ہے تاکہ وہ اس کی پرورش اور دیکھ بھال کرے کچھ عرصہ بعد اسے فروخت کر دیا جاتا ہے، قیمت خرید اصل مالک کو دے کر باقی رقم تقسیم کر لی جاتی ہے، کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب جواب سے قبل ایک اصول ملاحظہ کریں کہ عبادات میں اصل 'حرمت' ہے سوائے اس کے کہ ان کے بجالانے کا حکم شریعت میں آجائے جبکہ عادات و معاملات میں اصل 'حلت' ہے، الا یہ کہ اس کے متعلق کوئی امتناعی حکم شریعت میں آجائے۔

اس وضاحت کے بعد جب ہم سوال میں ذکر کردہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کا تعلق باہمی معاملات سے معلوم ہوتا ہے اور اس کے ناجائز یا حرام ہونے کے متعلق شریعت میں کوئی نص نہیں، لہٰذا ایسا کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، ہاں اگر اس دوران جانور مر جاتا ہے تو پہلے آدمی کی رقم اور دوسرے کی محنت رائیگاں جاتی ہے، اس پر مزید کوئی تاوان نہ لیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اسلام سے قبل لوگ کئی چیزوں کو استعمال کرتے اور کئی چیزوں کو ناپسند کرتے ہوئے چھوڑ دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتاب نازل کی، حلال کو حلال اور حرام کو حرام ٹھہرایا، تو جس چیز کو اس نے حلال کیا وہ حلال ہے اور جسے اس نے حرام ٹھہرایا وہ حرام ہے اور جس کے متعلق خاموشی اختیار کی وہ معاف ہے۔'' [1]

درج بالا اصول اور حدیث کے پیش نظر سوال میں ذکر کردہ معاملہ جائز ہے کیونکہ اس کے حرام یا ناجائز ہونے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی ایسی شرط ہے جس کے پیش نظر اسے حرام قرار دیا جائے۔ ہاں نقصان ہونے کی صورت میں پرورش اور دیکھ بھال کرنے والے پر کوئی جرمانہ یا تاوان نہ ڈالا جائے، اس کی محنت کے ضیاع کو ہی کافی خیال کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

کمیشن پر کام کرنا

سوال میں لوگوں کی اشیا اجرت لے کر فروخت کرتا ہوں، کیا شریعت میں اس طرح کا کاروبار جائز ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کمیشن پر مال فروخت کرنا جائز نہیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب طے شدہ اجرت پر کسی کا مال فروخت کرنا جائز ہے بشرطیکہ فریقین راضی ہوں اور کسی کے ساتھ دھوکہ، فراڈ اور کذب بیانی نہ کی جائے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''دلالی کی اجارت لینا'' [2]

---

[1] ابو داؤد، الاطعمہ: ۳۸۰۰۔ [2] صحیح بخاری، الاجارات، باب: ۱۴۔

نیز فرمایا کہ حضرت ابن سیرین، حضرت عطا بن ابی رباح، ابراہیم نخعی اور امام حسن بصری رحمہم اللہ دلالی پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ نیز ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ''دلالی'' ایک باقاعدہ ادارے کے طور پر موجود تھی، رسول اللہ ﷺ نے اسے ختم نہیں فرمایا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہم تاجروں کو ''سماسرہ'' یعنی دلال کہا جاتا تھا، ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس سے گزرے تو ہمیں اس سے بہتر نام سے یاد فرمایا: ''اے تاجروں کی جماعت!'' [1]

آپ نے دلالی کو ختم نہیں کیا بلکہ ان نقائص کی اصلاح فرمائی جو اس کاروبار میں موجود تھے، آپ نے فرمایا کہ کاروبار میں بہت سی باتیں بے جا اور لغو ہوتی ہیں نیز قسمیں بھی کھائی جاتی ہیں، اس کی تلافی صدقہ وخیرات سے کر دیا کرو۔ [2]

اس کے علاوہ شہروں میں بڑے پیمانے پر اشیائے صرف دور دراز علاقوں سے آتی ہیں اور مال کے ساتھ تاجر موجود نہیں ہوتا، اگر ہوتا بھی ہے تو وہ سارا مال خود نہیں بیچ سکتا یا مقامی تجارتی پارٹیوں کے قابل اعتبار ہونے یا نہ ہونے کے متعلق اسے علم نہیں ہوتا، ایسے حالات میں اُس کے لیے مقامی ایجنٹ حضرات کی خدمات انتہائی ضروری ہیں بصورت دیگر وہ اپنا مال منڈی میں نہیں بیچ سکے گا۔ اس لیے دلالی کے کاروبار کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے دلالوں کے کاروبار کو ختم کرنے کا حکم دیا۔ البتہ ایک حدیث سے اس کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شہری کو دیہاتی کے لیے خرید وفروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ کسی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی وضاحت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کے لیے دلال نہ بنے۔ [3]

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلالی کا کاروبار جائز نہیں لیکن ہمارے رجحان کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ شہر کے اردگرد اور آس پاس کے لوگ اگر اپنی اپنی زرعی پیداوار شہر میں بیچنے کے لیے لاتے ہیں تو ان کے درمیان مداخلت نہ کی جائے تاکہ وہ ان اشیا کی خرید وفروخت فطری طریقے سے جاری رکھیں اور فریقین کو اس سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ البتہ دوسرے علاقوں سے آنے والے شہری تاجر، ان ایجنٹ حضرات کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ناجائز دلالی کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر دھوکہ، فراڈ اور کذب بیانی والی دلالی ہو تو حرام اور ناجائز ہے اور اگر یہ برائیاں نہ ہوں بلکہ مفاد اور خیر خواہی مطلوب ہو نیز فریقین راضی ہوں تو جائز ہے بشرطیکہ اس کی شرح پہلے سے طے ہو اور اشیائے صرف سے دلال حضرات عمدہ مال اپنے لیے نہ رکھیں جیسا کہ آج کل منڈیوں میں ہوتا ہے۔

موسیقی اور گانے بجانے کے لیے ڈیک تیار کرنا

سوال ہمارا کاروبار ساؤنڈ سسٹم سے متعلق ہے، سپیکر وغیرہ تیار کر کے لوگوں کو فراہم کرتے ہیں، ہمارے پاس ایک گاہک آتا ہے وہ گانے بجانے اور موسیقی کے لیے ڈیک وغیرہ تیار کرنے کا آرڈر دیتا ہے، کیا ایسا کاروبار جائز ہے؟

---

[1] ابو داؤد، البیوع: ۳۳۲۶۔ [2] نسائی، الایمان: ۳۸۲۸۔ [3] بخاری، الاجارہ: ۲۲۷۴۔

جواب قرآن کریم میں ہے: ''جو کام نیکی اور تقویٰ پر مبنی ہیں، ان میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور جو کام گناہ اور زیادتی پر مشتمل ہیں، ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔'' [1] یہ آیت کریمہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے اور سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہمیں ایسے کاروبار نہیں کرنے چاہئیں جو گناہ اور اللہ کی نافرمانی پر مبنی ہیں۔

صورت مسئولہ میں سپیکر وغیرہ تیار کرنا ذاتی طور پر کوئی برا کام نہیں لیکن اگر کوئی دیدہ دانستہ طور پر کہتا ہے کہ مجھے موسیقی اور گانے بجانے میں سپیکر وغیرہ کو استعمال کرنا ہے تو ایسے شخص سے تعاون نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے اس کے آرڈر کے مطابق سامان تیار کر کے دینا چاہیے۔

شراب عموماً انگور، گنا، کھجور وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے حالانکہ یہ سب چیزیں بذات خود حلال ہیں، اگر یہ حلال چیزیں شراب کشید کرنے کے لیے استعمال کی جائیں گی تو اس حرام مقصد کے لیے ان کی خرید و فروخت بھی حرام ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی شراب نوشی یا کسی بھی دوسرے حرام کام کے لیے اپنی دکان کرایہ پر دیتا ہے یا انہیں جگہ مہیا کرتا ہے یا سودی کاروبار کے لیے مکان فراہم کرتا ہے تو وہ بھی برابر کا مجرم ہے اور **تعاونو علی الاثم و العدوان** کے ضمن میں آتا ہے۔ اس اصل کے مطابق ہر وہ بیع ناجائز اور حرام ہے جو کسی حرام یا غلط مقصد کے لیے کی جائے۔ چنانچہ ایک جگہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ و قتال کے ایام میں اسلحہ کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔ [2]

بہر حال ایسے غلط مقاصد کے لیے اشیا فراہم کرنا، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون کرنا ہے، اس لیے ایسے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر کوئی بتائے بغیر سودا لے جاتا ہے پھر اسے غلط استعمال کرتا ہے تو اس میں فروخت کنندہ کا کوئی گناہ نہیں۔ البتہ اسے علم ہے کہ میری فروخت کردہ چیز کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہے تو اسے اس کے متعلق غور و فکر کرنا چاہیے اور ایسے شخص کو اپنا تعاون پیش نہ کرے جو غلط کار اور دھوکے باز ہو۔ (واللہ اعلم)

---

[1] المائدہ: ۲۔ [2] بیہقی، ص ۳۲۷، ج ۵۔

وصیت و وراثت
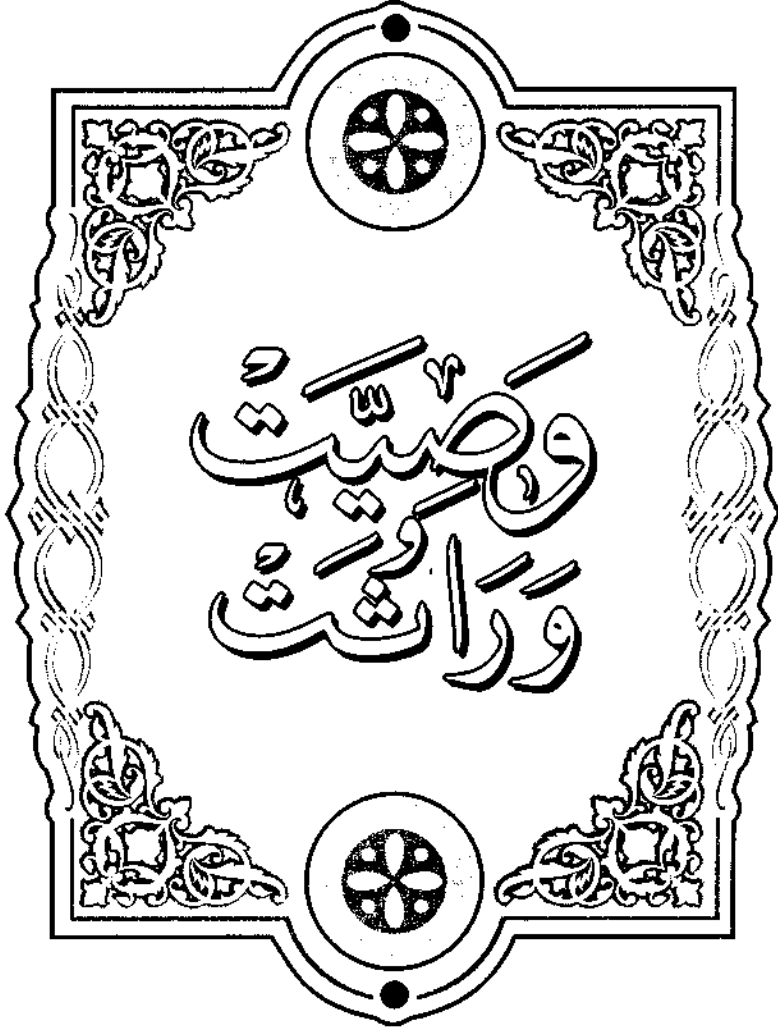
وصیت و وراثت

مسئلہ وراثت

سوال ایک عورت فوت ہوئی، پسماندگان میں سے خاوند، دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں، اس کا ترکہ ایک لاکھ روپے ہے، یہ ترکہ شرعی طور پر ورثا میں کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب جب انسان فوت ہوتا ہے تو سب سے پہلے کفن و دفن، قرض اور وصیت وغیرہ کے اخراجات نکالے جائیں، اگر کچھ بچ جائے تو اسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے، صورت مسئولہ میں خاوند کا چوتھا حصہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر ان بیویوں کی اولاد ہے تو چھوڑے ہوئے مال میں سے تمہارے لیے چوتھا حصہ ہے۔ [1]

خاوند کا حصہ نکال کر باقی ترکہ کو اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا جائے، سہولت کے پیش نظر کل ترکہ کو بارہ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ان میں سے تین حصے خاوند کو دو، دو حصے فی لڑکا اور ایک، ایک حصہ فی لڑکی تقسیم ہو گا۔ چونکہ کل ترکہ ایک لاکھ روپے ہے اس لیے اسے درج ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

خاوند -/25,000 (پچیس ہزار روپے) فی لڑکا 16666:66 (سولہ ہزار چھ صد چھیاسٹھ روپے چھیاسٹھ پیسے)

فی لڑکی 8333.33 (آٹھ ہزار تین صد تینتیس روپے تینتیس پیسے)

مسئلہ وراثت

سوال ایک عورت فوت ہوئی، پسماندگان میں خاوند، دو بھتیجے اور دو بھتیجیاں ہیں، اس کا ترکہ ایک لاکھ روپے ہے۔ ہر ایک وارث کو کیا ملے گا، قرآن و حدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب صورت مسئولہ میں میت کی اولاد نہیں ہے، اس لیے خاوند کو اس کے ترکہ سے نصف ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تمہاری بیویوں کی اگر اولاد نہ ہو تو ان کے ترکہ سے تمہارا نصف حصہ ہے۔'' [2]

خاوند کو حصہ دینے کے بعد جو باقی مال بچے اس کے حقدار اس کے دو بھتیجے ہیں، بھتیجیاں، اس کے ترکہ سے قطعاً محروم ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

---

[1] النساء: ۱۲۔ [2] النساء: ۱۲۔

''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کے لیے ہے۔'' [1] واضح رہے کہ بھتیجے اپنی بہنوں یعنی میت کی بھتیجیوں کو عصبہ نہیں بناتے، علم فرائض کی رو سے صرف چار حضرات اپنی بہنوں کو عصبہ بناتے ہیں، ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اپنی بہن کو عصبہ نہیں بنائے گا۔

① بیٹا، میت کی بیٹی کو عصبہ بناتا ہے۔ ② پوتا: میت کی پوتی کو عصبہ بناتا ہے۔ ③ حقیقی بھائی کی موجودگی میں میت کی حقیقی بہن عصبہ ہوگی۔ ④ میت کا پدری بھائی بھی میت کی پدری بہن کو عصبہ بنائے گا۔ میت کا بھتیجا خود عصبہ بن سکتا ہے لیکن وہ اپنی بہن یعنی میت کی بھتیجی کو عصبہ نہیں بنائے گا، اسی طرح چچا خود عصبہ بن سکتا ہے لیکن وہ اپنی بہن یعنی میت کی پھوپھی کو عصبہ نہیں بنائے گا، بنابریں صورت مسئولہ میں میت کے دونوں بھتیجے تو ترکہ سے حصہ لیں گے لیکن میت کی بھتیجیاں محروم ہوں گی، چونکہ کل ترکہ ایک لاکھ روپے صرف ہے اس لیے نصف یعنی پچاس ہزار خاوند کو ملیں گے اور باقی پچاس ہزار دونوں بھتیجے آپس میں پچیس پچیس ہزار لیں گے۔ (واللہ اعلم)

وراثت کا مسئلہ

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کی دو بیٹیاں اور ایک بہن ہے، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا، کیا بہن کو حصہ دیا جائے گا یا مقررہ حصہ بیٹیوں کو دینے کے بعد باقی ترکہ بھی ان بیٹیوں پر رد کر دیا جائے گا، قرآن و حدیث کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے۔

جواب بشرط صحت سوال کل ترکہ سے بیٹیوں کو دو تہائی دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زیادہ ہوں تو انہیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا۔'' [2] اس آیت کریمہ میں اگرچہ دو سے زیادہ لڑکیوں کا دو تہائی حصہ بیان ہوا ہے تاہم اگر دو لڑکیاں ہیں تو ان کے لیے بھی دو تہائی ہے، جیسا کہ اس آیت کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شہید ہو گئے اور ان کی دو لڑکیاں تھیں مگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مال پر ان کے ایک بھائی نے قبضہ کر لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں لڑکیوں کو اس آیت کے پیش نظر دو تہائی دلوایا تھا۔ [3]

علاوہ ازیں اس سورت کے آخر میں ہے کہ اگر مرنے والے کی وارث صرف دو بہنیں ہیں تو ان کے لیے کل مال سے دو تہائی ہے۔ [4] لہٰذا جب دو بہنیں دو تہائی مال کی وارث ہیں تو دو بیٹیاں بطریق اولیٰ دو تہائی کی وارث ہوں گی، بہرحال اگر میت کی دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو دونوں صورتوں میں انہیں دو تہائی دیا جاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں بیٹیوں کا مقررہ حصہ ۲/۳ نکال کر باقی ۱/۳ بہن کو دیا جائے گا کیونکہ بہن، بیٹیوں کے ہمراہ عصبہ مع الغیر ہوتی ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

بہنیں، بیٹیوں کے ہمراہ بطور عصبہ وراثت پاتی ہیں۔ [5] اس کے تحت انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے ایک بیٹی کو نصف، پوتی کو چھٹا حصہ اور باقی ماندہ ترکہ بہن کو دیا تھا۔ [6]

---

[1] صحیح البخاری، الفرائض: ٦٧٣٢۔ [2] النساء: ١١۔ [3] ابو داؤد، الفرائض، ٢٨٩٢۔
[4] النساء: ١٧٦۔ [5] صحیح بخاری، الفرائض، باب نمبر ١٢۔ [6] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٤٢۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شارح بخاری ابن بطال رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ بہنیں، بیٹیوں کے ہمراہ عصبہ بنتی ہیں۔اور بیٹیوں سے بچا ہوا ترکہ پاتی ہیں، اس بات میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے، البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف ہے کہ بہنیں محروم ہوں گی اور باقی ماندہ ترکہ بھی بیٹیوں پر رد کر دیا جائے گا لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف مرجوح ہے۔ [1] بہر حال مرحوم کی جائیداد کو تین حصوں میں تقسیم کرلیا جائے، دو حصے دونوں بیٹیوں کو اور ایک حصہ بہن کو بحیثیت عصبہ دے دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

سوال ایک آدمی کے تین وارث زندہ ہیں، بیوی، بیٹی اور پوتا۔اس نے ان کے حق میں وصیت نامہ لکھا ہے کہ میری کل جائیداد سے ۳۳ فیصد بیوی کو ۳۳ فیصد بیٹی کو اور ۴۴ فیصد پوتے ﷺ کو دے دیا جائے، کیا یہ وصیت جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب کسی انسان کو ورثا کی موجودگی میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ مال کی تقسیم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ضابطہ میراث نازل فرمایا ہے، مرنے کے بعد اس ضابطہ میراث کے مطابق اس کا مال تقسیم ہوگا۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔''اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ صدقہ کیا ہے کہ تم اپنے مال سے ایک تہائی کی وصیت کر سکتے ہو، تاکہ تمہارے نیک اعمال کے زیادہ ہونے کا باعث ہو۔'' [2]

اس حدیث کے پیش نظر انسان اپنے مال سے زیادہ سے زیادہ تیسرے حصہ تک وصیت کرسکتا ہے۔لیکن وہ وصیت بھی کسی غیر وارث کے لیے ہو۔اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے اب کسی وارث کے لیے کوئی وصیت جائز نہیں۔ [3] صورت مسئولہ میں دو غیر شرعی چیزیں ہیں، ایک تو اپنے تمام مال کی وصیت کی ہے جو کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔دوسرے شرعی ورثا کو وصیت کی گئی ہے جو مندرجہ بالا حدیث کی خلاف ورزی ہے۔ان دو غیر شرعی باتوں کی وجہ سے یہ وصیت کالعدم ہوگئی، اس کی اصلاح ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ ان کے ورثا کے درمیان صلح کروا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔'' [4]

چونکہ اس وصیت میں اپنے ورثا کے متعلق طرفداری اور حق تلفی کی گئی ہے لہذا اس کی اصلاح ضروری ہے، اس کی اصلاح یہ ہے کہ اسے کالعدم قرار دیا جائے اور مرنے کے بعد درج ذیل شرح کے مطابق اس کی جائیداد تقسیم ہوگی۔

① اولاد کی موجودگی میں اس کی بیوی کو کل جائیداد سے آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔

② اس کی بیٹی چونکہ ایک ہے اس لیے وہ اس کی جائیداد سے نصف کی حق دار ہوگی۔

③ پوتا عصبہ ہے لہذا ورثا سے جو مال بچے گا وہ پوتے کو مل جائے گا۔سہولت کے پیش نظر اس کی جائیداد کے کل چوبیس حصے

---

[1] فتح الباری، ص ۱۳، ج ۱۲۔
[2] ابن ماجہ، الوصایا:۲۷۰۹۔
[3] ترمذی، الوصایا:۲۱۱۲۔
[4] البقرہ ۱۸۲۔

ہوں گے، ان میں سے آٹھواں یعنی تین حصے بیوی کو، آدھا یعنی بارہ حصے بیٹی کو اور باقی نو حصے پوتے کو مل جائیں گے۔ یہ تقسیم اس صورت میں ہوگی جب صاحب جائیداد کی وفات کے وقت اس کے مذکورہ بالا ورثا زندہ ہوں، اگر کوئی رشتہ دار اس کی زندگی میں فوت ہوگیا تو وہ خود بخود اسکی جائیداد سے محروم ہوجائے گا۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

سوال میرے والد صاحب فوت ہوئے تو ان کے دو بیٹے زندہ تھے، اور ایک بیٹا ان کی زندگی میں فوت ہوگیا تھا، فوت ہونے والے بیٹے کے دو بیٹے یعنی مرحوم کے دو پوتے ہیں، میرے والد نے ان کے حق میں وصیت کی کہ انہیں کل جائیداد سے تیسرا حصہ دیا جائے، میری والدہ بھی زندہ ہے، مرحوم کی چوبیس بیگہ زمین شرعی طور پر کیسے تقسیم کی جائے، قرآن وسنت کی روشنی کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب بشرطِ صحت سوال صورت مسئولہ میں سب سے پہلے وصیت کا اجرا ہوگا جو مرحوم کی دو پوتوں کے لیے ہے، کیونکہ قرآن کریم کے مطابق تقسیم میراث سے پہلے قرض کی ادائیگی اور وصیت کا نفاذ ضروری ہوتا ہے، مرحوم کی چوبیس بیگہ زمین ہے اس کا تیسرا حصہ آٹھ بیگے مرحوم کے دونوں پوتوں کے لیے ہوں گی باقی سولہ بیگوں میں سے آٹھواں حصہ یعنی دو بیگے اس کی بیوہ کے لیے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر تمہاری اولاد ہے تو پھر ان بیویوں کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا۔''[1]

بیوہ کا حصہ نکالنے کے بعد جو باقی بچے گا وہ دو بیٹوں کو برابر تقسیم کردیا جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ والوں کو حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ داروں کو دیا جائے۔''[2] سات، سات بیگے دونوں بیٹوں کو مل جائیں گے۔ (واللہ اعلم)

بھتیجے کے لیے وصیت کرنا

سوال میرا ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں، میں صاحبِ جائیداد ہوں، یتیم بھتیجا میرے پاس رہتا ہے اور میری خدمت بھی کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی جائیداد میں سے ۱/۳ اس کے نام کردوں کہ میرے مرنے کے بعد وہ اس کا مالک ہوگا، کیا ایسا کرنا شرعی طور پر درست ہے؟

جواب میراث کے احکام نازل ہونے سے پہلے اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لے وصیت کرنا ضروری تھا، جیسا کہ سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۸۰ میں ہے، احکام مواریث کے نازل ہونے کے بعد یہ وصیت منسوخ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے اب ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے لہذا کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔''

البتہ ایسے رشتہ داروں کے لے وصیت کی جاسکتی ہے جو شرعی طور پر وارث نہ ہوں، اسی طرح راہ خیر میں خرچ کرنے کے لیے بھی وصیت کی جاسکتی ہے لیکن یہ وصیت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی جائیداد تک کی جاسکتی ہے، اس سے زیادہ کی وصیت ناجائز ہے

---

[1] النساء: ۱۲۔ [2] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٢۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ثلث کی وصیت کر سکتے ہو اور یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ [1]

صورت مسئولہ میں بھتیجا یتیم ہے اور اس کا باپ فوت ہو چکا ہے، دوسرے بہن بھائیوں کی موجودگی میں اس یتیم بھتیجے کو وراثت کے طور جائیداد سے کچھ نہیں ملتا، ایسے حالات میں اگر اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اسکے حق میں کل جائیداد سے ایک تہائی کی وصیت کر دی جائے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں بلکہ ایسا کرنے سے دوگنا ثواب ملنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کی بیوی، والد، چار بیٹے، تین بیٹیاں، ایک بہن اور دو بھائی زندہ ہیں، ان ورثا میں ترکہ کیسے تقسیم ہوگا، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب کفن ودفن کے اخراجات، قرض کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ کے بعد باقی ترکہ قابل تقسیم ہوتا ہے، بشرط صحت سوال مذکورہ صورت میں بیوہ کو آٹھواں حصہ دیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر ان بیویوں کو تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا۔'' [2] چونکہ میت کی اولاد ہے اس لیے باپ کو چھٹا حصہ دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے بشرطیکہ اس کی اولاد ہو۔'' [3]

میت کی بیوی اور والد کا حصہ نکالنے کے بعد جو باقی بچے گا وہ اس کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا ملے، حدیث میں ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کا حصہ نکال کر جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [4]

میت کے قریبی رشتہ دار اس کی اولاد ہے، اس لیے ان کی موجودگی میں بہن اور بھائی محروم قرار پائیں گے، بیٹے کے ساتھ بیٹیاں بھی ہیں، اس لیے انہیں بھی حصہ میں شریک کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔'' [5]

سہولت کے پیش نظر ترکہ کے چوبیس حصے کر لیے جائیں، ان میں آٹھواں یعنی تین حصے بیوہ کے لیے، چھٹا یعنی چار حصے والد کے لیے اور باقی سترہ حصے اس کی اولاد کے لیے ہیں، چونکہ سترہ حصے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں میں پورے تقسیم نہیں ہو سکتے اس لیے حصوں کو بڑھا دیا جائے تاکہ تقسیم پوری ہو جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک لڑکا دو لڑکیوں کے برابر ہے اس لیے 2X4 =8+3=11 حصوں کو چوبیس سے ضرب دینے پر 264 حصے بنتے ہیں، اب اس بنیادی ہندسہ (264) کو سامنے رکھتے ہوئے حصے تقسیم کر دیے جائیں، ایک لڑکے کو 34 ایک لڑکی کو 17، بیوہ کو 33 اور والد کو 44 حصے دیے جائیں۔ اب چار لڑکوں کے مجموعہ حصص 4X34=136، تین لڑکیوں کے مجموعی حصص 3X17=51، بیوہ کا حصہ 33، والد کا حصہ 44، انہیں جمع کرنے سے 264 بنیادی ہندسہ حاصل ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، الفرائض، ٦٧٧٣۔ [2] النساء: ١٢۔ [3] النساء: ١١۔
[4] بخاری، الفرائض: ٦٧٣٥۔ [5] النساء: ١١۔

مسئلہ وراثت

سوال ہمارے والد محترم دو سال قبل وفات پا گئے تھے، پسماندگان میں سے ہم چار بھائی، ایک بہن اور والدہ زندہ ہیں، ہمارے والد نے اپنی سمجھ کے مطابق ہم سب بہن بھائیوں اور والدہ کے نام پلاٹ یا مکان لگوا دیے تھے، وفات کے بعد ہم نے کوئی تقسیم نہیں کی، کاروبار بھی مشترکہ طور پر چلتا رہا، اب ہمیں کاروبار میں کافی نقصان ہوا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تقسیم کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد ہم اپنا کاروبار بھی تقسیم کر لیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں کہ کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

جواب سوال کا جواب دینے سے قبل ہم اس امر کی وضاحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ اپنی زندگی میں کوئی شخص بھی اپنی جائیداد بطور وراثت تقسیم کرنے کا مجاز نہیں ہے اور نہ کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے وراثتی حصے کا مطالبہ کر سکتا ہے کیونکہ وراثت کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان کی وفات ہو جائے اور حصہ لینے والا اس کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو، جو مورث کی وفات سے پہلے فوت ہو چکا ہے۔ اس کا وراثتی حصہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے، اس وضاحت کے بعد ہم اصل سوال پر غور کرتے ہیں، فوت ہونے والے بزرگ نے اپنی زندگی میں جو وراثتی حصے بصورت پلاٹ یا مکان اپنی اولاد یا بیوی کے نام لگوائے تھے وہ شرعاً ناجائز ہیں، وہ اپنی زندگی میں اولاد اور اپنی بیوی کی ضروریات کو پورا کرنے کے پابند تھے، اس سے آگے بڑھ کر بطور وراثت اولاد کے نام پلاٹ خریدنا یا بیوی کے نام مکان لگوانا اپنے اختیارات سے تجاوز کرنا ہے، اب اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ جو جو پلاٹ یا مکان کسی کے نام لگوائے گئے ہیں ان سب کو ایک کر دیا جائے اور کاروبار سے جو منافع حاصل ہوا ہے، اسے بھی اصل جائیداد میں شامل کر لیا جائے اور کاروبار میں جو نقصان ہوا ہے وہ بھی مشترکہ طور پر کاروبار پر تقسیم کر دیا جائے، اگر کاروباری قرضہ ہے تو وہ بھی اس چالو کاروبار سے ادا کیا جائے، باقی چالو کاروبار اور اس سے حاصل شدہ منافع کے بہتر (۷۲) حصے کر لے جائیں پھر ان سے آٹھواں حصہ (9=8/72) بیوہ کو دیا جائے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر مرنے والے کی اولاد ہے تو کل ترکہ سے بیویوں کو آٹھواں حصہ دیا جائے۔ [1]

ان بہتر حصوں سے نو حصے نکالنے کے بعد جو باقی تریسٹھ حصوں کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک لڑکے کو لڑکی کی نسبت دوگنا حصہ ملے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگنا دیا جائے۔ [2]

اس طرح لڑکی کو سات حصے اور ہر لڑکے کو چودہ، چودہ حصے دیے جائیں، حدیث میں ہے کہ مقررہ حصہ لینے والوں کا حصہ نکال کر باقی جائیداد میت کے قریبی رشتہ داروں کو دی جائے اور بیوی کا مقررہ حصہ نکالنے کے بعد قریبی رشتہ دار اس کی اولاد ہے، لہٰذا مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق اسے تقسیم کر لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

بہن کا بھائیوں کے برابر حصہ وصول کرنا

سوال والد کی وفات کے بعد بیٹی کا دعویٰ ہے کہ والد کی وصیت کے مطابق میں بھائیوں کے برابر حصہ لوں گی، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ جبکہ وصیت کا علم صرف بیٹی کو ہے۔

---

[1] النساء: ۱۲۔ [2] النساء: ۱۲۔

جواب قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہیں، تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔'' [1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ لڑکی کا حصہ لڑکے کے حصے سے نصف ہے، یہ عورت پر ظلم نہیں ہے کہ وصیت کے ذریعے اسے بھائیوں کے برابر کیا جائے بلکہ اسلام کا یہ قانون وراثت عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے کیونکہ اس نے عورت کو معاشی ذمہ داریوں سے فارغ رکھا ہے اور مرد کو اس کی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اس کے علاوہ عورت کے پاس مہر کی صورت میں مال آتا ہے جو ایک مرد ہی ادا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے عورت کے مقابلے میں مرد پر کئی گنا زیادہ مالی ذمہ داریاں ہیں، اس لیے اگر عورت کا حصہ نصف کے بجائے مرد کے برابر ہوتا تو یہ مرد پر ظلم و زیادتی کے مترادف تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔'' [2]

اس وضاحت کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ صورت مسئولہ میں والد کا بیٹی کو وصیت کرنا کہ وہ بھائیوں کے برابر لے، سراسر غلط اور بے انصافی ہے۔ اس قسم کی وصیت بے کار اور لغو ہے۔ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا بلکہ قرآن کریم کی صراحت کے مطابق ایک لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دو گنا دیا جائے گا۔ لڑکے چھوٹے ہوں یا بڑے، اسی طرح لڑکیاں چھوٹی ہوں یا بڑی، سب مذکورہ بالا اصول کے مطابق تقسیم کریں گے، حتی کہ ماں کے پیٹ میں زیر پرورش بچہ بھی وارث ہوگا۔ اس کا حصہ جائیداد سے الگ کر لیا جائے تاکہ پیدائش کے بعد اس کا حصہ اسے دیا جا سکے، بہر حال بیٹی کو بیٹوں کے برابر کسی صورت حصہ نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی اس قسم کی ظلم و زیادتی پر مبنی وصیت پر عمل کیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

وراثت کا ایک سوال

سوال میرا بھائی فوت ہوا ہے، پسماندگان میں سے بیوہ، ایک بیٹی، والدین اور ایک خود میں اس کا بھائی ہوں، اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی، کیا مجھے اس کے ترکہ سے کچھ ملے گا، واضح رہے کہ اس کے ذمہ کچھ قرضہ بھی ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہے کہ کسی کی وفات کے بعد اس کا ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے اس کے ذمے قرضہ ادا کیا جاتا ہے، قرآن کریم کا یہی حکم ہے، اس کے بعد اگر وصیت کی ہے تو ایک تہائی تک اسے پورا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وصیت کسی شرعی وارث کے نام اور غیر شرعی کام کے لیے نہ ہو، اس کے بعد جو باقی بچے اسے ورثاء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں پہلے مرحوم کے ذمے قرضہ کو اتارا جائے گا پھر باقی ماندہ ترکہ کے چوبیس حصے کیے جائیں، جن میں سے ۸/۱ یعنی تین حصے بیوہ کے لیے، نصف یعنی بارہ حصے بیٹی کے لیے ۶/۱ یعنی چار حصے باپ کے اور ۶/۱ چار حصے ہی ماں کے ہیں، باقی ایک حصہ بھی باپ کو بطور عصبہ دے دیا جائے، بھائی کو اس کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ میت کی اصل اور فرع کی موجودگی میں بھائی محروم ہوتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] النساء: ۱۱۔ [2] الکهف: ۴۹۔

تقسیم ترکہ کے دو مسائل

سوال قرآن وسنت کی روشنی میں درج ذیل صورتوں میں تقسیم ترکہ کیسے ہوگا؟ (الف) اگر ورثاء میں بیوی، والدین اور تین بھائی ہوں، (ب) اگر ورثاء میں خاوند، ماں، باپ، دو بھائی اور تین بہنیں ہوں؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ انسان کے فوت ہونے کے بعد سب سے پہلے اس کے ترکہ سے اس کی تجہیز وتکفین اور تدفین کی جائے، پھر قرضوں کی ادائیگی کا مرحلہ آتا ہے، اس کے بعد وصیت کے نفاذ کا درجہ ہے، بشرطیکہ وصیت کسی حصہ لینے والے وارث اور ناجائز کام کیلئے نہ ہو، اس کے علاوہ کسی صورت میں ۱/۳ سے زائد نہ ہو، ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ترکہ تقسیم کیا جاتا ہے، اس وضاحت کے بعد سوال میں ذکر کردہ صورتوں کے متعلق تقسیم ترکہ حسب ذیل طریقہ کے مطابق ہوگا۔

(الف) چونکہ مرحوم کی اولاد نہیں ہے اس لیے بیوی کو کل ترکہ سے ۱/۴ حصہ دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو بیویوں کو تمہارے ترکہ سے ۱/۴ ملتا ہے۔'' [1] ان دونوں کا حصہ نکال کر باقی باپ کو دیا جائے کیونکہ اس صورت میں اگرچہ بھائی بھی عصبہ ہیں لیکن باپ کا درجہ قریب تر ہے، اس لیے باپ کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہوں گے، اب بیوی کا 1/4 + ماں کا 1/6=5/12 باقی 7/12 باپ کا ہے، تفصیلی تقسیم اس طرح ہوگی:

بیوی: 1/4 ماں: 1/6 باپ: 7/12 تین بھائی محروم

سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے ۱۲ حصے کر لیے جائیں، ان میں ۳ بیوی کو ۲ ماں کو اور ۷ باپ کو دے دیے جائیں، اس صورت میں ۳ بھائی محروم ہیں، ان کو اپنے بھائی کے ترکہ سے کچھ نہیں ملے گا۔ (واللہ اعلم)

(ب) چونکہ مرحومہ کی اولاد نہیں ہے، اس لیے خاوند کو ۱/۲ دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر بیویوں کو اولاد نہیں ہے تو تمہیں ان کے ترکہ سے ۱/۲ دیا جائے گا۔'' [2] مرحومہ کے دو بھائی اور تین بہنیں موجود ہیں، ان کے ہوتے ہوئے ماں کا حصہ کم ہو کر ۱/۶ رہ جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کے متعدد بہن بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔'' [3]

لیکن بہن بھائی محروم ہوں گے البتہ وہ ماں کے حصے پر اثر انداز ہوں گے، پھر خاوند اور ماں کا حصہ نکال کر باقی ترکہ باپ کو دیا جائے گا کیونکہ اولاد کی عدم موجودگی میں وہ عصبہ بنتا ہے اور باقی ترکہ کا حقدار ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کی اولاد نہیں ہے تو اس کے ترکہ کے وارث اس کے والدین ہیں۔'' [4]

مرحومہ کے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں لیکن باپ کی موجودگی میں انہیں کچھ نہیں ملے گا۔

جیسا کہ سورۃ النساء آیت نمبر ۱۷۸ سے اشارہ ملتا ہے، اب خاوند کا حصہ 1/2 کا + ماں کا حصہ 1/6=2/3 باقی 1/3 باپ کا ہے، تفصیلی تقسیم اس طرح ہے۔ خاوند: 1/2 ماں: 1/6 باپ: 1/3

کل جائیداد کے ۶ حصے کر لیے جائیں ۳ خاوند کو، ایک ماں کو اور ۲ باپ کو دے دیے جائیں، بہن بھائی والدین کی موجودگی میں محروم ہیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] النساء: ۱۲۔ [2] النساء: ۱۲۔ [3] النساء: ۱۱۔ [4] النساء: ۱۱۔

مسئلہ وراثت

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کے تین بیٹے ہیں، ان میں سے ایک تیسری مخلوق سے تعلق رکھتا ہے یعنی وہ ہیجڑا ہے، اس کا ترکہ میں کیسے حصہ نکالا جائے، اس سلسلہ میں کتاب و سنت کی کیا ہدایات ہیں؟

جواب وراثت کے علم میں ہیجڑے کی وراثت کے متعلق مستقل طور پر عنوان باندھ کر لکھا گیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے: عربی زبان میں اسے خنثیٰ کہا جاتا ہے، اور اس کی تین اقسام ہیں۔

① خنثیٰ مذکر: جس میں مذکر کی علامات پائی جائیں، مثلاً داڑھی یا مونچھ کا نمودار ہونا، اس صورت میں اسے مذکر خیال کر کے مذکر کے احکام جاری کیے جائیں گے۔

② خنثیٰ مؤنث: جس میں مؤنث کی کوئی علامت پائی جائے۔ مثلاً چھاتی کا ابھرآنا وغیرہ، اس صورت میں سے مؤنث سے ملحق کیا جائے گا۔

③ خنثیٰ مشکل: جس میں تذکیر و تانیث کی کوئی علامت نہ پائی جائے یا دونوں علامتیں موجود ہوں، اس کی دو اقسام ہیں

(الف) ایسا بالغ خنثیٰ جس کا حال واضح ہونے کی امید نہ ہو، اسے غیر منتظر حال کہا جاتا ہے۔ جمہور اہل علم کے نزدیک ایسے خنثیٰ کو کم حصہ دیا جائے گا کیونکہ کم حصہ یقینی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ اسے مذکر اور ایک مرتبہ مؤنث تسلیم کر کے مسئلہ بنایا جائے، ان میں جو کم حصہ ہو وہ اسے دے دیا جائے۔ البتہ امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایسے خنثیٰ کو مذکر و مؤنث دونوں کا نصف، نصف حصہ دیا جائے گا۔

(ب) ایسا خنثیٰ جس کا حال واضح ہونے کی امید ہو مثلاً نابالغ خنثیٰ، اسے منتظر حال خنثیٰ کہا جاتا ہے۔ اس حالت میں اسے اور اس کے ساتھ والے ورثاء کو قلیل حصہ دیا جائے اور حالت واضح ہونے تک باقی ترکہ روک لیا جائے، جب حالت واضح ہو جائے تو باقی ماندہ ترکہ حسب حال تقسیم کر دیا جائے۔

صورت مسئولہ میں متوفی کے تین بیٹے ہیں جن میں سے ایک خنثیٰ ہے، مذکورہ بالا تینوں صورتوں کے مطابق اس مسئلہ کو حل کر لیا جائے، یا پھر اس کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے تاکہ ہم تفصیل کے ساتھ ان کے حصے بیان کر دیں۔

مسئلہ وراثت

سوال صابر بٹ نامی ایک شخص فوت ہوا، اس کی تین بیٹیاں اور تین بھتیجے موجود ہیں، اس کے ذمہ ایک لاکھ روپیہ کاروباری قرضہ ہے جبکہ اس کی جائیداد دس لاکھ کی مالیت رکھتی ہے، اس کی شرعی تقسیم کیسے ہو گی؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب میت کی مال میں سے پہلے کفن و دفن کے اخراجات منہا کیے جائیں پھر قرض کی ادائیگی ہونی چاہیے، اس کے بعد مال کی تہائی حصے سے وصیت پوری کی جائے بشرطیکہ کسی وارث کیلئے یا ناجائز کام کے لیے نہ ہو، پھر باقی ماندہ ترکہ کو ورثاء میں

تقسیم کیا جائے۔صورت مسئولہ میں میت کی جائیداد دس لاکھ ہے اور ایک لاکھ روپیہ اس کے ذمے قرضہ ہے،قرض کی ادائیگی کے بعد نو لاکھ روپیہ قابل تقسیم ہے،اس میں سے دو تہائی بیٹیوں کیلئے جو چھ لاکھ بنتا ہے،اس سے ہر بیٹی کو دو دو لاکھ روپیہ دیا جائے ،ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور اگر مونث اولاد دو سے زائد ہوں تو ان کیلئے اس کے ترکہ سے دو تہائی ہے۔'' [1]

اور باقی تین لاکھ اس کے تین بھتیجوں کیلئے ہے،ہر بھتیجے کو ایک ایک لاکھ روپیہ دیا جائے ،رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکہ میت کے مذکر قریبی رشتہ داروں کو دیا جائے۔'' [2]

حصص کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:

میت/۹ بیٹی:۲ بیٹی:۲ بیٹی:۲ بھتیجا:۱ بھتیجا:۱ بھتیجا:۱

پڑتال: دو لاکھ+ دو لاکھ+ دو لاکھ+ ایک لاکھ+ ایک لاکھ+ ایک لاکھ= نو لاکھ)(واللہ اعلم)

وراثت کا ایک مسئلہ

سوال ہمارے والد محترم فوت ہو گئے ہیں،پسماندگان میں ان کی بیوہ،تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں،مجموعی طور پر ان کا ترکہ چھتیس لاکھ کے لگ بھگ ہے،اس جائیداد کو مذکورہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔

جواب جب آدمی فوت ہوتا ہے تو ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے تین قسم کے حقوق کو ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

① اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین پر اٹھنے والے اخراجات اس کے ترکہ سے ادا کیے جائیں۔ ② اس کے ذمے جو مالی واجبات یعنی قرض وغیرہ ہو اسے ادا کیا جائے۔ ③ جائز حد تک اس کی جائز وصیت کو اس کے ترکہ سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ان حقوق کی ادائیگی کے بعد ترکہ تقسیم کرنا چاہیے۔صورت مسئولہ میں بیوہ کیلئے آٹھواں حصہ ہے کیونکہ مرحوم کی اولاد موجود ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اور اگر تمہاری اولاد ہے تو ان بیویوں کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا۔'' [3]

بیوہ کا حصہ نکالنے کے بعد جو باقی بچے وہ اس کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگنا ملے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اللہ تعالیٰ تمہیں،تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔'' [4]

بیوہ کا حصہ نکالنے کے بعد جو باقی بچے وہ اس کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگنا ملے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اللہ تعالیٰ تمہیں،تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔'' [5]

سہولت کے پیش نظر مذکورہ بالا حقوق کی ادائیگی کے بعد باقی ترکہ کے ۷۲ حصے کر لیے جائیں،ان میں سے آٹھواں حصہ یعنی نو حصے بیوہ کو پھر چودہ حصے ایک لڑکے کو اور سات حصے ایک لڑکی کو دیے جائیں،چونکہ قابل تقسیم ترکہ چھتیس لاکھ ہے۔اسے جب بہتر (۷۲) پر تقسیم کیا تو ایک حصہ پچاس ہزار بنتا ہے:لہٰذا اس کی تقسیم حسب ذیل ہوگی۔

---

[1] النساء: ۱۱۔ [2] صحیح البخاری، الفرائض: ۶۷۳۲۔ [3] النساء: ۱۲۔
[4] النساء: ۱۱۔ [5] النساء: ۱۱۔

بیوہ=-/9x50.000 ایک لڑکا-/14x50.000 = -/7.00.000 ایک لڑکی7x50.000 = -/3.50.000

پڑتال: بیوہ کا حصہ -/9x50.000 = -/4.50.000 ۳لڑکوں کا حصہ -/3x7.00.000 = -/21.00.000

۳لڑکیوں کا حصہ -/3x3.50.000 = -/10.50.000 میزان:-/36,00,000 چھتیس لاکھ روپیہ

بیٹیوں کو جہیز دینے کے بہانے وراثت سے محروم کرنا

سوال میرے دادا نے مرنے سے پہلے وصیت نامہ لکھا کہ میں نے اپنی بیٹیوں کو جہیز کی صورت میں ان کا حق دے دیا ہے، لہذا وہ میری جائیداد سے کچھ لینے کا حق نہیں رکھتیں، کیا ایسی وصیت پر عمل کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا اس کی اصلاح ہو سکتی ہے؟

جواب چند شرائط کے ساتھ بیٹیوں کو جہیز دینے میں کوئی حرج نہیں، محدثین نے با قاعدہ جہیز کے متعلق کتب حدیث میں عنوان بندی کی ہے، لیکن ہمارے ہاں یہ رسم رائج ہے کہ بیٹیوں کو جہیز دے کر انہیں جائیداد سے محروم کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سوال میں ذکر کردہ وصیت نامے سے معلوم ہوتا ہے ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں۔ دور جاہلیت میں بھی بیٹیوں کو جائیداد سے محروم کیا جاتا تھا لیکن وہ لوگ اس محرومی کو کسی اور سبب کے ساتھ مربوط کرتے تھے لیکن اس روشن خیالی کے دور میں بھی جہیز کی آڑ میں بیٹیوں، بہنوں کو جائیداد سے محروم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ماں، باپ اور خویش واقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی، خواہ وہ مال کم ہو یا زیادہ، اس میں ہر ایک حصہ مقرر کیا ہوا ہے۔''[1]

اسلام سے قبل ایک یہ بھی ظلم روا رکھا جاتا تھا کہ عورتوں اور چھوٹے بچوں کو وراثت سے حصہ نہیں دیا جاتا تھا اور صرف بڑے لڑکے جو میدان جنگ میں لڑنے کے قابل ہوتے، سارے مال کے وارث قرار پاتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کی طرح عورتوں اور چھوٹے بچوں کو بھی والدین اور رشتہ داروں کے مال میں حصے دار قرار دیا ہے۔ انہیں کسی صورت میں محروم نہیں کیا جائے گا۔ صورت مسئولہ میں بیٹیوں کو جہیز کی آڑ میں جہیز سے محروم کیا گیا ہے جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ ایسا وصیت نامہ قطعاً ناقابل عمل ہے، یہ وصیت نامہ کوئی پتھر کی لکیر نہیں کہ اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب داری یا طرفداری کا اندیشہ رکھے تو ان میں اصلاح کروا دے، ایسے حالات میں اس پر کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے۔''[2] اس آیت کے پیش نظر غلط وصیت نامے کی اصلاح ضروری ہے جس کی یہ صورت ہے کہ اس وصیت نامے سے اس شق کو حذف کر دیا جائے، اگر بزرگ فوت ہو جائے تو شریعت کے مطابق انہیں ان کا حصہ دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

ایک معاشرتی مسئلہ

سوال ایک آدمی دو بیٹوں کی شادی کر کے فوت ہو جاتا ہے، جبکہ باقی اولاد کے لیے اٹھنے والے اخراجات کی ضرورت

---

[1] النساء: ۷۔ [2] البقرۃ: ۱۸۲۔

ہوتی ہے۔ اب کیا باقی اولاد کی ضروریات واخراجات منہا کر کے اس کی جائیداد تقسیم کی جائے؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس مسئلہ کا کیا حل ہے، آخر باقی اولاد کی شادی وغیرہ کرنا پڑتی ہے، وہ اخراجات کہاں سے پورے کیے جائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسان ہے کہ وہ اسے صاحب اولاد کر دے، صاحب اولاد ہونے کے بعد انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی ضروریات کا خیال رکھے اور انہیں کسی صورت میں ضائع نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''انسان کو یہی گناہ کافی ہے کہ وہ جس کی کفالت کرتا ہے اسے ضائع کر دے۔'' [1]

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے پاس ایک دینار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے اپنے آپ پر خرچ کر، پھر عرض کیا، میرے پاس ایک دوسرا دینار بھی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے اپنے بچے پر خرچ کر۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو خصوصی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''اپنے اہل وعیال پر اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرتے رہو، ان کی تربیت کیلئے چھڑی تیار رکھو اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہو۔'' [3]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی اولاد کی ضروریات کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے، اس کے علاوہ ان میں عدل وانصاف کرنے کا بھی حکم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ سے ڈرو اور اپنے بچوں میں عدل کرو۔'' [4]

جس بچے کو جتنی ضرورت ہے اسے پورا کرنا باپ کا اولین فرض ہے۔ ضروریات کو پورا کرنے میں مساوات کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے۔ کیونکہ ایک بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کی ضروریات اور شیر خوار بچے کی ضروریات ایک جیسی نہیں ہیں، البتہ ضروریات کے علاوہ تحفے تحائف اور محبت وپیار میں عدل وانصاف اور مساوات رکھنا ضروری ہے۔ ہر باپ اپنی زندگی میں اولاد کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے، ان کے کھانے پینے، لباس اور رہنے سہنے کا بندوبست کرتا ہے، اسی طرح ان کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے، اولاد بھی جو کچھ کماتی ہے وہ باپ کے حوالے کر دیتی ہے۔ اسی طرح مل جل کر زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے لیکن جب والد فوت ہو جاتا ہے تو اس پر اولاد کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ترکہ تمام اولاد اور شرعی ورثا کا مال بن جاتا ہے۔ اس کے ترکہ سے انسان کی ذاتی ضروریات مثلاً کفن ودفن، قرض کی ادائیگی وغیرہ تو منہا کی جاسکتی ہے لیکن دوسری ضروریات کیلئے کچھ رقم الگ رکھ لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کے مرنے کے بعد بچوں پر اٹھنے والے اخراجات بھی منہا کرنا جائز نہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے کہ سربراہ خانہ کے فوت ہونے کے بعد اسکا ترکہ اس کی بیوہ اور بال بچوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے تقسیم کرنے کی نوبت نہیں آتی بلکہ مشترکہ طور پر تمام ضروریات پوری کی جاتی ہیں لیکن اگر کوئی وارث (بیٹا یا بیٹی) اپنا حصہ لینے کا تقاضا کرتا ہے تو اسے اس کا حصہ ضرور دینا چاہیے۔

صورت مسئولہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد جو بچے غیر شادی شدہ ہیں، ان کے اخراجات ترکہ سے

---

[1] ابو داؤد، الزکوۃ: ۱۶۹۲۔
[2] نسائی، الزکوۃ: ۲۵۳۶۔
[3] مسند امام احمد، ص ۲۳۹، ج۵۔
[4] صحیح البخاری، الھبۃ: ۲۵۸۷۔

منہا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں اور ایسا کرنا شرعاً جائز بھی نہیں۔ چنانچہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی، اپنی دو بچیوں کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ئی دونوں بچیاں سعد بن ربیع کی بیٹیاں ہیں اور ان کا باپ آپ کے ہمراہ غزوہ احد میں شہید ہوگیا ہے اور اس کے بھائی یعنی بیٹیوں کے چچا نے سعد کا سارا مال اپنے قبضہ میں لے لیا ہے جبکہ بیٹیوں کا نکاح مال کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا: اس کے متعلق اللہ ضرور کوئی فیصلہ کرے گا چنانچہ اس کے پس منظر میں آیت میراث نازل ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے ان کے چچا کی طرف پیغام بھیجا اور اسے فرمایا کہ سعد کی بیٹیوں کو ۲/۳، ان کی ماں کو ۱/۸ دو۔ اور جو باقی بچے وہ تیرا ہے۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹیوں کی شادی پر اخراجات ہوتے ہیں کیونکہ سعد کی بیوی نے کہا تھا کہ مال کے بغیر بچیوں کا نکاح نہیں ہوسکتا، چنانچہ ایک روایت میں ہے: سعد کی بیوی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مال کے بغیر عورت کا نکاح نہیں ہوتا۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کا انکار نہیں فرمایا، یہ نہیں کہا کہ شادی پر خرچ کرنے کی ضرورت نہیں اور تم فی سبیل اللہ کسی سے ان کا نکاح کردو، بلکہ آپ نے خاموش رہ کر اس کی تائید فرمائی۔

اس حدیث سے صورت مسئولہ کا حل بھی معلوم ہوا کہ بچوں کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات ترکہ سے منہا نہیں کیے جائیں گے بلکہ ان کا پورا حصہ نہیں دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بچے کو دودھ پلانے کے اخراجات باپ کے ذمے ڈالے ہیں، اس ضمن میں فرمایا: ''وارث پر بھی اس جیسی ذمہ داری ہے۔'' [3]

یعنی باپ کے فوت ہوجانے کے بعد اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری اس کے وارثوں کی ہے اور یہ بچہ بھی ان وارثوں میں سے ہے، اس لیے ترکہ سے اخراجات منہا نہیں کیے جائیں گے۔ لہذا باپ اپنی زندگی میں اولاد کے اخراجات برداشت کرنے کا پابند تھا، مرنے کے بعد دیگر شرعی پابندیوں کے ساتھ بچوں کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کی پابندی بھی اس سے اٹھالی گئی ہے، اس لیے تقدیر پر راضی رہتے ہوئے اس کے ترکہ کے ساتھ شریعت کے مطابق معاملہ کیا جائے، اس کے علاوہ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔ (واللہ اعلم)

وارث کے لیے وصیت کرنا

سوال میرے والد نے فوت ہونے سے قبل میرے بڑے بھائی کے لیے وصیت کی کہ رہائشی مکان اسے دیا جائے اور باقی جائیداد تمام بھائی تقسیم کرلیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب وصیت کے جائز ہونے کے لیے تین اصول حسب ذیل ہیں۔ ① وصیت ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ ② وصیت کسی ناجائز کام کے لیے نہ ہو۔ ③ وصیت کسی شرعی وارث کے لیے نہ ہو۔ صورت مسئولہ میں چونکہ وصیت بڑے بیٹے کے لیے ہے جو مرحوم کا وارث ہے لہذا یہ وصیت جائز نہیں، یہ کالعدم ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

---

[1] ترمذی، الفرائض: ۲۰۹۲۔ [2] ابن ماجه، الفرائض: ۲۷۲۰۔ [3] البقرة: ۲۳۳۔

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے لہٰذا کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں۔'' ❶

اس قسم کی ناجائز وصیت پر عمل کرنا شرعاً درست نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے جانبداری یا کسی کی حق تلفی کا خطرہ محسوس کرے اور وہ اس کی اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' ❷ ہمارے رجحان کے مطابق یہ وصیت ناجائز ہے اور اس پر عمل کرنا شرعاً درست نہیں۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

سوال ایک کرم الٰہی شخص غیر شادی شدہ فوت ہوا، اس کا کوئی حقیقی یا پدری بہن بھائی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے والدین زندہ ہیں، صرف ایک مادری بھائی موجود ہے۔ شرعی تقسیم کے وقت اس مادری بھائی کو مرحوم کے تمام ترکہ کا حقدار قرار دیا گیا، فوتیدگی کے چند ماہ بعد کچھ افراد نے دعویٰ کیا کہ وہ مرحوم کے دادا کے بھائی کے پوتے ہیں لہٰذا ہم بھی مرحوم کے ترکہ میں شریک ہیں ،لیکن وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت کیلئے کوئی گواہ وغیرہ نہ پیش کر سکے، عدالت نے فیصلہ دیا کہ ماں شریک بھائی کل ترکہ کا وارث ہوگا اور مدعیان، عدم ثبوت کی وجہ سے عصبہ رشتہ دار نہیں بن سکتے۔ اب مسئلہ درپیش یہ ہے کہ اگر ماں شریک بھائی عدالتی فیصلہ کے مطابق کل ترکہ لے لے تو اس پر دنیا و آخرت میں کوئی باز پرس تو نہیں ہوگی؟ اس کے متعلق آپ کی راہنمائی درکار ہے۔

جواب قرآن کریم میں مادری بہن بھائیوں کا حصہ بیان ہوا ہے کہ اگر ایک ہے تو کل جائیداد سے چھٹا حصہ اور متعدد ہیں تو سب ۱/۳ میں برابر کے شریک ہیں۔ ❸

چونکہ صورت مسئولہ میں مادری بھائی کے علاوہ اور کوئی رشتہ دار موجود نہیں، لہٰذا وہ میت کی تمام جائیداد کا حقدار ہوگا، لیکن فوتیدگی کے چند ماہ بعد کچھ افراد نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم میت کے دادا کے بھائی کے پوتے ہیں لہٰذا ہمیں بھی مرحوم کی جائیداد میں شریک کیا جائے، شریعت میں صرف دعویٰ کرنے سے کسی چیز کا حقدار قرار نہیں پاتا بلکہ اسے دعویٰ کے ثبوت کے لیے گواہ درکار ہوتے ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اگر لوگوں کو محض دعویٰ کی بنا پر چیز دے دی جائے تو لوگ دوسرے افراد کی جان و مال پر دعویٰ کر دیں۔ ❹

رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق مزید فرمایا: ''گواہی پیش کرنا مدعی کا فرض ہے اور مدعا علیہ کے ذمے قسم اٹھانا ہے۔'' ❺

صورت مسئولہ میں مدعیان اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے گواہی نہیں پیش کر سکے لہٰذا عدالت کا فیصلہ صحیح ہے لیکن مدعی کو یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جج کے فیصلہ کرنے سے حرام چیز حلال اور حلال چیز حرام نہیں ہو جاتی، اگر وہ جانتا ہے کہ مدعیان برحق ہیں اگرچہ وہ گواہ پیش نہیں کر سکے تو اس کیلئے مدعی کا حق لینا جائز نہیں جس کا جج اسے کا حق دار قرار دے چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان اس سلسلہ میں بہت واضح ہے کہ اگر میں کسی کے حق میں فیصلہ دے دوں جو اس کا نہیں تو وہ اسے نہ لے، میں اسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔ ❻ واللہ اعلم

---

❶ ابو داؤد، الوصایا: ۲۸۷۰۔ ❷ البقرۃ: ۱۸۲۔ ❸ النساء: ۱۲۔
❹ صحیح البخاری، التفسیر ۴۵۵۲۔ ❺ ترمذی، الاحکام ۱۳۴۱۔ ❻ ابن ماجہ، الاحکام، ۲۳۱۷۔

مسئلہ وراثت

سوال نھو کی وفات کے وقت اس کی بیوہ سائراں اور اس کے دادا سلطانی کے بھائی عبدالقادر کا بیٹا یوسف زندہ تھا، جبکہ یوسف کا ایک دوسرا بھائی رُلیا، نھو کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا، اب نھو کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی، نیز بتائیں کہ نھو کی جائیداد سے یوسف کو ملنے والا حصہ یوسف کی اولاد کو منتقل ہوگا یا اس کے بھائی رُلیا کی اولاد بھی اس میں حقدار ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں میت کے کفن و دفن پر اٹھنے والے اخراجات، قرض کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ کے بعد اس کی جائیداد سے جو کچھ بچے گا وہ قابل تقسیم ہوگا، سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ نھو مرحوم لاولد فوت ہوا ہے اور اس کے والدین بھی اس وقت زندہ نہ تھے لہذا بیوہ کو اس کی جائیداد سے چوتھا حصہ ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکہ سے تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ ہے۔'' [1]

بیوہ کو اس مقرر حصہ ۱/۴ دینے کے بعد باقی ۳/۴ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کیلئے ہے۔ صورت مسئولہ میں میت کا قریبی مذکر رشتہ دار مرحوم کے دادا سلطانی کے بھائی عبدالقادر کا بیٹا یوسف ہے، باقی ترکہ اسے دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کے بعد جو ترکہ باقی ہو وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کا ہے۔'' [2]

میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں میں یوسف ولد عبدالقادر کے علاوہ کوئی اور زندہ نہیں، لہذا بیوہ سائراں کو ۱/۴ دینے کے بعد باقی ۳/۴ کا حقدار یوسف ولد عبدالقادر ہے۔ یہ ماندہ حصہ یوسف کی وفات کے بعد اس کی اولاد کو منتقل ہوگا، رُلیا کی اولاد اس میں قطعاً حقدار نہیں کیونکہ رُلیا تو نھو مرحوم کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا، اس بنا پر وہ خود بخود نھو کی جائیداد سے محروم ہو گیا، جب وہ خود محروم ہے تو اس کی اولاد، اس کے ترکہ سے کیسے حقدار ہو سکتی ہے، بہرحال رُلیا کی اولاد کو اس ترکہ سے کچھ نہیں ملے گا۔ (واللہ اعلم)

ایک مسئلہ وراثت

سوال ایک شخص اپنے دادا مرحوم کی جائیداد سے ملنے والی وراثت کو صرف اپنے تصرف میں لاتا ہے، بہنوں کو اس سے محروم رکھتا ہے اور اسے صرف اپنی اولاد کے نام کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ مجوزہ اقدام شریعت کے مطابق ہے، وضاحت فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں محمد ایوب کا مجوزہ اقدام شریعت کے خلاف ہے کیونکہ اولاً کوئی بھی باپ اپنی زندگی میں وراثت کے طور پر اپنی جائیداد اپنی اولاد کو نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وراثت موت کے بعد بنتی ہے اور کسی کی موت کے وقت جو ورثا زندہ موجود ہوں وہ اس وراثت کے حقدار ہوتے ہیں۔ مذکورہ صورت میں اس بات کا قطعی علم نہیں کہ باپ کی وفات کے وقت اس کی اولاد میں سے کون کون زندہ تھا۔ ثانیاً متروکہ جائیداد میں اس کی ہمشیرگان بھی شریک ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔'' [3]

---

[1] النساء:۱۲۔ [2] صحیح البخاری، الفرائض، ۶۷۳۵۔ [3] النساء :۱۱۔

اس آیت کے پیش نظر محمد ایوب اپنے دادا کی متروکہ جائیداد کا اکیلا وارث نہیں بلکہ اس کی بہنیں بھی اس میں شریک ہیں۔ اسے اپنی ایک بہن کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملتا ہے۔ لہٰذا اپنی بہنوں کو مقررہ حصہ دے کر باقی جائیداد میں تصرف کرنے کا حق دار ہے وہ بھی شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے۔ اگر محمد ایوب اپنے دادا کی متروکہ جائیداد میں اپنی بہنوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنی اولاد کے نام کرنا چاہتا ہے تو اس کا یہ اقدام شریعت کے خلاف ہے، اسے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

وراثت کا ایک مسئلہ

سوال ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں بیوہ، والدین، دو بھائی اور تین بہنیں ہیں، اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں وصیت کے نفاذ اور قرض کی ادائیگی کے بعد مرحوم کی منقولہ جائیداد سے چوتھائی حصہ بیوہ کیلیے ہے کیونکہ خاوند کی اولاد موجود نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جو مال تم چھوڑ جاؤ اگر تمہاری اولاد نہیں تو بیویوں کا اس میں چوتھا حصہ ہے۔'' [1]

والدین یعنی ماں باپ دونوں کا چھٹا چھٹا حصہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور میت کے ماں باپ یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا متروکہ جائیداد میں چھٹا چھٹا حصہ ہے۔'' [2]

ان ورثاء کے مقررہ حصے دینے کے بعد جو باقی بچے وہ باپ کا ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کے بہن بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔'' [3]

اس صورت میں باپ کا حصہ مقرر نہیں بلکہ اسے بچا ہوا دیا جائے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے حصے دیے جائیں اور جو باقی بچے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ دار کا ہے۔'' [4]

مذکورہ صورت میں میت کا قریبی رشتہ دار باپ ہے، قرآن کریم کی صراحت کے مطابق میت کے بہن بھائی اس وقت وارث بنتے ہیں جب میت کی اصل یعنی باپ دادا اور نہ ہی اس کی فرع یعنی اولاد وغیرہ موجود ہو جیسا کہ سورۃ النساء آیت نمبر ۱۷۶ میں ہے، اس لیے بہن بھائی باپ کی موجودگی میں محروم ہیں۔ سہولت کے پیش نظر جائیداد کے بارہ حصے کر لیے جائیں، بیوہ کو تین، باپ کو دو اور ماں کو بھی دو، یہ سات حصے ہوئے اور باقی پانچ حصے باپ کو بحیثیت عصبہ کے دیے جائیں یعنی:

بیوہ (۳)   ماں (۲)   باپ (2+5=7)   دو بھائی (محروم)   تین بہنیں (محروم)   ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

وراثت کا ایک مسئلہ

سوال ایک آدمی ۱۹۷۷ء میں فوت ہوا، اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، ان میں سے ایک شادی شدہ بیٹی اپنے باپ کی وفات سے پہلے ۱۹۷۵ء میں فوت ہوگئی، اب اس کی اولاد اپنے نانا کی جائیداد سے حصہ مانگتے ہیں، کیا باپ سے پہلے فوت ہونے والی بیٹی کی اولاد کو اپنے نانا کی جائیداد سے حصہ ملے گا یا نہیں، اگر ملتا ہے تو کتنا حصہ دیا جائے؟

---

[1] النساء: ۱۲۔   [2] النساء: ۱۱۔   [3] النساء: ۱۲۔   [4] بخاری، الفرائض۔

جواب کسی کی جائیداد سے بطور وراثت حصہ لینے کی شرط یہ ہے کہ وہ مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو، اگر کوئی کسی کی وفات سے پہلے فوت ہو جاتا ہے تو وہ خود بخود جائیداد سے کٹ جاتا ہے اور اسے وراثت سے حصہ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے صورت مسئولہ میں فوت شدہ بیٹی کی اولاد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نانا کی زندگی میں فوت ہونے والی بیٹی جوان کی والدہ ہے کا حصہ طلب کریں، ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اور نواسے نواسی کی حیثیت سے بھی ان کا کوئی حصہ نہیں۔ کیونکہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور والے رشتہ دار محروم ہوتے ہیں، جیسا کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے محروم ہوتے ہیں، اسی طرح بیٹیوں کی موجودگی میں نواسے اور نواسیاں محروم ہوتی ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ’’پوتے کی میراث کا بیان جبکہ بیٹا زندہ نہ ہو۔‘‘ [1]

اس کے بعد امام بخاریؒ نے حضرت زید بن ثابتؓ کے ایک فتویٰ کا حوالہ دیا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا محروم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’مقررہ حصہ لینے والے حقداروں کو ان کا حصہ دو اور جو بچ جائے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کا ہے۔‘‘ [2]

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور والے رشتہ دار محروم ہوتے ہیں۔ اس بنا پر صورت مسئولہ میں مرحوم کے نواسے نواسیاں وراثت سے محروم قرار پاتے ہیں کیونکہ مرحوم کی اولاد موجود ہے اور وہ اپنی ماں کے حصہ کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ حصہ کا حقدار بننے سے قبل ہی وفات پا گئی تھیں۔ وراثت میں زندہ رشتہ دار شریک ہوتے ہیں، کسی کی زندگی میں وفات پانے والا کوئی بھی رشتہ دار اس کی جائیداد سے محروم رہتا ہے۔ (واللہ اعلم)

کلالہ کیا ہوتا ہے؟

سوال کلالہ کیا ہوتا ہے؟ ایک آدمی فوت ہوا ہے جس کے صرف باپ کی طرف سے بہن بھائی موجود ہیں اور کوئی رشتہ دار زندہ نہیں، اس کے ترکہ کی تقسیم کیسے ہوگی؟

جواب کلالہ وہ شخص ہے جس کے نہ والدین ہوں، نہ دادا اور نہ اولاد، نہ پوتے پوتیاں، خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت، وہ کلالہ ہے البتہ اس کے بہن بھائی ہو سکتے ہیں، کلالہ کے ترکہ کے متعلق دو باتوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جو حسب ذیل ہیں۔

① اگر کلالہ کے حقیقی بہن بھائی موجود ہیں اور سوتیلے بھی زندہ ہیں تو حقیقی بہن بھائیوں کی موجودگی میں سوتیلے بہن بھائی محروم ہوں گے اور اگر حقیقی نہ ہوں تو پھر سوتیلے بہن بھائیوں میں جائیداد تقسیم ہوگی۔

② کلالہ کے بہن بھائیوں میں تقسیم ترکہ کی بالکل وہی صورت ہوگی جو اولاد کی صورت میں ہوتی ہے یعنی اگر ایک بہن ہے تو اسے نصف ملے گا اور اگر دو یا دو سے زیادہ ہیں تو انہیں دو تہائی ملے گا اور اگر صرف ایک ہی بھائی ہو تو تمام ترکہ کا واحد وارث ہوگا اور اگر بہن بھائی ملے جلے ہوں تو ان میں سے ہر مرد کو ۲ حصے اور ہر عورت کو ۱ حصہ ملے گا، جیسا کہ درج ذیل کی آیت کریمہ میں اس کی تفصیل ہے:

---

[1] بخاری، الفرائض باب نمبر ۷۔ [2] بخاری، الفرائض، ۶۷۳۵۔

(ترجمہ): ''لوگ آپ سے کلالہ کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہیں؟ آپ ان سے کہہ دیں اللہ تمہیں اس کے متعلق یہ فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص لاولد مر جائے اور اس کی ایک ہی بہن ہو تو اسے ترکہ کا نصف ملے گا اور اگر کلالہ عورت ہو یعنی لاولد تو اس کا بھائی اس کا وارث ہوگا اور اگر بہنیں دو ہوں تو انہیں ترکہ سے دو تہائی ملے گا اور اگر کئی بہن بھائی یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔'' [1]

صورت مسئولہ میں جو آدمی فوت ہوا ہے وہ کلالہ ہے، اس کے صرف باپ کی طرف سے بہن بھائی زندہ ہیں اور کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہیں، اس صورت میں پدری بہن بھائی اس کی جائیداد کے وارث ہوں گے، ترکہ بایں طور پر تقسیم کیا جائے کہ بھائی کو بہن کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

وراثت کا مسئلہ

سوال ہمارے والد گرامی فوت ہو گئے ہیں، پسماندگان میں ایک بیٹا، ایک بیٹی اور ایک تیسری جنس سے ہے جس کے مذکر یا مؤنث ہونے کا پتہ نہیں چلتا، مرحوم کی بیس ایکڑ کی زمین کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب تیسری جنس کو عربی زبان میں خنثیٰ کہا جاتا ہے جسے ہم ہیجڑا کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ انسان ہے جس کا معاملہ مشتبہ ہو جائے اور اس کے مذکر یا مؤنث ہونے کا علم نہ ہو سکے۔ اس کی تین اقسام حسب ذیل ہیں۔

① خنثیٰ مذکر: جس میں مذکر کی کوئی علامت پائی جائے یعنی اس کی داڑھی یا مونچھیں اُگ آئیں۔

② خنثیٰ مؤنث: جس میں مؤنث کی کوئی نشانی نمودار ہو جائے یعنی اس کی چھاتی کا ابھار نمایاں ہو جائے۔

③ خنثیٰ مشکل: جس میں تذکیر و تانیث کی دونوں یا کوئی بھی علامت نہ پائی جائے۔

صورت مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ علامات کے ظہور تک انتظار کیا جائے پھر خنثیٰ مذکر کو، مذکر کے ساتھ اور خنثیٰ مؤنث کو مؤنث کے ساتھ لاحق کیا جائے۔ اگر دیگر ورثاء صورت حال واضح ہونے تک انتظار نہ کریں تو ایسے حالات میں خنثیٰ اور اس کے ساتھ والے ورثاء کو قلیل حصہ دیا جائے گا اور باقی صورت حال واضح ہونے تک روک لیا جائے گا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ خنثیٰ کو ایک مرتبہ مذکر اور دوسری مرتبہ مؤنث تسلیم کر کے الگ الگ مسئلہ بنایا جائے پھر دونوں مسئلوں میں سے ہر وارث کا قلیل حصہ اسے دیا جائے اور باقی محفوظ رکھا جائے۔ پیش آمدہ سوال میں بیس سے مسئلہ بنایا جائے گا پھر اس کی دو صورتیں حسب ذیل ہیں:

① خنثیٰ کو مذکر تسلیم کرنے کی صورت میں بیٹے کو آٹھ، بیٹی کو چار اور خنثیٰ کو آٹھ حصے دیے جائیں۔

② خنثیٰ کو مؤنث تسلیم کرنے کی صورت میں بیٹے کو دس، بیٹی کو پانچ اور خنثیٰ کو بھی پانچ حصے دیے جائیں۔ اس وضاحت کے پیش نظر ورثاء کے قلیل حصے درج ذیل ہیں۔

بیٹے کو آٹھ، بیٹی کو چار اور خنثیٰ کو پانچ حصے دیے جائیں، یہ کل سترہ حصے ہوئے باقی تین حصے صورت حال واضح ہونے تک محفوظ رکھے جائیں، پھر اگر اس میں مذکر کی علامات ظاہر ہوں تو محفوظ کردہ تین حصے اسے دیے جائیں گے گویا یہ بیٹا ہے اور اگر مؤنث کی

---

[1] النساء :۱۷۶۔

علامات نمایاں ہو جائیں تو محفوظ کردہ تین حصوں میں سے دو بیٹے کو اور ایک بیٹی کو دے دیا جائے گو یا یہ بیٹی ہے۔ اگر مستقبل میں بھی معاملہ مشتبہ رہے، یعنی اس میں تذکیر و تانیث کی کوئی علامت نہ پائی جائے یا دونوں کی علامتیں ظاہر ہو جائیں تو ایسی حالت میں جمہور اہل علم کے نزدیک ایسے خنثیٰ کو کم حصہ دیا جائے گا کیونکہ کم حصہ یقینی ہے۔ مرحوم کی بیس ایکڑ زمیں مذکورہ وضاحت کے مطابق تقسیم کر لی جائے۔ (واللہ اعلم)

ایک مسئلہ وراثت

سوال میرے والد محترم فوت ہوئے پسماندگان میں بیوہ، تین بیٹے اور دو بیٹیاں سوگوار چھوڑی ہیں، ان کا ترکہ دس مرلہ کا پلاٹ ہے، ہر ایک وارث کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ ہماری خواہش ہے کہ ہر ایک وارث کو اس کا حصہ دے دیا جائے۔

جواب بشرطِ صحت سوال صورت مسئولہ میں بیوہ کا آٹھواں حصہ اور باقی ترکہ بیٹے اور بیٹیوں میں اس طرح تقسیم ہو گا کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر ترکہ کو چونسٹھ (۶۴) حصوں میں تقسیم کر لیا جائے پھر ان سے آٹھ حصے بیوہ کو ۱۴۔۱۴ حصے فی لڑکا اور ۷۔۷ حصے فی لڑکی دے دیے جائیں: تفصیل یہ ہے

بیوہ: ۸ لڑکے: ۱۴x۳=۴۲ لڑکیاں ۷x۲=۱۴ میزان: ۶۴

واضح رہے کہ ترکہ میں منقولہ اور غیر منقولہ تمام جائیداد قابل تقسیم ہوتی ہے بشرطیکہ قرض کی ادائیگی اور وصیت کا نفاذ پہلے کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

بے اولاد بیوی کا حصہ

سوال ایک آدمی فوت ہوا جو صاحب اولاد ہے اور اسکی پہلی بیوی فوت شدہ ہے، اس کی دوسری بیوی موجود ہے جس کے بطن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی، اسے خاوند کے ترکہ سے کتنا حصہ ملے گا؟

جواب بیوی کو اپنے فوت ہونے والے شوہر سے حصہ ملنے کی دو صورتیں ہیں:

① اگر شوہر کی صلبی اولاد موجود ہے تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کے لیے آٹھواں حصہ ہے۔'' [1] بیوی خواہ ایک ہو یا متعدد، اس کے بطن سے اولاد ہو یا نہ ہو، خاوند کی اولاد کی موجودگی میں اسے آٹھواں حصہ ملتا ہے۔

② اگر شوہر کی حقیقی اولاد نہیں تو بیوی یا بیویوں کو چوتھا حصہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان بیویوں کے لیے چوتھا حصہ ہے اس ترکہ سے جو تم چھوڑ جاؤ بشرطیکہ تمہاری اولاد نہ ہو۔'' [2]

بیوی خواہ ایک ہو یا متعدد، اس کے بطن سے اولاد ہو یا نہ ہو، خاوند اگر لاولد فوت ہوا ہے تو وہ چوتھے حصے کی حقدار ہے۔ اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ بیوی سے اولاد ہوئی ہے یا نہیں بلکہ مرنے والے شوہر کی اولاد کا اعتبار ہوتا ہے، اگر وہ لاولد فوت ہوا ہے تو

---

[1] النساء:۱۲۔ [2] النساء:۱۲۔

بیوی یا بیویوں کو ترکہ سے چوتھا حصہ اولاد ہے تو انہیں آٹھواں حصہ دیا جاتا ہے۔ جب بیوی فوت ہو گی تو اس کے ترکے کی تقسیم کیلئے اس کی اولاد ہونے یا نہ ہونے کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

پاکستانی قانون اور یتیم پوتا

سوال اگر باپ سے پہلے بیٹا فوت ہو جائے تو دوسرے بیٹوں کی موجودگی میں اسلامی قانون کے مطابق باپ کے فوت ہونے کے بعد اس کے یتیم پوتے پوتیاں حصہ نہیں لے سکتے جبکہ پاکستانی قانون انہیں مرحوم بیٹے کی جگہ حصے دار بناتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی پاکستانی قانون کا سہارا لے کر حصہ وصول کرتا ہے تو شریعت کی خلاف ورزی کا گناہ کس کے سر ہو گا، وضاحت فرمائیں۔

جواب شریعت نے وراثت کے سلسلہ میں الاقرب فالاقرب کے قانون کو پسند کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو رشتہ دار میت کے قریب تر ہو گا اسے وارث بنایا جائے گا اور اس کے مقابلہ میں دور والے رشتہ دار کو محروم ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔﴿ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ﴾ [1]

''ہر ایک کے لیے ہم نے اس ترکہ کے وارث بنائے ہیں جسے والدین اور قریب تر رشتہ دار چھوڑ جائیں۔''

چونکہ بیٹا درجہ کے اعتبار سے پوتے کی نسبت قریب تر ہے، اس لیے پوتے کے مقابلہ میں بیٹا وارث ہو گا۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ترکہ کے مقررہ حصے، ان کے حقداروں کو دو پھر جو بچ جائے وہ میت کے سب سے زیادہ قریبی مذکر رشتہ دار کیلئے ہے۔'' [2]

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ مقررہ حصہ لینے والے کے بعد وہ رشتہ دار وارث ہو گا جو میت کے قریب تر ہو گا۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ پوتا، بیٹے کی موجودگی میں وارث نہیں ہو گا۔ اس پر امام بخاریؒ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''پوتے کی وراثت جبکہ بیٹا موجود نہ ہو'' [3]

اس قدر صراحت کے باوجود اگر کوئی ملکی قانون کا سہارا لے کر شرعی قانون کو پامال کرتا ہے تو اسے درج ذیل حدیث کو سامنے رکھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اگر میں (چرب زبانی سے متاثر ہو کر) ایک شخص کو کسی دوسرے مسلمان کا حق دینے کا فیصلہ کر دوں تو وہ آگ کا ٹکڑا ہے، اب اس کی مرضی ہے اسے لے لے یا چھوڑ دے۔'' [4]

ان احادیث کی روشنی میں پاکستانی قانون کا سہارا لے کر شریعت کی خلاف ورزی کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ (واللہ اعلم)

بیوی کے لیے وصیت

سوال ہمارا بڑا بھائی فوت ہوا، اس کا ایک مکان تھا جس کی مالیت تقریباً بارہ لاکھ روپے ہے، اس نے وصیت کی تھی کہ

---

[1] النساء:۳۳۔
[2] بخاری، الفرائض:٦٧٣٢۔
[3] صحیح بخاری، الفرائض۔
[4] بخاری، المظالم:٢٤٥٨۔

اس مکان میں سے نصف میری بیوہ کو دے دیا جائے، کیا یہ وصیت جائز ہے؟ نیز ہم تین بھائی اور دو بہنیں زندہ ہیں۔

جواب اسلام کے قوانین بتدریج پایہ تکمیل کو پہنچے ہیں، دور جاہلیت میں میت کا تمام مال اس کی بیوی اور اولاد بلکہ خاص بیٹوں کو ملتا تھا۔ والدین اور دیگر اقارب محروم رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کا قانون اتارا کہ اگر مرنے والا مال وغیرہ چھوڑ کر جا رہا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے والدین اور دیگر اقارب کے لیے وصیت کر کے جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جب تم میں سے کسی کی موت قریب آئے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لیے انصاف کے ساتھ وصیت کرے بشرطیکہ اس نے مال وغیرہ چھوڑا ہو۔ [1]

اس وقت وصیت کرنا فرض تھا، لیکن اس وصیت کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچا دیتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء میں آیت میراث نازل فرمائی اور اس کے ذریعے تمام ورثا کا حصہ متعین کر دیا۔ اس آیت کے ذریعے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا گیا اور وارث کے حق میں وصیت کو منسوخ کر دیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر اعلان فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے، اب وصیت کے ذریعے کسی وارث کو کچھ بھی نہیں دیا جا سکے گا۔'' [2]

البتہ جن ورثا کو اس کی جائیداد سے حصہ نہیں ملتا ان کے حق میں جائز طور پر وصیت کی جا سکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں اللہ تعالیٰ نے خاوند کی جائیداد سے بیوی کا حصہ دیا ہے لہٰذا اس کے لیے وصیت کے ذریعے کوئی مال دینا ناجائز ہے۔ اس بنا پر مرنے والے نے جو بیوی کے متعلق وصیت کی ہے وہ کالعدم ہے۔ اب اسے بارہ لاکھ میں سے چوتھا حصہ تین لاکھ ملیں گے کیونکہ مرنے والا اس کا خاوند لا ولد ہے باقی نو لاکھ روپیہ تین بھائیوں اور دو بہنوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر نو لاکھ روپے کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ ایک لاکھ بارہ ہزار پانچ صد روپیہ ہے جو میت کی ایک بہن کو ملے گا اور اس کا دوگنا دو لاکھ پچیس ہزار روپیہ ایک بھائی کو دے دیا جائے۔ بیوی کو اس کے حصے کے علاوہ وصیت کے ذریعے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ اس کے حق میں وصیت کالعدم ہے۔

حق وراثت

سوال خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق دی، بیوی ابھی دوران عدت تھی کہ خاوند وفات پا گیا، کیا اس بیوی کو خاوند کی جائیداد سے حصہ ملے گا، نیز کتنا حصہ دیا جائے گا کیونکہ بیوی کی اولاد نہیں جبکہ خاوند کی دوسری بیوی سے اولاد موجود ہے کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب اس کا جواب دینے سے قبل دو بنیادی باتیں حسب ذیل ہیں:

① اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو پہلی یا دوسری طلاق دیتا ہے تو عدت کے ختم ہونے تک وہ اس کی بیوی ہی رہتی ہے۔ عدت کے ختم ہوتے ہی رشتہ ازدواج ختم ہو جاتا ہے، محض طلاق دینے سے میاں بیوی کا تعلق ختم نہیں ہوتا۔

② میاں بیوی کی وراثت کے سلسلہ میں ہونے والے کی اولاد کو دیکھا جاتا ہے، اولاد ہونے کی صورت میں حصہ کم اور اولاد نہ

---

[1] البقرہ: ۱۸۱۔ [2] ترمذی، الوصایا: ۲۱۲۰۔

ہونے کی صورت میں حصہ زیادہ ملتا ہے، نیز بیوی ایک ہو یا زیادہ اپنا مقررہ حصہ ہی پاتی ہیں، زیادہ ہونے کی صورت میں اپنا مقررہ حصہ باہم تقسیم کر لیتی ہیں۔ اب موجودہ سوال کا جواب حسب ذیل ہے:

خاوند نے بیوی کو طلاق دی اور وہ اس وقت فوت ہوا جب کہ اس کی بیوی طلاق کے بعد دوران عدت تھی، لہٰذا وفات کے وقت وہ اس کی بیوی تھی کیونکہ اختتام عدت تک نکاح برقرار رہتا ہے۔ اس صورت میں اسے اپنے خاوند کی جائیداد سے حصہ ملے گا، چونکہ فوت ہونے والے خاوند کی اولاد موجود ہے اگرچہ دوسری بیوی سے ہے، اس لیے اولاد ہونے کی صورت میں ایک بیوی یا زیادہ بیویوں کو آٹھواں حصہ دیا جاتا ہے لہٰذا دونوں بیویوں کو آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔ پھر یہ دونوں بیویاں آٹھواں حصہ ہی تقسیم کریں گی اور باقی سات حصے اس کی اولاد کے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو اور صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔'' [1]

خاوند کی طرف سے ملنے والا آٹھواں حصہ دونوں بیویوں کے درمیان برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

دو بیویوں سے خاوند کا حصہ

سوال میری دو بیویاں تھیں جو کسی حادثہ میں فوت ہو گئی ہیں، ان میں سے ایک صاحب اولاد اور دوسری لاولد فوت ہوئی ہے، مجھے ان کے ترکہ سے کتنا حصہ ملے گا، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ حقداروں کے حصے متعین کیے ہیں۔ بیوی خاوند کے حصوں کی تفصیل بھی بیان کی ہے کہ خاوند اگر لاولد فوت ہوا ہے تو بیوی یا بیویوں کو چوتھا حصہ اور اگر خاوند صاحب اولاد تھا تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ اسی طرح اگر بیوی لاولد ہو تو خاوند کو نصف اور اگر بیوی صاحب اولاد ہے تو خاوند کو چوتھا حصہ ملتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور تمہیں آدھا مال ملے گا جو تمہاری بیویاں چھوڑ مریں بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہے تو تمہیں ان کے ترکہ سے چوتھا حصہ ملے گا۔۔۔۔ اور بیویوں کو چوتھا حصہ ملے گا جو تم چھوڑ مرو بشرطیکہ تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہے تو انہیں تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا۔'' [2]

صورت مسئولہ میں جو بیوی لاولد فوت ہوئی ہے خاوند کو اس کے ترکہ سے نصف ملے گا اور جو بیوی صاحب اولاد ہے خاوند کو اس کے ترکہ سے چوتھا حصہ ملے گا اور باقی تین حصے اس کی اولاد کے لیے ہیں، جیسا کہ مذکورہ قرآنی آیات میں اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] النساء:۱۲۔ [2] النساء:۱۲۔

بھتیجی کا حصہ

سوال ایک آدمی لاولد فوت ہوا، اس کا کوئی رشتہ دار موجود نہیں، صرف دو بھتیجے اور ایک بھتیجی زندہ ہے کیا اس کی جائیداد سے بھتیجے اور بھتیجی دونوں وارث ہوں گے یا صرف بھتیجوں کو حصہ دیا جائے گا؟

جواب مرنے والے کا ترکہ جب حسب ذیل تین مراحل طے کرے گا تو پھر زندہ ورثا میں تقسیم ہوگا۔ وہ مراحل بالترتیب حسب ذیل ہیں:

① کفن ودفن: اگر کسی میت کے کفن ودفن کا انتظام کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کے ترکہ سے مناسب انداز میں کفن ودفن کا انتظام کیا جائے گا۔

② ادائیگی قرض: کفن ودفن کے اخراجات کے بعد میت کے ذمے جو قرض ہو اسے ادا کیا جائے گا خواہ ادائیگی میں تمام ترکہ صرف ہو جائے۔

③ نفاذ وصیت: ادائیگی قرض کے بعد میت کے باقی ماندہ ترکہ سے میت کی جائز وصیت کو پورا کیا جائے گا۔ جائز وصیت کے لیے ضروری ہے کہ وصیت، ترکہ کے ایک تہائی سے زائد نہ ہو اور شرعی ورثا کے حق میں وصیت نہ ہو نیز کسی حرام کام کی وصیت نہ کی جائے۔

مذکورہ بالا تین مراحل طے کرنے کے بعد باقی ماندہ ترکہ ورثا میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، پہلے ان ورثا کو دیا جائے جن کے حصے طے شدہ ہیں، پھر عصبات کو دیا جائے، ان کی عدم موجودگی میں ذوالارحام وارث ہوں گے۔

صورت مسئولہ میں میت کا کوئی رشتہ دار موجود نہیں جو ترکہ سے مقررہ حصہ لیتا ہو، صرف عصبات موجود ہیں، انہیں میت کا تمام ترکہ دیا جائے گا۔ عصبات میں سے صرف دو بھتیجے اس کی جائیداد کے حقدار ہوں گے، ان کے ساتھ ان کی بہن یعنی میت کی بھتیجی حقدار نہیں ہوگی کیونکہ علم فرائض میں یہ بات طے شدہ ہے کہ صرف چار آدمی اپنی بہنوں کو عصبہ بناتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① بیٹا، اپنی بہنوں کو عصبہ بنائے گا۔ ② پوتا بھی اپنی بہن یعنی میت کی پوتی کو عصبہ بنائے گا۔ ③ حقیقی بھائی کی موجودگی میں حقیقی بہن عصبہ بنتی ہے۔ ④ پدری بھائی کے ساتھ اس کی پدری بہن عصبہ بنے گی۔ ان کے علاوہ کوئی رشتہ دار اپنی بہنوں کو عصبہ نہیں بناتا۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں صرف دو بھتیجے وارث ہوں گے، بھتیجی محروم رہے گی۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

سوال ہمارے والد فوت ہوئے تو اس وقت ہم دو بھائی اور چار بہنیں زندہ تھے، انھوں نے وصیت کی تھی کہ بڑے لڑکے نے میری خدمت کی ہے لہٰذا رہائشی مکان اسے دیا جائے اور باقی جائیداد تقسیم کر لی جائے، کیا ایسا کرنا جائز ہے نیز بتائیں کہ جائیداد کس طرح تقسیم کی جائے گی؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اولاد میں جائیداد کی تقسیم کا اصول بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے۔'' [1]

شریعت نے وصیت کے متعلق بھی ایک ضابطہ بنایا ہے، اس کے مطابق جس رشتہ دار کو جائیداد سے حصہ ملتا ہے اس کے حق میں وصیت نا جائز ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، اس لیے اب وارث کے لیے وصیت نہیں ہو گی۔ [2]

اس حدیث کی بنا پر باپ کی ایک بیٹے کے نام اس کی خدمت کے صلہ میں وصیت کرنا نا جائز اور باطل ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا بھی درست نہیں ہے، ہاں اگر تمام بیٹے بیٹیاں اس پر رضامندی اور موافقت کا اظہار کر دیں تو پھر کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وصیت کردہ مکان کل جائیداد کے ایک تہائی سے زیادہ مالیت کا نہ ہو۔ لیکن اگر شرعی ورثا اس پر راضی نہ ہوں تو بیٹے سے وہ مکان واپس لے کر متروکہ جائیداد میں شامل کیا جائے پھر وہ جائیداد اللہ تعالیٰ کے مقررہ اصولوں کے مطابق دو بیٹوں اور چار بیٹیوں میں تقسیم کی جائے گی، اگر سوال میں ذکر کردہ ورثاء دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہی ہیں تو جائیداد اس طرح تقسیم کی جائے کہ ایک بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دی جائے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مذکر کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے۔'' [3]

سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں، دو دو حصے فی لڑکا اور ایک ایک حصہ فی لڑکی تقسیم کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ وراثت

سوال میرے والد گرامی فوت ہوئے، پسماندگان میں بیوہ، تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، ان کا ترکہ دس مرلہ کا ایک مکان ہے، ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا، کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ سب سے پہلے میت کے ترکہ میں سے اس کے کفن و دفن کے اخراجات نکالے جائیں پھر اس کے ذمے جو قرض ہے وہ اتارا جائے اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس کی وصیت کو پورا کیا جائے، اس کے بعد جو مال بچے اسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ صورت مسئولہ میں میت کے ترکہ سے بیوہ کا آٹھواں حصہ ہے کیونکہ میت صاحب اولاد ہے اور بیوہ کا حصہ دینے کے بعد باقی ۸/۷ ترکہ اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو ایک لڑکی سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے چونسٹھ حصے کیے جائیں اور بیوہ کو آٹھ حصے، ہر لڑکے کو چودہ اور ہر لڑکی کو سات، سات حصے دیے جائیں۔ درج ذیل صورت میں مکان کی مالیت کو تقسیم کر لیا جائے۔

بیوہ: ۸ لڑکا: ۱۴ لڑکا: ۱۴ لڑکا: ۱۴ لڑکی: ۷ لڑکی: ۷ کل: ۶۴

---

[1] النساء: ۱۱۔ [2] ابو داؤد، الفرائض: ۲۸۷۰۔ [3] النساء: ۱۱۔

وراثت کا ایک مسئلہ

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس نے بائیس لاکھ روپیہ کی جائیداد چھوڑی ہے، پسماندگان میں والدہ، دو بیویاں، چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا، کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ والدہ کو چھٹا حصہ ملتا ہے کیونکہ میت کی اولاد موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔'' ❶

دونوں بیویاں ترکہ سے آٹھویں حصہ میں شریک ہوں گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''خاوند کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بیویوں کا آٹھواں حصہ ہوگا۔'' ❷

مقررہ حصے دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کی اولاد کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دو اور جو باقی بچے وہ میت کے مذکر رشتہ داروں کا ہے۔'' ❸ پھر باقی ترکہ کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دُگنا حصہ ملے۔ قرآن میں ہے: ''تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔'' ❹ سہولت کے پیش نظر ترکہ کے چوبیس حصے کیے جائیں پھر ان سے چار حصے والدہ کو، تین حصے بیوگان کو اور باقی سترہ حصے اولاد کے ہیں۔ تقسیم کے لیے مندرجہ ذیل صورت ہوگی۔

والدہ	(بیوی، بیوی)	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی	ٹوٹل
۲۴/۴	۱۷/۱۳۲	۱۷/۱۳۲	۱۷/۱۳۲	۱۷/۱۳۲	۱۷/۱۳۲	۱۷/۲۶۴	۱۷/۲۶۴	۱۷/۲۶۴	۲۶۴
۴۴	(۳۳)	۳۴	۳۴	۳۴	۳۴	۱۷	۱۷	۱۷	

چونکہ جائیداد بائیس لاکھ روپیہ ہے اسے ۲۶۴ پر تقسیم کیا تو ایک حصہ 8333.33 روپے آتا ہے۔ اب ہر وارث کو ان کے حصوں کے مطابق اسے تقسیم کر دیا جائے۔ جو حسبِ ذیل ہے:

والدہ کو 366667 بیوگان -/275000 روپے ہر بیوہ کو -/137500 روپے

ہر بیٹے کو 28333.25 روپے اور ہر بیٹی کو 141666.70 روپے۔ (واللہ اعلم)

سوال ایک آدمی فوت ہوا اور اس کا ترکہ اسی ہزار روپے ہے۔ پسماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں بیوہ کا آٹھواں حصہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔: ''اگر ساری اولاد ہے تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔'' (النساء:۱۲) بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد باقی حصہ اس کی اولاد کا ہے۔ اور وہ اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔'' اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔ (النساء:۱۱) سہولت کے پیش نظر متروکہ مال کے آٹھ حصے بنا لیے جائیں، ان میں سے ایک

---

❶ النساء:۱۱۔ ❷ النساء:۱۲۔ ❸ بخاری، الفرائض۔ ❹ النساء:۱۱۔

حصہ بیوہ کو دیا جائے اور باقی سات حصوں سے دو حصے فی لڑکے اور ایک ایک لڑکی کو دیا جائے چونکہ ترکہ اسی ہزار روپے ہے اسے آٹھ پر تقسیم کیا جائے تو ایک حصہ دس ہزار بنتا ہے، یہ بیوہ کا حق ہے اسے دیا جائے اور باقی ستر ہزار میں بیس بیس ہزار لڑکوں کو اور دس ،دس ہزار لڑکیوں کو دیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

سوال میرا ایک عزیز فوت ہوا، اس کی بیوی، دو بیٹیاں اور پانچ بھائی ہیں، اس کی بیوی نے تمام جائیداد پر قبضہ کرلیا ہے، شریعت کے مطابق ہر وارث کو کیا حصہ ملتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دے کر ممنون فرمائیں۔

جواب اگر مرنے والے کے ذمے کوئی قرض وغیرہ نہیں اور نہ ہی اس نے کوئی وصیت کی ہے تو اس کی بیوی کل جائیداد سے آٹھویں حصہ کی حقدار ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اگر مرنے والے کی اولاد ہے تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔ [1] اس کی بیٹیوں کو کل جائیداد سے دو تہائی دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر لڑکیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہیں تو انہیں کل ترکہ سے ۲/۳ دیا جائے۔ [2] بیوی اور بیٹیوں کو حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے اس کے حقدار میت کے بھائی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، مقرر حصہ لینے والوں کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ دار کے لیے ہے۔ [3] سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کو چوبیس حصوں میں تقسیم کرلیا جائے۔ ان میں سے تین حصے بیوی کو، سولہ حصے بیٹیوں کو اور باقی پانچ حصے بھائیوں کو دے دیے جائیں، اس طرح کل جائیداد کو تقسیم کیا جائے بیوی کا کل جائیداد پر قبضہ کرلینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال ایک شخص نے کسی لڑکی سے شادی کی، لیکن جنسی تعلقات قائم ہونے سے پہلے ہی وہ فوت ہوگیا، اس کا اور کوئی وارث نہیں ہے، اس نے ڈھیروں مال اپنے ترکہ میں چھوڑا ہے۔ اس کے متعلق کیا شرعی حکم ہے۔

جواب عقد صحیح سے کوئی بھی عورت اپنے خاوند کی بیوی بن جاتی ہے، خواہ جنسی ملاپ نہ ہوا ہو، اس پر عدت وفات بھی ہے یعنی وہ چار ماہ دس دن تک سوگ میں رہے گی، لہذا جب یہ عقد صحیح ہے اور اس کا خاوند فوت ہوگیا ہے تو اسے کل جائیداد سے چوتھائی حصہ دیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جو مال تم چھوڑ مرو، اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہاری بیویوں کا اس میں چوتھا حصہ ہے۔'' [4] اس کی جائیداد کے چار حصے کر لیے جائیں، ان میں سے ایک حصہ اس کی بیوی کو دے دیا جائے، پھر اس کے دیگر ورثا کے متعلق تحقیق کرلی جائے، اگر باپ کی طرف سے کوئی بھی رشتہ دار موجود ہو جو عصبہ بن سکتا ہے تو باقی تین حصے اسے ادا کر دیے جائیں، اگرچہ وہ دور کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی بھی رشتہ دار معلوم نہ ہو تو باقی رقم اسلامی بیت المال میں جمع کرادی جائے بشرطیکہ وہ بیت المال صحیح اسلامی حکومت کے زیر نگرانی ہو۔ بصورت دیگر اس رقم کو مرحوم کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

ناجائز وصیت کالعدم ہے

سوال میرے والد نے اپنی جائیداد ہمارے بڑے بھائی کو دینے کی وصیت کی ہے جبکہ ہماری بہنیں بھی موجود ہیں، اب وہ فوت ہو چکے ہیں، کیا اس پر عمل کیا جائے گا یا شرعی ضابطہ کے مطابق اسے تقسیم کرنا ہوگا، پسماندگان میں سے ہم دو بھائی اور چار بہنیں ہیں، ہماری والدہ پہلے ہی وفات پا چکی ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری الجھن دور کریں۔

---

[1] النساء: ۱۲۔ [2] النساء: ۱۱۔ [3] صحیح بخاری، الفرائض، ۶۷۳۵۔ [4] النساء: ۱۲۔

جواب وصیت کا ایک ضابطہ ہے کہ جو شرعی طور پر کسی کا وارث ہے اس کے متعلق وصیت ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادگرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے، اس لیے وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔'' [1] اس حدیث کی بنا پر باپ کی ایک بیٹے کے نام وصیت باطل ہے لہٰذا اس کا نفاذ جائز نہیں ہے، اگر دیگر ورثا اس وصیت پر اپنی رضامندی کا اظہار کردیں تو چنداں حرج نہیں، اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو شرعی ضابطہ کے مطابق متوفی کی جائیداد تقسیم کی جائے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اولاد میں وراثت کا اصول بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔'' [2]

اس آیت کریمہ کے پیش نظر اگر میت کے ذمے قرض ہے تو اسے اتارا جائے پھر تقسیم کے لیے اس جائیداد کے آٹھ حصے بنا لیے جائیں، دو دو حصے فی بیٹا اور ایک ایک فی بیٹی کو دے دیا جائے۔ ہم اس مناسبت سے والدین کو نصیحت کرتے ہیں کہ جائیداد کے سلسلہ میں کوئی ایسی وصیت نہ کریں جو ظلم و زیادتی پر مبنی ہو۔ کیونکہ دنیا کا مال و متاع قیامت کے دن کام نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی اولاد کچھ نفع دے سکے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اس دن مال و اولاد کچھ کام نہ آئے گی۔'' [3] اس لیے وصیت کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرتے ہوئے اسے سرانجام دیا جائے، اگر کوئی ناجائز وصیت کر گیا تو اسے نافذ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ پسماندگان پر اس کی اصلاح ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے طرفداری یا زیادتی کا اندیشہ رکھتا ہو تو اس کی اصلاح کردے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' [4] صورت مسئلہ میں وصیت کالعدم ہے اور ورثا کو چاہیے کہ وہ متوفی کی جائیداد کو ضابطہ شرعی کے مطابق تقسیم کریں۔ (واللہ اعلم)

سوال ایک آدمی کی زندگی میں اس کی شادی شدہ صاحب اولاد بیٹی فوت ہوگئی، اس کے بعد وہ خود بھی فوت ہوگیا، اس کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا زندہ ہے جبکہ فوت شدہ بیٹی کا ایک بیٹا اور بیٹی موجود ہے۔ بیوی بھی حیات ہے، اس صورت میں فوت ہونے والے کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی، اس کا نواسا اور نواسی بھی دعویدار ہیں کہ ہمیں بھی اس جائیداد سے حصہ دیا جائے، کتاب و سنت کے مطابق اس کا حل بتائیں۔

جواب قرآن و سنت کے مطابق جائیداد کی تقسیم کا ایک اصول یہ ہے کہ میت کے ساتھ اگر کسی کا قریبی رشتہ ہے تو اس کی موجودگی میں دور والا رشتہ دار محروم ہوتا ہے۔ مثلاً بیٹے کی موجودگی میں اس کا پوتا اور بیٹی کی موجودگی میں اس کا نواسا وغیرہ محروم ہوتے ہیں، چونکہ صورت مسئولہ میں میت کے قریبی رشتہ دار بیٹا اور بیٹیاں موجود ہیں اس لیے ان کی موجودگی میں نواسا اور نواسی محروم ہیں، ہاں اگر ان کی والدہ مرحوم کی وفات کے بعد فوت ہوتی تو نواسے اور نواسی کو اپنی ماں کا حصہ ملنا تھا لیکن وہ اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہوگئی لہٰذا اسے یا اس کی اولاد کو مرحوم کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا، سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی وفات کے بعد اس کی بیوی، بیٹا اور پانچ بیٹیاں زندہ ہیں۔ انہیں حسب ذیل تفصیل سے حصہ دیا جائے گا۔

① خاوند اگر صاحب اولاد ہو تو اس کی جائیداد سے ایک بیوی یا متعدد بیویوں کو آٹھواں حصہ ملتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] ابو داؤد: ۲۸۷۰۔ [2] النساء: ۱۱۔ [3] الشعراء: ۸۸۔ [4] البقرۃ: ۱۸۲۔

''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کے لیے آٹھواں حصہ ہے۔'' ❶

بیوی کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد باقی جائیداد اولاد میں اس طرح تقسیم کی جائے کہ بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔ ❷

آسانی کے پیش نظر کل جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں، ان میں سے ایک بیوی کو، دو حصے بیٹے کو اور ایک ایک حصہ ہر بیٹی کو دے دیا جائے، نواسا اور نواسی کو اس جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا، اگر مرحوم کی اولاد اپنی خوشی سے کچھ دینا چاہیں تو الگ بات ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال ہمارے رشتہ داروں میں سے ایک شخص فوت ہوا ہے اس کا چچا، دادی اور نانی زندہ ہیں، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا، کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب حدیث میں اس طرح کا ایک واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت قبیصہ بن ذویب فرماتے ہیں: ایک دادی نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آکر اپنی وراثت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ''تمہارے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے اور نہ ہی سنت رسول اللہ ﷺ سے مجھے تمہارے لیے کسی چیز کا علم ہے تم جاؤ میں لوگوں سے اس سلسلہ میں مشورہ کروں گا۔'' پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا آپ ﷺ نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی اس وقت تھا؟ حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ نے کھڑے ہو کر اس امر کی گواہی دی تو حضرت ابوبکرؓ نے اسے نافذ کر دیا پھر ایک دوسری جدہ (نانی) حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور اس نے اپنی وراثت کا سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تمہارے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے لیکن یہی چھٹا حصہ ہے، اگر تم جمع ہو جاؤ یعنی دادی کے ساتھ نانی بھی ہو تو یہی چھٹا حصہ تمہارے درمیان تقسیم کیا جائے گا اور اگر تم میں سے کوئی اکیلی رہ جائے تو یہ حصہ اس کا ہے۔ ❸ چھٹا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے چچا کے لیے ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ شریعت کے مقررہ حصے ان کے حقداروں کو دو، پھر جو باقی بچ جائے وہ میت کے سب سے قریبی مرد رشتہ دار کو دے دیا جائے۔ ❹ چونکہ میت کے چچا کے علاوہ دوسرا کوئی رشتہ دار صورت مسئولہ میں مذکور نہیں ہے لہذا دادی اور نانی کا چھٹا حصہ نکال کر باقی پانچ حصے چچا کو ملیں گے۔ (واللہ اعلم)

بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کو حصہ دینا

سوال میرے والد نے وصیت کرتے ہوئے کہا کہ میرا بڑا شادی شدہ بیٹا تو جائیداد کے حصہ کی خواہش لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا لہٰذا تم نے مرحوم بیٹے کی بجائے میرے پوتے کو جائیداد سے حصہ دینا کیا ہم پوتے کو بھی جائیداد سے حصہ دینے کے پابند ہیں؟

---

❶ النساء:۱۲۔ ❷ النساء:۱۱۔

❸ مسند امام احمد ص ۳۲۶، ج ۵۔ ❹ صحیح بخاری، الفرائض:۶۷۴۶۔

جواب مرنے کے بعد ترکہ کی تقسیم میں یہ اصول رکھا گیا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار محروم ہوتا ہے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''پوتے کی وراثت جبکہ بیٹا نہ ہو۔'' [1] پھر اسے ثابت کرنے کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ کا قول پیش کیا ہے کہ پوتا، بیٹے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتا، پھر ایک حدیث ذکر کی ہے جسے حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مقررہ حصے، حصے داروں کو دینے کے بعد جو بچ جائے وہ میت کے قریبی مذکر رشتے داروں کو دیا جائے گا۔'' [2]

قریبی مذکر رشتہ دار کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ دور والے رشتہ دار، قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں محروم ہوں گے، اس بنا پر یہ طے شدہ اصول ہے کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کو کچھ نہیں ملتا خواہ پوتا یتیم ہی کیوں نہ ہو، شریعت نے اس کا حل یہ پیش کیا ہے کہ فوت ہونے والا وصیت کے ذریعے اپنی جائیداد سے کچھ حصہ نامزد کر دے، یہ کچھ حصہ کسی صورت میں ۱/۳ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں مرحوم کی وصیت غلط ہے، اس پر عمل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی پوتے کی بہنوں کو وراثت سے کچھ ملے گا۔ ہاں اگر شرعی ورثا اپنی مرضی سے کچھ یتیم بچوں اور بچیوں کو دینا چاہیں تو اس پر شرعاً کوئی قدغن نہیں ہے لیکن وراثت سے انہیں بیٹوں کی موجودگی میں کچھ نہیں ملے گا۔ (واللہ اعلم)

ترکہ سے حج کروانا

سوال ایک عورت اپنے شوہر، والد اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر فوت ہوئی ہے، اس کی ایک بچی، اس کی وفات سے پہلے فوت ہو چکی تھی، اس نے کچھ رقم چھوڑی ہے، ورثا کو کتنا حصہ ملے گا، نیز اگر اس نقدی سے کسی کو حج کروا دیا جائے تو کیا یہ صحیح ہے، کتاب و سنت کے مطابق فتویٰ دیں؟

جواب اگر وہ اپنی زندگی میں حج کرنے پر قادر تھی اور شرائط حج بھی میسر تھیں تو اس کے ترکہ سے کسی کو حج کروا دیا جائے اگر وہ زندگی میں حج کرنے کی طاقت نہ رکھتی تھی تو ورثا کی رضامندی سے کسی دوسرے کو حج کرایا جا سکتا ہے، حج و عمرہ سے اگر کچھ رقم بچ جائے تو اس کے ذمے قرض کی ادائیگی پھر وصیت کا نفاذ ہونا چاہیے اگر قرض اور وصیت نہیں ہے تو اس کی نقدی کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، ایک حصہ خاوند کو دیا جائے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری بیویوں کی اولاد نہ ہو تو ان کے ترکہ سے تمہارا نصف حصہ ہے۔'' [3]

جو بچی ماں کی وفات سے پہلے فوت ہو چکی ہے وہ خاوند کے حصہ پر اثر انداز نہیں ہو گی، دوسرا حصہ مرحومہ کے باپ کو دے دیا جائے کیونکہ وہ عصبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصے حقداروں کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ داروں کا ہے۔ [4] میت کے بہن بھائی باپ کی وجہ سے ساقط ہیں، انہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اسی طرح جو بچی ماں سے پہلے فوت ہو گئی ہے اسے بھی کچھ نہیں ملے گا کیونکہ تقسیم میراث کی شرائط میں سے ایک یہ بھی شرط ہے کہ مورث کی وفات کے بعد وارث زندہ ہو۔ اس مقام پر یہ شرط مفقود ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، الفرائض، باب نمبر ۷۔ [2] صحیح بخاری، الفرائض، ٦٧٣٥۔
[3] النساء: ۱۱۔ [4] صحیح البخاری، الفرائض: ٦٧٣٥۔

مسئلہ وراثت

سوال ایک آدمی سکول ٹیچر ہے، اس کی نو ایکڑ زرعی اراضی بھی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اپنی زمین اپنے بھتیجے کے نام کر دے۔ لیکن وہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے بھی ڈرتا ہے کیونکہ وہ اکثر بیمار رہتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جس کی وجہ سے آخرت میں مواخذہ ہو، قرآن و حدیث کے مطابق اسے کیا کرنا چاہیے؟ واضح رہے کہ اس کی والدہ، دو بھائی اور ایک بہن بقید حیات ہیں۔

جواب شرعی ورثا کو محروم کرنے کی نیت سے کسی غیر وارث کو کچھ دینا بہت سنگین جرم ہے۔ بلکہ آخرت میں جنت سے محرومی کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ضابطہ میراث بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آخر میں فرمایا:

''یہ حدیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ تعالیٰ سدا بہار جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اسے جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ اس کے لیے انتہائی رسوا کن عذاب ہوگا۔'' [1]

ان آیات کی روشنی میں کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے شرعی ورثا کو محروم کر کے ایک غیر شرعی وارث کے نام اپنی جائیداد کر دے، یہ ہمدردی نہیں بلکہ اس پر اور اپنے آپ پر زیادتی کرنا ہے۔ ہاں شرعی طور پر اسے یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے بھتیجے کے نام ایک تہائی تک وصیت کر دے۔ یعنی نو ایکڑ زرعی اراضی سے تین ایکڑ کی اس کے لیے وصیت کر دے جو مرنے کے بعد اسے مل جائے گی۔ اگر موت کے وقت یہی ورثا زندہ ہوں جن کا سوال میں ذکر ہے تو درج ذیل تفصیل کے مطابق اس کی جائیداد تقسیم کر دی جائے۔ والدہ کو چھٹا حصہ دیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کے متعدد بہن بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے۔'' [2]

ماں کا حصہ دینے کے بعد باقی جائیداد بہن بھائیوں میں اس طرح تقسیم کی جائے کہ بھائی کو بہن کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر مرنے والے کے مرد اور عورتیں، بہن بھائی موجود ہیں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے۔'' [3]

لیکن بہن بھائیوں کو جو کچھ دینا ہے وہ ماں کا حصہ نکالنے کے بعد دیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے حصص دیے جائیں، اس کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کے لیے ہے۔'' [4]

سہولت کے پیش نظر وصیت کے نفاذ کے بعد باقی ترکہ کو چھ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ان میں ایک حصہ والدہ کو، دو دو حصے دونوں بھائیوں کو اور ایک حصہ بہن کو دے دیا جائے، بھائیوں کی موجودگی میں بھتیجا محروم ہوگا، اگر بیمار شخص کو واقعی اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے تو اسے درج بالا تفصیل کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو شریعت کے خلاف ہو، اگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے دن اس سے ضرور باز پرس ہوگی۔ (واللہ اعلم)

---

[1] النساء: ۱۳-۱۴۔ [2] النساء: ۱۱۔ [3] النساء: ۱۷۶۔ [4] بخاری، الفرائض، ۶۷۳۲۔

عقدِ ثانی کے بعد بیوی کی وراثت

سوال میرا بھائی جو شادی شدہ تھا وہ فوت ہو گیا، وفات کے وقت اس کی ایک بیٹی، بیوی اور ایک بھائی (میں خود) موجود تھا، بیوہ نے عدت گذارنے کے بعد عقد ثانی کر لیا ہے، کیا اسے متوفی کی جائیداد سے حصہ ملے گا۔ کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب وراثت کے استحقاق کے لیے آدمی کی وفات کے وقت ان کی تعلق داری کو دیکھا جاتا ہے، اگر سبب وراثت موجود ہے اور وہاں کوئی رکاوٹ نہیں تو اسے متوفی کی جائیداد سے وراثت کا حق دار قرار دیا جاتا ہے، دوسرے ورثا اگر اسے اس کا حق نہیں دیتے تو یہ ان کا اپنا قصور ہے۔ صورت مسئولہ میں جب سائل کا بھائی فوت ہوا تو اس وقت اس کی بیوی، بیٹی اور سائل خود موجود تھا لہٰذا مرحوم کی جائیداد کے وارث بھی یہ تینوں افراد ہوں گے جو مرحوم کی وفات کے وقت زندہ موجود تھے۔ اگر اس کی بیوہ نے عدت گزارنے کے بعد عقد ثانی کر لیا ہے تو اسے اپنے سابقہ خاوند کی جائیداد سے محروم نہیں قرار دیا جا سکتا، ہمارے ہاں یہ غلط مسئلہ متصور ہو چکا ہے کہ عقد ثانی کے بعد بیوی اپنے پہلے خاوند کے ترکہ سے محروم ہو جاتی ہے، کتاب وسنت میں اس کے محروم قرار دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، ان ورثا کے شرعی حصص حسب ذیل ہیں۔

① مرحوم کی لڑکی کو منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے نصف حصہ دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ترکہ ہے۔'' [1]

② بیوہ کو آٹھواں حصہ دیا جائے گا کیونکہ مرحوم کی اولاد موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر ان بیویوں کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا۔'' [2]

③ بھائی کو مقررہ حصہ لینے والوں سے بچا ہوا ترکہ دیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [3]

سہولت کے پیش نظر جائیداد کے چوبیس حصے کر لیے جائیں، ان کا نصف یعنی ۱۲ حصے بیٹی کو، آٹھواں حصہ یعنی ۳ حصے بیوہ کو اور باقی نو حصے بھائی (سائل) کو مل جائیں گے۔ اگر مرحوم کے ذمے کوئی قرض ہو یا اس نے کوئی وصیت کی ہو تو تقسیم سے پہلے قرض کی ادائیگی اور وصیت کا نفاذ ضروری ہے اور وصیت کے لیے بھی ضروری ہے کہ تیسرے حصہ سے زائد نہ ہو، بہر حال بیوہ، مرحوم کی جائیداد سے حق دار ہے اگرچہ اس نے عدت کے بعد عقد ثانی کر لیا ہے، عقد ثانی اس کی محرومی کا سبب نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بہن کو وراثت سے محروم کرنا

سوال تقسیم وراثت کے وقت ایک بہن کو غریب اور کمزور سمجھتے ہوئے جائیداد سے محروم کرنا جائز ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

---

[1] النساء: ۱۱۔ [2] النساء، ۱۲۔ [3] صحیح بخاری، الفرائض، ۶۷۳۲۔

جواب دور جاہلیت میں عورتوں کو میراث میں شامل کرنے کا دستور نہ تھا بلکہ عورت خود ترکہ شمار ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق حکم امتناعی جاری فرمایا کہ:

''اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ [1]

بلکہ عورتوں کا مرنے والے کی جائیداد سے حصہ مقرر فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''مردوں کے لیے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ چھوڑ جائیں خواہ یہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، ہر ایک کا طے شدہ حصہ ہے۔'' [2]

اس آیت سے درج ذیل احکام معلوم ہوتے ہیں:

① ترکہ میں عورتوں کے لیے باقاعدہ حصہ ہے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔

② ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، منقولہ ہو یا غیر منقولہ بہر حال وہ تقسیم ہوگا۔

③ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور والے رشتہ دار محروم ہوں گے۔

بہر حال اسلام نے میت کی جائیداد میں عورتوں کو شریک کیا ہے، صورت مسئولہ بہت ہی تکلیف دہ ہے کہ باپ کی جائیداد سے ایک بیٹی کو صرف غریب اور کمزور ہونے کی وجہ سے محروم کیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ورثا کے حصے مقرر فرمائے ہیں وہاں آخر میں تنبیہ بھی کی ہے:

''یہ اللہ کی حدود ہیں، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں داخل کریں گے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، نیز اسے رسوا کن عذاب ہوگا۔'' [3]

بہن کو کمزور اور غریب خیال کر کے جائیداد سے محروم کرنا اللہ کی حدود سے تجاوز کرنا ہے، اس پر بہت سخت وعید ہے، خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جنت سے محروم کر دیں۔

ایک وراثتی مسئلہ

سوال ایک آدمی فوت ہوا پسماندگان میں سے ایک بیٹی اور دو بھتیجے ہیں، اس کی جائیداد جو ایک کوٹھی (مالیت ۷۵ لاکھ) اور ۱۰ لاکھ روپے بینک بیلنس کی صورت میں ہے، اس کی تقسیم کیسے ہوگی؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں وصیت کے نفاذ اور قرض کی ادائیگی کے بعد بیوی کو کل ترکہ سے آٹھواں حصہ، بیٹی کو نصف اور باقی ترکہ دو بھتیجوں کو دیا جائے گا۔ سہولت کے پیش نظر کل ترکہ کے سولہ حصے کر لیے جائیں، جن میں سے دو حصے بیوی کو، آٹھ حصے لڑکی کو، باقی میں سے تین حصے ایک بھتیجے کو اور تین دوسرے بھتیجے کو دے دیئے جائیں۔ چونکہ سوال میں

---

[1] النساء: ۱۹۔ [2] النساء: ۷۔ [3] النساء: ۱۳۔۱۴۔

وضاحت کے مطابق کل ترکہ پچاسی لاکھ مالیت کے برابر ہے، اس لیے اس ترکہ کو سولہ پر تقسیم کرنے سے ایک حصہ نکل آئے گا، تفصیل حسب ذیل ہے۔

کل ترکہ -/85,00,000 روپے ایک حصہ -/85,00,000 / 16=531250

بیوی کا حصہ: 2x531250 = 1062500 بیٹی کا حصہ 8x531250 = 4250000

ایک بھتیجے کا حصہ: 3x531250 = 1593750 دوسرے بھتیجے کا حصہ: 3x531250 = 1593750

پڑتال: 1062500+4250000+159350+159350 + 1593750=-/85,00,000 روپے

نکاح و طلاق

نکاح وطلاق

مطلقہ عورت کا سسر سے پردہ

سوال مجھے میرے خاوند نے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا ہے، اب اس کے والد یعنی میرے سسر کی کیا حیثیت ہے، کیا مجھے اس سے پردہ کرنا ہوگا یا وہ بدستور میرا محرم رہے گا؟

جواب جب کسی مرد کا کسی عورت سے نکاح ہوتا ہے تو چار رشتوں کے درمیان حرمت قائم ہو جاتی ہے۔

① جس عورت سے والد نے نکاح کر لیا ہو وہ عورت آدمی پر حرام ہو جاتی ہے۔

② بیوی کی والدہ یعنی ساس بھی حرام ہو جاتی ہے۔

③ ربیبہ: پہلے خاوند کی بیٹی، یہ اس وقت حرام ہوگی جب مرد نے اس کی والدہ سے ہم بستری کر لی ہو۔

④ بیٹے کی بیوی یعنی بہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور تمہارے سگے بیٹوں کی بیویاں تم پر حرام ہیں۔''[1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی آدمی نے عورت سے عقد نکاح کر لیا ہے تو خاوند کا والد یعنی عورت کا سسر اپنی بہو کا محرم بن جائے گا خواہ میاں بیوی کا باہمی ملاپ نہ ہوا ہو، صرف عقد نکاح سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے، یہ حرمت برقرار رہتی ہے خواہ خاوند فوت ہو جائے یا اسے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دے، بیوی کا سسر اس کا محرم رہے گا، وہ اس کے سامنے اپنا چہرہ ننگا کر سکتی ہے، اس کے ساتھ سفر بھی کر سکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس طرح جب کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرے تو بیوی کی والدہ کے لیے وہ محرم بن جائے گا۔ خواہ اس نے اپنی بیوی سے ہم بستری کی ہو، بیٹی اگر فوت ہو جائے یا خاوند اسے طلاق دے دے تو بھی بیوی کی والدہ کا محرم ہی رہے گا، یہ محرمیت کسی صورت میں ختم نہیں ہوگی، صورت مسئولہ میں عقد صحیح کے بعد خاوند کا باپ، بہو کے لیے محرم بن جاتا ہے اور یہ محرمیت برقرار رہتی ہے، خواہ خاوند فوت ہو جائے یا اسے طلاق دے کر فارغ کر دے، بہو اپنے سسر پر ہمیشہ کے لیے حرام رہے گی اور بہو اس کے سامنے بلا حجاب آ سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال نکاح کے لیے لڑکا اور لڑکی رضامند ہیں، لیکن والدین اس میں رکاوٹ ہیں، لڑکی گھر سے بھاگ کر لڑکے سے نکاح کر لیتی ہے، اس کے بعد والدین بھی راضی ہو جاتے ہیں، تو کیا یہ شادی صحیح ہے؟؟

---

[1] النساء: ۲۳۔

جواب یہ نکاح صحیح نہیں ہے اگر چہ اس کے بعد والدین راضی ہو جائیں، کیونکہ نکاح کے لیے ولی یعنی سرپرست کی اجازت ضروری ہے، جو عورت اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیتی ہے، حدیث میں اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایسی عورت کو زانیہ اور بدکار کہا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ ہی کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے، بلاشبہ وہ عورت زانیہ ہے جس نے اپنا نکاح خود کر لیا۔'' [1]

اگر اس کے والدین، اس نکاح کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں تو بھی نکاح دوبارہ کیا جائے گا کیونکہ پہلا عقدِ نکاح صحیح نہیں تھا، ان دونوں لڑکی اور لڑکے کو اللہ تعالیٰ سے اس غیر شرعی اقدام پر معافی مانگنا ہو گی اور فوراً علیحدگی اختیار کر کے دوبارہ سرپرست کی اجازت سے نکاح کیا جائے، پہلے نکاح کو شریعت تسلیم نہیں کرتی اگر چہ والدین نے اس پر اظہار رضامندی کر دیا ہو۔ (واللہ اعلم)

سالی سے اپنے بیٹے کی شادی کرنا

سوال ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، دوسری بیوی کے بیٹے سے اپنی سالی کی شادی کرا سکتا ہے یا نہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ دیں؟

جواب جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے قرآن مجید نے ان کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں سے سات نسب کی وجہ سے حرام ہیں، دو رضاعت کی وجہ سے اور چار شتہ نکاح قائم ہونے کی بناء پر حرام ہیں، ان کی تفصیل سورۃ النساء آیت نمبر ۲۳ میں بیان ہوئی ہے، جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں ان میں ایک خالہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری خالائیں بھی تم پر حرام ہیں۔

صورتِ مسئولہ میں اگر سالی، برخوردار کی خالہ ہے تو اس سے کسی صورت میں نکاح نہیں ہو سکتا، اگر سالی اس کی خالہ نہیں تو اس سے نکاح کرنے میں کوئی قباحت نہیں مثلاً لڑکا ایک بیوی کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور دوسری بیوی کی بہن سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ دوسری بیوی کی بہن، باپ کی سالی تو ہے لیکن اس کے بیٹے کی خالہ نہیں ہے، لہٰذا اس نکاح میں شرعاً کوئی قباحت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے محرمات بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے:

''ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں۔'' [2]

دوسری بیوی کے بیٹے سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ بیٹا کسی پہلے خاوند سے ہو، اس صورت میں بھی پہلی بیوی کی بہن سے نکاح ہو سکتا ہے بہر حال اللہ تعالیٰ نے خالہ سے نکاح کرنا حرام قرار دیا ہے لیکن آدمی کی ہر سالی اس کے بچوں کے لئے خالہ نہیں ہو سکتی، لہٰذا اگر اس کی سالی، بیٹے کی خالہ نہیں تو اس سے نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

---

[1] ابن ماجه، النكاح: ١٥٢٧۔ [2] النساء: ٢٤۔

سابقہ سالی سے بیٹے کا نکاح

سوال محمد علی نے ایک عورت سے شادی کی جو اَب فوت ہو چکی ہے، خاوند نے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا، اس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا، جو اَب جوان ہے، محمد علی اپنے اس بیٹے کا نکاح پہلی فوت شدہ بیوی کی بہن یعنی اپنی سابقہ سالی سے کرنا چاہتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟

جواب قرآن کریم نے جن حرام رشتوں کی تفصیل بیان کی ہے ان کی حسب ذیل تین اقسام ہیں:

☆ خونی رشتے: یہ سات قسم کے رشتے ہیں:

① مائیں، ان میں دادیاں اور نانیاں بھی شامل ہیں، ② بیٹیاں، ان میں پوتیاں اور نواسیاں بھی شامل ہیں۔ ③ بہنیں خواہ حقیقی ہوں یا پدری یا مادری تمام بہنیں اس میں شامل ہیں۔ ④ پھوپھیاں، ان میں باپ کی حقیقی، پدری اور مادری بہنیں سب شامل ہیں۔ ⑤ خالائیں خواہ سگی ہوں یا پدری یا مادری سب حرام ہیں۔ ⑥ بھتیجیاں اور ان کی بیٹیاں۔ ⑦ بھانجیاں اور ان کی بیٹیاں۔

☆ دودھ کے رشتے: قرآن کریم نے حسب ذیل صرف دو رضاعی رشتوں کو حرام کہا ہے:

① رضاعی مائیں، ② رضاعی بہنیں۔

حدیث کے مطابق رضاعت کی رو سے وہ سب رشتے حرام ہیں جو نسب یعنی خون کی رو سے حرام ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے: رضاعی بیٹیاں، رضاعی پھوپھیاں، رضاعی خالائیں، رضاعی بھانجیاں اور رضاعی بھتیجیاں۔ ☆ سسرالی رشتے، اس سے مراد وہ رشتے ہیں جو نکاح کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① بیوی کی ماں یعنی ساس، ② بیوی کی بہن یعنی سالی جب تک اس کی بہن نکاح میں ہے۔ ③ باپ کی منکوحہ یعنی سوتیلی ماں ④ سوتیلی بیٹی بشرطیکہ اس کی ماں سے مباشرت ہو چکی ہو۔ ⑤ بہو سے نکاح بھی حرام ہے۔ ان کے علاوہ شوہر والی تمام عورتیں بھی حرام ہیں، نیز خالہ اور اس کی بھانجی، پھوپھی اور اس کی بھتیجی اسی طرح دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا بھی حرام ہے۔ ان تمام حرام رشتوں کی تفصیل سورۃ النساء آیت نمبر ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے مذکورہ رشتوں کے علاوہ دیگر تمام رشتے حلال ہیں، بشرطیکہ عورت کی رضامندی سے ایجاب وقبول ہو، عورت کا سرپرست اس کی اجازت دے، حق مہر مقرر ہو اور گواہ بھی موجود ہوں نیز یہ نکاح آبادی کی نیت سے مستقل بنیادوں پر ہو، عارضی طور پر چند دنوں یا مہینوں یا سالوں کے لیے نہ ہو۔ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں جب ہم صورت مسئولہ پر غور کریں تو ان کے علاوہ جتنی بھی عورتیں ہیں انہیں اپنے مال کے ذریعے حاصل کرنا تمہارے لئے جائز قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ اس سے تمہارا مقصد نکاح میں لانا ہو، محض شہوت رانی مقصود نہ ہو۔'' [1]

---

[1] النساء: ۲٤۔

عدالتی نکاح کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے معاشرہ کا یہ بہت نازک مسئلہ ہے کہ لڑکی اور لڑکا آپس میں نکاح کے لئے رضامند ہوتے ہیں لیکن والدین اس نکاح کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، پھر وہ لڑکی گھر سے بھاگ کر عدالتی نکاح کر لیتی ہے، اس طرح اولاد بھی پیدا ہو جاتی ہے، اس قسم کی شادی کو کس طرح صحیح کہا جا سکتا ہے؟

جواب شریعت اسلامیہ میں جو لڑکی بھی گھر سے بھاگ کر اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کرتی ہے وہ نکاح باطل ہے، خواہ اس قسم کے نکاح کو کتنی ہی مدت کیوں نہ گذر جائے اور اس نکاح کے نتیجہ میں خواہ بچے بھی پیدا ہو جائیں، نکاح کے لئے ولی کی اجازت اور اس کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جب عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے، آپ نے یہ کلمات تین مرتبہ دہرائے۔ [1]

بلکہ جو عورت اپنے سرپرست سے بالا بالا خود ہی نکاح کر لیتی ہے اسے رسول اللہ ﷺ نے بدکار قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

''کوئی عورت کسی دوسری عورت کا (ولی بن کر) نکاح نہ کرے اور نہ ہی خود اپنا نکاح کرے بلاشبہ وہ عورت زانیہ ہے جس نے اپنا نکاح خود کر لیا۔ [2]

اب عدالتی نکاح کو درست کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ ان کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے، جب اس پر کچھ وقت گزر جائے تو مشرقی روایات کے مطابق سرپرست کی رضامندی اور اجازت کے ساتھ دوبارہ نکاح کیا جائے، کیونکہ شریعت پہلے نکاح کو درست تسلیم نہیں کرتی بلکہ اسے باطل قرار دیتی ہے، بیوی خاوند کو چاہیے کہ وہ عدالتی نکاح کرنے پر اللہ کے حضور خلوص دل سے توبہ کریں، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ رضاعت

سوال مسمی عبدالحمید شاہد نے گیارہ ماہ کی عمر میں اپنی پھوپھی کا دودھ ایک مرتبہ پیا جب کہ اس کی والدہ کو غسل دیا جا رہا تھا کیونکہ وہ فوت ہو چکی تھی، پھر دوسری مرتبہ اس وقت دودھ پیا جب کہ اس کی والدہ کو دفن کیا جا چکا تھا، اب عبدالحمید اپنے لڑکے کی شادی اپنی پھوپھی کی ایک چھوٹی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے، اس نکاح میں رضاعت یا کوئی دوسرا امر تو مانع نہیں، راہنمائی فرمائیں؟

جواب سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی شاہد نے صرف دو مرتبہ اپنی پھوپھی کا دودھ پیا ہے، دو مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک دفعہ یا دو دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ [3]

ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ایک مرتبہ دودھ پینے اور دو مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، جب کہ ایک

---

[1] ابو داود، النکاح: ۲۰۸۳۔ [2] ابن ماجہ، النکاح: ۱۸۸۲۔ [3] صحیح مسلم، الرضاع: ۱۴۵۰۔

تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''پستان کو ایک مرتبہ منہ ڈالنے یا دو مرتبہ منہ ڈالنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ ❶

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ ایک یا دو مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضرت سالم رضی اللہ عنہ کو پانچ مرتبہ دودھ پلایا پھر وہ ان کے بچے کی جگہ پر ہو گیا۔ ❷

متعدد صحابہ کرام کا یہی موقف ہے کہ کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے متعلق ایسا ہی مروی ہے۔ صورت مسئولہ میں عبدالحمید شاہد نے اپنی پھوپھی کا دو مرتبہ دودھ پیا ہے، اتنی تعداد سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنی پھوپھی کی لڑکی سے کر سکتا ہے، اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اگرچہ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ دودھ تھوڑا یا زیادہ جتنا بھی پی لیا جائے، اس سے حرمت ثابت ہو جائے گی لیکن ہمارے نزدیک یہ موقف صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

سوال میری بچی نے اپنی چچی کی شہادت کے مطابق مدت رضاعت میں چچی کا دودھ دو یا تین مرتبہ پیا تھا، کیا میری بچی کا نکاح چچی کے بیٹے سے ہو سکتا ہے یا نہیں، نیز بتائیں کہ رضاعت کب ثابت ہوتی ہے؟

جواب دین اسلام میں مسئلہ رضاعت بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ رضاعت کی بناء پر وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت کے تعلق سے حرام ہیں، جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ ❸

دودھ پینے والے کا تعلق دودھ پلانے والی عورت کے تمام رشتہ داروں سے جڑ جاتا ہے یعنی دودھ پلانے والی رضاعی ماں، اس کا شوہر رضاعی باپ، اس کے بیٹے بیٹیاں رضاعی بہن بھائی اور خاوند کے بھائی رضاعی چچا بن جاتے ہیں، لیکن یہ تعلق دودھ پینے والے کی حد تک رہے گا، اس کے دیگر رشتہ داروں سے قائم نہیں ہوگا۔ دودھ کا رشتہ قائم ہونے کے لئے درج ذیل دو شرائط ہیں:

☆ بچے نے اپنی دودھ پینے کی عمر یعنی دو سال کے اندر اندر دودھ پیا ہو، دو سال کے بعد بچہ روٹی سالن اور خوراک سے اپنی بھوک مٹانے لگتا ہے، اس لئے جمہور اہل علم کے نزدیک دو سال کے بعد دودھ پینے کا اعتبار نہیں اور نہ ہی اس سے حرمت ثابت ہوگی۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''رضاعت وہی معتبر ہے جو بھوک کی بناء پر ہو۔'' ❹

دوسری حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ اسی رضاعت کا اعتبار ہوگا جو ہڈیوں کو مضبوط کرے اور گوشت پیدا کرے۔ ❺

☆ دوسری شرط یہ ہے کہ بچے نے کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پیا ہو، ایک مرتبہ پینے کا مطلب یہ ہے کہ بچہ ماں کا پستان منہ میں لے کر دودھ چوسے پھر بغیر کسی عارضہ کے اپنی مرضی سے اسے چھوڑ دے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ پانچ مرتبہ یقینی طور پر دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ ❻

---

❶ صحیح مسلم، الرضاع: ١٤٥١۔ ❷ صحیح مسلم، الرضاع: ١٤٥٢۔ ❸ ابو داؤد، النکاح: ٢٠٥٥۔

❹ صحیح بخاری، الشهادات: ٢٦٤٧۔ ❺ بیهقی ص ٤٦٧ ج٧۔ ❻ صحیح مسلم، الرضاع: ١٤٥٢۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کو بھی یہی حکم دیا تھا کہ وہ سالم کو پانچ مرتبہ دودھ پلا دے تو وہ بیٹے کی جگہ ہو جائے گا۔ ❶

چنانچہ انہوں نے حضرت سالم کو پانچ مرتبہ دودھ پلایا تو وہ ان کے بیٹے کی جگہ ہو گیا۔ ❷

صورتِ مسؤلہ میں چچی کی شہادت کے مطابق مدت رضاعت میں بچے نے دو یا تین مرتبہ دودھ پیا ہے، اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، چنانچہ حدیث میں صراحت ہے کہ ایک دو مرتبہ چوسنے سے نکاح حرام نہیں ہوتا۔ ❸

مایوس کن حالات میں شادی نہ کرنا

سوال میرے معاشرتی اور مادی حالات ایسے ہیں کہ میں شادی کی عمر سے گذر کر مایوسی کی دہلیز پر جا بیٹھی ہوں، اب میرے لئے شادی کرنا ناممکن ہے، اس سلسلہ میں میرے راہنمائی کریں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، ممکن ہے میرے جیسی دوسری لڑکیوں کو بھی اس سے راہنمائی مل جائے؟

جواب نکاح کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے لڑکیوں کے ورثا کو یہ ہدایت دی ہے: ''جب تمہارے پاس کسی ایسے شخص کا پیغام آئے جس کا دین اور اخلاق وعادات تمہیں پسند ہوں تو اسے بچی کا رشتہ دے دو، اگر ایسا نہ کرو گے تو پھر زمین میں فتنہ اور فساد ہوگا۔'' ❹

اس حدیث کے پیش نظر ہم لوگ اس بات کے پابند ہیں کہ لڑکی کے نکاح کے لئے دین اور اخلاق کو دیکھا جائے لیکن ہمارا معیار برادری اور مالداری ہے جس نے ہمارے معاشرہ کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، جوان بچیاں شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں، جیسا کہ سوال میں ذکر ہوا ہے اور وہ مایوس ہو کر گھر میں بیٹھی رہتی ہیں، ایسے حالات میں عورتوں کو چاہیے کہ وہ عجز وانکسار کے ساتھ اللہ کے حضور دعا کریں، اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی سبب ضرور پیدا کرے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں تو انہیں بتا دیں کہ میں بہت قریب ہوں، جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں، لوگوں کو چاہیے کہ وہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہ راست پر آجائیں۔'' ❺

اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا درج ذیل ارشاد بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے: ''جان لو! یقیناً ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرنے میں بہت سی خیر وبھلائی ہے، یقیناً اللہ کی نصرت، صبر کے ساتھ، خوشحالی، بدحالی کے ساتھ اور آسانی تنگی کے ساتھ ہے۔'' ❻

بہر حال ایسی عزت مآب خواتین سے ہماری گذارش ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط اور مستحکم کریں کیونکہ وہی مشکلات کو حل کرنے پر قادر ہے، امید ہے کہ وہ ضرور کشادگی پیدا کرے اور خزانہ غیب سے کوئی بندوبست فرمائے گا تاکہ یہ خواتین باعزت زندگی بسر کر سکیں۔

---

❶ مسند امام احمد ص ۲۰۱ ج۶۔ ❷ ابو داؤد، النکاح: ۲۰۶۱۔ ❸ صحیح مسلم، الرضاع: ۱۴۵۰۔
❹ سنن الترمذی، النکاح: ۱۰۸۴۔ ❺ البقرۃ: ۱۸۶۔ ❻ مسند امام احمد ص ۳۰۸ ج۱۔

رخصتی سے قبل وفات

سوال ایک عورت کا کسی شخص سے نکاح ہوا، لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ وہ فوت ہوگئی، اس کے کچھ زیوارت ہیں جو خاوند نے اسے بطور حق مہر دیئے تھے، کیا اس کے ترکہ سے خاوند کو حصہ ملے گا یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب جب کسی عورت کا نکاح ہوجاتا ہے تو وہ بیوی بن جاتی ہے خواہ اس کی رخصتی نہ ہوئی ہو، اس کے لئے بیوی کے حقوق ثابت ہوجاتے ہیں، اسی طرح جس سے نکاح ہوا ہے وہ اس کا خاوند بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر کوئی فوت ہوجائے تو ایک کو دوسرے کا وارث بنایا جائے گا۔ صورت مسئولہ میں خاوند نے جو زیورات بطور حق مہر دیئے ہیں، ان میں سے نصف کا حقدار اس کا خاوند ہے اگرچہ رخصتی نہیں ہوئی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''تمہاری بیویاں جو مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو تمہارے لئے ان کے ترکہ سے نصف ہے۔'' [1]

اگر مرنے والی لڑکی کا کوئی وارث ہے تو باقی ماندہ مال اسے دیا جائے گا، بصورت دیگر اسے بیت المال میں جمع کرادیا جائے کیونکہ جس مال کا کوئی معین مالک نہ ہو، اسے بیت المال میں جمع کرادیا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

طلاق کا شرعی طریقہ

سوال میری بیوی نافرمان اور گستاخ ہے، اسے سمجھانے بجھانے کے تمام حربے استعمال کرچکا ہوں لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوئے ہیں، اب میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں، اس طلاق کا شرعی طریقہ کیا ہے؟

جواب قرآن کریم نے نافرمان اور گستاخ بیوی کو سمجھانے کے لئے درج ذیل چار طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:
① اسے وعظ ونصیحت کی جائے اور نافرمانی کے انجام سے آگاہ کیا جائے۔ ② اگر وہ باز نہ آئے تو خواب گاہ سے اسے الگ کردیا جائے۔ ③ اگر یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو اسے ہلکی پھلکی مار دی جائے۔ ④ اگر مار پیٹ کا وہ کوئی اثر قبول نہ کرے تو اصلاح احوال کے لئے ثالثی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر ثالثی کے ذریعہ بھی اصلاح نہ ہوسکے تو اسے ایک طلاق دی جائے، حالانکہ آج کل نکاح تحریری ہوتے ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ طلاق بھی تحریری دی جائے، ایک طلاق دینے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر عورت کا دماغ درست ہوجائے تو دوران عدت تجدید نکاح کے بغیر ہی رجوع ہوسکتا ہے، اگر عدت گزرجائے تو نکاح تو ٹوٹ جائے گا لیکن تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اپنے خاوند سے نکاح کرنے سے نہ روکو، جب کہ وہ معروف طریقہ کے مطابق آپس میں نکاح کرنے پر آمادہ ہوں۔'' [2]

---

[1] النساء: ١٢۔ [2] البقرۃ، آیت ٢٣٢۔

رضاعی بہن سے شادی

سوال میں نے اپنی چچازاد کے ساتھ شادی کی، شب زفاف کے وقت باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ میری رضاعی بہن ہے، اب میرے لئے کیا حکم ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں؟

جواب اگر واقعی یہ بات صحیح ہے کہ سائل نے اپنی بیوی کے ہمراہ کسی عورت کا پانچ یا اس سے زیادہ مرتبہ دودھ پیا ہے اور دو سال کی عمر کے دوران پیا ہے تو پھر دونوں کے درمیان علیحدگی ضروری ہے کیونکہ یہ نکاح صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انہوں نے ابواھاب کی بیٹی ام یحییٰ سے شادی کی، شادی کے بعد ایک سیاہ فام عورت نے بتایا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو نے پہلے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی مجھے کسی دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا ہے۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ طیبہ گئے اور اپنا ماجرا بیان کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب یہ بات کہی گئی ہے تو اسے تسلیم کرلو۔''

چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو الگ کردیا پھر اس نے کسی دوسرے مرد سے شادی کرلی۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شادی کے بعد بھی اگر رضاعت کا علم ہو جائے تو علیحدگی ضروری ہے کیونکہ رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ [2]

چونکہ میاں بیوی دونوں کو شب زفاف میں خلوت میسر آچکی ہے، اس لئے بیوی اپنے حق مہر کی حقدار ہوگی۔ (واللہ اعلم)

تو مجھ پر حرام ہے

سوال ہمارا میاں بیوی کا آپس میں جھگڑا ہوا تو میری بیوی نے مجھے کہا کہ آئندہ کے لئے تو مجھ پر حرام ہے، آج کے بعد تو میرے لئے حلال نہیں ہے، یہ الفاظ اس نے بار بار دھرائے، شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟

جواب طلاق دینے کا اختیار خاوند کو ہے، عورت کی طرف سے واقع نہیں ہوتی، خواہ وہ خود کو کتنی ہی طلاقیں دے ڈالے یا خود کو اپنے خاوند پر حرام کرلے۔ صورت مسئولہ میں بیوی نے جو کچھ کہا ہے، اس سے طلاق وغیرہ واقع نہیں ہوگی، وہ سائل کی بدستور بیوی ہی رہے گی۔ البتہ اس کے ذمے قسم کا کفارہ لازم ہوگا کیونکہ کسی چیز کو خود پر حرام کرلینے سے قسم کا کفارہ پڑتا ہے جیسا کہ سورۃ تحریم کے آغاز میں ہے اور قسم کا کفارہ حسب ذیل ہے: ''دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلایا جائے یا انہیں کپڑے پہنائے جائیں، یا ایک غلام آزاد کیا جائے اور جو ان تین امور میں سے کسی ایک کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔'' بہر حال اس حوالہ سے ہم میاں بیوی دونوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ طلاق وقسم کو کھیل اور تماشہ نہ بنایا جائے اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے، دنیا کے چند دن گزارنے کی کوشش کی جائے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، العلم: ۸۸۔

[2] صحیح بخاری، النکاح: ۲۶۴۵۔

مطلقہ کا بچوں کے ساتھ رہنا

سوال میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، بچوں کی وجہ سے ہم ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں لیکن گفتگو وغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب عورت، خاوند کی طلاق کے بعد جب اپنی عدت پوری کر لے تو وہ اس کے لئے اجنبی بن جاتی ہے، اس کے بعد دونوں کا اکٹھے رہنا فحاشی اور بے حیائی کو دعوت دینا ہے، کسی اجنبی عورت کے ساتھ اس طرح رہنا کسی مذہب میں بھی جائز نہیں چہ جائیکہ اسلام میں رہتے ہوئے ایسا کام کیا جائے، جو انسان اپنی اصلاح چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے بچوں کی خاطر خود کو اس فتنۂ اختلاط میں مبتلا نہ کرے، طلاق دینے کے بعد، اس کی عدت گذرتے ہی دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو چکے ہیں اور اجنبی کو دیکھنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''مومن مردوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے باخبر ہے۔'' [1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان خواتین کو بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے، اس بنا پر طلاق یافتہ بیوی کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اپنے سابقہ خاوند سے علیحدگی اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی راستہ پیدا فرمائے گا جس سے وہ اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے ساتھ زندگی گذار سکے۔ (واللہ اعلم)

منگنی کے بعد طلاق

سوال میری اپنے حقیقی چچا کی بیٹی سے منگنی ہوئی ہے لیکن میں جہالت کی وجہ سے متعدد مرتبہ اسے نکاح سے پہلے ہی طلاق دے بیٹھا ہوں، اب میرا ارادہ اس سے نکاح کرنے کا ہے، میرے لئے شرعی حکم کیا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب ہم میں کچھ لوگ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں، قبل از نکاح طلاق دینا بھی اسی قبیل سے ہے، عقد نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہوتی کیونکہ طلاق دینا شوہر کا اختیار ہے، اور جو ابھی ''شوہر'' نہیں بنا اسے طلاق دینے کا کوئی اختیار نہیں، وہ لڑکی جس سے منگنی ہوئی ہے وہ اس کی بیوی نہیں ہے، ایسے حالات میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''طلاق صرف نکاح کے بعد ہی ہوتی ہے۔'' [2]

بہر حال قبل از نکاح طلاق واقع نہیں ہوتی، اگر کسی نے یہ حماقت کر ڈالی ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس اقدام پر استغفار کرے۔ ایسی طلاق سے آئندہ ہونے والے نکاح پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] النور: ۳۱۔ [2] سنن ابن ماجه، الطلاق: ۲۰۴۸۔

حق مہر مؤخر کرنا

سوال ایک آدمی کسی عورت سے نکاح کرتا ہے اور حق مہر بھی طے ہو جاتا ہے لیکن وہ کسی وجہ سے اس کی ادائیگی نہیں کر پاتا بلکہ وہ اسے مؤخر کر دیتا ہے تو کیا اس صورت میں وہ اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہے؟

جواب طے شدہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تم عورتوں کو ان کے حق مہر بخوشی ادا کرو، ہاں اگر وہ خوشی سے کچھ تمہیں چھوڑ دیں تو تم اسے مزے سے کھا سکتے ہو۔'' [1]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ طے شدہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے، اگر باہمی رضامندی سے حق مہر مؤخر کرنے پر کوئی سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''اگر حق مہر طے ہو جانے کے بعد بیوی خاوند آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔'' [2]

لیکن بیوی کے پاس جانے سے پہلے پہلے اس کی ادائیگی کرنا یا مباشرت سے پہلے ادائیگی کو مشروط کرنا درست نہیں۔ اگرچہ بہتر ہے کہ اس کی ادائیگی جلد از جلد ہونی چاہیے اور خاوند کا دانستہ طور پر اس کی ادائیگی سے پہلو تہی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

والدین کی اجازت کے بغیر طلاق دینا

سوال میرے بیٹے نے میری اجازت کے بغیر اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، اور وہ کسی صورت میں اسے آباد کرنے پر آمادہ نہیں ہے میں نے اس کو رجوع کرنے پر آمادہ کیا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ میں اس شرط پر رجوع کرتا ہوں کہ میں اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھوں گا بلکہ وہ نئی شادی کرنا چاہتا ہے، اب کتاب وسنت کے مطابق میرے لئے کیا حکم ہے؟؟

جواب کتاب وسنت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا حق خاوند کو دیا ہے، اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ طلاق دینے کے لئے اپنے باپ سے اجازت لے، مشورہ کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن طلاق کو باپ کی اجازت سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے جب اس نے طلاق دے دی ہے تو طلاق نافذ ہو جائے گی، اگر وہ اسے دوبارہ آباد کرنے پر آمادہ ہے تو رجوع کرنے کا اسے حق ہے لیکن یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ وہ رجوع کرنے کے بعد اپنی بیوی سے لاتعلق رہے کیونکہ یہ بیوی کو تکلیف دینا ہے اور شریعت کی رو سے ایسا کرنا حرام ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور انہیں تکلیف دینے کے لئے مت روکے رکھو، تا کہ تم ان پر زیادتی کرو اور جو شخص ایسا کام کرے گا وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرے گا۔'' [3]

بلکہ قرآن کریم نے بیوی کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور ان بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔'' [4]

---

[1] النساء: ٤۔ [2] النساء: ٢١۔ [3] البقرة: ٢٣١۔ [4] النساء: ١٩۔

صورت مسئولہ میں اگر بیٹا رجوع کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے، اگر وہ لاتعلق رہتے ہوئے رجوع پر آمادہ ہے تو اس قسم کا رجوع شرعاً ناجائز ہے بہتر ہے کہ اس کی ذہن سازی کی جائے اور جن وجوہات کی بناء پر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، اس کی تلافی کرتے ہوئے میاں بیوی کے درمیان صلح کی کوشش کی جائے لیکن باپ ہونے کی حیثیت سے اس پر کسی قسم کا ناجائز دباؤ ڈالنا جائز نہیں، اگر اس کی بیوی، باپ کی کوئی عزیزہ ہے تو رشتہ داری کے حقوق اپنی جگہ پر قابل احترام ہیں لیکن اس کے لئے خاوند کے حقوق کو قربان نہ کیا جائے، ہمارے معاشرہ میں یہ امر قابل اصلاح ہے کہ باپ اپنی اولاد کی شادی کرتے وقت انہیں اعتماد میں نہیں لیتا پھر شادی کرنے کے بعد بھی مداخلت کی جاتی ہے، اس کی مداخلت سے بہت بگاڑ پیدا ہوتا ہے لہٰذا والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں اور شادی نکاح سے پہلے اپنے بچوں اور بچیوں کو اعتماد میں لیں تاکہ آئندہ ہونے والے بگاڑ کا سدباب ہو سکے۔ (واللہ اعلم)

نکاح وٹہ

سوال ہماری برادری میں نکاح وٹہ سٹہ کا بہت رواج ہے، اس کے متعلق شرعی حکم کی وضاحت کریں، کیا اگر حق مہر رکھ لیا جائے تو بھی وٹہ بن جاتا ہے؟

جواب نکاح وٹہ سے رسول اللہ ﷺ نے بڑی صراحت کے ساتھ منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح وٹہ سے منع فرمایا ہے۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام میں وٹہ سٹہ کی شادی نہیں ہے۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے نکاح وٹہ کی صورت یہ بیان فرمائی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ کسی سے اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ اس سے کر دے گا، آپ نے اس سلسلہ میں حق مہر کا ذکر نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت عام ہے، حق مہر ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں منع ہے اور جس تعریف میں حق مہر نہ ہونے کا ذکر ہے وہ حضرت نافع کی تفسیر ہے، رسول اللہ ﷺ کے الفاظ نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ امیر مدینہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ دو آدمیوں نے نکاح شغار کیا ہے اور مہر بھی مقرر کیا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب لکھا کہ ان میں تفریق کرا دی جائے کیوں کہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ [3]

نکاح وٹہ اس لئے بھی منع ہے کہ اس میں سرپرست کی طرف سے عورتوں پر ظلم کیا جاتا ہے، انہیں شادی پر مجبور کیا جاتا خواہ وہ اسے ناپسند کرتی ہوں، اس نکاح میں عورتوں کو ایک سودا سلف کی حیثیت دی جاتی ہے، عورت کی مرضی اور رغبت کا اس میں کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ معاشرتی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک عورت کو کسی قصور کی وجہ سے سزا مل جاتی ہے تو دوسری کو بے قصور ہونے کے باوجود اس کٹھن مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے، ہمارے ہاں حالات وواقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے؟ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۱۲۔ [2] صحیح مسلم، النکاح: ۳۴۶۸۔

[3] مسند امام احمد ص ۹۴ ج ۴۔

رخصتی سے پہلے طلاق دینے یا خلع لینے کی صورت میں حق مہر کا حکم

سوال ایک لڑکی کا صرف نکاح ہوا، ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی کہ اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی یا اس نے از خود خلع لے لیا تو حق مہر کے متعلق کیا حکم ہے، آیا وہ ادا کرنا ہو گا یا نہیں؟

جواب مطلقہ عورت کے حق مہر کی ادائیگی کے متعلق چار صورتیں حسب ذیل ہیں:

① حق مہر مقرر نہ ہوا ہو اور نہ ہی صحبت کی نوبت آئی ہو تو اس صورت میں حق مہر تو ہے ہی نہیں البتہ کچھ نہ کچھ دینے کی تاکید ہے کیونکہ رشتہ جوڑنے کے بعد صحبت سے پہلے ہی طلاق دینے سے عورت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی کسی حد تک تلافی ضرور کرنا چاہیے، قرآن کریم میں ہے: ''اگر تم ایسی عورتوں کو طلاق دے دو جنہیں نہ تم نے ہاتھ لگایا ہو اور نہ ہی حق مہر مقرر کیا ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں البتہ کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرو، وسعت والا اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق انہیں بھلے طریقے سے رخصت کرے، یہ نیک آدمیوں پر حق ہے۔'' [1]

ایسی عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیے۔

② حق مہر مقرر ہو چکا ہو لیکن صحبت کا موقع نہ ملا ہو، اس صورت میں طے شدہ حق مہر کا نصف ادا کرنا ہو گا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم انہیں ہاتھ لگانے سے پیشتر طلاق دے دو مگر ان کا حق مہر مقرر ہو چکا تھا تو طے شدہ حق مہر کا نصف ادا کرنا ہو گا الا یہ کہ وہ عورتیں از خود معاف کر دیں یا وہ مرد فراخدلی سے کام لے جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے اور اگر تم درگزر کرو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔'' [2]

عورت کی طرف سے معافی یہ ہے کہ وہ خاوند کو آدھا حق مہر بھی معاف کر دے جو اسے ادا کرنا ضروری تھا اور خاوند کی طرف سے فراخدلی یہ ہے کہ آدھے کے بجائے پورا حق مہر ادا کر دے اگر ادا کر چکا ہے تو اس سے کچھ واپس نہ لے۔

③ مہر بھی مقرر ہوا اور صحبت بھی ہو چکی ہو، یہ عام صورت ہے، اس میں حق مہر پورا ادا کرنا ہو گا، اگر ادا کر چکا ہے تو واپس لینے کا مجاز نہیں ہے۔ ④ مہر مقرر نہ ہوا تھا مگر صحبت ہو چکی ہو تو اس صورت میں مہر مثل ادا کرنا ہو گا یعنی اتنا حق مہر ادا کرے گا جو اس خاندان اور قبیلہ کی عورتوں کو دیا جاتا ہے، اس کے متعلق پنچائتی فیصلہ ہو گا۔ اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ خلع لینے کی صورت میں عورت کو کچھ نہیں ملے گا، خواہ حق مہر مقرر ہوا ہو یا مقرر نہ ہوا ہو۔ اس سے صحبت ہوئی ہو یا صحبت کا موقع نہ ملا ہو، بہر حال خلع یافتہ عورت کو کچھ نہیں ملے گا اگر حق مہر وصول کر چکی ہے تو وہ اسے واپس کرنا ہو گا۔

بیوہ کے لئے اس کے برعکس حکم ہے کہ اسے ہر صورت میں حق مہر ملے گا، مہر مقرر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مرنے والے خاوند سے صحبت کی ہو یا اسے صحبت کا موقع نہ ملا ہو، عورت کو بہر حال پورا حق مہر ملے گا، اگر مہر مقرر تھا تو اتنا ملے گا اور اگر مقرر نہیں ہوا تھا تو مہر+مثل ملے گا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] البقرة: ٢٣٦۔ [2] البقرة: ٢٣٧۔

نکاح میں دینداری کی حیثیت

سوال مجھے دین اسلام سے بہت محبت ہے، میں نے اپنی ایک پڑوسن سے قرآن مجید کا ترجمہ اور منتخب احادیث پڑھی ہیں۔ میری انتہائی خواہش ہے کہ آئندہ زندگی میں میرا رفیق سفر کوئی دیندار شخص ہو لیکن میرے گھر والے اس انتخاب پر آمادہ نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے برادری کی کڑی شرط لگا رکھی ہے، کیا اسلام میں اس قسم کی شرط کا کوئی ذکر ہے؟ براہ کرم اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں؟

جواب ازدواجی رشتہ کے لئے بنیادی چیز دینداری ہے، باقی مال ومتاع، حسن وجمال اور حسب ونسب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورت سے نکاح کرنے کے لئے چار چیزوں کو دیکھا جاتا ہے، اس کے مال ومتاع کو، اس کے حسب ونسب کو، اس کے حسن وجمال کو اور اس کے دین واخلاق کو، تیرے ہاتھ خاک آلودہ ہوں تو دین والی عورت کو اختیار ہے۔ [1]

اسی طرح عورت کے سرپرست کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب اس کے پاس کوئی ایسا رشتہ آئے جس کا دین واخلاق اچھا ہو اور عورت کے بارے میں وہ امین اور دیانتدار ہو تو اسے نکاح کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تمہارے پاس کوئی شخص پیغام نکاح بھیجے جس کا دین اور اخلاق تمہیں پسند ہے تو اس سے نکاح کر دیا جائے، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا۔'' [2]

لیکن ہمارا معاشرہ ایک دوسری تفریق میں مبتلا ہے جسے اسلام پسند نہیں کرتا اور اسلام میں اس کی چنداں حیثیت بھی نہیں ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور یہ کنبے، خاندان تو تمہاری شناخت اور پہچان کے لئے ہیں، لیکن اللہ کے ہاں تم سب میں زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہو۔'' [3]

اس آیت میں ذات، پات اور خاندان وقبیلہ کی حیثیت نہیں بیان کی گئی ہے لیکن ہمارے ہاں اس خاندانی حسب ونسب کو باعث فخر خیال کیا جاتا ہے اور اپنے رشتوں کی بنیاد اسی کو قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں دینداری کی اس قدر حیثیت نہیں جتنی خاندان اور قبیلے کی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، خبردار! کسی عربی کو عجمی پر کوئی برتری نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل ہے، اسی طرح نہ کسی سرخ کو سیاہ پر اور نہ کسی سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت ہے البتہ تقویٰ اور پرہیز گاری وجہ فضیلت ضرور ہے۔'' [4]

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ اپنے آباء واجداد پر فخر کرنے سے باز آجائیں یا پھر وہ اللہ کے ہاں اپنی ناک سے گندگی دھکیلنے والے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آباؤ اجداد کی بنیاد پر دورِ جاہلیت کے فخر وغرور کو ختم کر دیا ہے۔ آج یا تو وہ مومن متقی ہے یا پھر فاجر اور لوگوں میں سب سے زیادہ بدبخت، سب کے سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔'' [5]

---

[1] صحیح بخاری۔ النکاح: ۵۰۹۰۔ [2] سنن الترمذی، النکاح: ۱۰۸۴۔ [3] الحجرات: ۱۳۔
[4] مسند امام احمد ص ۴۴۱ ج ۵۔ [5] جامع ترمذی، المناقب: ۳۹۵۵۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک مسلمانوں میں رنگ نسل یا خاندان وقبیلہ کی بنیاد پر تفریق وجہ فضیلت نہیں ہے، اسلام میں اللہ کے ہاں فضیلت صرف تقویٰ و پرہیز گاری ہے۔ آخر میں ہم سائلہ کو یہ وصیت کرتے ہیں کہ وہ صبر وتحمل سے کام لے اور کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو خاندان کے لئے باعث ننگ وعار ہو، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہنا چاہیے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور ایسا رفیق سفر عطا فرمائے گا جو آپ کے لئے اللہ کی اطاعت میں مددگار ومعاون ثابت ہو۔ (واللہ اعلم)

بیوہ عورت کا ولی کے بغیر نکاح کرنا

سوال ہمارے پڑوس میں ایک بیوہ ہے، اس کے والد عقد ثانی کے متعلق تذبذب کا شکار ہیں، اس نے کسی سے مسئلہ پوچھا تو بتایا گیا کہ بیوہ خود مختار ہے، اس کے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے، اس نے خفیہ طور پر کسی سے نکاح کر لیا، نکاح کے وقت وہاں صرف نکاح خواں، دولہا، وہ خود اور ایک اور آدمی موجود تھا، کیا یہ نکاح درست ہے؟ وہ خود بھی پریشان ہے کہ اس کے والد کسی دوسری جگہ شادی کرنا چاہتے ہیں، کیا دوسری جگہ پر نکاح کرنا، نکاح پر نکاح تو نہیں ہوگا، کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب دین اسلام میں کوئی بھی مسلمان عورت اپنے نکاح کا معاملہ از خود طے نہیں کر سکتی خواہ وہ بیوہ ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اس کے نکاح کا معاملہ اس کے ولی کی وساطت ہی سے انجام پائے گا۔ احادیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔'' [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس عورت نے بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو وہ نکاح باطل ہے، وہ نکاح باطل ہے، وہ نکاح باطل ہے۔'' [2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی عورت، کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔'' [3]

اس حدیث کے پیش نظر ولایت کے لئے مرد کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ باپ کے بجائے ماں ولی نہیں بن سکتی اور نہ کوئی لڑکی از خود اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ اگر باپ نہیں ہے تو چچا یا بھائی وغیرہ ولی بنے گا، اگر کوئی بھی نہیں ہے تو حاکم وقت یا قاضی اس کا ولی ہوگا۔ بہرحال اسلام کی تعلیمات میں بڑا توازن ہے کہ جن والدین نے لڑکی کو پالا پوسا، اس کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا، وہ نکاح میں بنیادی کردار ادا کرنے کے حقدار ہیں، ان کی رضامندی کے بغیر لڑکی کی شادی ناجائز ہے۔ دوسری طرف والدین کو لڑکی پر جبر کرنے اور اس کی رضامندی حاصل کئے بغیر اس کی شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے، جن روایات میں بیوہ کو خود مختار کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہونے والے خاوند کا انتخاب کرنے میں خود مختار ہے، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ وہ اپنا نکاح کرنے میں خود مختار ہے۔

---

[1] ابو داؤد، النکاح: ۲۰۸۵۔ [2] ابو داؤد، النکاح: ۲۰۸۳۔ [3] ابن ماجہ، النکاح: ۱۸۸۲۔

ہمارے رجحان کے مطابق صورت مسئولہ میں جو نکاح ولی کے بغیر ہوا ہے اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، اگر اس نکاح کے متعلق کوئی کاغذی کارروائی نہیں ہوئی ہے تو اسے طلاق لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر نکاح کا باضابطہ اندارج ہوا ہے تو مستقبل میں خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے مرد سے تحریری طلاق نامہ لکھوالیا جائے، پھر جہاں والدین نکاح کرنا چاہتے ہیں اگر عورت وہاں راضی ہے تو نکاح کردیا جائے، اس طرح وہ نکاح پر نکاح کی زد میں نہیں آئے گی۔ (واللہ اعلم)

بانجھ پن کی وجہ سے طلاق دینا

سوال میں اہل حدیث ہوں اور میرا رشتہ ایک تبلیغی حنفی سے ہوگیا، نکاح کے آٹھ ماہ بعد اس نے مجھے اس بنیاد پر طلاق دے دی کہ میں اولاد کے قابل نہ تھی، میں نے اس کی بہت منت سماجت کی لیکن میری کوئی شنوائی نہ ہوئی، کیا معاشرہ میں بانجھ عورت کی یہی عزت ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس سلسلہ میں مجھے کتاب وسنت کی روشنی میں مطمئن کیا جائے؟

جواب نکاح کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''شوہر سے زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچوں کو جنم دینے والی عورتوں سے شادی کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔'' [1]

اس حدیث کا سبب ورود یہ ہے کہ ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا، یارسول اللہ! مجھے ایک عورت ملی ہے جو عمدہ حسب ونسب اور حسن جمال والی ہے مگر اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تو کیا میں اس سے شادی کرلوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں'' پھر وہ دوبارہ آیا تو آپ نے منع فرمادیا، جب وہ تیسری مرتبہ آیا تو آپ نے مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ولادت کی صلاحیت سے محروم عورت سے نکاح نہیں کرنا چاہیے کیونکہ نکاح کا اصل مقصود اولاد کا حصول ہوتا ہے، اس لئے جو عورت اس وصف سے ہی محروم ہو تو اس سے نکاح کرنے کا فائدہ؟ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ بانجھ عورت سے مطلق طور پر نکاح کرنا حرام ہے، کیونکہ بعض اوقات نکاح کا مقصد حصول اولاد کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے مثلاً بانجھ عورت بے سہارا ہے تو اسے سہارا دینے کے لئے نکاح کرلیا جائے یا بانجھ عورت دینی تعلیم سے آراستہ ہے تو دینی تعلیم کی نشر واشاعت کے لئے اسے اپنے حبالہ عقد میں لے لیا جائے، ایسے حالات میں ایسی بانجھ عورت سے نکاح کرنا جائز ہی نہیں بلکہ پسندیدہ امر ہے۔ عورت کے بانجھ ہونے کا کیسے پتہ چلایا جائے؟ بیوہ عورت کے متعلق تو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے مگر کنواری میں حیض نہ آنا ایک امکانی سبب تو سکتا ہے مگر یقینی نہیں ہوتا، بہت زیادہ محبت کرنے والی اور بہت زیادہ بچے جننے والی، یہ صفات خاندانی طرف سے پہچانی جاتی ہیں۔

صورت مسئولہ میں نکاح ہوچکا ہے تو خاوند کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اسے طلاق نہ دیتا جبکہ بیوی کی طرف سے دوسری شادی کرنے کی پیشکش بھی ہوئی، کیونکہ اولاد دینا یا اس سے محروم کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے، یا بیٹے بیٹیاں دونوں جمع کردیتا ہے اور جسے چاہے بانجھ کردیتا ہے۔'' [2]

---

[1] ابو داؤد، النکاح: ۲۰۵۰۔ [2] الشوریٰ: ۵۰۔

اس آیت کے پیش نظر بانجھ پن ایک غیر اختیاری امر ہے، اس میں انسانی عمل کو کوئی دخل نہیں، البتہ بعض اوقات قابل علاج ہوتا ہے اور بعض اوقات ناقابل علاج ہوتا ہے، بہر حال صورت مسئولہ میں چاہیے تھا کہ خاوند اپنی بیوی کا علاج کراتا۔ اگر بانجھ پن ناقابل علاج تھا تو حصول اولاد کے لئے دوسرے شادی کر لیتا، اس طرح اس کی بیوی میں یہ احساس پیدا نہ ہوتا کہ شاید معاشرہ میں میرے جیسی عورتوں کا کوئی مقام نہیں ہے یا انہیں دنیا میں کبھی کوئی سہارا نہیں مل سکے گا، ہم اس مقام پر یہ گزارش کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ والدین بچیوں کا نکاح کرتے وقت ذہنی ہم آہنگی کا ضرور خیال رکھا کریں، صرف برادری کے رکھ رکھاؤ کے لئے اپنی بچیوں کو اپنے پندار نفس کی بھینٹ نہ چڑھایا کریں۔

صورتِ مسئولہ میں ممکن ہے کہ ذہنی تفاوت ہی کارفرما ہو کیونکہ لڑکی اہل حدیث ہے اور خاوند تبلیغی حنفی، بھلا ایک حنفی، اہل حدیث عورت کو کیسے قبول کر سکتا ہے، اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے معاملات کو گہری بصیرت کے ساتھ حل کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

غیر مدخولہ پر عدتِ وفات ضروری ہے؟

سوال ہماری بچی کا نکاح ہوا تھا، ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی کہ خاوند کسی حادثہ میں وفات پا گیا، ایسے حالات میں کیا بچی پر عدت وفات پوری کرنا ضروری ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب عقد نکاح کے بعد عورت، بیوی بن جاتی ہے، اس پر وہی احکام لاگو ہوتے ہیں جو نکاح کے بعد ایک بیوی کے لئے ہوتے ہیں، نکاح کے بعد جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن عدت میں رکھیں۔'' [1]

اس حکم میں وہ تمام عورتیں شامل ہیں جو عقد نکاح کے بعد بیویاں بن چکی ہیں، خواہ وہ ایسی بوڑھی عورت ہو جسے اب مردوں کی کوئی حاجت نہیں، اسی طرح وہ بچی بھی اس حکم میں شامل ہے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچی اور وہ لڑکی جو نکاح کے بعد ابھی اپنے خاوند کے پاس نہیں گئی، الغرض یہ تمام عورتیں اس آیت کے عموم میں داخل ہیں، صرف وہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے جو خاوند کی وفات کے وقت حمل سے تھی، اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ دوسرے دن بچہ پیدا ہو جائے یا آٹھ ماہ بعد وہ بچے کو جنم دے، اس کی عدت وضع حمل ہے۔ صورت مسئولہ میں عقد نکاح ہو چکا ہے لیکن رخصتی عمل میں نہیں آئی اور اس کا خاوند کسی حادثہ کی وجہ سے فوت ہو گیا ہے تو اس حالت میں بھی بچی کو عدت وفات گزارنا ضروری ہے جو چار ماہ دس دن ہے، ہاں اگر خاوند اس حالت میں طلاق دے دے تو اس کے ذمے عدت طلاق ضروری نہیں ہے لیکن اس پر عدت وفات کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال صورت مسئولہ میں بچی پر عدت وفات گزارنا ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] البقرة: ٢٣٤۔

میاں بیوی اکٹھے مسلمان ہوں تو نکاح برقرار ہے

سوال جب میاں بیوی دونوں اکٹھے مسلمان ہو جائیں تو کیا ان کا سابقہ نکاح برقرار ہے یا انہیں اس کی تجدید کرنا ہوگی، کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب میاں بیوی غیر مسلم ہوں اور وہ اکٹھے مسلمان ہو جائیں تو وہ پہلے نکاح پر رہیں گے، اسلام لانے سے ان کا نکاح متاثر نہیں ہوگا۔ ایسے حالات میں ان کے پہلے نکاح کی کیفیت کو نہیں دیکھا جائے گا اور نہ ہی ان کے پہلے نکاح کے لئے مسلمانوں کے ہاں نکاح کی شرائط کا اعتبار ہوگا، یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ انہوں نے حالت کفر میں جو نکاح کیا تھا اس میں ولی کی رضامندی تھی یا نہیں، گواہ موجود تھے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں کسی بھی اہل علم کا اختلاف نہیں ہے۔ علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ جب میاں بیوی دونوں ایک وقت میں اکٹھے مسلمان ہو جائیں تو وہ اپنے نکاح پر رہیں گے ہاں اگر نسبت یا رضاعت کی ممانعت موجود ہو تو اس کا اعتبار کرتے ہوئے انہیں پہلے نکاح پر برقرار نہیں رکھا جا سکتا، پھر ان کے نکاح کو کالعدم قرار دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بہت سے جوڑے مسلمان ہوئے، رسول اللہ ﷺ سے کوئی نص ثابت نہیں ہے کہ آپ نے ان کا تجدید نکاح کیا ہو، بلکہ انہیں پہلے نکاح پر مسلمان برقرار رکھا گیا، ہاں اگر کوئی قطعی حرمت کا معاملہ تھا تو اسے ملحوظ رکھا گیا ہے مثلاً کسی نے دو بہنوں سے نکاح کر رکھا تھا تو مسلمان ہوتے وقت اسے ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا یا کسی نے چار سے زائد بیویاں رکھی تھیں تو اسلام کے بعد اسے اپنی پسند کی چار منتخب کرنے کی اجازت دی گئی لیکن ان کے نکاح کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں کی گئی اور نہ ہی تجدید نکاح کی نوبت آئی۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو تواتر سے ثابت ہے بہر حال میاں بیوی اگر اکٹھے مسلمان ہوتے ہیں تو وہ اپنے نکاح پر برقرار رہیں گے، ان کے عقد نکاح اور کیفیت نکاح کو نہیں دیکھا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

بدخواہ ولی کی حیثیت

سوال میرے والد فوت ہو چکے ہیں، اب میری والدہ اور ایک سوتیلا بھائی زندہ ہے لیکن یہ بھائی وٹے سٹے کی بنیاد پر میرا کہیں نکاح کرنا چاہتا ہے، جبکہ میں وہاں نکاح پر راضی نہیں ہوں، ایسے حالات میں میرے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ مجھے اس بات کا علم ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا؟

جواب امت کے اکثر اہل علم کا یہ موقف ہے کہ عورت کنواری ہو یا شوہر دیدہ، اس کا نکاح ولی کے بغیر نہیں ہوتا، قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی متعدد آیات میں عورت کے سرپرست کو عقد نکاح کے متعلق مخاطب کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر نکاح کا معاملہ ولی کے بجائے عورت کے ہاتھ میں ہوتا تو اس کے ولی کو مخاطب کرنے کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی، امام بخاری رحمہ اللہ نے ان آیات کے پیش نظر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''جو شخص کہتا ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' [1]

---

[1] صحیح بخاری، النکاح باب: ۳۷۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح میں ولی کا ہونا شرط ہے، چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' ❶

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس عورت نے اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے، آپ نے یہ کلمات تین مرتبہ دہرائے۔ ❷

شریعت نے نکاح کے لئے یہ شرط اس لئے عائد کی ہے کہ ولی، عورت کے نفع ونقصان کو زیادہ سمجھتا ہے اور وہ اس کی خیر خواہی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا، لیکن اگر ولی اپنی زیر سرپرست کا خیر خواہ نہ ہو بلکہ اسے اپنا مفاد پیش نظر ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو ایسے حالات میں وہ ولایت سے خود بخود محروم ہو جاتا ہے پھر ولایت کسی دوسرے قریبی رشتہ دار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اگر کسی کا کوئی دوسرا سرپرست نہ ہو تو پھر حاکم وقت کی طرف ولایت منتقل ہو جائے گی جیسا کہ حدیث میں ہے: ''اگر اولیاء کا باہمی اختلاف ہو جائے تو پھر جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی حکمران ہے۔'' ❸

اگر حکمران سے بھی عدل وانصاف کی توقع نہ ہو جیسا کہ ہمارے ہاں عدالتوں میں ہوتا ہے تو پھر گاؤں یا شہر کا کوئی بھی شخص ولی بن سکتا ہے جسے اختیارات حاصل ہوں مثلاً قافلے کا امیر، گاؤں کا نمبردار اور شہر کا چیئر مین وغیرہ۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اگر نکاح کے لئے ولی نہ ہو تو ایسے حالات میں ولایت نکاح اس شخص کی طرف منتقل ہوگی جسے نکاح کے علاوہ دوسرے معاملات میں کچھ اختیارات حاصل ہیں جیسے کہ گاؤں کا نمبردار یا قافلے کا امیر وغیرہ۔ ❹

صورت مسئولہ میں ہم سائلہ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اگر حالات واقعی اسی طرح ہیں جیسا کہ سوال میں ذکر کئے گئے ہیں تو اپنے گاؤں یا شہر کے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی سرپرستی میں اپنا نکاح کر لے، امید ہے کہ اللہ کے ہاں اسے کوئی مواخذہ نہیں ہو گا۔ (واللہ اعلم)

ایام حیض میں نکاح کرنا

سوال کیا عورت کا ایام حیض میں نکاح ہو سکتا ہے، اس کے متعلق کتاب وسنت میں کیا ہدایات ہیں؟

جواب دورانِ حیض عورت سے نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ عقد نکاح میں اصل اباحت ہے جبکہ حالت حیض میں نکاح کے حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے لیکن نکاح کے بعد خاوند کو طہر تک اپنی بیوی کے پاس نہیں جانا چاہیے کیونکہ ممکن ہے وہ ایسا کام کر بیٹھے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ بہر حال اسے طہر تک انتظار کرنا چاہیے البتہ ہم بستری کے علاوہ بیوی سے لطف اندوز ہونے میں چنداں حرج نہیں ہے۔

سوال ایک لڑکی کا نکاح ایام حیض میں ہوا، جبکہ گھر والوں کو اس کا علم بھی تھا، کیا شرعی طور پر اس حالت میں نکاح ہو جاتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

---

❶ ابو داود، النکاح: ۲۰۸۵۔
❷ مسند امام احمد ص ۴۷ ج ٦۔
❸ سنن الترمذی، النکاح: ۱۱۰۲۔
❹ الاختیارات ص ۳۵۰۔

جواب نکاح کی چار شرائط ہیں، لڑکے لڑکی کی رضامندی، ولی کی اجازت، گواہوں کی موجودگی اور حق مہر وغیرہ۔ جس نکاح میں یہ چار شرائط پائی جائیں گی وہ نکاح صحیح ہے، حالت حیض میں نکاح بھی صحیح ہے البتہ بعض فقہاء نے حالت حیض میں لڑکی کی رخصتی کو مکروہ قرار دیا ہے تا کہ خاوند اس سے مقاربت کر کے گنہگار نہ ہو، نیز کتاب وسنت میں اس کے حرام ہونے کے متعلق کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی حرمت پر اجماع امت ملتا ہے، قیاس صحیح سے بھی اس کی ممانعت ثابت نہیں کی جاسکتی، ہمیں کسی فقیہ کا علم نہیں ہے جس نے اس قسم کے نکاح کو حرام کہا ہو پھر عقود و معاملات میں اصل جواز و اباحت ہے الا یہ کہ اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل ہو، حالت حیض میں نکاح کی حرمت پر کوئی دلیل ثابت نہیں ہے۔ بناء بریں اس حالت میں کیا ہوا نکاح جائز اور صحیح ہے۔ البتہ خاوند کو چاہیے کہ بیوی کے پاک ہونے کا انتظار کرے، اس کے پاس نہ جائے، جب وہ حالت حیض سے پاک ہو جائے اور غسل کر لے تو پھر خاوند اس کے پاس جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کی وفات کے بعد عدت کا مسئلہ

سوال ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا ہے، اس کے گھر میں اس کا قریب البلوغ بیٹا اور بالغ دیور رہتا ہے، اب عدت گزارنے کا مسئلہ درپیش ہے کہ بیوہ، اپنے گھر میں عدت گزارے یا اپنے والدین کے پاس چلی جائے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب خاوند کی وفات کے بعد عدت گزارنے والی عورت کا گھر میں رہ کر عدت گزارنے کے متعلق اہل علم کے دو موقف ہیں، ان میں مشہور اور قوی موقف یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے گھر میں رہتے ہوئے ایام عدت گزارے، اس کی دلیل حسب ذیل واقعہ ہے: ''حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میرا شوہر اپنے بھاگے ہوئے غلام کی تلاش میں نکلا۔ انہوں نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا، میں نے اپنی عدت اپنے میکے گزارنے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، کیونکہ میرے شوہر نے اپنی ملکیت میں کوئی گھر نہیں چھوڑا تھا اور نہ اخراجات اور نان نفقہ کا کوئی بندوبست تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! تم اپنے میکے جا کر اپنی عدت پوری کر سکتی ہو، جب میں حجرے میں بیٹھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی اور فرمایا: تم اپنے پہلے مکان میں رہو جب تک تمہاری عدت پوری نہ ہو جائے، میں نے اپنی عدت اسی مکان میں گزاری جہاں میں اپنے خاوند کے ساتھ رہائش پذیر تھی، وہ فرماتی ہیں کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے کسی کو بھیج کر یہ مسئلہ مجھ سے دریافت کیا، میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے بھی اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔'' [1]

اس حدیث کے پیش نظر صورت مسئولہ میں عورت کو اسی جگہ عدت گزارنا چاہیے جہاں وہ اپنے خاوند کے ہمراہ رہائش پذیر تھی، اپنے پاس اپنی والدہ یا کسی اور رشتہ دار کو رکھ لے، ہاں اگر وہاں رہنے میں اس کی عزت وناموس یا اس کے مال کے ضیاع کا باعث ہے یا وہاں فاسق وفاجر لوگ موجود ہیں جن کی شرارتوں سے محفوظ رہنا ناممکن ہو تو پھر اپنے میکے جا کر ایام عدت گزار سکتی ہے لیکن اگر اپنے خاوند کے گھر رہتے ہوئے اپنے معاملات چلا سکتی ہے اور اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو ایسے حالات میں اس کا

---

[1] ابو داود، الطلاق: ۲۳۰۰۔

دوسری جگہ منتقل ہونا شرعاً جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی

سوال کیا دوسری شادی کرنے کے لئے پہلی بیوی سے رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے نیز بتائیں کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی کیا شرائط ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے خاوند کو یہ حق دیا ہے کہ وہ حسب استطاعت چار شادیاں کرسکتا ہے اور اسے بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے متعلق ان سے انصاف نہیں کرسکو گے تو دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند آئیں دو، دو، تین تین اور چار، چار تک نکاح کرلو۔'' ❶

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے اور اس میں پہلی بیوی کی رضامندی کا کوئی ذکر نہیں، اگرچہ ہمارے عائلی قوانین میں یہ شرط ہے کہ دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے تحریری اجازت نامہ حاصل کرے لیکن یہ شرط اسلام میں نہیں ہے۔ البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ معاشرتی طور پر پہلی بیوی کو اگر اعتماد میں لے لیا جائے تو آئندہ زندگی اجیرن نہیں ہو گی، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ دوسری شادی کرنے سے قبل پہلی بیوی کو اعتماد میں لے لیا جائے۔ دوسری شادی کرنے کے لئے بنیادی طور پر دو ہی شرائط ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

عدل وانصاف: خاوند کو چاہیے کہ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کرے بصورت دیگر معاملہ بہت سنگین ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان کے درمیان عدل نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے۔'' ❷

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: جس خاوند کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک طرف میلان رکھے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو فالج زدہ ہوگا۔ ❸

اس سلسلہ میں جو عدل مطلوب ہے وہ نان ونفقہ، لباس اور شب باشی وغیرہ ہے یعنی ان مادی امور میں عدل کرے جو اس کے بس میں ہیں اور جن پر اس کی قدرت ہے لیکن محبت اور جنسی تعلقات کے متعلق باہمی عدل وانصاف قطعاً مراد نہیں ہے۔ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان عدل نہیں کرسکتے اگرچہ تم اس کی کوشش بھی کرو۔'' ❹

خرچ کی طاقت: دوسری شادی کرنے کے لئے دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے اندر مالی استطاعت پاتا ہو، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور ان لوگوں کو پاکدامن رہنا چاہیے جو اپنا نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی کردے۔'' ❺

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا ہے کہ جو بھی نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور اسے کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا ہو تو وہ

---

❶ النساء: ۳۔ ❷ النساء: ۳۔ ❸ دارمی، ص ۱۴۳، ج ۲۔ ❹ النساء: ۱۲۹۔
❺ سورۃ النور: ۳۳۔

پاکبازی اختیار کرے، نکاح کی رکاوٹ بننے والی اشیا میں مالی استطاعت سرفہرست ہے۔ اس آیت کا تقاضا ہے کہ جس انسان کے پاس شادی کے بعد بیوی کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے وہ پاکبازی کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کر لے، دوسری شادی کا خیال ذہن سے نکال دے۔ (واللہ اعلم)

موبائل سے طلاق

سوال میں نے اپنی بیوی کو موبائل کے ذریعے طلاق کا پیغام بھیجا، میری بیوی کو وقفہ وقفہ سے گیارہ مرتبہ وہ پیغام موصول ہو چکا ہے، کیا وہ ایک طلاق شمار ہو گی یا زیادہ طلاقوں کا اعتبار کیا جائے گا، براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے خاوند کو زندگی بھر تین طلاقیں دینے کا اختیار دیا ہے، پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش ہے جس کی دو صورتیں ہیں، اگر دوران عدت رجوع کر لیا جائے تو تجدید نکاح کے بغیر ہی گھر آباد کیا جا سکتا ہے اور اگر عدت گذر جانے کے بعد رجوع کا پروگرام بنے تو تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے، اس لئے بیوی کی رضامندی، سرپرست کی اجازت حق مہر کا تعین اور گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر تیسری طلاق بھی دے دی جائے تو عام حالات میں رجوع نہیں ہو سکے گا تا آنکہ وہ آباد ہونے کی نیت سے کسی دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کرے، ملاپ کے بعد اگر وہ فوت ہو جائے یا اسے طلاق دے دے تو پہلے خاوند سے از سرِ نو نکاح ہو سکتا ہے، صورت مسئولہ میں اگر خاوند نے موبائل کے ذریعے نکاح کے پیغام متعدد مرتبہ ارسال کئے ہیں تو تینوں طلاق واقع ہو چکی ہیں، اور اب رجوع کا کوئی موقع نہیں رہا اور اگر خاوند نے صرف ایک مرتبہ طلاق کا پیغام ارسال کیا پھر نیٹ ورک کے ذریعے خود بخود بیوی کو پیغام طلاق موصول ہوتے رہے تو اس صورت میں صرف ایک طلاق ہو گی اور دوران عدت رجوع ہو سکتا ہے اور عدت گزرنے کے بعد تجدید نکاح سے اپنا گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

ایک معاشرتی مسئلہ

سوال مجھے کسی رشتہ دار کی طرف سے عقد ثانی کی پیشکش ہوئی، لیکن انہوں نے شرط لگائی کہ پہلی بیوی کو طلاق دی جائے، چونکہ مجھے پہلی بیوی سے محبت تھی اور مذکورہ پیشکش بھی مسترد نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ ایک خالی لفافہ پیشکش کنندہ کے حوالے کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ ہے طلاق نامہ، کیا ایسا کرنے سے طلاق ہو جاتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب کسی حقیقی ضرورت کے پیش نظر پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا آدمی کا حق ہے لیکن ہمارے ہاں اس حق کا بہت غلط استعمال ہوتا ہے۔ دوسری شادی کی پیشکش کرنے والے حضرات اس سلسلہ میں بہت گھناؤنا کردار ادا کرتے ہیں، بلکہ خاوند کا گھر برباد کرنے میں ان کا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ ہمارے علم میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ پہلی بیوی کے علم میں لائے بغیر چوری چوری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پھر چوری چوری نکاح کر لیا جاتا ہے حالانکہ پہلی بیوی صاحب اولاد ہوتی ہے اور خاوند

کے حقوق ادا کرنے میں بھی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود دوسری شادی کر کے بیوی کو صلح کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اگر وہ صلح نہیں کرتی تو اسے طلاق کی دھمکی دی جاتی ہے پھر چار و ناچار اسے صلح کر کے اس آگ میں جلنا پڑتا ہے، اس تکلیف دہ صورت حال سے کئی خواتین ہمیں آگاہ کرتی ہیں اور اس پر لکھنے کے متعلق کہتی ہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایسے حالات میں جب نکاح کی کوئی حقیقی ضرورت نہ ہو پھر چور دروازوں سے گزر کر نکاح کرنے سے شرعاً نکاح نہیں ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ پیشکش کرنے والے ایسی شرائط عائد کرتے ہیں جو شرعاً ناجائز اور حرام ہیں، جیسا کہ صورت مسئولہ میں پہلی بیوی کو طلاق دینے کی شرط لگائی گئی ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''ایسی شرائط کا بیان جو نکاح کے وقت جائز نہیں ہیں۔'' [1]

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول پیش کیا ہے کہ کوئی عورت نکاح کے وقت پہلی بیوی کو طلاق دینے کی شرط نہ لگائے، اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی عورت کے لئے حلال نہیں کہ وہ نکاح کے لئے دوسری بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرے تاکہ اس کے برتن میں جو کچھ ہے اسے اُنڈیل دے، اسے تو وہی کچھ ملے گا جو اس کے مقدر میں ہے۔'' [2]

اس لئے جو نکاح اس طرح کی ناجائز شرائط منوانے کے بعد کیا جائے گا وہ جائز نہیں ہے۔ لہٰذا نکاح کی پیشکش کرنے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کہیں ہلاکت و تباہی کا راستہ تو اختیار نہیں کر رہے۔ سائل نے اس نکاح کی خاطر جو حیلہ اختیار کیا ہے وہ ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے زمرے میں آتا ہے۔ اسے پہلی بیوی سے محبت بھی ہے، اسے بھی رکھنا چاہتا ہے اور تازہ شکار کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس نے خالی لفافہ پیشکش کرنے والوں کے حوالے کر کے کہا یہ لو پہلی بیوی کا طلاق نامہ، پھر پوچھتا ہے کہ آیا ایسا کرنے سے طلاق تو واقع نہیں ہو جاتی۔ اس سلسلہ میں ہماری گذارش یہ ہے کہ طلاق کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ ہنسی مذاق میں طلاق دینے سے بھی طلاق ہو جاتی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں سائل کی طلاق ہنسی مذاق کی نہیں بلکہ انتہائی سنجیدگی سے اپنا کام نکالنے کے لئے ''طلاق نامہ'' نکاح کی پیشکش کرنے والوں کے حوالے کرنا ہے۔ اگرچہ لفافہ میں کچھ نہیں تھا لیکن طلاق لینے والے اسے طلاق ہی سمجھتے تھے اور خاوند نے بھی یہی باور کرایا کہ یہ طلاق نامہ ہے، لہٰذا اس طرح طلاق بھی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ پہلی بیوی کو رکھنا چاہتا ہے تو اس سے رجوع کر لے لیکن رجوع کرنے کے باوجود ایک طلاق شمار ہو جائے گی، یعنی اسے نکاح کے بعد جو طلاق کے متعلق تین اختیارات حاصل تھے اس نے اپنا ایک اختیار استعمال کر لیا ہے، اب اس کے بعد اگر دوسرا اختیار استعمال کرتا ہے تو رجوع کا حق اسے حاصل رہے گا جبکہ آخری اختیار استعمال کرنے کے بعد رجوع کا حق بھی ختم ہو جائے گا۔ اس تفصیل سے ہم قارئین کرام کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ نکاح اور طلاق دونوں بہت سنجیدہ اور نازک معاملے ہیں، اسے کھیل تماشے کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

سوال ہم نے ایک لڑکے سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا، ہمیں بعد میں علم ہوا کہ وہ لڑکا غلط کار تھا، اس نے چھ ماہ بعد طلاق دے دی، جبکہ ہماری لڑکی دو ماہ سے حاملہ تھی، ہم چاہتے ہیں کہ صفائی کرا دی جائے تاکہ ہمیں دوسری جگہ نکاح کرنے میں دشواری

---

[1] صحیح بخاری، النکاح باب نمبر: ۵۴۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۵۲۔

نہ ہو، قرآن وحدیث کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب شریعت اسلامیہ میں نکاح، اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے اور زندگی کا مضبوط بندھن ہے، اسے خوب غور وخوض اور سوچ وبچار کے بعد سرانجام دینا چاہیے۔ یہ کوئی بجلی کا بلب نہیں کہ خراب ہونے کے بعد دوسرا پھر تیسرا لگا دیا جائے اور دنیاوی مفاد و ذاتی اغراض کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ صورت مسئولہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی جلد بازی میں یہ کام کیا گیا ہے، تاہم نکاح کے بعد ہمیں چاہیے کہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے شریعت کی خلاف ورزی ہو پھر ہماری شرمندگی کا بھی باعث بنے۔ لڑکی چونکہ دو ماہ سے حاملہ ہے اور اسے طلاق مل گئی ہے، اب عقد ثانی کے لئے وضع حمل کا انتظار کرنا ہوگا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کا حمل وضع ہو جائے۔'' [1]

اب اپنی سہولت کے لئے حمل کو ضائع کرنا شرعی طور پر ناجائز ہے، اسلام ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا بلکہ قرآن کریم کی اس سلسلہ میں ایک واضح ہدایت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''مطلقہ عورتوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہے اسے چھپائیں، انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے اگر وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔'' [2]

اس سے معلوم ہوا کہ مادر رحم میں خلق شدہ بچے کو چھپانے کا حکم نہیں، جب چھپانے کا حکم نہیں تو اسے ضائع کرنے کی اجازت کیونکر دی جاسکتی ہے، بہتر ہے کہ صلح کی کوئی صورت پیدا کی جائے چونکہ عدت کا دورانیہ خاصہ طویل ہے اس لئے شاید کوئی راستہ نکل آئے، اس سلسلہ میں والدین کی سوچ کو کسی بھی صورت میں درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (واللہ اعلم)

گرین کارڈ کے لیے پیپر میرج

سوال ہمارے ہاں اکثر لوگ گرین کارڈ کے حصول کے لئے مغرب ممالک کا رُخ کرتے ہیں اور وہاں جا کر کاغذی طور پر ایسی عورت سے شادی کر لیتے ہیں جسے وہاں کی شہریت حاصل ہوتی ہے تاکہ نکاح کرنے والے کو گرین کارڈ کے حصول میں سہولت رہے کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب اسلام میں نکاح کے جو مقاصد ہیں وہ متعین ہیں، ان میں سرفہرست حسن معاشرت ہے اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھنا ہے، صورت مسئولہ میں نکاح کرتے وقت اس طرح کے مقاصد پیش نظر نہیں ہوتے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لئے ایسے اقدامات جائز نہیں ہیں جن کی شریعت میں گنجائش نہ ہو۔ گرین کارڈ کے حصول کے لئے اس طرح کا فریب کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ نیز اس میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ عورت ماہانہ ''وظیفہ'' کے لالچ میں کئی ایک لوگوں سے نکاح کا ڈھونگ رچا لیتی ہے تاکہ اسے وظیفہ ملتا رہے۔ بعض ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں کہ اس طرح کا نکاح کرنے والے ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں اور انہوں نے نکاح کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں ہوتا محض کاغذی کارروائی کی ہوتی ہے جو انٹرنیٹ پر مکمل کر لی جاتی ہے۔ نکاح کرنے والے کا مقصد صرف گرین کارڈ کا حصول اور عورت کا مقصد صرف ماہانہ وظیفہ حاصل کرنا ہے، حسن معاشرت یا خاندان کی بنیاد کا دُور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ہمارے رجحان کے مطابق اس طرح کا دھندا شرعاً ناجائز ہے، اس سے

---

[1] الطلاق: ٤۔ [2] البقرۃ: ٢٢٨۔

اجتناب کرنا چاہیے۔

حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح

سوال مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، لیکن شیعہ حضرات اس کا انکار کرتے ہیں، اس نکاح کا حوالہ درکار ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، چنانچہ ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی خواتین میں کچھ چادریں تقسیم کیں، ایک نئی چادر بچ گئی تو کچھ حضرات نے آپ کو مشورہ دیا (جو آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے) کہ اے امیر المومنین! آپ یہ چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی کو دے دیں جو آپ کے گھر میں ہیں، ان کی مراد آپ کی بیوی ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا سے تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ام سلیط رضی اللہ عنہا اس کی زیادہ حقدار ہیں۔[1]

بخاری کے اس حوالے سے ثابت ہوا کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا آپ کی بیوی تھیں، اس رشتہ کی تفصیل بھی روایات میں مذکور ہے، چنانچہ زین العابدین بیان کرتے ہیں کہ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت ام کلثوم کا رشتہ مانگا، آپ نے فرمایا کہ اس کا نکاح میرے ساتھ کردیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں نے یہ رشتہ اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر کے لئے رکھا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ اس کا نکاح میرے ساتھ کردیں کیونکہ اللہ کی قسم! مجھے اس کی بہت طلب ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کردیا، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مہاجرین کے پاس آئے اور کہا تم مجھے مبارکباد کیوں نہیں دیتے، انہوں نے عرض کیا: امیر المومنین! کس چیز کی مبارکباد؟ انہوں نے فرمایا: ''فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر حضرت ام کلثوم سے نکاح کی مبارکباد، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ نے فرمایا: ''قیامت کے دن ہر نسب اور سبب منقطع ہوجائے گا لیکن میرا نسب اور سبب باقی رہے گا۔ میں نے چاہا کہ میرا نسب اور سبب بھی کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہوجائے۔''[2]

اس کے علاوہ اور بھی بے شمار حوالہ جات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لخت جگر حضرت ام کلثوم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا تھا اور ان کے بطن سے ایک زید نامی بچہ بھی پیدا ہوا تھا، ماں اور بیٹا جب فوت ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کا جنازہ پڑھا تھا۔ اس جنازہ میں ابوہریرہ، ابوسعید اور ابوقتادہ موجود تھے۔[3]

لیکن شیعہ حضرات اس نکاح کو تسلیم کرکے بہت عجیب تبصرہ کرتے ہیں، چنانچہ زرارہ بیان کرتے ہیں کہ ابوعبداللہ (جعفر صادق) نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی کے متعلق فرمایا: ''یہ شرمگاہ ہم سے چھین لی گئی تھی۔''[4]

بہرحال شیعہ حضرات جو بھی موقف اختیار کریں، اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت کلثوم رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔

(واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، الجهاد: ۲۸۸۱۔
[2] مستدرك حاكم ص ۱۴۲ ج ۳۔
[3] سنن نسائی، الجنائز: ۱۹۸۰۔
[4] الفروع من كافی ص ۳۴۶ ج ۵۔

شادی کے لئے پہلی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرنا

سوال میں غیر شادی شدہ ہوں، میں جس قسم کے آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں وہ صاحب اولاد اور شادی شدہ ہے۔کیا میں اس آدمی سے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کر سکتی ہوں، اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

جواب دین اسلام افراط وتفریط سے بالاتر ہو کر اعتدال کی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے، اس لئے ہمیں بھی زندگی گزارنے کے لئے اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں کہ کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ نکاح کرنے کے لئے آدمی سے اس کی پہلی بیوی کی طلاق کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ترجمہ) ''کسی بھی عورت کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ کرے تا کہ اس کے برتن کو فارغ کر کے خود نکاح کرے بلکہ اس کے مقدر میں جو کچھ ہے وہ بہر حال اس کو مل کر رہے گا۔'' [1]

واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ''عورت کے لئے یہ حلال نہیں'' اس قسم کی شرط کے حرام ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ حلال کی نفی کرنا اس کے حرام ہونے کی صراحت ہے۔ اس سے مقصود عورت پر سختی کرنا ہے کہ وہ نکاح کے لئے اس قسم کی شرائط نہ لگائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہے، اس آدمی کو بھی چاہیے کہ وہ اس قسم کی شرائط کو خاطر میں نہ لائے۔ اگر حالات اجازت دیتے ہیں تو اس سے نکاح کرے، اس قسم کی ناجائز شرائط کا پورا کرنا ضروری نہیں۔ یہ بھی اس کے علم میں ہونا چاہیے کہ عورت کی طرف سے اس قسم کی شرائط اس کی غیرت کی وجہ سے ہوتی ہیں جو عمومی طور پر صنف نازک میں پائی جاتی ہے۔ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد کو اس بات پر ختم کیا ہے اس کے مقدر میں جو کچھ ہے وہ بہر صورت اس کو مل کر رہے گا۔'' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اس نے اس قسم کا مطالبہ کیا اور اس پر اصرار کیا نیز اپنے نکاح کو اس شرط کے ساتھ مشروط رکھا تو یہ شرط واقع نہیں ہوگی بلکہ وہی کچھ ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ [2]

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے چاہیے کہ وہ نکاح کر لے (کسی شرط سے مشروط نہ کرے) اس کے مقدر میں جو کچھ ہوگا وہ بہر حال اسے مل کر رہے گا۔'' [3]

اس روایت کی روشنی میں ہم سائلہ کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر اسے کسی آدمی کا دین اور خلق پسند ہے تو کسی قسم کی شرط لگائے بغیر اس سے نکاح کرے، اللہ کے ہاں جو رزق اس کے مقدر میں لکھا ہے وہ بہر صورت اسے مل کر رہے گا، اس قسم کی شرائط لگانا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ (واللہ اعلم)

شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا

سوال میں شادی شدہ ہوں اور میرے بچے بھی ہیں، میں دوسری شادی کرنے کا خواہش مند ہوں لیکن میری بیوی کہتی ہے کہ اگر تم دوسری شادی کرنا چاہتے ہو تو مجھے طلاق دے دو، اس سلسلہ میں آپ کی راہنمائی درکار ہے کہ میں حالات سے مصالحت

---

[1] صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۵۲۔ [2] فتح الباری ص ۹ ج ۲۷۵۔ [3] صحیح بخاری، القدر: ۶۶۰۱۔

کرلوں یا اپنی خواہش کے پیش نظر بیوی کو طلاق دے دوں؟

جواب ارشادِ باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''اور عورتوں میں سے جو اچھی تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کرلو، دو دو، تین تین، چار چار لیکن اگر تمہیں عدل وانصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی کافی ہے۔ [1]

اس آیت کریمہ سے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا جواز ملتا ہے لیکن اسے عدل وانصاف کرنے سے مشروط کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک شادی کرنے کی شرائط حسب ذیل ہیں: ① اسے صحیح معنوں میں شادی کرنے کی رغبت ہو، محض شوق پورا کرنا مقصود نہ ہو۔ ② وہ شخص بدنی اور مالی طور پر دوسری شادی کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ ③ دونوں کے درمیان حتی المقدور عدل و انصاف کرنے کا بھرپور جذبہ ہو۔

اس سلسلہ میں معاشرتی طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پہلی بیوی کو اعتماد میں لے۔ اگرچہ شرعی طور پر ایسا کرنا ضروری نہیں تاہم انجام ونتیجہ کے طور پر اسے چاہیے کہ پہلی بیوی سے مشورہ ضرور کرلے۔ دوسری شادی کا جذبہ رکھتے ہوئے یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عورت کی طبیعت میں بہت زیادہ غیرت ہوتی ہے، وہ یہ نہیں چاہتی کہ کوئی دوسری عورت خاوند کے ساتھ اس کی محبت میں شریک ہو۔ عورت میں اس طرح کی غیرت کا پایا جانا کوئی باعث ملامت چیز نہیں کیونکہ یہ غیرت امہات المومنین اور دیگر صحابیات میں بھی پائی جاتی تھی، لیکن یہ غیرت اس حد تک نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جائز کردہ اشیاء پر حرف گیری کرے اور اس پر اعتراض کرنے لگے بلکہ اسے چاہیے کہ اگر اس کا خاوند دوسری شادی کا ضرورت مند ہے اور یہ اس کی ضرورت پورا کرنے سے قاصر ہے تو وہ اس نیکی میں اس کا بھرپور تعاون کرے۔ امید ہے کہ اللہ کے ہاں اسے اس تعاون پر اجر وثواب ملے، لیکن اس کا خاوند سے اس بناء پر طلاق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: (ترجمہ) ''جو کوئی عورت کسی ضرورت کے بغیر اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔'' [2]

بیوی کو چاہیے کہ صدق دل سے حالات کا جائزہ لے محض جذبات سے کام نہ لے، کیونکہ جذباتی باتوں میں سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ وہ دوسری بیوی کی موجودگی میں اس کے ساتھ زندگی نہیں بسر کرسکتی تو اسے شریعت کی طرف سے خلع لینے کی اجازت ہے لیکن اگر وہ ایسے حالات میں خاوند کے ساتھ گزارہ کرسکتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس تنگی اور تکلیف پر صبر کرے۔ خاوند کو بھی چاہیے کہ وہ زمینی حقائق پر نظر رکھتے ہوئے خواہ مخواہ اس ''پنگے'' میں نہ پڑے بلکہ وہ حسن معاشرت کے پیش نظر اپنی ضرورت پر نظر ثانی کرلے، کیونکہ یہ عورتوں کی فطرت ہے کہ انہیں ایسے معاملات سے بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں استخارہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا رہے کیونکہ وہی مشکلات کو حل کرسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال میری بہن شادی شدہ ہے لیکن وہ اپنے خاوند کے ہاں نہیں رہنا چاہتی بلکہ وہ طلاق لینے پر اصرار کرتی ہے اور خاوند بھی بہت ضدی انسان ہے، اب ہم پریشان ہیں کہ کیا کیا جائے، ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ براہ کرم اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

---

[1] النساء: ۳۔ [2] ابو داود، الطلاق: ۲۲۲۶۔

جواب: اگر خاوند اپنی بیوی کے شرعی حقوق ادا کرتا ہے تو بیوی کا خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرنا حرام اور ناجائز ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے بلکہ اس کام پر سخت وعید سنائی ہے، فرمان نبوی ہے: ''جو کوئی عورت کسی سبب کے بغیر اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔'' [1]

کسی سبب کے بغیر کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی سختی یا تکلیف کے بغیر جو طلاق تک لے جائے، مگر جب بیوی مجبور ہو جائے اور خاوند اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہو یا اس کا اخلاق وکردار صحیح نہ ہو یا اس کے علاوہ کوئی بھی سنگین سبب ہو تو بیوی اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے، اگر وہ طلاق نہیں دیتا تو عدالتی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ عورت، عدالت میں اپنے سارے معاملہ کی وضاحت کرے پھر عدالت خاوند سے بیوی کے حقوق کی ادائیگی کروائے یا پھر اس سے طلاق دلوائے، اگر خاوند عدالت میں حاضر نہ ہو یا طلاق نہ دینے پر اصرار کرے تو عدالت کو اختیار ہے کہ وہ عورت کو خاوند کے خلاف فسخ نکاح کی ڈگری دے۔ عدالتی فیصلے کے ایک ماہ بعد عورت کو عقد ثانی کرنے کی اجازت ہے۔ (واللہ اعلم)

نکاح کے لئے سرکاری رجسٹریشن

سوال: نکاح کے لئے سرکاری کاغذات میں اندراج کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کے بغیر نکاح ہو جاتا ہے، قرآن و حدیث کے مطابق جواب دیں؟

جواب: نکاح کے لئے بنیادی طور پر چار شرائط حسب ذیل ہیں:

① جس عورت سے نکاح کرنا ہے وہ رضامند ہو اور اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔ ② عورت کا سرپرست اس نکاح کی اجازت دے کیونکہ اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ ③ حق مہر بھی ضروری ہے، قرآن کریم میں اس کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

④ نکاح گواہوں کی موجودگی میں کیا جائے اور اس کا باقاعدہ اعلان ہونا چاہیے۔

شرعی نکاح کے لئے مذکورہ بالا چار چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے لیکن رائج الوقت قانون کے مطابق اس کا اندراج کرانے میں چنداں حرج نہیں تاکہ آئندہ کسی قسم کی مشکل پیش آئے تو قانونی طور پر کوئی پریشانی نہ ہو۔ رجسٹرڈ کرانے میں حقوق کا تحفظ بھی ہوتا ہے اور آئندہ مفاسد سے بھی بچا جا سکتا ہے، پھر ملکی قانون اگر کتاب وسنت کے منافی نہ ہو تو اسے عمل میں لانا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ''اولی الامر'' کی اطاعت سے مراد ملکی قوانین کی پابندی ہے بشرطیکہ وہ قرآن وحدیث کے خلاف نہ ہوں، اس بنا پر ہمارے رجحان کے مطابق شرعی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ملکی قانون پر عمل درآمد یقینی بنانا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

دودھ پلانے سے کب حرمت ثابت ہوگی؟

سوال: میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں، میرے دو بیٹے بھی ہیں، شنید ہے کہ میری والدہ نے میرے خاوند کو ایک دفعہ دودھ پلایا تھا جبکہ وہ چھوٹا تھا، رو رہا تھا اور اس کی والدہ موجود نہ تھی، اب مجھے اس وجہ سے شکوک وشبہات نے گھیر لیا ہے، پتہ نہیں میرا نکاح صحیح ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں؟

---

[1] ابو داود، الطلاق: ٢٢٢٦۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ جو رشتے خون اور ولادت سے حرام ہوتے ہیں وہ کسی عورت کا دودھ پینے سے بھی حرام ہو جاتے ہیں، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت (خون) سے حرام ہوتے ہیں۔'' ❶

لیکن یہ حرمت کتنا دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے اور کس عمر میں دودھ پیا جائے تو معتبر ہوگی؟ اس کے متعلق علمائے امت میں اختلاف ہے، ہمارے رجحان کے مطابق حرمت کے ثبوت کے لئے حسب ذیل دو شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

① کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پہلے یہ حکم نازل کیا تھا کہ دس رضعات سے حرمت ثابت ہوتی ہے پھر اسے پانچ رضعات سے منسوخ کر دیا۔'' ❷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اس سالم کو اپنا دودھ پلا دو، چنانچہ اس نے اس کو پانچ رضعے (پانچ بار) دودھ پلا دیا۔ اس طرح وہ اس کے رضائی بیٹے کی طرح ہو گیا۔ ❸

بلکہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسے حکم دیا تھا کہ تو اسے پانچ مرتبہ دودھ پلا دے۔ ❹

ایک رضعہ سے مراد یہ ہے کہ بچہ عورت کی چھاتی کو منہ میں لے اور اس سے دودھ چوسنا شروع کر دے، جبکہ تک وہ پستان کو منہ میں لے کر پیتا رہے گا یہ ایک رضعہ کہلائے گا خواہ یہ مدت طویل ہو یا قلیل، اگر کسی عارضہ کی وجہ سے دودھ پینا چھوڑ دیا مثلاً سانس لینے کے لئے یا کسی اور وجہ سے چھوڑ کر دوسری طرف مشغول ہو گیا پھر جلد ہی دوبارہ دودھ پینا شروع کر دے تو یہ عارضی وقفہ غیر معتبر ہوگا اور اسے ایک مرتبہ پینا ہی شمار کیا جائے گا۔ اس طرح پانچ مرتبہ پینے سے حرمت ثابت ہوگی، ایک دو دفعہ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''ایک دفعہ اور دو دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔'' ❺

بہر حال ایک دو دفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینا ضروری ہے جیسا کہ احادیث بالا سے بصراحت معلوم ہوتا ہے۔

② دوسری شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے کی مدت کے دوران دودھ پیا جائے اور دودھ پلانے کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے، یعنی دو سال کے اندر اندر دودھ پیا جائے تو اس کا اعتبار کیا جائے گا جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صرف وہی رضاعت حرمت ثابت کرتی ہے جو انتڑیوں کو کھول دے اور دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔'' ❻

انتڑیوں کو کھول دے سے مراد یہ ہے کہ اس کی خوراک صرف دودھ ہو جس سے بچہ پروان چڑھے اور پرورش پائے چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ''رضاعت اسی وقت معتبر ہے جب بھوک کے وقت دودھ پیا جائے۔'' ❼

---

❶ صحیح بخاری، النکاح: ٢٦٤٤۔ ❷ ابو داود، النکاح: ٢٠٦٢۔ ❸ ابو داود، النکاح: ٢٠٦١۔
❹ مسند امام احمد ص ٢٠١ ج٦۔ ❺ صحیح مسلم، الرضاع: ١٤٥٠۔ ❻ سنن ترمذی، الرضاع: ١١٥٢۔
❼ صحیح بخاری، النکاح: ٥١٠٢۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ ہے کہ اس رضاعت کا اعتبار ہوگا جو دو سال کے دوران ہو۔ [1]

بہر حال اس رضاعت کا اعتبار ہوگا جس میں دو سال کے دوران کم از کم پانچ دفعہ دودھ پیا جائے۔ صورت مسئولہ میں سائلہ کو چاہیے کہ وہ شکوک وشبہات کا شکار نہ ہو، محض ایک دفعہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ (واللہ اعلم)

جہیز کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے معاشرہ میں بچی کی شادی کے موقع پر جہیز کو لازمی قرار دیا گیا ہے، جس کے پاس وسائل نہیں ہوتے وہ کسی سے قرض لے کر اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرتا ہے، اسلام، ہمارے لئے ایک نظام زندگی ہے، اس میں جہیز دینے یا لینے کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب لفظ جہیز عربی لفظ ''جہاز'' سے ماخوذ ہے، احادیث میں یہ لفظ دو مفہوم میں استعمال ہوا ہے:

① رخصتی کے موقع پر باپ کا اپنی بچی کو نیا گھر بسانے کے لئے کچھ سامانِ ضرورت دینا۔

② دلہن کو شب زفاف کے لئے تیار کرنا اور اسے عمدہ لباس سے آراستہ کرنا۔

رخصتی کے موقع پر لڑکی کو جہیز دینا ایک معاشرتی مسئلہ ہے جسے ہم نے انتہاء پسندی کی سان پر چڑھا دیا ہے، ہمارے ہاں موجودہ جہیز کی صورت یہ ہے کہ بچی کو شادی کے موقع پر اسے لازمی چیز بنا لیا گیا ہے، خواہ کسی کے وسائل اس کے متحمل نہ ہوں اور اسے قرض پکڑ کر یہ ''فریضہ'' سرانجام دینا ہوتا ہے۔ پھر ہم نے ضروریات زندگی کے علاوہ تمام تمدنی سہولتوں اور آسائشوں تک اسے وسیع کر دیا ہے خواہ لڑکے والوں کے ہاں اسے رکھنے کے لئے جگہ میسر نہ ہو۔ نیز جو بچی جہیز کے بغیر سسرال جاتی ہے سسرال والے اس کا جینا محال کر دیتے ہیں، اسے ہر طرف طعنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہم نے اسے وراثت کے قائم مقام بنا لیا ہے اور اس بنیاد پر عورتوں کو وراثت سے حصہ نہیں دیا جاتا۔ کچھ حضرات اس کے برعکس دوسری انتہا پر ہیں، وہ اسے بالکل حرام قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ والد جب اپنی لخت جگر کو شادی کے موقع پر گھر سے رخصت کرتا ہے تو حسب استطاعت کچھ سامان ضرورت دینا دونوں کے لئے باعث فرحت وانبساط ہے۔ محدثین کرام نے اس مسئلہ کو اپنی کتب حدیث میں بیان کیا ہے چنانچہ امام نسائی نے اپنی سنن میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: '' باب جھاز الرجل ابنته'' باپ کی طرف سے اپنی بیٹی کو (شادی کے موقع پر) سامان ضرورت دینا۔ پھر حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو چادر، مشکیزہ اور ایک تکیہ دیا جس میں روئی کے بجائے اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔ [2]

ایک روایت میں مذکورہ سامان کے ساتھ چکی اور دو مٹکوں کا بھی ذکر ہے۔ [3]

ان روایات کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ابو طالب انتہائی مفلس آدمی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مدد کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی کفالت میں لے لیا، جب وہ جوان ہوئے تو اپنی لخت جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ان سے کر دیا، اس موقع پر ان کا الگ گھر بسانے کے لئے ضروری سامان زندگی انہیں مہیا کر دیا گیا، اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مالی حالت بھی انتہائی

---

[1] بیہقی ص ۵۵۲ ج ۷۔ [2] سنن نسائی، النکاح : ۳۳۸۶۔ [3] مسند امام احمد ص ۱۰۴ ج ۱۔

کمزور تھی چونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے زیر کفالت تھے، اس لئے آپ نے مذکورہ سامان ایک نیا گھر آباد کرنے کے لئے دیا، اس کا رائج الوقت جہیز سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ دور حاضر میں دولہا میاں کوئی غریب نہیں ہوتا کہ اس کا گھر بھاری بھرکم جہیز کے ذریعے ساز و سامان سے بھر دیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا مقصد تعاون تھا اور اس تعاون کے پیچھے جذبہ ہمدردی کارفرما تھا جبکہ ہمارے ہاں نہ تو تعاون مقصود ہوتا ہے اور نہ ہی ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے، محض عزت نفس اور دولہا میاں کی طلب کو پورا کرنے کے لئے لاکھوں روپیہ جہیز کی نذر کر دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سسرال کے ہاں جہیز کے سامان کو رکھنے اور سنبھالنے کے لئے جگہ بھی نہیں ہوتی یہ کس قدر ظلم وستم ہے کہ لڑکی والوں سے اپنی پسند کا جہیز لینے کے لئے ان کے ہاتھ میں لمبی چوڑی فہرست تھما دی جائے۔ ہمارے نزدیک لڑکے والوں کی طرف سے احسان مندی کے بجائے ان مطالبات کے ذریعے احسان فراموشی کا اظہار ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو ''قوام'' کی حیثیت دی ہے، جہیز کا مطالبہ اس کے شیوۂ مردانگی کے بھی خلاف ہے۔ جہیز کے سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ سادگی کے ساتھ رخصتی کے وقت اگر کوئی اپنی بچی کو ضروریات زندگی دیتا ہے تو اس میں چنداں حرج نہیں، بشرطیکہ مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے:

① اسے ضروریات زندگی تک محدود رکھا جائے اور تمدنی سہولتوں اور آسائشوں تک وسعت نہ دی جائے۔

② بقدر ضروریات دیا جائے اور چالیس، چالیس گرمی اور سردی کے بستروں پر مشتمل نہیں ہونا چاہیے۔

③ اسے شادی کا جزو خیال نہ کیا جائے کہ اس کے دیئے بغیر شادی نامکمل رہتی ہے۔

④ لڑکے والوں کی طرف سے کسی قسم کا مطالبہ نہ ہو بلکہ سرپرست اپنی خوشی سے جو دینا چاہے دے دے۔

⑤ خود سرپرست بھی حسب استطاعت دے ایسا نہ ہو کہ بچی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے زندگی بھر مقروض رہے۔

⑥ جو کچھ دینا چاہے نہایت سادگی اور خاموشی سے دے دیا جائے، اسے فخر ومباہات کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

⑦ اس سلسلہ میں عدل وانصاف سے کام لیا جائے اور باقی بچوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا جائے۔

⑧ اس سامان زندگی کے عوض بچی کو وراثت سے قطعاً محروم نہ کیا جائے۔

⑨ کوئی ناجائز چیز یا جس کا استعمال ناجائز ہو اسے جہیز میں نہ دیا جائے۔

بہر حال مبالغہ آمیزی، نمود ونمائش، شہرت وریاکاری سے اجتناب کرتے ہوئے فضولیات زندگی کے بجائے ضروریات زندگی کے پیش نظر اگر کوئی باپ یا سرپرست شادی کے وقت اپنی بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے کچھ سامان دیتا ہے تو اس پر شرعاً کوئی قدغن نہیں۔ (واللہ اعلم)

خاوند فوت ہونے کے بعد بیوی کا شادی نہ کرنا

سوال بعض میاں بیوی آپس میں معاہدہ کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے اگر کوئی فوت ہو جائے تو دوسرا عمر بھر کسی دوسرے

سے شادی نہیں کرتے گا، کیا ایسا معاہدہ کیا جا سکتا ہے، شریعت میں اس کی گنجائش ہے، وضاحت کریں؟

جواب میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں، ظاہر ہے کہ ایک کی وفات کے بعد دوسرے کی ضروریات متاثر ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ شادی سے مقصود عفت وعصمت کی حفاظت ہے، اس لئے ایک کی وفات کے بعد دوسرے فریق کو چاہئے کہ اگر حالات سازگار ہوں تو عقد ثانی کر لے۔ شریعت نے دوسری شادی پر کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ اس کی ترغیب دلائی ہے اور اور حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ چنانچہ ہم خیر القرون میں دیکھتے ہیں کہ متعدد حضرات کی بیویاں فوت ہوئیں تو انہوں نے عقد ثانی کئے تھے۔ اسی طرح متعدد خواتین بھی ایسی ہیں جنہوں نے خاوند کی وفات کے بعد دوسری شادیاں کی تھیں۔ لیکن اگر کوئی بیوی اپنے خاوند کی وفات کے بعد دوسری شادی نہیں کرتی اور پاکدامنی کی حفاظت کرتی ہے شریعت میں اس کی بھی گنجائش ہے۔ اگر کوئی میاں بیوی ایسا معاہدہ کر لیتے ہیں تو اس کی بھی قرون اولیٰ میں مثالیں ملتی ہیں، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی بیوہ ام الدرداء کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے عقد ثانی سے انکار کر دیا اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی جس کے الفاظ یہ ہیں: ''عورت، قیامت کے دن آخری خاوند کی ہوگی۔''

انہوں نے مزید کہا کہ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ پر کسی کو ترجیح نہیں دینا چاہتی اور نہ کسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ [1]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی بیوی سے کہا تھا: ''اگر تم چاہتی ہو کہ جنت میں میری بیوی بنو تو میرے بعد کسی اور سے شادی نہ کرنا کیونکہ عورت، جنت میں اپنے آخری دنیوی شوہر کی بیوی ہوگی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر آپ کے بعد نکاح ثانی کرنا ممنوع قرار دیا کیونکہ وہ جنت میں بھی آپ کی بیویاں ہوں گی۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''تم دنیا اور آخرت میں میری بیوی ہو۔'' [3]

ان احادیث وآثار کے پیش نظر اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی وفات کے بعد عقد ثانی نہیں کرتی تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی خاوند اپنے بچوں کی تربیت کے پیش نظر بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی نہیں کرتا تو اس پر بھی دوسرے نکاح کے لئے دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

کزن میرج

سوال ''کزن میرج'' کی شرعی حیثیت کیا ہے، جدید طب کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ کزن میرج کی وجہ سے پیدا ہونے والی اولاد موروثی بیماریوں سے محفوظ نہیں رہتی، اس لئے اپنے رشتہ داروں سے باہر شادی کرنا چاہیے، وضاحت کریں؟

جواب ہم مسلمان ہیں، ہمیں زندگی گزارنے کے لئے ہر قسم کی راہنمائی کتاب وسنت سے لینا چاہیے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مغربی تہذیب جو بات کہے وہ حدیث بن جائے اور جس کی وہ مخالفت کرے ہم بھی سوچے سمجھے بغیر اس کی مخالفت شروع کر دیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کی بعض ریاستوں میں کزن میرج پر قانونی پابندی عائد ہے کیونکہ ان کے نزدیک ایسا کرنا بیماریوں کو

---

[1] الاحادیث الصحیحہ ص ۲۷۵ ج۳۔ [2] بیہقی ص ۷۰ ج۷۔ [3] مستدرك حاكم ص ۱۰ ج٤۔

دعوت دینا ہے۔ ہم لوگ بھی ان کی دیکھا دیکھی اس طرح کا ذہن رکھتے ہیں کہ کزن میرج بیماریوں کا پیش خیمہ ہے اور ہمارے زرخرید میڈیا نے بھی اس قسم کا شور مچا رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے جو چیزیں حلال کی ہیں وہ ہرگز انسانوں کے لئے نقصان دہ نہیں اور جو چیزیں اسلام نے حرام کی ہیں وہ کسی صورت میں ہمارے لئے فائدہ مند نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہمیں قرآن وحدیث سے راہنمائی لینی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اے نبی! ہم نے تمہارے لئے حلال کر دیں تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کئے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں اور تمہاری وہ چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے۔ [1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کزن میرج کی زد میں جتنے بھی رشتے آتے ہیں، ان کا نام لے کر وضاحت کی ہے کہ وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔ اگر طبی نقطہ نظر سے ان میں کوئی خرابی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو اس سے منع کر دیتے اور آپ کی امت پر بھی پابندی لگا دیتے۔ لیکن اسلام نے ایسا کرنے کے بجائے ان رشتوں کی ترغیب دی ہے اور جن میں کوئی اخلاقی یا روحانی قسم کا خطرہ تھا تو ان پر پابندی لگائی ہے۔ کزن میرج کی وجہ سے جو خدشات ظاہر کئے جاتے ہیں ان کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض موروثی امراض والدین سے اولاد میں منتقل ہو جائیں لیکن یہ بھی ضروری نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک نسل کسی مرض میں مبتلا رہی ہے تو اسی گھرانے کی کئی نسلیں بالکل اس مرض سے محفوظ رہتی ہیں۔ بہر حال یہ لازمی نہیں کہ کزن میرج ہی بیماریوں کا سبب ہے بلکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ بیماریاں اللہ کی طرف سے ہیں وہ جس کو چاہتا ہے بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے، کبھی بیماری کا کوئی سبب ہوتا ہے اور کبھی بغیر سبب کے بھی بیماری لگ جاتی ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق کزن میرج بالکل درست ہے اور ایسا کرنے سے بیمار اولاد پیدا ہونا ضروری نہیں۔ (واللہ اعلم)

منگنی کا شرعی حکم

سوال ہمارے ہاں کچھ علماء کا خیال ہے کہ منگنی، نکاح کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں رشتہ دینے اور لینے کا اقرار ہوتا ہے جسے شرعی اصطلاح میں ایجاب وقبول کہا جاتا ہے، اس کے متعلق شریعت کا موقف کیا ہے؟

جواب منگنی نکاح نہیں، بلکہ نکاح کا وعدہ ہوتا ہے یعنی فریقین یہ عہد و پیمان کرتے ہیں کہ فلاں لڑکی کا فلاں لڑکے سے نکاح کیا جائے گا، اس قول واقرار کو پورا کرنا اخلاقی فرض سمجھا جائے، اگر کوئی معقول عذر ہو تو اس عہد و پیمان کو توڑا بھی جا سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ منگنی کے بعد فریقین میں سے کسی ایک پر دوسرے کا کوئی عیب ظاہر ہو جائے جو پہلے معلوم نہ تھا یا اسے دانستہ چھپایا گیا تھا تو ایسے حالات میں قول وقرار کو ختم کیا جا سکتا ہے لیکن کسی معقول وجہ کے بغیر اسے ختم کر دینا شرعاً جائز نہیں۔ یہ بھی دوسری بدعہدیوں کی طرح ایک بدعہدی ہے جس کے متعلق اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق منگنی نکاح نہیں کیونکہ اس میں ایجاب وقبول اور دیگر شرائط نکاح مفقود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منگنی کے بعد لڑکا فوت ہو جائے تو لڑکی اس کی وارث نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کے ذمے کوئی عدت وغیرہ ہے کیونکہ وہ فوت

---

[1] الاحزاب: ۵۰۔

ہونے والے کی بیوی نہیں بلکہ اس کے لئے ابھی اجنبی کی حیثیت رکھتی ہے۔

بیوی کے لئے عقد نکاح کا ہونا ضروری ہے جو ابھی تک نہیں ہوا، ابھی تک تو نکاح کرنے پر اتفاق ہی ہوا تھا صرف اتنی چیز سے نکاح نہیں ہوتا، اس کے لئے دیگر لوازمات بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کے اندازِ بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ منگنی اور نکاح میں فرق ہے کیونکہ اس میں دوران عدت خطبۃ النساء اور عقدۃ النکاح کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اگر تم ایام عدت میں اشارہ کے طور پر عورتوں کو پیغام نکاح بھیجو یا نکاح کی خواہش کو اپنے دل میں مخفی رکھو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔''

آگے فرمایا: ''اور جب تک عدت پوری نہ ہو جائے تم نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرو'' [1]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبۃ النساء اور عقدۃ النکاح دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف منگنی کر دینے سے نکاح نہیں ہوتا، یہ بات ہمارے ہاں عرف کے بھی خلاف ہے۔ اہل علم میں سے کسی نے بھی اس قسم کی بات نہیں کہی کہ منگنی سے نکاح ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

لڑکی والوں کی طرف سے نکاح کی پیشکش

سوال ہمارے معاشرہ میں لڑکی کی شادی کے معاملہ میں لڑکے والوں کی طرف سے پہل کا انتظار کیا جاتا ہے، چنانچہ اس انتظار میں کچھ لڑکیاں جوانی کی حد کو عبور کر جاتی ہیں، اس کے متعلق شریعت میں کیا ہدایات ہیں؟

جواب ہمارے معاشرے میں جو صورت رائج ہے یہ کسی حد تک فطرت کے ہم آہنگ ہے یعنی لڑکے والوں کی طرف سے ابتدا ہوتی ہے۔ وہ اپنی طلب کا اظہار پہلے کرتے ہیں، لیکن اسے حد سے زیادہ بڑھانا مناسب نہیں۔ اگر کسی شخص کو کوئی مناسب رشتہ نظر آتا ہے تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں کہ لڑکی والے خود پیغام دینے میں ابتدا کرے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''آدمی کا اہل خیر کو اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ پیش کرنا'' [2]

اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بطور دلیل پیش کیا ہے کہ جب ان کی لخت جگر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بیوہ ہو گئیں تو انہوں نے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بیٹی کا رشتہ پیش کیا، انہوں نے فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں غور و فکر کر کے آپ کو آگاہ کروں گا، اس کے بعد انہوں نے ''نہ'' میں جواب دے دیا۔ پھر انہوں نے ان کا رشتہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پیش کیا تو وہ خاموش رہے، انہوں نے ہاں یا نہ میں کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر کے اس رویے سے دکھ ہوا تاہم چند دنوں کے بعد رسول اللہ کی طرف سے پیغام نکاح آیا تو انھوں نے ان سے بیٹی کا رشتہ کر دیا۔

نکاح کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی کہ آپ کی بیٹی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجھ سے ذکر کیا تھا، اس لئے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا نہیں کرنا چاہتا تھا، اگر آپ اسے ترک کر دیتے تو میں ضرور اس رشتہ کو قبول کر لیتا۔ [3]

اس طویل حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکی والے بھی رشتے کے سلسلہ میں پہل کر سکتے ہیں، انہیں چاہیے کہ اگر مناسب رشتہ نظر آئے تو لڑکے والوں کی طرف سے پہل کا انتظار نہ کریں بلکہ خود رشتے کی پیشکش کر دیں، اس میں اللہ کی طرف سے خیر و برکت ہو

---

[1] البقرۃ: ۲۲۵۔ [2] صحیح بخاری، النکاح باب نمبر ۳۴۔ [3] صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۲۲۔

گی ،لیکن انتظار میں غلو کرنا جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

دینی لحاظ سے پسندیدہ شخص

سوال میرے قریبی رشتہ داروں میں ایک لڑکا حافظ قرآن ہے اور اخلاقی اعتبار سے بھی اچھا ہے، لیکن میرے والد گرامی اس کے ساتھ میرا نکاح کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، مجھے اس سلسلہ میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے تا کہ میرا نکاح دینی لحاظ سے پسندیدہ شخص سے ہو جائے؟

جواب نکاح کے متعلق اسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ اپنی پسند کی بجائے دین کو ترجیح دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے جس کا دین اور اخلاق تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کو دینی لحاظ سے لڑکی کی مصلحت کا خیال رکھنا چاہیے، وہ کسی صورت میں اپنی مصلحت کو پیش نظر نہ رکھیں۔ اگر قریبی رشتہ داروں میں کوئی ایسا لڑکا موجود ہے جو دینی اور اخلاقی اعتبار سے اچھا ہے اور لڑکی کا رجحان بھی اس کی طرف ہے تو والد کو چاہیے کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ وہاں کر دے۔ ہاں اگر لڑکی ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے جو دینی اور اخلاقی طور پر بہتر نہیں تو والد کو یہ حق ہے کہ حق ولایت استعمال کرتے ہوئے ایسی شادی میں رکاوٹ بن جائے، اگر اس کی بیٹی دینی اور اخلاقی لحاظ سے کسی اچھے لڑکے کا انتخاب کرتی ہے تو اس کے والد کو برضا و رغبت قبول کر لینا چاہیے، اس کے درمیان میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے ایسا کرنا حرام ہی نہیں بلکہ خیانت اور گناہ بھی ہے۔ ایسا کرنے سے جو بھی فتنہ اور فساد پیدا ہوگا وہ اس کا ذمہ دار اور اللہ کے ہاں اس کے متعلق جوابدہ ہوگا۔

ہم اس اعتبار سے لڑکی کو بھی نصیحت کرتے ہیں کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے۔ وہ قطعاً ایسا قدام نہ کرے جو اس کی اپنی عزت و آبرو کے منافی ہو، اپنی والدہ کو درمیان میں لا کر والد کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دے، پھر اللہ کے حضور دعا کا سلسلہ جاری رکھے، اللہ تعالیٰ بہتر اسباب پیدا کرنے والا ہے۔ (واللہ اعلم)

حق مہر میں زکوٰۃ

سوال نکاح کے موقع پر عورت کو جو حق مہر دیا جاتا ہے، آیا اس میں سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے، اگر ضروری ہے تو اس کی ادائیگی کس کے ذمے ہے، خاوند دے گا یا بیوی اس کے متعلق تفصیل سے آگاہ فرمائیں؟

جواب حق مہر دو طرح کا ہوتا ہے ایک مالی یعنی اس میں نقد رقم یا زیورات وغیرہ شامل ہوتے ہیں، دوسرا غیر مالی اس میں قرآن پڑھانا یا دینی تعلیم دینا بطور حق مہر شامل ہوتا ہے۔ حق مہر نقد رقم یا زیورات ہیں تو اگر حق مہر نصاب کی مقدار ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں سے زکوٰۃ دینا ضروری ہے کیونکہ یہ بھی دیگر اموال کی طرح ہے۔ اگر عورت نے نکاح کے موقع پر حق مہر

---

[1] سنن الترمذی، النکاح: ۱۰۸٤۔

وصول کرلیا اور وہ اس قدر ہے کہ نصاب کی مقدار یا اس سے زائد ہے تو سال گزرنے کے بعد وہ خود اس سے زکوٰۃ ادا کرے گی۔ اگر شادی کے موقع پر اس نے حق مہر وصول نہیں کیا بلکہ وہ مؤجل ہے تو اس صورت میں اس کی حیثیت قرض کی ہوگی۔ اگر اس کا خاوند صاحب حیثیت ہے اور فراخدلی کے ساتھ ادائیگی پر آمادہ ہے تو بھی ہر سال اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے جیسا کہ دوسروں کے ذمے واجب الاداء قرض سے زکوٰۃ دی جاتی ہے اور اگر خاوند تنگ دست ہے اور اس سے حق مہر ملنے کی اُمید نہیں، یا وہ مالدار ہے لیکن تنگ دلی اور بخل کی وجہ سے وہ حق مہر دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا تو اس صورت میں عورت ایسے حق مہر سے زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری نہیں، ہاں جس وقت اسے حق مہر کی رقم یا زیور مل جائے اس وقت سابقہ ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی، اس کے بعد حسب معمول زکوٰۃ دی جائے گی۔ اگر عورت نے نکاح کے موقع پر حق مہر وصول کرلیا لیکن رخصتی سے قبل ہی اسے طلاق مل گئی اس صورت میں وہ نصف مہر کی حقدار ہے، جیسا کہ سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۳۷ میں صراحت ہے ہے، اسے اس نصف حق مہر سے زکوٰۃ دینا ہوگی اور باقی نصف سے اس کا خاوند زکوٰۃ ادا کرے گا کیونکہ اس صورت میں وہ نصف حق مہر کی مالک ہے۔ حق مہر سے زکوٰۃ کون ادا کرے گا؟ چونکہ اس کی مالک بیوی ہے لہٰذا اصولی طور پر وہی اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کا بندوبست کرے گی، ہاں اگر خاوند خوشی سے اس کی زکوٰۃ اپنے پاس سے ادا کرتا ہے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

قبیلہ ''جون'' کی عورت کا نکاح

سوال غالباً بخاری میں ہے کہ ایک جونیہ عورت سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح ہوا، جب آپ اس عورت کے پاس گئے تو اس نے رسول اللہ ﷺ سے اللہ کی پناہ مانگی، اس کے بعد آپ نے اسے کچھ دے دلا کر واپس کر دیا، اس واقعہ کو بنیاد بنا کر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو ہدف بنایا جاتا ہے، اس واقعہ کی حقیقت سے آگاہ فرمائیں؟

جواب یہ واقعہ بخاری اور مسلم حدیث کی دونوں کتابوں میں مروی ہے، تمام روایات کی روشنی میں اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے: ''قبیلہ جون کا ایک سردار مسلمان ہوکر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے قبیلے میں ایک عورت بیوہ ہوگئی ہے اور وہ آپ سے نکاح پر آمادہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حالات معلوم کرنے کے بعد اس سے نکاح کرنے کی رضامندی فرما دی اور نکاح بھی کرلیا پھر اس کے وطن سے مدینہ طیبہ بلوا لیا، جو صاحب اسے لے کر آئے تھے انہوں نے ''بنو ساعدہ'' کی ایک حویلی میں ٹھہرایا اور رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دے دی، آپ وہاں تشریف لے گئے اور منکوحہ ہونے کی حیثیت سے اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور جب اس سے کوئی بات کی تو اس نے یہ کلمہ کہا: ''میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں'' یہ سن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے ایک ایسی ذات کی پناہ مانگی ہے جو پناہ مانگنے اور پناہ دینے کے قابل ہے، چنانچہ اس کے بعد آپ نے اسے طلاق دے دی اور کپڑوں کے جوڑے دے کر واپس اس کے گھر بھجوانے کا حکم دے دیا۔'' [1]

اب رہا یہ سوال کہ اس خاتون نے پناہ کیوں مانگی؟ اس کے متعلق بعض ناقابل اعتبار روایات میں کہا گیا ہے کہ کچھ ازواج مطہرات نے اسے سکھا دیا تھا کہ ''أعوذ باللّٰه منك'' کا کلمہ رسول اللہ ﷺ کو بہت پسند ہے، ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ یہ کلمہ سن

---

[1] صحیح بخاری، الطلاق: ٥٢٥٤، ٥٢٥٥، ٥٢٥٦، صحیح مسلم، الاشربہ: ٥١٩٥۔

کر اسے طلاق دے دیں، لیکن یہ روایات واقدی اور کلبی جیسے راویوں کی ہیں جو اپنے جھوٹ اور رفض میں مشہور ہیں، لہٰذا ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی امہات المومنین سے یہ توقع ہو سکتی ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق یہ خاتون دماغی طور پر نارمل نہیں تھیں، بخاری کی روایات سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ باپ کے کئے ہوئے نکاح پر راضی نہ ہو، جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے اشارہ ملتا ہے۔ ❶

بہر حال رسول اللہ ﷺ نے خاتون کے مذکورہ الفاظ سن کر اسے طلاق دے کر حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اسے کپڑوں کے جوڑے دے کر اپنے گھر بھجوا دو۔'' ❷ واقعہ تو اسی قدر ہے، اس میں تو رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرنے یا آپ کو ہدف تنقید بنانے کی کوئی بات نہیں۔ (واللہ اعلم)

بے نماز کا نکاح پڑھنا

سوال میرے پاس نکاح رجسٹر ہے اور میں نکاح خواں بھی ہوں بعض اوقات بے نماز کا نکاح پڑھنا پڑتا ہے، اس کے متعلق آپ کی راہنمائی درکار ہے، قرآن و حدیث کے مطابق ایسے نکاح کی کیا حیثیت ہے؟

جواب سوال میں سائل نے نکاح کے متعلق دو ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے ایک یہ کہ وہ نکاح کا اندارج کرتا ہے یہ اس کی قانونی ذمے داری ہے جسے بہر حال پورا کرنا چاہیے دوسری نکاح کی ذمہ داری ہے، جب کسی کو علم ہو کہ دونوں میں کوئی ایک بے نماز ہے تو دیکھ لیا جائے کہ وہ نماز کے قریب تک نہیں جاتا، ایسا آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس کا نکاح نہیں پڑھنا چاہیے۔ حدیث میں ترک صلوٰۃ کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کفر و شرک اور (مسلمان) بندے کے درمیان فرق نماز کا چھوڑ دینا ہے۔'' ❸

ایک روایت میں مزید وضاحت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندے اور کفر و ایمان کے درمیان (فرق کرنے والی) نماز ہے، جب اس نے نماز ترک کر دی تو اس نے شرک کیا۔'' ❹

ہاں اگر کوئی ایسا آدمی ہو جو سستی کی بنا پر نماز کو آگے پیچھے کر دیتا ہے لیکن وہ مستقل طور پر تارک نماز نہیں تو ایسے شخص کا نکاح پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اسے نصیحت ضرور کی جائے کہ نماز کی ادائیگی میں سستی نہیں کرنی چاہیے، بہر حال نماز کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہماری اصلاح فرمائے اور نماز پنجگانہ پر پابندی کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

سوال ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا، اہل خانہ نے دوران عدت ہی اس کی منگنی کر دی اور اسے سونے کی انگوٹھی پہنا دی، کیا کتاب و سنت کی رو سے ایسا کرنا صحیح ہے؟

جواب جو عورت اپنے خاوند کی وفات کے بعد عدت گزار رہی ہو، اسے اشارہ کے ساتھ تو پیغام نکاح دیا جا سکتا ہے لیکن کھلے طور پر دو ٹوک الفاظ میں اسے پیغام دینا جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ایسی بیواؤں کو اگر تم اشارہ کے ساتھ پیغام نکاح دے دو یا یہ بات اپنے دل میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں تم پر کوئی گناہ نہیں'' ❺

---

❶ صحیح بخاری، الطلاق: ٥٢٥٦۔ ❷ صحیح بخاری، الطلاق: ٥٢٥٥۔ ❸ صحیح مسلم، الایمان: ٨٢۔
❹ ترغیب و ترهیب ص ٣٧٩ ج١۔ ❺ البقرۃ: ٢٣٥۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عدت گزارنے والی بیوہ کو اشارہ کے ساتھ تو پیغام نکاح دیا جا سکتا ہے مگر واضح الفاظ میں پیغام دینا جائز نہیں۔مثلاً اسے یوں کہا جائے کہ میرا بھی نکاح کرنے کا ارادہ ہے، اس طرح پیغام دینے میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ کوئی دوسرا اس سے پہلے کوئی پیغام نہ دے دے۔البتہ جو عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو اسے اشارہ سے بھی کوئی ایسی بات کہنا حرام ہے۔صورت مسئولہ میں ایک بیوہ جو اپنے عدت کے ایام گزار رہی تھی اسے پیغام نکاح سے بالاتر ہو کہ اس کی منگنی کر دی گئی ہے پھر اسے نشانی کے طور پر منگنی کی انگوٹھی بھی پہنا دی گئی ہے، اس طرح دو گناہ کا ارتکاب کیا گیا ہے:

① دوران عدت پیغام نکاح واضح طور پر دے دیا گیا ہے جو شرعاً حرام ہے۔

② اسے دوران عدت سونے کی انگوٹھی پہنائی گئی حالانکہ عدت کے ایام میں زینت اس کے لئے حرام تھی۔اب یہ کام ہو چکے ہیں، سونے کی انگوٹھی کو اتار دیا جائے اور منگنی کرنے کے گناہ سے استغفار کیا جائے، یہ کوئی ایسا گناہ نہیں جس کے ارتکاب پر کوئی کفارہ ہوتا ہو، اس سے توبہ اور استغفار کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال میں ایک لڑکی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوں تو کیا براہ راست اس سے گفتگو کر سکتا ہوں، میرا اس سے شادی کا پیغام کس طرح ممکن ہے، اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

جواب ہمارے ہاں مشرقی روایات کے مطابق لڑکے کے سرپرست ہی پیغام شادی دیتے ہیں یعنی والدین کے ذریعے ہی منگنی وغیرہ کا پروگرام طے ہوتا ہے، کوئی لڑکا براہ راست ایسا کام نہیں کرتا اور نہ ہی لڑکی سے بات چیت کرنے کا مجاز ہے۔ اجنبی عورت سے بات چیت کرنے کے کچھ شرعی آداب حسب ذیل ہیں، اگر کوئی دوسرا پیغام نکاح دینے کے لئے موجود نہ ہو تو ان آداب کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

① مرد، عورت تک اس کے محرم یا اپنی محرم عورت کے ذریعے بات پہنچائے۔ ② اگر ایسا ممکن ہو تو ان کی یہ گفتگو خلوت وتنہائی کے بغیر ہو، نیز یہ کلام مباح اور جائز موضوع سے خارج نہ ہو۔ ③ فتنہ وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو، اگر اس طرح کی کلام سے لذت حاصل کرنے لگیں تو ایسا کرنا حرام ہے۔ ④ عورت کی طرف سے گفتگو میں نرم لہجہ اختیار نہ کیا جائے اور وہ مکمل پردے میں ہو۔

⑤ یہ گفتگو ضرورت سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

بہرحال ایسے موقع پر ضروری ہے کہ فتنہ میں مبتلا کر دینے والے اسباب سے احتراز کیا جائے، انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے اور اپنے مقصد کو ہر اس طریقہ سے حل کیا جا سکتا ہے جو لڑکی کے پاس جانے کے علاوہ ہو۔بہرحال اس سلسلہ میں ہر اس کام سے پرہیز کیا جائے جو حرام کام کی طرف لے جانے والا ہو یا حرام کے قریب کرنے والا ہو۔ (واللہ اعلم)

نمازی بیوی اور بے نماز خاوند

سوال بیوی مستقل طور پر نماز کی پابند ہے لیکن خاوند مستقل طور پر بے نماز ہے حتیٰ کہ عیدین کی نماز بھی نہیں پڑھتا، کیا ایسے حالات میں نکاح میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسے رشتہ کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب جو انسان مستقل طور پر بے نماز ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ آدمی کو کفر وشرک کے ساتھ ملا دینے والی چیز نماز کو چھوڑ دینا ہے۔'' ❶

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ وصیت فرمائی: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ خواہ تمہیں کاٹ دیا جائے یا جلا دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے اور جان بوجھ کر نماز ترک نہ کرو کیونکہ جو شخص جان بوجھ کر اسے ترک کرتا ہے وہ ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔'' ❷

حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے، جس نے اسے ترک کر دیا اس نے کفر کیا۔'' ❸

صحابہ کرام کا اس امر پر اتفاق تھا کہ تارک صلوٰۃ دائرہ اسلام سے خارج ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن شفیق فرماتے ہیں کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے علاوہ کسی عمل کے ترک کو کفر قرار نہیں دیتے تھے۔ ❹

کتاب وسنت کے مذکورہ دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے، ایسے حالات میں ایک مسلمان خاتون کا اس کے ہاں رہنا شرعاً درست نہیں، اگر کوئی شخص بالکل نماز نہیں پڑھتا حتیٰ کہ عیدین بھی نہیں پڑھتا تو ضروری ہے کہ اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے اگر وہ توبہ کر کے نماز شروع کر دے تو صورت مسئولہ میں ان کا میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا درست ہے، اگر وہ توبہ نہیں کرتا اور اپنی ترک نماز کی روش پر قائم ہے تو ایسے حالات میں ان کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے کیونکہ اسلام اور کفر یکجا جمع نہیں ہو سکتے۔ (واللہ اعلم)

طلاق کی نیت سے نکاح کرنا

سوال ایک آدمی حصول علم کے لئے بیرون ملک جاتا ہے اور وہاں بے حیائی سے بچنے کے لئے معینہ مدت تک کے لئے کسی عورت سے شادی کر لیتا ہے، اس کی نیت یہ ہے کہ جب تعلیم مکمل ہو جائے گی تو اسے طلاق دے دے گا لیکن وہ اپنی نیت کے بارے میں کسی کو آگاہ نہیں کرتا، کیا اس طرح نکاح کرنا جائز ہے؟

جواب طلاق کی نیت سے نکاح کرنا حرام اور ناجائز ہے کیونکہ ایسا کرنا مقاصد نکاح کے خلاف ہے، پھر نکاح بغرض طلاق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

① کہ آدمی نکاح کے وقت شرط لگائے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے طلاق دے دے گا، یہ نکاح متعہ کی ایک شکل ہے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے سال نکاح متعہ سے منع فرما دیا تھا۔ ❺

② دوسری صورت میں جس طرح کہ سوال میں مذکور ہے کہ بوقت نکاح اس کی نیت رکھے اور بطور شرط بوقت نکاح اس کا ذکر نہ کرے تو ایسا کرنا بھی حرام ہے کیونکہ نیت میں مخفی بات بھی مشروط کردہ کی طرح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''اعمال کا

---

❶ صحیح مسلم، الایمان: ۲۔ ❷ مجمع الزوائد ص ۲۱۶ ج ۴۔ ❸ مسند امام احمد ص ۳۴۶ ج ۵۔
❹ سنن الترمذی، الایمان: ۲۶۲۲۔ ❺ صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۱۵۔

دار و مدار نیتوں پر ہے، ہر آدمی کے لئے وہی کچھ ہوتا ہے جو اس نے نیت کی۔'' ❶

نکاح حلالہ بھی اس لئے حرام ہے کہ وہ پہلے خاوند کے لئے حلال کرنے کی نیت سے نکاح کیا جاتا ہے، اگرچہ نکاح کے وقت اس کا ذکر نہ کیا جائے تاہم اس کی گندی نیت کی وجہ سے ایسا نکاح حرام ہے۔ جس طرح حلالہ کی نیت نکاح کو فسخ کر دیتی ہے اسی طرح متعہ کی نیت بھی نکاح کو فسخ کر دیتی ہے۔ نیز یہ نکاح اس لئے بھی حرام ہے کہ اس میں بیوی اور اس کے خاندان کو دھوکہ دیا جاتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کی دھوکہ دہی سے منع فرمایا ہے، اگر عورت یا اس کے خاندان کو اس بات کا علم ہو جائے کہ یہ شخص ایک معینہ مدت تک کے لئے نکاح کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ کوئی شخص بھی اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح اس شرط پر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، خود نکاح کرنے والا بھی اس قسم کے نکاح کے لئے اپنی بیٹی یا بہن کا انتخاب نہیں کرتا۔ بہر حال اس قسم کے نکاح میں سنگین قسم کا دھوکہ اور فراڈ ہے، لہٰذا اس قسم کے تمام کام حرام اور ناجائز ہیں۔ (واللہ اعلم)

مہر بیوی کا حق ہے

سوال ہمارے ہاں کچھ لوگ لڑکی کو ملنے والا حق مہر خود وصول کر کے استعمال کر لیتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے، قرآن و حدیث کی رو سے اس کا جواب دیں؟

جواب شریعت اسلامیہ میں مہر بیوی کا خصوصی حق ہے اور یہ حق اسے ہی ملنا چاہیے، تاہم کچھ قبائل ایسے ہیں جو لڑکی کا مہر خود استعمال کرتے ہیں، جو شرعاً ناجائز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی ادا کرو۔'' ❷

دور جاہلیت میں لوگ نکاح کے وقت لڑکی کا مہر خود لے لیتے اور اسے استعمال کر لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی روک تھام کے لئے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں حضرت عبد الرحمن بن عوف رحمہ اللہ نے ایک انصاری عورت سے شادی کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسے کتنا مہر دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا ''ایک کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا دیا ہے۔'' ❸

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مہر عورت کا حق ہے اور عورت کو ہی دیا جاتا تھا البتہ اگر لڑکی، اپنا حق کسی کو دے دیتی ہے تو اسے استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں، وہ استعمال کرنے والا لڑکی کا والد، بھائی یا خاوند ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح وہ لڑکی اپنے حق مہر سے کچھ معاف کر دے تو بھی جائز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی ادا کرو، ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو شوق سے اسے خوش ہو کر کھاؤ۔'' ❹

بہر حال مہر لڑکی کا حق ہے اس کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔

ذاتی مفاد کے لئے نکاح کرنا

سوال میں بیرون ملک میں زیر تعلیم ہوں، میں نے شادی الاؤنس لینے کے لئے ایک لڑکی سے نکاح کیا ہے لیکن میری

---

❶ صحیح بخاری، الوحی: ١۔ ❷ النساء: ٤۔ ❸ صحیح بخاری، النکاح: ٥١٦٧۔ ❹ النساء: ٤۔

نیت شادی کی نہیں تھی ، میں نے یہ نکاح گواہوں کی موجودگی ،لڑکی کے والدین اور اپنے والدین کی رضامندی سے کیا ہے، اس قسم کے نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب جب نکاح کے تمام ارکان اور شرائط پائی جائیں اور ایجاب وقبول ہو جائے تو نکاح واجب ہو جاتا ہے خواہ نکاح کرنے والے کی نیت ذاتی مفادات کا حصول ہی کیوں نہ ہو، اس قسم کی نیت کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ احناف، شوافع، حنابلہ اور مالکی حضرات اس قسم کے نکاح کو صحیح قرار دیتے ہیں، خواہ ہنسی مذاق میں ہی کیوں نہ ہو۔ ان حضرات کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تین باتیں ایسی ہیں جنہیں اگر سنجیدگی سے کیا جائے تو بھی پختہ ہیں اور اگر مذاق میں انہیں کیا جائے تو بھی پختہ ہیں: ایک نکاح، دوسری طلاق اور تیسرا رجوع۔ [1]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تینوں کام حقیقی طور پر سنجیدگی سے کئے جائیں تو حقیقت پر مبنی ہوں گے اور اگر بطور مذاق کئے جائیں تو بھی حقیقت ہی ہوں گے۔ اس لئے ہمارے رجحان کے مطابق سوال میں مذکورہ نکاح حقیقت پر مبنی اور اسے واجب قرار دیا جائے گا، اگرچہ نکاح کرنے والے کی نیت ذاتی مفادات کا حصول تھا۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''عام علماء کے ہاں مذاق میں طلاق دینے والے کی طلاق بھی واقع ہو جائے گی اور اسی طرح اس کا نکاح بھی صحیح ہے کہ مرفوع حدیث کے متن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام کا مؤقف بھی یہی ہے اور مشہور اہل علم نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ [2]

طلاق اور خلع میں فرق

سوال بعض دفعہ عدالت، عورت کے حق میں خلع کی ڈگری جاری کر دیتی ہے جبکہ خاوند نے اسے طلاق نہیں دی ہوتی، اس خلع اور طلاق میں فرق واضح کریں، کیا خلع کی صورت میں خاوند کا طلاق دینا ضروری نہیں؟

جواب جب عورت کسی وجہ سے اپنے خاوند کے پاس نہ رہنا چاہتی ہو اور خاوند اسے طلاق نہ دے تو اسے بذریعہ عدالت خلع لینے کا حق ہے خواہ خاوند اسے طلاق نہ بھی دے، عدالت کی طرف سے خلع کی ڈگری ہونے کے بعد عورت آزاد ہے۔

خلع اور طلاق میں درج ذیل فرق ہے:

- طلاق دینا مرد کا حق ہے جبکہ خلع لینا عورت کا حق ہے۔
- خلع میں خاوند کو رجوع کا حق نہیں ہوتا جبکہ طلاق رجعی میں اسے رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔
- طلاق میں عدت تین حیض ہے جبکہ خلع میں عدت ایک حیض ہے۔
- طلاقوں کی تعداد تین ہے، جب کہ آخری طلاق ہو جائے تو عورت مرد کے لئے حلال نہیں ہوگی، جبکہ خلع کے بعد نکاح تو ختم ہو جاتا ہے لیکن نئے نکاح سے دوبارہ تعلقات بحال ہو سکتے ہیں۔ بہر حال خلع ،عورت کا حق ہے وہ اسے جب چاہے استعمال کر سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابو داود، الطلاق : ٢١٩٤۔ [2] مجموع الفتاویٰ ص ٦٣ ج ٦۔

طلاق اور معاہدہ طلاق

سوال میں نے اپنی بیوی سے ایک تحریری معاہدہ کیا ہے کہ اگر میں اسے طلاق دوں تو مبلغ بیس ہزار ریال سعودی ادا کروں گا، کیا صرف معاہدہ کرنے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اور مجھے حسب معاہدہ مبلغ بیس ہزار سعودی ریال ادا کرنا ہوں گے یا عملی طور پر طلاق دینے سے طلاق ہوگی، اس سلسلہ میں مجھے فتویٰ درکار ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں اگر سائل نے صرف تحریری معاہدہ ہی کیا ہے اور عملی طور پر طلاق نہیں دی تو صرف معاہدہ کرنے سے طلاق واقع نہ ہوگی اور نہ ہی اسے کوئی رقم ادا کرنا پڑے گی کیونکہ یہ صرف ایک معاہدہ ہے جس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ معاہدہ طلاق اور عملی طلاق میں بہت فرق ہے، یہ ایسے ہی ہے جس طرح ایک آدمی کسی کمپنی میں کام کرنے کے لئے کوئی معاہدہ کرتا ہے اور اس میں درج ہوتا ہے کہ اسے کام کرنے کا اتنا معاوضہ دیا جائے گا، اب ظاہر ہے کہ وہ حسب معاہدہ کام کرنے کے بعد معاوضہ کا حقدار ہوگا، بصورت دیگر صرف معاہدہ کرنے سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ اپنی ازواج مطہرات کو اختیار دیا تھا کہ اگر تم دنیا کا ساز وسامان چاہتی ہو تو میں تمہیں کچھ دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیتا ہوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت کی طلبگار ہو تو تمہیں اللہ کے ہاں بہت اجر ملے گا۔ اس کی تفصیل سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۸۲ میں موجود ہے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا انتخاب کیا تو اس اختیار کو کچھ حیثیت نہ دی گئی اور نہ اسے کچھ شمار کیا گیا۔ [1]

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ محض اختیار دینے کو طلاق شمار نہیں کیا گیا کیونکہ عملی طور پر طلاق نہیں دی گئی تھی۔ صورت مسئولہ میں بھی صرف معاہدہ ہوا ہے، عملی طور پر طلاق نہیں دی گئی۔ لہٰذا صرف معاہدہ کرنے سے طلاق نہیں ہوگی اور نہ ہی سائل کے ذمے کسی قسم کی ادائیگی ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران حمل طلاق

سوال میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور وہ حالت حمل میں تھی، اب مجھے پتا چلا ہے کہ دوران حمل دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی، کیا واقعی حمل میں دی گئی طلاق نہیں ہوتی۔ اس کے متعلق وضاحت فرمائیں؟

جواب دوران حمل طلاق دینا جائز ومباح ہے اور حمل میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی عدت وضع حمل بیان کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔'' [2]

اگر دوران حمل دی گئی طلاق واقع نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو اس کی عدت بتانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ حدیث میں نص ہے چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''پھر اسے حالت طہر یا حالت حمل میں طلاق دو۔'' [3]

اس روایت میں صراحت ہے کہ دوران حمل طلاق دی جا سکتی ہے اور اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق ہو جاتی ہے، یہ

---

[1] صحیح بخاری، الطلاق : ۵۲۶۲۔ [2] الطلاق: ۴۔ [3] ابو داود، الطلاق : ۲۱۸۱۔

بات لوگوں میں غلط مشہور ہو چکی ہے کہ دوران حمل دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی یا شریعت میں اس انداز سے طلاق دینا منع ہے۔ بہر حال حالت حمل میں طلاق دینا جائز ہے اور اس طرح طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے نیز اس کی عدت وضع حمل ہے۔ (واللہ اعلم)

شادی کے بعد بیوی سے قطع تعلّق

سوال ایک آدمی شادی کے چند سال بعد اپنی بیوی سے ناراض ہو کر کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ازدواجی تعلقات نہیں رکھنا چاہتا مگر تمہارے ہر قسم کے اخراجات پورے کرتا رہوں گا، یہ میرا عمر بھر کا فیصلہ ہے، اس بات کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، کیا ایسا کرنے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے شادی کے بندھن کو اپنی معرفت کی ایک نشانی قرار دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور الفت پیدا کر دی، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی خاص تلقین فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں کے ساتھ خیرو بھلائی سے پیش آؤ۔'' [2] نیز فرمایا: ''کوئی مومن شوہر اپنی اہل ایمان بیوی سے بغض نہ رکھے، اگر اس کی کوئی ایک عادت اسے ناپسند ہے تو کوئی دوسری عادت پسند بھی ہے۔'' [3]

رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کو انسان کے بہتر ایمان کی علامت قرار دیا ہے، آپ نے فرمایا: ''مومنوں میں سے کامل ایمان والا شخص وہ ہے جو اچھے اخلاق والا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ زیادہ مہربان ہو۔'' [4]

بیوی کو بھی تلقین فرمائی کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت گزار اور فرمانبردار رہے، فرمان نبوی ہے: ''جو عورت اس حالت میں فوت ہوئی کہ اس کا شوہر اس سے خوش تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔'' [5]

صورت مسئولہ میں بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ رویے پر نظر ثانی کرے، آخر معاملہ اس حد تک کیوں پہنچا ہے، شریعت اس صورت حال کو قطعاً پسند نہیں کرتی کہ خاوند اپنی بیوی سے اس حد تک لاتعلق ہے۔ بہر حال اس لاتعلقی سے طلاق واقع نہیں ہوگی، جب تک خاوند خود طلاق نہ دے۔ (واللہ اعلم)

مطلقہ عورت سے سامان واپس لینا

سوال ہم نے اپنے بیٹے کی شادی کی تھی، حق مہر ایک ہزار روپیہ تھا جو موقع پر ہم نے ادا کر دیا تھا، اس کے علاوہ ہم نے پندرہ تولے طلائی زیور بھی اسے دیئے تھے، اب حالات کی سنگینی کی وجہ سے بیٹے نے طلاق دے دی ہے، کیا زیورات اسے واپس لینے کا حق ہے؟

---

[1] الروم:٢١۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ٥١٨٦۔ [3] صحیح مسلم، الرضاع: ٣٦٤٣۔
[4] سنن الترمذی، الایمان: ٢٦١٢۔ [5] سنن الترمذی، الرضاع: ١١٦١۔

جواب ہمارے معاشرہ میں مروج ہے کہ نکاح کے موقع پر بیوی کو معمولی سا حق مہر دیا جاتا ہے اور حکومتی ٹیکس سے بچنے کے لئے حق مہر کے خانہ میں تھوڑا سا حق مہر لکھا جاتا ہے، اس کے علاوہ اور بہت کچھ دیا جاتا ہے جو تحریر میں نہیں آتا، صورت مسئولہ میں یہی نظر آتا ہے کیونکہ جو صاحب پندرہ تولے طلائی زیورات دینے کی طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے ایک ہزار حق مہر اونٹ کے منہ میں زیرہ رکھنے کے مترادف ہے، اگر انہوں نے طلائی زیورات بھی بطور حق مہر دیئے ہیں تو اب ان کی واپسی کا مطالبہ جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم کسی بیوی کی جگہ دوسرے بیوی بدل کرلانے کا ارادہ کرو اور تم ان میں سے کسی کو ایک خزانہ دے چکے ہو تو اس میں کچھ بھی واپس نہ لو۔'' [1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زیادہ مہر کی کوئی حد معین نہیں بلکہ خاوند اپنی حیثیت کے مطابق جتنا مہر دینا چاہے دے سکتا ہے، لیکن جو کچھ دیا طلاق کے بعد اسے واپس لینے کا مجاز نہیں، ویسے بھی اس کی مردانگی کے خلاف ہے۔ اگر حق مہر کے علاوہ بیوی کو بطور تحفہ مذکورہ طلائی زیورات دیئے ہیں تب بھی انہیں واپس نہیں لے سکتا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہبہ کر کے واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کرتا ہے پھر اسے چاٹ لیتا ہے۔'' [2]

اس بنا پر صورت مسئولہ کے متعلق ہمارا رجحان یہ ہے کہ اگر طلائی زیورات مہر کا حصہ ہیں تو اسے واپس لینا جائز نہیں اور اگر بطور ہدیہ دیئے ہیں تو بھی انہیں واپس نہیں لیا جاسکتا، زیورات دینے کے دو ہی مقاصد معلوم ہوتے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی مقصد بظاہر معلوم نہیں ہوتا۔ (واللہ اعلم)

طلاق کے بعد رجوع

سوال میں نے اپنی بیوی کو اس کے ناروا رویے کے پیش نظر ایک طلاق دی، وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی، میں نے فون پر دوران عدت رجوع کرلیا لیکن میرے سسر اس رجوع کو نہیں مانتے بلکہ میری طلاق کو بنیاد بنا کر میری بیوی کے عقد ثانی کے لئے آگے کسی سے بات شروع کردی ہے، ایسے حالات میں میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب اگر بیوی کا خاوند کے ساتھ رویہ درست نہیں تو طلاق دینے سے پہلے چند ایک مراحل ہیں، خاوند کو چاہیے کہ پہلے ان کو عمل میں لائے پھر اگر حالات درست نہ ہوں تو آخری چارہ کار طلاق ہے۔ اگرچہ شریعت نے اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے تاہم ناگزیر حالات میں طلاق دینے کی اجازت ہے اور طلاق دینا خاوند کا حق ہے جسے وہ بامر مجبوری استعمال کرسکتا ہے جیسا کہ صورت مسئولہ میں خاوند نے اس حق کو استعمال کیا ہے، اب اس طلاق کے بعد دوران عدت اسے رجوع کا حق ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان کے شوہر تعلقات درست کرلینے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران میں پھر اپنی زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔'' [3]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جس طرح خاوند کو اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا حق دیا ہے، اسی طرح اسے طلاق کے بعد دوران عدت رجوع کرلینے کا حق بھی دیا ہے لیکن یاد رہے کہ خاوند صرف دو مرتبہ حق رجوع استعمال کرسکتا ہے۔ جو شخص دو مرتبہ

---

[1] النساء: ۲۰۔ [2] صحیح بخاری، الھبہ: ۲۶۲۲۔ [3] البقرۃ: ۸۷۔

طلاق دے کر اس سے رجوع کر چکا ہو، پھر وہ اپنی عمر میں جب کبھی تیسری طلاق دے گا تو پھر رجوع نہیں کر سکے گا بلکہ وہ عورت مستقل طور پر اس سے جدا ہو جائے گی۔

بہر حال سائل کو پہلی طلاق کے بعد رجوع کا حق ہے جو اس نے استعمال کر لیا ہے، بیوی کے والد کو درمیان میں حائل نہیں ہونا چاہیے، اگر پہلی اور دوسری طلاق کے بعد عدت گزر جائے تب بھی تجدید نکاح سے رجوع ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے عورت کے سرپرست حضرات کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اس ''حق رجوع'' کے درمیان رکاوٹ نہ بنیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے مت روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق رضامند ہوں۔'' [1]

اس آیت کی روشنی میں سرپرست حضرات کو چاہیے کہ وہ اسے عزت نفس کا مسئلہ نہ بنائیں اور خاوند نے اگر رجوع کر لیا ہے تو بیٹی کا گھر آباد ہونے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ (واللہ اعلم)

بیویوں سے عدل وانصاف کا مفہوم

سوال قرآن مجید میں ہے کہ ''اگر تمہیں ڈر ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی سے نکاح کرو۔'' [2]

دوسرے مقام پر فرمایا: ''تم اپنی بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کر سکو گے خواہ تم اس کی کتنی ہی خواہشیں کرو۔'' [3]

ان دونوں آیات کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف ایک عورت سے ہی شادی ہو سکتی ہے کیونکہ متعدد بیویوں کی موجودگی میں عدل کی شرط کو پورا کرنا ناممکن ہے، وضاحت فرمائیں؟

جواب اگرچہ پہلی آیت میں ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنے کے لئے عدل وانصاف کو شرط قرار دیا گیا ہے جبکہ دوسری آیت میں وضاحت ہے کہ قیام عدل ناممکن ہے لیکن ان دونوں آیات میں نہ تو کوئی تعارض ہے اور نہ ہی ناسخ ومنسوخ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے بلکہ پہلی آیت میں عدل سے مراد وہ عدل ہے جو انسان کے اختیار میں ہو جیسا کہ باری مقرر کرنا اور نان نفقہ کا اہتمام کرنا، لیکن ازدواجی زندگی میں کچھ ایسی اشیا بھی ہوتی ہیں جو انسانی اختیار سے باہر ہیں مثلاً محبت اور جنسی تعلقات وغیرہ۔ ان میں کمی بیشی انسان کے اختیار میں نہیں ہے اور جس آیت میں انصاف نہ کر سکنے کا بیان ہے اس سے مراد تعلقات کی یہ آخری قسم ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے درمیان پورا پورا عدل کرتے تھے، باری کے متعلق یہ وضاحت قرآن میں ہے کہ وہ آپ پر فرض نہ تھی، اس کے باوجود آپ اس کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے، نان نفقہ کے متعلق بھی عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے لیکن دلی محبت اور قلبی تعلقات، آپ کے بس میں نہ تھے اس لئے آپ بایں الفاظ دعا فرماتے: ''اے اللہ! جو امور میرے بس میں ہیں، ان کے متعلق میری تقسیم یہ ہے اور جن امور کا میں مالک نہیں ہوں بلکہ وہ تیرے اختیار میں ہیں تو ان کے متعلق مجھے ملامت نہ کرنا۔'' [4]

بہر حال باری اور نان ونفقہ میں عدل وانصاف کی شرط کے ساتھ ایک سے زیادہ چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت ہے اور جس

---

[1] البقرة: ۲۳۲۔ [2] النساء: ۱۲۹۔ [3] النساء: ٤۔ [4] جامع ترمذی، النکاح: ۱۱٤۰۔

آیت میں عدل وانصاف نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد قلبی تعلقات اور دلی محبت ہے، اس میں عدل وانصاف کرنا انسان کے اختیار میں نہیں۔ (واللہ اعلم)

عرصہ دراز تک خاوند کا بیوی سے الگ رہنا

سوال میرا خاوند بیرون ملک گیا، وہ میرا اور اپنے بچوں کا خرچہ بھی نہیں بھیجتا، کیا مدت دراز تک الگ رہنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے یا طلاق دینے سے ہی علیحدگی ہوگی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب شرعی شروط کے ساتھ جب عقد نکاح ہو جائے تو وہ نکاح صحیح ہے اور اپنی اصل پر باقی رہتا ہے خواہ میاں بیوی کے درمیان عرصہ دراز تک علیحدگی رہے۔ شرعی طور پر چار صورتوں میں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہوتی ہے، جو حسب ذیل ہیں:

① طلاق: جب خاوند بقائمی ہوش وحواس طلاق دے دے اور عدت گزر جائے تو نکاح ختم ہو جاتا ہے، اس طرح دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔

② وفات: جب خاوند فوت ہو جائے تو بھی عدت وفات گزرنے کے بعد بیوی کو عقد ثانی کرنے کی اجازت ہے۔

③ خلع: جب بیوی، خاوند سے تنگ ہو اور خاوند اسے طلاق نہ دیتا ہو تو خلع کے ذریعے علیحدگی عمل میں آسکتی ہے، ایک حیض عدت گزارنے کے بعد عورت آگے نکاح کر سکتی ہے۔

④ لعان: جب خاوند، بیوی پر تہمت لگاتا ہے لیکن اس کے پاس گواہ وغیرہ نہیں ہیں تو لعان کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل سورۃ النور (آیت نمبر ٦۔٩) میں ہے۔ لعان کے بعد بھی ہمیشہ کے لئے علیحدگی عمل میں آجاتی ہے۔

صورت مسئولہ میں اگرچہ خاوند مدت دراز تک بیوی سے الگ رہا ہے اور خرچہ بھی نہیں دیتا تاہم اس سے طلاق یا علیحدگی نہیں ہوگی۔ البتہ عورت، عدالت کی طرف رجوع کر کے اپنا معاملہ حل کر سکتی ہے، صرف علیحدہ رہنے سے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی نہیں ہوگی۔ (واللہ اعلم)

پدری بہن کی بیٹی سے نکاح کرنا

سوال کیا کوئی انسان اپنی پدری بہن کی بیٹی سے نکاح کر سکتا ہے، اگر نہیں کر سکتا تو اس کی کیا دلیل ہے، وضاحت کریں؟

جواب قرآن کریم نے محرمات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ان میں کچھ خونی رشتے ہیں اور کچھ سسرالی، جبکہ کچھ رشتے دودھ پینے سے حرام ہو جاتے ہیں۔ جو رشتے خون کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں ان میں ایک بہن کی بیٹی بھی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، خالائیں، بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں حرام ہیں۔'' [1]

---

[1] النساء: ٢٣۔

اس آیت کریمہ میں ''بنت الاخت'' بہن کی بیٹیاں عام ہیں، خواہ حقیقی بہن کی بیٹیاں ہوں یا پدری یا مادری بہن کی بیٹیاں ہوں۔لہٰذا ہمارے رجحان کے مطابق مطلق طور پر بھانجی حرام ہے خواہ وہ حقیقی بہن کی بیٹی ہو، یا پدری بہن کی یا مادری بہن کی، اس میں خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں لہٰذا اسے عموم پر ہی رکھا جائے گا۔(واللہ اعلم)

گم شدہ خاوند کی بیوی کتنا عرصہ انتظار کرے گی

سوال اگر کسی شادی شدہ عورت کا خاوند گم ہو جائے تو اسے کتنا عرصہ انتظار کرنا ہوگا، قرآن وحدیث کے مطابق وہ کتنی دیر تک عقد ثانی نہیں کرسکتی؟

جواب گم شدہ خاوند کی بیوی کے متعلق ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا پتہ شوہر کی بیوی اس وقت تک اس کی بیوی ہی رہے گی جب تک گم شدہ آدمی کے متعلق کوئی واضح اطلاع نہ موصول ہوجائے۔'' [1]

لیکن یہ روایت نا قابل حجت اور بے کار ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن شرحبیل صمدانی نامی ایک راوی ہے جسے محدثین نے متروک قرار دیا ہے نیز وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے منکر اور باطل روایات کرنے میں مشہور ہے۔اس کے علاوہ آگے بیان کرنے والا اس کا شاگرد ''سوار بن مصعب'' بھی اسی قسم کا ہے البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس طرح کا ایک معاملہ آیا تو انہوں نے فرمایا: ''لاپتہ شوہر کی بیوی چار سال تک انتظار کرے پھر شوہر کے فوت ہونے کی عدت چار ماہ دس دن گزارے، اس کے بعد اگر چاہے تو شادی کرسکتی ہے۔'' [2]

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا تھا اور اس کے مطابق فیصلہ دیا تھا۔ [3]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی موقف ہے۔ [4]

امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان ایک سال تک انتظار کرنے کی طرف معلوم ہوتا ہے، چنانچہ انہوں نے اپنی صحیح میں ایسے شخص کے متعلق عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''گم شدہ خاوند کی بیوی اور اس کے مال ومتاع کا حکم'' [5]

لیکن آپ نے واضح طور پر دوٹوک الفاظ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا البتہ پیش کردہ آثار واحادیث سے آپ کا رجحان معلوم کیا جاسکتا ہے۔چنانچہ آپ نے حضرت سعید بن مسیب کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے کہ جب کوئی سپاہی میدان جنگ میں گم ہو جائے تو اس کی بیوی ایک سال تک انتظار کرے، نیز آپ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ انہوں نے کسی سے ادھار لونڈی خریدی پھر لونڈی کا مالک گم ہوگیا تو انہوں نے ایک سال تک اس کا انتظار کیا۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنا رجحان بیان کرنے کے لئے حدیث لقطہ بیان کی ہے کہ اگر کسی کو گرا پڑا سامان ملے تو وہ اس کا سال بر اعلان کرے۔ [6]

---

[1] دارقطنی ص ۳۱۲ ج۳۔ [2] بیہقی ص ٤٤٥ ج ۷۔ [3] مصنف عبد الرزاق ص ۸۵ ج۷۔
[4] بیہقی ص ٤٤٥ ج۷۔ [5] صحیح بخاری، الطلاق باب نمبر : ۲۲۔
[6] صحیح بخاری ، الطلاق: ۵۲۹۲۔

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک گم شدہ خاوند کی بیوی کے لئے انتظار کا وقت ایک سال مقرر کیا جاسکتا ہے موجودہ احوال وظروف اور ذرائع مواصلات کے پیش نظر یہ موقف انتہائی قرین قیاس ہے۔ ہمارے نزدیک بھی ایک سال کا انتظار کافی معلوم ہوتا ہے بصورت دیگر قدیم فتویٰ چار سال والا تو اپنی جگہ جمہور علمائے اسلام اور مفتیانِ کرام کے ہاں رائج چلا آ رہا ہے لیکن عقد نکاح کوئی کچا دھاگہ نہیں کہ جسے آسانی سے توڑ دیا جائے اور یہ ایک ایسا حق ہے جو خاوند کے لئے لازم ہو چکا ہے، اس بناء پر اس عقد نکاح کو کھولنے کا مجاز عورت کا خاوند ہے جو گم ہو چکا ہے۔ اب دفع مضرت کے لئے عدالت، خاوند کے قائم مقام ہوگی اور اس نکاح کو فسخ قرار دینے کی مجاز ہوگی، جیسا کہ خلع وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک گم شدہ خاوند سے خلاصی کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ عورت فیملی کورٹ کی طرف رجوع کرے۔ رجوع سے قبل جتنی مدت گزر چکی ہوگی اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے ہاں بعض عورتیں مدت دراز تک انتظار کرنے کے بعد عدالت کے نوٹس میں معاملہ لائے بغیر یا اس کا فیصلہ حاصل کرنے سے قبل محض فتویٰ لے کر آگے نکاح کر لیتی ہیں، ان کا یہ اقدام نکاح انتہائی محل نظر ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی عورت عدالت کے نوٹس میں لائے بغیر اپنے مفقود شوہر کا چار سال تک انتظار کرے تو کیا اس مدت کا اعتبار کیا جائے گا تو آپ نے جواب دیا: ''اگر وہ اس طرح بیس سال بھی گزارے تو بھی اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔'' ❶

اس بنا پر ضروری ہے کہ جس عورت کا خاوند لا پتہ ہو جائے تو وہ فوری طور پر عدالت کی طرف رجوع کرے پھر اگر عدالت اس نتیجہ پر پہنچے کہ واقعی اس کا خاوند گم شدہ ہے تو وہ اسے ایک سال تک انتظار کرنے کا حکم دے گی۔ اگر اس مدت تک اس کا شوہر نہ آئے تو ایک سال کے اختتام پر عدالت فسخ نکاح کی ڈگری جاری کرنے کی مجاز ہوگی۔ عدالت کے فیصلے کے بعد عورت اپنے شوہر کو مردہ تصور کر کے عدتِ وفات یعنی چار ماہ دس دن گزارے گی۔ اس کے بعد نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہوگی۔ اگر عدالت بلا وجہ معاملہ کو طول دے اور عورت مجبور ہو کر صبر نہ کر سکے تو مسلمانوں کی ایک جماعت تحقیق کر کے اس کے گم شدہ خاوند کے متعلق فیصلہ کرے، ایسے حالات میں پنچایتی فیصلہ بھی عدالت مجاز کا فیصلہ ہی تصور ہوگا۔ (واللہ اعلم)

پدری دو بہنوں سے نکاح

سوال ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، ہر ایک بیوی سے ایک ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ کیا ممکن ہے کہ دونوں لڑکیوں کو کوئی اپنے عقد نکاح میں جمع کرے کیونکہ وہ حقیقی بہنیں نہیں ہیں جنہیں جمع کرنے کی ممانعت ہے؟

جواب قرآن کریم نے دو بہنوں کو بیک وقت اپنے عقد نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور (حرام ہے) کہ تم دونوں بہنوں کو جمع کرو۔'' ❷

نیز ایک حدیث میں ہے کہ حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرے نکاح میں دو بہنیں ہیں، آپ نے فرمایا: ان دونوں میں سے جسے چاہو طلاق دے دو۔'' ❸

قرآنی آیت اور حدیث کی رو سے ہر قسم کی دو بہنوں کو عقد نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، خواہ وہ ایک باپ اور ماں سے ہوں یا

---

❶ المدونۃ الکبریٰ ص۹۳ ص ۲۔ ❷ النساء: ۲۳۔ ❸ ابو داود، النکاح: ۲۲۴۳۔

باپ کی طرف سے ہوں یا صرف ماں کی طرف سے، یہ سب فرمان الٰہی کے تحت محرمات میں شامل ہیں، اس بنا پر صورت مسئولہ میں بھی اس حکم کا اطلاق ہوتا ہے، اس قسم کی دو بہنوں کو عقد نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

نکاح سے پہلے تعلقات

سوال ہم نے اپنی بچی کی ایک جگہ پر منگنی کی ہے، برخوردار ہمیں آئے دن مجبور کرتا ہے کہ میری موبائل پر اپنی منگیتر سے بات چیت ہونی چاہیے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، ہم اس سلسلہ میں بہت پریشان ہیں، اس سلسلہ میں کتاب وسنت میں کیا ہدایات ہیں؟

جواب منگنی ہونے سے پیشتر لڑکی کو ایک نظر دیکھنے میں تو چنداں حرج نہیں کیونکہ شریعت میں اجازت ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت میں ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا، تو نے اسے دیکھا ہے؟ عرض کیا: نہیں، تو آپ نے فرمایا: ''اسے دیکھ لو، اس طرح زیادہ توقع ہے کہ تم میں الفت پیدا ہو جائے۔'' [1]

لیکن منگنی کے بعد عورت، مرد کے لئے اجنبی ہوتی ہے، اجنبی عورت سے بات چیت کرنے کے لئے شریعت اسلامیہ نے کچھ قواعد وضوابط مقرر کئے ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① مرد، عورت تک اس کے محرم یا پھر اپنی محرم عورت کے ذریعے بات نہ پہنچا سکتا ہو۔
② یہ بات چیت خلوت اور تنہائی میں نہ ہو کیونکہ اس سے فتنوں کے جنم لینے کا اندیشہ ہے۔
③ یہ گفتگو شہوت انگیز اور محض لذت کے لئے نہ ہو بلکہ جائز اور بامقصد موضوع پر مبنی ہو۔
④ عورت کی طرف سے گفتگو کرتے وقت نرم لہجہ اور لچکدار انداز اختیار نہ کیا جائے۔
④ گفتگو کے دوران عورت مکمل پردہ سے ہو اور شرم وحیا کا پیکر بن کر رہے۔
⑤ یہ کلام ضرورت سے زائد نہ ہو بلکہ ضرورت کی حد تک اکتفا کیا جائے۔

ہمارے رجحان کے مطابق نکاح سے قبل برخوردار کا موبائل پر اپنی منگیتر سے گفتگو کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں فتنے کا اندیشہ ہے، ہاں اگر گفتگو صرف منگنی کی مصلحت کو سمجھنے اور سمجھانے کی حد تک ہو اور وہ بھی موبائل کا سپیکر آن کر کے والدین کی موجودگی میں کی جائے تو کسی حد تک اس کی اجازت ہے لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں لڑکی کے والدین سے بات کی جائے۔ بہر حال ایسے معاملات میں ہر اس کام سے اجتناب کیا جائے جو کسی حرام کی طرف لے جانے والا ہو یا حرام کے قریب کرنے والا ہو۔ اگر لڑکی سے نکاح ہو جاتا ہے لیکن رخصتی نہیں ہوئی تو ایسے حالات میں گفتگو کرنے میں چنداں حرج نہیں کیوں کہ نکاح کرنے سے اجنبیت ختم ہو جاتی ہے لیکن نکاح سے پہلے مرد کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی غیر محرم عورت سے گفتگو، نظر یا خلوت وغیرہ کے ذریعے لطف اندوز ہو، خواہ مرد کی منگنی اس عورت سے ہو چکی ہو کیونکہ وہ نکاح ہونے سے قبل اس کے لئے اجنبی اور بیگانی ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] مسند امام احمد ص ۲۴۴ ج ۴۔

عقیقہ و قربانی

عقیقہ و قربانی
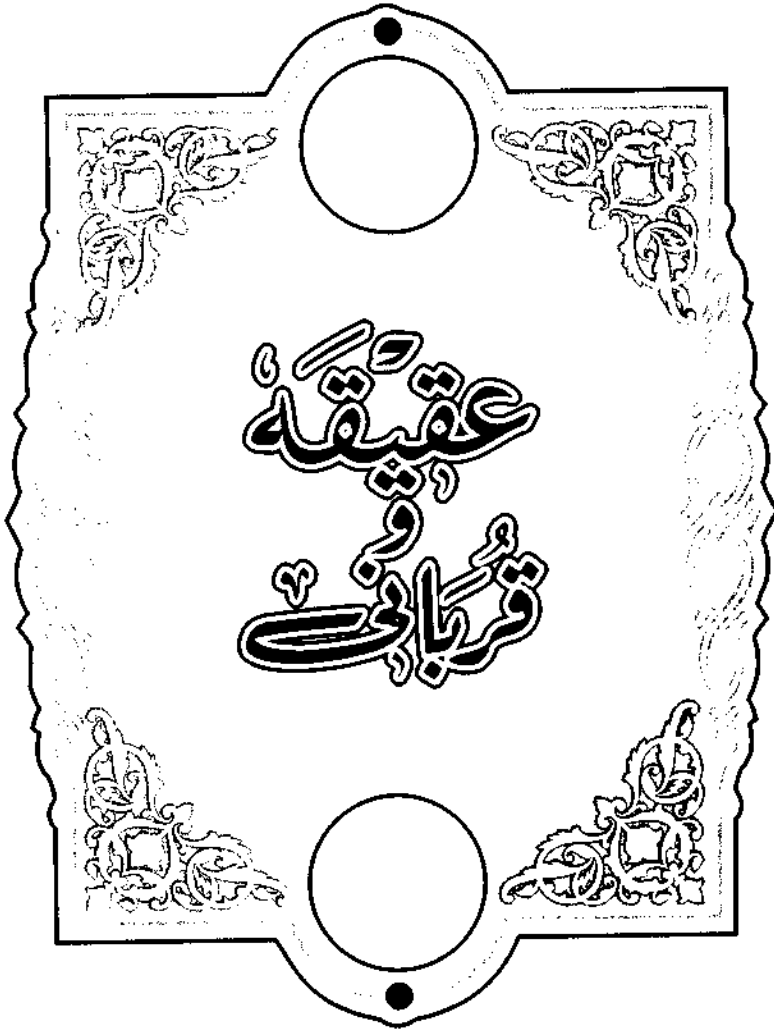
ذبح کرتے وقت بسم اللہ نہ پڑھنا

سوال کچھ لوگ جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر کہنا بھول جاتے ہیں، اس قسم کے ذبیحہ کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے، پھر بازار میں جو گوشت دستیاب ہوتا ہے، اس کے متعلق بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ذبح کرتے وقت اس پر بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھا گیا تھا یا نہیں، اس کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب جانور ذبح کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھا جائے جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی وضاحت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جس جانور پر اللہ کا نام لیا جائے، اس میں سے کھاؤ، اگر تم اس کے احکام پر یقین رکھتے ہو۔'' [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جس جانور پر عمداً اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ حلال وطیب نہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تم ایسے جانوروں کا گوشت مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، کیونکہ یہ نافرمانی ہے۔'' [2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس میں شک نہیں کہ اللہ کا نام ذبیحہ کو طیب بنا دیتا ہے، ذبح کرنے والے اور ذبح ہونے والے دونوں کے درمیان سے شیطان کو دور کر دیتا ہے، بصورت دیگر ذبح کرنے والے اور ذبیحہ کے درمیان شیطانی تعلق قائم ہو جاتا ہے وہ حیوان پر خبث کے اثرات ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جانور ذبح کرتے تو ساتھ بسم اللہ بھی پڑھتے تھے۔'' [3]

اگر بھول کر بسم اللہ نہ پڑھی جائے تو اس صورت میں جانور حلال ہوگا اور اس کا کھانا بھی جائز ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری خاطر میری امت کی خطاء، بھول چوک اور جو کام کسی سے زبردستی اور مجبور کر کے کرایا جائے اسے معاف کر دیا ہے۔'' [4]

جس جانور کے متعلق شک وشبہ ہو کہ ذبح کرنے والے نے اسے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا تھا یا نہیں، اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اسے اللہ کا نام لے کر کھا لیا جائے، اس کے متعلق زیادہ کرید نہ کی جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''یا رسول اللہ! یہاں کچھ لوگ تازہ تازہ عہد شرک کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہیں، وہ ہمارے پاس گوشت لے کر

---

[1] الانعام: ۱۱۸۔ [2] الانعام: ۱۲۱۔

[3] اعلام الموقعین ص ۱۵۲ ج۲۔ [4] ابن ماجہ، الطلاق: ۲۰۴۳۔

آتے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اللہ کا نام لیا تھا یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر اسے کھالو۔'' [1]

صورت مسئولہ میں بازاری گوشت کے متعلق اگر کوئی شک والتباس ہو تو اسے بسم اللہ پڑھ کر کھالینا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

میت کی طرف سے مستقل قربانی

سوال میں کئی سال سے اپنی والدہ مرحومہ کی طرف سے قربانی کرتا آ رہا ہوں، اب مجھے چند اہل علم نے بتایا ہے کہ میت کی طرف سے مستقل قربانی کرنے کا ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ملتا، اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم جو کام بطور عبادت کرتے ہیں، ان کا قرآن وحدیث سے ثابت ہونا ضروری ہے، اگر وہ کام قرآن وسنت سے ثابت نہیں تو ان کے بجالانے سے ثواب نہیں ملے گا۔ میت کی طرف سے مستقل قربانی کے متعلق عام طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، چنانچہ حضرت حنش بیان کرتے ہیں:

''میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ قربانی کے موقع پر دو مینڈھے ذبح کرتے تھے، میں نے انہیں پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں ان کی طرف سے قربانی کرتا رہوں، اس لئے میں آپ کی طرف سے قربانی کرتا ہوں۔'' [2]

لیکن یہ روایت دو وجہ سے قابل حجت نہیں:

① اس کی سند میں شریک بن عبداللہ القاضی راوی مدلس ضعیف ہے۔

② ابوالحسناء نامی ایک راوی مجہول ہے۔

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت تھی جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ پورا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے اس قسم کا کوئی عمل منقول نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مینڈھا لایا گیا، انہوں نے اسے ذبح کرتے وقت کہا: ''اللہ کے نام سے، اے اللہ! تیری توفیق سے اور تیرے لئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تیرے لئے ہے پھر اسے صدقہ کر دینے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا مینڈھا لایا گیا جسے انہوں نے ذبح کرتے وقت یہ کلمات کہے: اللہ کے نام کے ساتھ اے اللہ! یہ تیری توفیق سے ہے اور یہ تیرے لئے ہے، یہ قربانی علی کی طرف سے تیرے لئے ہے۔ [3]

لیکن یہ روایت بھی عاصم بن شریب نامی راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں۔ حضرت عبدالرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ شارح ترمذی فرماتے ہیں: ''میت کی طرف سے مستقل قربانی کرنے کے متعلق مجھے ایک بھی صحیح حدیث نہیں مل سکی۔ اس سلسلہ میں مروی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ضعیف ہے۔'' [4]

اس لئے ہمارے رجحان کے مطابق میت کی طرف سے مستقل طور پر قربانی کرنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحيح البخاري، التوحيد: ٧٣٩٨۔
[2] سنن أبي داؤد، الضحايا: ٢٧٩٠۔
[3] سنن البيهقي ص ٢٨٧ ج٩۔
[4] تحفة الاحوذي ص ٦٠ ج٥۔

عقیقہ میں ایک جانور ذبح کرنا؟

سوال کیا عقیقہ میں لڑکے کی طرف سے ایک جانور بھی ذبح کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس سلسلہ میں کوئی حدیث کتب احادیث میں مروی ہے، وضاحت کریں؟

جواب رسول اللہ ﷺ سے قولاً وعملاً یہی بات ثابت ہے کہ لڑکے کے عقیقہ میں دو چھوٹے جانور ذبح کئے جائیں، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے دو، دو مینڈھے ذبح کئے۔ [1]

اسی طرح ام کرز سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لڑکے کی طرف سے دو بکریاں جو ہم مثل ہوں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔'' [2]

یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت پر سیر حاصل بحث کی ہے لیکن آپ نے دو مینڈھوں والی روایت کو دو وجہ سے قابل ترجیح قرار دیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن احادیث میں دو بکریوں کا ذکر ہے، وہ ایک اضافہ پر مشتمل ہیں اور ثقہ راوی کا اضافہ قبول ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ قبول کئے جانے کے زیادہ مستحق ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ قولی روایات میں دو جانوروں کا ذکر ہے، اس طرح دوسری روایات بھی قولی روایت کے مطابق ہو جاتی ہیں۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''قواعد شریعت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ لڑکے کے لئے دو جانور ذبح کئے جائیں، اس لئے کہ شریعت نے کئی احکام میں مرد کو عورت پر فضیلت اور برتری عطا کی ہے۔'' [3]

درج بالا بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو جانور ذبح کرنا ہی زیادہ صحیح ہے، اس لئے لڑکے کی طرف سے دو جانور ہی ذبح کرنے چاہئیں۔ (واللہ اعلم)

کیا قربانی کا جانور خود ذبح کرنا چاہیے؟

سوال ہمارے ہاں عام طور پر گائے ذبح کرنے کے لئے قصاب کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، جبکہ وہ اکثر بے نماز ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب قربانی کا جانور خود ذبح کرنا چاہیے اور ذبح کرنے کا طریقہ بھی اچھی طرح سیکھنا چاہیے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تریسٹھ اونٹ خود اپنے ہاتھ سے نحر کئے تھے، آپ اپنے ہاتھ میں موجود چھوٹا نیزہ اونٹوں کی گردنوں پر مارتے تھے۔ [4]

اسی طرح مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے لئے دو مینڈھے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کئے تھے۔ [5]

اس لئے قربانی کرنے والے کو اپنی قربانی خود ذبح کرنی چاہیے البتہ بوقت ضرورت قصاب سے مدد لی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] سنن أبي داؤد، الضحاك: ٢٨٤٢۔ [2] سنن أبي داؤد، الضحايا: ٢٨٤١۔ [3] تحفة المودود، ص ٧٩۔
[4] صحيح مسلم، الحج: ٢٩٥٠۔ [5] صحيح البخاري، الاضاحی: ٥٥٥٨۔

عقیقہ میں بڑا جانور ذبح کرنا؟

سوال نومولود کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا جاتا ہے، کیا عقیقہ میں بڑا جانور گائے یا اونٹ وغیرہ ذبح کرنا جائز ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے، اس کی اسنادی حیثیت کیسی ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب کتب احادیث میں مروی جن روایات میں عقیقہ کا ذکر آیا ہے، ان میں صرف بکری یا دنبہ ذبح کرنے کا بیان ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''لڑکے کی طرف سے دو مساوی بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری بطور عقیقہ ذبح کی جائے۔'' ❶

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عقیقہ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا عمل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے دو، دو دنبے ذبح کئے۔ ❷

ان روایات کا تقاضا ہے کہ عقیقہ میں چھوٹے جانور ذبح کئے جائیں، اگرچہ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''جمہور گائے اور بکری کو عقیقہ کے لئے کافی قرار دیتے ہیں۔'' ❸

لیکن ہمارے رجحان کے مطابق جمہور کا مذکورہ موقف محل نظر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام سے عقیقہ میں بڑا جانور ذبح کرنا ثابت نہیں بلکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس سلسلہ میں شدید نفرت کا اظہار مروی ہے۔ چنانچہ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے ہاں جب بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے عقیقہ میں اونٹ ذبح کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس بات کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے بایں الفاظ اپنے جذبا②② ت کا اظہار کیا: ''معاذ اللہ! رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی تو یہ ہے کہ عقیقہ میں دو مساوی بکریاں ذبح کی جائیں۔'' ❹

لہٰذا عقیقہ میں گائے بھینس یا اونٹ ذبح کرنے سے گریز کیا جائے۔ اس سلسلہ میں جو روایت پیش کی جاتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''بچے کی طرف سے اونٹ، گائے اور بکری سے عقیقہ کیا جا سکتا ہے۔ ❺

محدثین کے ہاں یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اس میں سعد بن یسع راوی کذاب ہے، چنانچہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس کی سند میں سعد بن یسع راوی کذاب ہے۔ ❻

لہٰذا عقیقہ میں بکری، بھیڑ اور دنبہ ذبح کیا جائے کیونکہ احادیث میں ان جانوروں کو ذبح کرنے کا ذکر ملتا ہے اور گائے، بھینس یا اونٹ کو بطور عقیقہ ذبح کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ ہاں اگر کسی کے دوست واحباب اور دیگر رشتہ دار زیادہ ہیں اور عقیقہ کے جانور دعوت طعام کے لئے کافی نہیں تو وہ عقیقہ کے جانور کے ساتھ اضافی طور پر دوسرے جانور ذبح کر کے دعوت کا اہتمام کر سکتا ہے لیکن اضافی جانور بطور عقیقہ نہ ذبح کئے جائیں۔ (واللہ اعلم)

---

❶ سنن أبي داؤد : ٢٨٣٤۔ ❷ سنن النسائي ، العقيقة : ٤٢٢٤۔ ❸ نيل الأوطار ص ٥٠٦ ج٣۔
❹ سنن البيهقي ص ٣٠١ ج٩۔ ❺ طبراني.... ص ٨٤ ج١۔ ❻ مجمع الزوائد ص ٥٨ ج٤۔

بلوغ کے بعد اپنا عقیقہ خود کرنا

سوال اگر والدین نے عقیقہ نہ کیا ہو تو کیا آدمی بالغ ہونے کے بعد اپنا عقیقہ خود کر سکتا ہے، کیا کسی روایت یا واقعہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، وضاحت کریں؟

جواب جس شخص کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو وہ بالغ ہونے کے بعد از خود اپنا عقیقہ کر سکتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے، ہر بچہ اپنے عقیقہ کی وجہ سے گروی ہے۔ [1]

اس حدیث میں نومولود کو گروی چیز کی طرح قرار دیا گیا ہے تاوقت یہ کہ اس کا عقیقہ نہ کیا جائے، لہٰذا بڑی عمر کا آدمی اپنا عقیقہ خود بھی کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد خود اپنا عقیقہ کیا۔ [2]

لیکن اس کی سند میں عبداللہ بن محرر نامی راوی متروک ہے، لہٰذا یہ روایت محدثین کے معیار کے مطابق صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ البزار لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو بیان کرنے والا صرف عبداللہ بن المحرر ہے جو انتہائی ضعیف ہے۔ [3] (واللہ اعلم)

اونٹ کو نحر کرنے کا طریقہ

سوال اونٹ کو نحر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب کسی جانور کو زمین پر لٹا کر اس کی گرن پر چھری چلانا ذبح کہلاتا ہے جبکہ جانور کو کھڑا کر کے اس کی گردن پر تیز دھار آلہ مارنا نحر کہلاتا ہے۔ نحر کا طریقہ حسب ذیل ہے: اونٹ کا اگلا بایاں گھٹنا باندھ کر اسے تین ٹانگوں پر کھڑا کر دینا چاہیے پھر کوئی تیز دھار چیز مثلاً چھری، نیزہ یا برچھی اس کی گردن پر ماری جائے۔ جس اس کا خون بہہ جائے اور وہ ایک طرف گر جائے تو اس کی کھال وغیرہ اتار کر گوشت بنا لیا جائے۔

قرآن کریم نے اونٹ کو نحر کرنے کے متعلق صراحت کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''قربانی کے اونٹ ہم نے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں مقرر کر دی ہیں ان میں تمہارے لئے نفع ہے، انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لو، بایں حالت کہ وہ گھٹنا بندھے کھڑے ہوں، پھر جب ان کے پہلو گر پڑیں تو ان سے کچھ کھاؤ۔'' [4]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ کر اسے نحر کرتے تھے اور وہ اپنی باقی تین ٹانگوں پر کھڑا ہوتا تھا۔ [5]

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گذرے جس نے اپنے اونٹ کو ذبح کرنے

---

[1] صحيح البخاري، العقيقة : ٥٤٧٢۔ [2] سنن البيهقي ص ٣٠٠ ج٩۔
[3] كشف الأستار ص ٧٤ ج٢ ح ١٢٣٧۔ [4] الحج : ٣٦۔ [5] سنن أبي داوٗد، المناسك : ١٧٦٧۔

کی غرض سے زمین پر بٹھا رکھا تھا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: ''اس کا گھٹنا باندھ کر اسے کھڑا کرو، یہی حضرت محمد ﷺ کی سنت ہے۔'' [1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''اونٹ کو باندھ کر نحر کرنا'' [2]

بہرحال اونٹ کو نحر کرنا مسنون ہے لیکن یہ عمل کسی تجربہ کار اور ماہر کو کرنا چاہیے کیونکہ عام آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔ (واللہ اعلم)

زخمی اونٹ کو ذبح کرنا

سوال اگر اونٹ کسی گہرے گڑھے میں گر جائے جہاں سے اسے زندہ نکالنا مشکل ہو اور اسی حالت میں پڑا رہنے سے اس کے مرنے کا اندیشہ ہو تو ایسے حالات میں کیا کیا جائے؟ ہمارے ہاں ایک آدمی نے مسئلہ بیان کیا کہ بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر اس کی دم کو کاٹ دیا جائے تو وہ ذبح ہو جاتا ہے۔

جواب صورت مسئولہ میں جو اونٹ کو ذبح کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اس کا قرآن و حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ جہالت پر مبنی ایک رسم معلوم ہوتی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جب کسی قوم کا کوئی اونٹ بدک جائے اور قوم میں سے کوئی شخص خیر خواہی کی نیت سے اسے تیر سے نشانہ لگا کر مار ڈالے تو جائز ہے، حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ [3]

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ حسب ذیل ہیں، فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے، ایک اونٹ بدک کر بھاگ نکلا تو ایک آدمی نے اسے اپنے تیر سے مارا، رسول اللہ ﷺ نے اسے روک دیا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اونٹ بھی بعض اوقات جنگلی جانوروں کی طرح بدک سکتے ہیں، لہٰذا ان میں جو تمہارے قابو سے باہر ہو جائیں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو۔ [4]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی وجہ سے جانور کو ذبح کرنا مشکل ہو جائے تو تیر یا نیزہ مار کر اسے حلال کرنا درست ہے اور ایسا کرنا ذبح ہی کی طرح ہے، اس کا گوشت استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر واقعی اونٹ کو باہر نہیں نکالا جا سکتا تو اسے تکبیر پڑھ کر نیزہ وغیرہ سے حلال کیا جا سکتا ہے، لیکن بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر صرف اس کی دم کاٹنے والی بات جاہلانہ رسم ہے، عقل و نقل سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ حدیث میں بیان کردہ صورت پر صورت مسئولہ کو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب بھی کسی جانور کو ذبح نہ کیا جا سکتا ہو تو اس کے ساتھ حدیث میں بیان کردہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

قربانی کے لئے صاحب نصاب ہونے کی شرط

سوال ہمارے ہاں کچھ مذہبی حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ قربانی کے لئے صاحب نصاب ہونا شرط ہے یعنی وہ اتنے مال کا مالک ہو کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے کے قابل ہو، اس شرط کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

---

[1] صحيح البخاري، الحج: ١٧١٣۔
[2] صحيح البخاري، الحج باب ١١٨۔
[3] صحيح البخاري، الذبائح باب ٣٧۔
[4] صحيح البخاري، الذبائح : ٥٥٤٤۔

جواب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو قربانی کے متعلق بایں الفاظ حکم دیا ہے: ''آپ صرف اپنے رب کے لئے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔'' [1]

یہ حکم تمام امت مسلمہ کے لئے یکساں ہے خواہ وہ صاحب نصاب ہو یا نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی معاشی زندگی انتہائی تنگدستی میں گزاری، اس کے باوجود آپ مدنی دور میں برابر قربانی کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا اور آپ برابر قربانی کرتے رہے۔ [2]

حالانکہ رسول اللہ ﷺ کبھی صاحب نصاب نہیں ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں دین اسلام کے ہر حکم پر عمل کیا ہے لیکن آپ نے کبھی زکوۃ نہیں دی کیونکہ زکوۃ صاحب نصاب پر فرض ہے لیکن آپ کبھی صاحب نصاب نہیں ہوئے، اس کے باوجود آپ ہر سال قربانی کرتے اور اس کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ اس بنا پر ہمارا رجحان ہے کہ قربانی کے لئے صاحب نصاب ہونے کی شرط لگانا انتہائی محل نظر ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں قربانی کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''عورتوں اور مسافروں کا بیان'' [3]

اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسافر حضرات بھی قربانی کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سفر میں بھی قربانی کی ہے۔ بہرحال قربانی کے لئے صاحب نصاب ہونے کی شرط لگانا کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

بھینس کی قربانی

سوال عید قربان کے موقع پر بھینس کی قربانی کا مسئلہ زیر بحث آتا رہتا ہے، اس کے متعلق صحیح موقف کیا ہے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب قربانی کے متعلق قرآن کریم میں صراحت ہے کہ وہ ''بهيمة الانعام'' سے ہونا چاہیے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کے طریقے مقرر کئے ہیں تا کہ وہ مویشی قسم کے ان چوپائیوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں دے رکھے ہیں۔'' [4]

قرآن کریم کی تصریح کے مطابق لفظ ''الانعام'' میں چار قسم کے نر اور مادہ جانور شامل ہیں:

① اونٹ ② گائے ③ بھیڑ (دنبہ) ④ بکری۔

اس امر کی وضاحت سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۳ اور آیت نمبر ۱۴۴ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق قربانی کے سلسلہ میں صرف انہی جانوروں پر اکتفا کیا جائے جن پر بهيمة الانعام کا لفظ بولا جا سکتا ہے اور وہ صرف اونٹ، گائے، بھیڑ (دنبہ) اور بکری ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی اونٹ، گائے، دنبہ اور بکری کی قربانی کا ہی ثبوت ملتا ہے چونکہ بھینس ان جانوروں میں شامل نہیں لہٰذا قربانی میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جو حضرات اس کے قائل اور فاعل ہیں وہ اسے گائے پر قیاس کرتے ہیں

---

[1] الكوثر: ٢۔ [2] سنن الترمذي، الاضاحي: ١٥٠٧۔
[3] صحيح البخاري، الاضاحي باب ٢۔ [4] الحج: ٣٤۔

یا اسے گائے کی جنس قرار دیتے ہیں، حالانکہ بھینس ایک الگ جنس ہے جو تقریباً دس وجوہ سے اپنا امتیاز قائم کرتی ہے یعنی اس کا گوشت اور اس کی تاثیر، اس کا دودھ اور مکھن نیز اس کی رنگت اور تاثیر پھر اس کے رہنے کا طریقہ اور بچہ جنم دینے کا وقت گائے سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اپنے ایک فتویٰ میں ان وجوہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو اسے گائے سے ممتاز کرتی ہیں، پھر قیاس کے لئے کوئی علت مشترک ہونی چاہیے جو ان میں نہیں پائی جاتی۔

حافظ عبداللہ روپڑی مرحوم نے اس سلسلہ میں بڑا اچھا موقف اختیار کیا ہے کہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں احتیاط یہ ہے کہ گائے پر اسے قیاس کرتے ہوئے اس سے زکوٰۃ دی جائے اور قربانی کے سلسلہ میں احتیاط یہ ہے کہ اسے اجتناب کیا جائے۔ ہمارے رجحان کے مطابق مبنی بر احتیاط اور راجح موقف یہی ہے کہ بھینس کی قربانی نہ دی جائے بلکہ مسنون قربانی اونٹ، گائے، بھیڑ (دنبہ) اور بکری سے ہی کی جائے، جب یہ جانور بسہولت دستیاب ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے مشتبہ امور سے اجتناب کرنا چاہیے۔ حدیث میں ہے: ''ایسی چیز کو چھوڑ دو جو تجھے شک میں ڈالے اور ایسی چیز کو اختیار کرو جو تمہیں شک میں نہ ڈالے۔'' (واللہ اعلم)

سوال ہمارے علاقہ میں بھینس کی قربانی کی جاتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بھی دیئے جاتے ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب قربانی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مویشی قسم کے چار پائے جانور ذبح کئے جائیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کے طریقے مقرر فرمائے ہیں تاکہ وہ ان مویشی قسم کے چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اللہ نے انہیں دے رکھے ہیں۔ [1]

اس قسم کی وضاحت سورۃ الحج کی آیت نمبر ۲۸ میں بھی ہے:

ایک دوسرے مقام پر قرآن کریم نے صراحت کی ہے کہ چوپایوں کے نر مادہ آٹھ جوڑے ہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کل آٹھ جوڑے (اقسام) ہیں: بھیڑ میں سے دو اور بکری میں سے دو۔'' [2]

''اونٹوں میں سے دو اور گائیوں میں سے دو۔'' [3]

ہمارے رجحان کے مطابق گائے، اونٹ بھیڑ اور بکری کی قربانی کرنا چاہیے، بھینس کی قربانی سے اجتناب ہی بہتر ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ سے بھینس کی قربانی کرنا ثابت نہیں ہے جو حضرات بھینس کی قربانی کو جائز خیال کرتے ہیں وہ درج ذیل تین دلائل پیش کرتے ہیں:

① بھینس گائے کی ایک بڑی قسم ہے۔ ② مسئلہ زکوٰۃ میں بھینس کو گائے کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

③ ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ بھینس کی قربانی میں سات حصے دار ہو سکتے ہیں۔ لیکن علمی اعتبار سے ان دلائل کی کوئی حیثیت نہیں ہے جیسا کہ درج ذیل وضاحت سے معلوم ہوتا ہے:

☆ بھینس کو گائے کی قسم قرار دینا کئی ایک اعتبار سے محل نظر ہے کیونکہ بھینس کے دودھ سے برآمد ہونے والا مکھن سفید اور

---

[1] سورۃ الحج: ۳٤۔ [2] سورۃ الانعام: ۱٤۳۔ [3] سورۃ الانعام: ۱٤٤۔

گائے کا مکھن پیلی رنگت میں ہوتا ہے۔ ○ بھینس کے سینگ چوڑی دار اور خوبصورت ہوتے ہیں جبکہ گائے کے سینگ کبھی چوڑی دار نہیں ہوتے۔ ○ بھینس گندے پانی اور کیچڑ میں بیٹھ جاتی ہے جبکہ گائے ایک صاف ستھرا جانور ہے جو کیچڑ میں نہیں بیٹھتا۔

○ سب سے نمایاں فرق اس کے بچے کی پیدائش کا ہے کہ گائے نو ماہ بعد بچہ جنم دیتی ہے جبکہ بھینس گیارہویں ماہ بچے کو جنتی ہے۔

○ گائے کھیتی باڑی میں استعمال ہوتی ہے جبکہ بھینس اس کام کے لئے استعمال نہیں ہوتی۔

درج بالا وجوہات کی بنا پر بھینس کو گائے کی قسم قرار دینا سینہ زوری ہے۔

☆ اس میں شک نہیں ہے کہ مسئلہ زکوٰۃ میں بھینس کا وہی حکم ہے جو گائے کا ہے جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مسئلہ زکوٰۃ میں گائے اور بھینس کو جمع کیا جا سکتا ہے۔[1]

لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے قربانی کے باب میں گائے کے ساتھ بھینس کا ذکر نہیں کیا ہے، دراصل کچھ مسائل احتیاط کے اعتبار سے دو پہلو رکھتے ہیں اور عمل احتیاط پر کرنا ہوتا ہے، بھینس کا معاملہ بھی اسی طرح ہے اس کے دو پہلو ہیں: مسئلہ زکوٰۃ میں زکوٰۃ دینے میں احتیاط ہے اور مسئلہ قربانی نہ دینے میں احتیاط ہے کیونکہ اس کی قربانی کے متعلق علماء امت کا اتفاق نہیں، جن حضرات نے بھینس کو گائے کی قسم قرار دیا ہے وہ زکوٰۃ کے اعتبار سے صحیح ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر یہ دونوں الگ الگ اجناس ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے وضاحت کر دی ہے۔

اس سلسلہ میں مسند فردوس کے حوالے سے جو حدیث پیش کی جاتی ہے کہ بھینس کی قربانی میں سات حصے داروں کی شراکت جائز ہے، اس کی سند کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جس حدیث کی کوئی سند نہ ہو، وہ مجہول اور ناقابل اعتبار ہے، جب تک حدیث کے راویوں کی عدالت وثقاہت معلوم نہ ہو اسے بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال جن اہل علم کو مذکورہ بالا دلائل پر اطمینان ہے، اگر وہ بھینس کی قربانی کے قائل و فاعل ہیں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے، البتہ بھینس کے بجائے گائے کی قربانی رسول اللہ ﷺ کے قول، عمل اور تقریر سے ثابت ہے۔ لہٰذا سنت کے مطابق اونٹ، گائے، بھیڑ (دنبہ) اور بکری کو بطور قربانی ذبح کیا جائے اور بھینس کی قربانی سے گریز کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

گھٹی کا مطلب

سوال ہمارے ہاں نومولود کو گھٹی دی جاتی ہے، اسکا کیا مقصد ہوتا ہے اور کیا طریق کار ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ کسی نیک سیرت انسان سے گھٹی دلوائی جائے، کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب گھٹی کی تعریف یہ ہے کہ کوئی نیک سیرت آدمی کھجور یا اس جیسی کوئی میٹھی چیز چبائے، جب وہ باریک ہو جائے تو بچے کا منہ کھول کر اس کے حلق سے چپکا دی جائے تاکہ وہ اس کے پیٹ میں پہنچ جائے۔ یہ عمل مسنون اور مستحب ہے، مدنی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کا بایں طور اہتمام کرتے تھے کہ ان کے ہاں جب بھی بچہ پیدا ہوتا تو اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لاتے اور آپ ﷺ سے گھٹی دلواتے تاکہ آئندہ اس نومولود میں اس نیک سیرت انسان کی جھلک نظر آ سکے، جیسا کہ درج ذیل

---

[1] موطا امام مالك، كتاب الزكوٰة باب ما جاء في صدقة البقر۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

① حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور کو اپنے منہ میں چبا کر نرم کیا پھر اسے نومولود کے منہ میں رکھا اور اس کے لئے خیر و برکت کی دعا کی۔ [1]

② جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے انہیں لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں رکھ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور منگوائی پھر اسے چبایا اور اسے نومولود کے منہ میں رکھ دیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ان احادیث سے گھٹی کے عمل کو ثابت کیا ہے، وہ یہ ہے کہ کھجور یا کوئی بھی میٹھی چیز چبا کر نرم کر کے نومولود کے منہ میں ڈالنا ہے، اس کا مقصد ایمان کی نیک فال لینا ہے کیونکہ کھجور کے درخت کو مومن سے تشبیہ دی گئی ہے پھر میٹھی چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسند بھی کرتے تھے، لہٰذا اس عمل سے حلاوت ایمان کے لئے نیک فال لینا ہے، خصوصاً جب گھٹی دینے والا نیک سیرت اور اچھی شہرت کا حامل ہو۔ بازار سے ''ہمدرد گھٹی'' بھی دستیاب ہے، لوگ اس سے گھٹی کا کام نکال لیتے ہیں لیکن یہ تو پیٹ کی صفائی کے لئے ہوتی ہے، اس سے مسنون گھٹی کا کام نہیں لیا جا سکتا، ہاں اگر کوئی نیک آدمی اسے اپنے منہ میں ڈال کر پھر نومولود کے منہ میں ڈالے تو صحیح ہے، بہر حال گھٹی کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

① کھجور یا کوئی بھی میٹھی چیز شہد وغیرہ ② کسی بزرگ کا انتخاب، وہ بزرگ اس میٹھی چیز کو پہلے اپنے منہ میں رکھے پھر اسے نومولود کے منہ میں ڈالے اور اس کے لئے خیر و برکت کی دعا کرے، امت کے اہل علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بچے کی ولادت کے موقع پر کھجور کے ساتھ گھٹی دینا مستحب عمل ہے اگر کھجور نہ مل سکے تو کسی بھی میٹھی چیز سے یہ عمل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کام کسی نیک سیرت، بزرگ انسان سے کرایا جائے۔

کھیرے جانور کی قربانی

سوال ہمارے پاس ایک صحت مند دنبہ ہے اور اسے ہم نے اپنے گھر میں پالا ہے لیکن وہ دودانتا نہیں ہوا، کیا اسے عید الاضحیٰ کے موقع پر بطور قربانی ذبح کیا جا سکتا ہے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب ہمارے ہاں کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ بھیڑ اور دنبہ وغیرہ کا یک سالہ کھیرا بطور قربانی ذبح کیا جا سکتا ہے لیکن بھیڑ اور دنبے کے علاوہ اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ یکسالہ ذبح کرنا جائز نہیں، جبکہ دیگر اہل علم کا موقف ہے کہ بھیڑ یا دنبہ کا یکسالہ کھیرا اس وقت جائز ہے جب دودانتا جانور دستیاب نہ ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

① دودانتا جانور بازار سے ملتا نہ ہو۔ ② مل تو رہا ہو لیکن اسے خریدنے کی طاقت نہ ہو۔

ایسی صورت میں بھیڑ یا دنبہ یکسالہ کھیرا ذبح کیا جا سکتا ہے۔ وہ درج ذیل حدیث بطور دلیل پیش کرتے ہیں: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم قربانی میں صرف مسنہ (دودانتا) جانور ہی ذبح کرو، ہاں اگر تمہیں مسنہ ملنا مشکل ہو

---

[1] صحیح البخاري، العقیقة: ٥٤٦٧۔

تو پھر تم بھیڑ کا یکسالہ کھیرا ذبح کر سکتے ہو۔ ❶

اس حدیث کے پیش نظر ہمارا رجحان بھی یہی ہے کہ قربانی میں دو دانتا ذبح کیا جائے اگر وہ دو دانتا جانور ملنا مشکل ہو تو پھر بھیڑ کا یکسالہ کھیرا ذبح کرنا جائز ہے۔ مطلق طور پر کھیرا ذبح کرنا جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

مقروض کے لئے قربانی کرنا

سوال میرے ذمے کچھ قرض ہے، میں قربانی کرنا چاہتا ہوں، کیا قرض کی موجودگی میں قربانی ہو جاتی ہے، وضاحت کریں؟

جواب قربانی کے لئے صاحب استطاعت ہونا ضروری ہے جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس قربانی کرنے کی وسعت ہے لیکن وہ قربانی نہیں کرتا تو اسے چاہیے کہ وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔'' ❷

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کے لئے صاحب استطاعت ہونا ضروری ہے، اگر کسی میں قربان کرنے کے لئے وسعت نہیں تو وہ قربانی نہ کرے۔ مقروض آدمی کے قرض کو دیکھا جائے اگر معمولی درجے کا قرض ہے جو عام زندگی میں لیا جاتا ہے اور اسے پھر آسانی سے ادا بھی کر دیا جاتا ہے تو ایسے حالات میں قربانی کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہیے اور اگر قرض بہت زیادہ ہے اور اس کے ادا کرنے کی ہمت نہیں تو اسے چاہیے کہ وہ قربانی کرنے کی بجائے اپنا قرض اتارنے کی فکر کرے گویا ایسے حالات میں قربانی کی استطاعت ختم ہو جاتی ہے پھر وہ شخص قربانی نہ کرے۔

بہر حال یہ شوق کا معاملہ ہے اگر اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہوئے ایسے حالات میں بھی قربانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا قرض اتارنے کا بھی کوئی راستہ پیدا کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ایسے انسان کو اپنی رحمت سے محروم نہیں کرتا جو اس کے راستہ میں خرچ کرنے کے لیے فراخدلی کا ثبوت دیتا ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا ذبیحہ

سوال کیا عورت کوئی جانور ذبح کر سکتی ہے، اگر عورت ذبح کرے تو اس جانور کا گوشت کھایا جا سکتا ہے؟

جواب قرآن و حدیث میں عورت کے متعلق کوئی ممانعت نہیں کہ وہ ذبح نہ کرے یا اس کا ذبیحہ ناجائز ہے، اس لئے عورت ذبح بھی کر سکتی ہے اور عورت کا ذبح کردہ جانور کھایا بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک عورت نے پتھر کی دھار کے ساتھ بکری کو ذبح کر دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے اسے کھانے کا حکم دیا۔ ❸

---

❶ صحیح مسلم، الاضاحی: ۱۹۶۳۔ ❷ ابن ماجه، الاضاحی: ۳۱۲۳۔

❸ صحیح البخاري، الوكالة: ۲۲۰۴۔

اس حدیث سے دو مسائل کا پتہ چلا:

① ذبح کرنے کے لئے صرف چھری ہی نہیں بلکہ تیز دھار سے بھی ذبح کیا جا سکتا ہے۔

② عورت ذبح کرسکتی ہے، اور اس کا ذبح کیا جانور استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سوال کیا کسی مجبوری کی وجہ سے عورت، جانور ذبح کرسکتی ہے وضاحت فرمائیں؟

جواب عورت کے ذبح کرنے کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی ممانعت نہیں، اس لئے عورت کوئی بھی حلال جانور ذبح کرسکتی ہے، احادیث میں اس امر کی صراحت ہے چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی نے تیز دھار پتھر سے ایک زخمی بکری کو ذبح کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: تم اس کا گوشت کھاؤ۔ [1]

اس حدیث پر امام بخاری نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''عورت اور لونڈی کا ذبیحہ'' [2]

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی قربانیاں خود ذبح کریں۔ [3]

ان احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ عورت جانور ذبح کرسکتی ہے، اس کا ذبیحہ جائز ہے اور اس کا ذبح کیا ہوا جانور قابل استعمال ہے۔ (واللہ اعلم)

عقیقہ کی بجائے رقم کسی غریب کو دینا

سوال بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنے کے بجائے اگر اس کی قیمت کسی غریب کو دے دی جائے تا کہ وہ اپنی اس رقم سے کوئی ضرورت پوری کرے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی کریں۔

جواب عقیقہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض گروی ہوتا ہے، پیدائش کے ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور سر کے بال منڈوائے جائیں۔'' [4]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاد ایک بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت کا شکر ادا کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ اس لیے شریعت نے بچے کی پیدائش کے ساتویں روز عقیقہ مشروع قرار دیا ہے تا کہ اللہ کی نعمت کے حصول پر اس کا شکر بھی ادا ہو جائے اور اقرباء اور دوست کی ضیافت کے ساتھ ساتھ غرباء اور مساکین کا بھی فائدہ ہو جائے۔

ہمارے رجحان کے مطابق جانور کی قیمت کسی غریب کو دینے کے بجائے جانور ہی ذبح کرنا چاہیے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانور ہی ذبح کرنے کا حکم دیا ہے اور عملی طور پر حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی پیدائش پر جانور ہی ذبح کئے تھے، اس کے متعلق روایات میں بہت تاکید آئی ہے، اس لئے ولیمہ اور قربانی کی طرح جانور کو ذبح کرنا ہی افضل ہے۔ اتباع سنت کا یہ تقاضا ہے کہ عقیقہ کی رقم کسی کو دینے کی بجائے جانور ہی ذبح کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحيح البخاري، الذبائح: ٥٥٠٥۔ [2] صحيح البخاري، الذبائح باب ١٩۔

[3] بخاري، تعليقاً قبل حديث ٥٥٥٩۔ [4] سنن أبي داؤد، الضحايا: ٢٨٣٩۔

قربانی کی شرعی حیثیت

سوال قربانی کی شرعی حیثیت کے متعلق وضاحت کریں، آیا یہ واجب ہے یا مستحب، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا تصریحات ہیں؟

جواب قربانی واجب یا مستحب ہونے کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے، احناف اور کچھ مالکی حضرات کا کہنا ہے کہ ہر صاحب استطاعت ، پر قربانی کرنا واجب ہے جبکہ جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ قربانی واجب نہیں بلکہ سنت ہے البتہ اس کے متعلق بہت تاکید کی گئی ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق قربانی سنت مؤکدہ ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''قربانی کے سنت ہونے کا بیان'' [1]

پھر انہوں نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا درج ذیل قول نقل کیا ہے: ''قربانی کرنا سنت اور ایک مشہور امر ہے۔''

انہوں نے اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''جس نے نماز عید کے بعد اپنا جانور ذبح کیا، اس کی قربانی مکمل ہوئی اور وہ اہل اسلام کے طریقے کو پہنچا۔'' [2]

امام بخاری رحمہ اللہ کے پیش کردہ دلائل کے علاوہ درج ذیل دلائل بھی ہمارے موقف کی تائید کرتے ہیں:

☆ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب ذوالحجہ کا پہلا عشرہ آجائے تو اگر تم میں سے کوئی قربانی کرنا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے بالوں اور جسم کے کسی حصہ سے کچھ نہ کاٹے۔'' [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے عمل کو قربانی کرنے والے کی مرضی پر موقوف رکھا ہے جو اس کے غیر واجب ہونے کی دلیل ہے۔

☆ متعدد صحابہ کرام سے صراحت ہے کہ قربانی واجب نہیں چنانچہ روایات میں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قربانی نہیں کرتے تھے۔ [4]

اسی طرح حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں خوشحال ہونے کے باوجود قربانی نہیں کرتا، مبادا میرے پڑوسی اسے لازم خیال کریں۔ [5]

محدثین کرام نے اس حدیث کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس امر کی صراحت کی ہے، جن حضرات نے قربانی کو واجب کہا ہے انہوں نے ایسی روایات پیش کی ہیں جو دلالت کے اعتبار سے صریح نہیں اور جو صریح ہیں وہ سند کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

گم شدہ قربانی

سوال ایک آدمی نے قربانی کے لئے جانور خریدا اور اس کی اچھی دیکھ بھال کی لیکن بقرعید سے پہلے وہ جانور گم ہو گیا تو

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الاضاحي۔ [2] صحيح البخاري ، الاضاحي : ٥٥٤٦۔

[3] مسند أحمد ص ٢٨٩ ج٦۔ [4] سنن البيهقي ص ٢٦٩ ج٩۔ [5] مصنف عبد الرزاق : ٨١٤٩۔

وہ شخص کیا کرے؟ وضاحت فرمائیں؟

جواب قربانی کی دو اقسام ہیں ایک عام قربانی ہوتی ہے دوسری یہ کہ نذر مان کر خود پر واجب کر لی جاتی ہے۔

اگر کسی کی قربانی گم ہو جائے یا مر جائے تو اگر پہلی قسم ہے تو اپنی ہمت اور استطاعت کو دیکھا جائے، اگر دوسرا جانور خرید کر قربانی کر سکتا ہو تو کر دے بصورت دیگر اس پر کوئی گناہ نہیں۔ چنانچہ حضرت تمیم بن حویص کہتے ہیں کہ میں نے منیٰ میں قربانی کا جانور خریدا جو بعد میں گم ہو گیا، میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: ''اس کا تجھے کوئی نقصان نہیں۔'' [1]

اگر قربانی کی دوسری قسم ہے تو اسے دوبارہ خرید کر اپنی نذر کو پورا کرنا ہو گا چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: جس نے قربانی کا جانور حاصل کیا پھر وہ گم ہو گیا یا مر گیا تو اگر نذر کا ہے تو اسے بدل کر ذبح کرنا ہو گا اور اگر نذر کا نہیں بلکہ نفلی ہے تو اس کی صوابدید پر موقوف ہے اگر چاہے تو بدل لے اگر چاہے تو چھوڑ دے۔ [2] (واللہ اعلم)

قربانی کے گوشت کا مصرف

سوال قربانی کا گوشت کتنے دنوں تک استعمال کیا جا سکتا ہے، نیز کتاب و سنت کے مطابق اس کا صحیح مصرف کیا ہے، تفصیل سے آگاہ کریں؟

جواب قربانی کا گوشت شروع میں ایک ہنگامی ضرورت کے پیش نظر تین دن تک استعمال کرنے کی اجازت تھی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پابندی کو ختم کر دیا۔ چنانچہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو کوئی قربانی کرے، تیسرے دن کے بعد اس کے گھر میں اس سے کوئی چیز باقی نہ ہو، آئندہ سال صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اس سال بھی ہم اسی طرح کریں جس طرح ہم نے گزشتہ سال کیا تھا تو آپ نے فرمایا: ''کھاؤ اور کھلاؤ نیز ذخیرہ کرو۔ گزشتہ سال لوگ مشقت میں تھے تو میں نے ارادہ کیا کہ تم ان کی مدد کرو۔'' [3]

ایک دوسری حدیث میں اس ہنگامی ضرورت کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ دیہاتی لوگ مدینہ میں آباد ہو گئے تھے، ان کے تعاون کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ قربانی کا گوشت انہیں دیا جائے۔ [4]

جب یہ ہنگامی ضرورت ختم ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تک قربانی کا گوشت استعمال کرنے کی پابندی بھی ختم کر دی۔ اب انسان قربانی کا گوشت اپنی صوابدید کے مطابق جتنے دنوں تک چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے مصرف کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ، اس کے علاوہ سوال سے رکنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔'' [5]

اس آیت سے کچھ اہل علم نے استدلال کیا ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کیا جائے، ایک اپنے لئے، دوسرا ملاقاتیوں اور رشتہ داروں کے لئے اور تیسرا سائلین کے لئے۔ جبکہ بعض علماء اس آیت سے پہلے والی آیت سے استدلال کرتے

---

[1] المحلیٰ ابن حزم ص ۳۵۸ ج۷۔ [2] سنن البیهقي ص ۲۸۹ ج۹۔

[3] صحیح البخاري، الاضاحی: ۵۵۶۹۔ [4] صحیح مسلم، الاضاحی: ۱۹۷۱۔ [5] الحج: ۳۶۔

ہوئے کہتے ہیں کہ گوشت کے دو حصے کئے جائیں، نصف اپنے لئے اور نصف صدقہ کے لئے۔ ❶

لیکن درحقیقت ان آیات سے اس طرح قربانی کے گوشت کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کرنے کا حکم نہیں نکلتا بلکہ ان میں مطلقاً کھانے کا حکم ہے، اس لئے اس اطلاق کو اپنی جگہ پر برقرار رہنا چاہیے اور کسی تقسیم کا پابند نہیں بنانا چاہیے بلکہ قربانی کا گوشت سارا بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا۔ ❷

اور جتنا چاہے خود بھی کھا سکتا ہے اور اسے ذخیرہ بھی کر سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

قربانی اور منکرین حدیث

سوال منکرین حدیث کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں قربانی کا ذکر حج کے بیان میں ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قربانی صرف حجاج کرام کے لئے ہے، عام لوگ قربانی کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اس اعتراض کا کیا جواب ہے، تفصیل سے آگاہ فرمائیں؟

جواب اس میں شک نہیں کہ قربانی کا ذکر حج کے بیان میں ہوا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''قربانی کے اونٹ ہم نے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بنادی ہیں ان میں تمہارے لئے خیر و برکت ہے، اس لئے تم انہیں کھڑا کر کے اللہ کا نام لو پھر جب ان کے پہلوز مین سے لگ جائیں تو اسے خود بھی کھاؤ، سوال سے رُکنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

اس آیت میں قربانی کے اونٹوں کا ذکر مسائل حج میں بیان ہوا ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قربانی صرف حجاج کرام کے لئے ہے، دوسرے مسلمانون کے لئے ضروری نہیں، کیونکہ قربانی کا ذکر دوسرے مقامات پر مطلقاً بھی آیا ہے جہاں حج وغیرہ کا ذکر نہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر۔'' ❹

اس آیت کریمہ کی تفسیر و تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے منصب کے لحاظ سے کی ہے کہ آپ دس سال مدینہ طیبہ میں رہے اور قربانی کرتے رہے، دوسرے مسلمانوں کو بھی قربانی دینے کی ترغیب دلائی اور قربانی کے احکام و مسائل بیان فرمائے، ان میں سے ایک مسئلہ درج ذیل ہے: ''جس نے نماز عید پڑھنے سے پہلے قربانی کی وہ اس کی جگہ پر اور قربانی کرے اور جس نے نماز سے پہلے قربانی ذبح نہیں کی وہ نماز کے بعد قربانی کرے۔'' ❺

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قربانی صرف حاجیوں کے لئے نہیں بلکہ اس کا حکم ہر مسلمان کے لئے ہے وہ جہاں کہیں بھی ہو کیونکہ حجاج کرام تو عید کی نماز نہیں پڑھتے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک جگہ پر یہود کے کردار کو بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے: ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول کو نہ مانیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا جائے۔'' ❻

اس آیت میں بھی قربانی کا ذکر ہے اور حاجیوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال منکرین حدیث کا مذکورہ دعویٰ کہ قربانی صرف حاجیوں کے لئے ہے دوسرے مسلمانوں کے لئے نہیں، اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں۔ بلکہ قربانی کا حکم جس طرح حاجیوں

---

❶ الحج: ٢٨۔ ❷ صحيح البخاري، الحج: ١٧١٧۔ ❸ الحج: ٣٦۔
❹ الكوثر: ٢۔ ❺ صحيح البخاري، الاضاحي: ٥٥٦٢۔ ❻ آل عمران: ١٨٣۔

کے لئے ہے اسی طرح دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی ہے اگرچہ دوسرے مسلمانوں کے لئے یہ واجب نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔ (واللہ اعلم)

عقیقہ میں گائے ذبح کر کے اس میں حصے رکھنا

سوال کیا کسی بچے کے عقیقہ میں گائے ذبح کی جا سکتی ہے، کیونکہ بعض دفعہ مہمان زیادہ ہوتے ہیں اور بکرے کا گوشت ان کے لئے ناکافی ہوتا ہے، نیز اگر گائے میں دو لڑکوں اور تین لڑکیوں کا عقیقہ کر دیا جائے تو کیا شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟

جواب احادیث میں عقیقہ کے لئے جن جانوروں کے ذبح کرنے کا ذکر ملتا ہے، وہ بکری اور دنبہ وغیرہ ہے۔ یعنی لڑکے کی طرف سے دو چھوٹے جانور اور لڑکی کی طرف سے ایک چھوٹا جانور ذبح کیا جائے، جیسا کہ حضرت ام کرز کعبیہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لڑکے کی طرف سے دو ہم پلہ بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔'' [1]

نیز رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے دو، دو دنبے ذبح کئے تھے۔ [2]

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ عقیقہ میں چھوٹے جانور یعنی بکری، دنبہ اور چھترا وغیرہ ذبح کیا جائے۔ اگرچہ بعض اہل علم نے اونٹ اور گائے کے بطور عقیقہ ذبح کرنے کی اجازت دی ہے لیکن ہمارا رجحان یہ ہے کہ عقیقہ میں بڑے جانور گائے اور اونٹ وغیرہ ذبح نہ کئے جائیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس سلسلہ میں کراہت منقول ہے۔ چنانچہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا تو انہوں نے عقیقہ میں اونٹ ذبح کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب اس امر کی اطلاع ملی تو آپ نے اعوذ باللہ پڑھ کر اپنی کراہت کا اظہار فرمایا۔ [3]

اس بناء پر عقیقہ میں بڑا جانور ذبح کرنا پھر اس میں حصے رکھنا انتہائی محل نظر ہے۔ اگر مہمان زیادہ ہیں تو ان کے ساتھ مزید بکروں کو ذبح کیا جا سکتا ہے یا بطور عقیقہ دو بکرے ہی ذبح کئے جائیں البتہ مہمان نوازی کے طور پر گائے یا اونٹ ذبح کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ ہمارا رجحان یہ ہے کہ عقیقہ کے متعلق سنت نبوی کو ملحوظ رکھا جائے، اپنی مجبوریوں اور مصلحتوں کے پیش نظر اس کی خلاف کرنا ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔ (واللہ اعلم)

حلال جانور کا خون

سوال جانور ذبح کرتے اور اس کا گوشت بناتے وقت کچھ خون کپڑوں کو لگ جاتا ہے، اس کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے، ہم گوشت کا کاروبار کرتے ہیں، ہمیں اس مسئلہ کی اکثر ضرورت رہتی ہے، براہ کرم اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب قرآن کریم نے جانور کے خون کو حرام قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر مرا ہوا جانور اور اُس کا خون حرام قرار دیا ہے۔ [4]

---

[1] سنن أبي داوٗد، الضحایا : ۲۸۳۲۔ [2] سنن النسائي، العقیقة : ٤٢٢٤۔

[3] سنن البیهقي ص ۳۰۱ ج۹۔ [4] ۲/البقرة : ۱۷۳۔

دوسرے مقام پر اس خون کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''وہ بہتا ہوا خون ہے۔'' ❶

اس بہتے خون سے مراد وہ خون ہے جو جانور ذبح کرتے وقت حلق سے بہتا ہے۔ دور جاہلیت میں لوگ اس جمے ہوئے خون کے ٹکڑوں کو بھون کر کھا لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس خون کو حرام قرار دیا ہے۔ باقی رہا وہ خون جو ذبح کرنے کے بعد گوشت کے خلیوں یا رگوں میں باقی رہ جاتا ہے تو وہ حرام نہیں، حتیٰ کہ گوشت پکڑتے وقت جو خون ہاتھ کو لگ گیا یا کپڑے سے صاف کرتے وقت جو خون لگ گیا وہ حرام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے دو خون حلال قرار دیئے ہیں، ایک کلیجی اور دوسرا تلی، یہ دونوں چیزیں خون ہیں اور انہیں کھانا جائز ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صحیح بات یہ ہے کہ ذبح کے وقت تیزی سے بہنے والا خون حرام ہے اور جو خون گوشت کی رگوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ علماء کے نزدیک حرام نہیں۔'' ❷

درج بالا وضاحت کے پیش نظر جو حضرات گوشت کا کاروبار کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ذبح کرتے وقت بہنے والے خون سے پرہیز کریں، اس کے علاوہ جانور کا کوئی بھی خون حرام نہیں، البتہ صفائی اور نظافت کے پیش نظر اس خون کو دھو لینا چاہیے۔

(واللہ اعلم)

یکسالہ بکری کا بچہ

سوال بکری کا ایک سالہ بچہ جو موٹا تازہ ہو، کیا اسے قربانی کے طور پر ذبح کیا جا سکتا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب قربانی کے متعلق ایک مشہور حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''دوندے کے علاوہ کوئی جانور ذبح نہ کرو، ہاں اگر اس کا ملنا مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا کھیرا ذبح کر لو۔'' ❸

عربی زبان میں ''مسنة'' اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دو دانت گر جائیں اور نیچے سے نئے اُگ آئیں، اس میں عمر کا کوئی اعتبار نہیں، صحت اور علاقے کے لحاظ سے اس کی عمر مختلف ہو سکتی ہے، البتہ جذعہ یکسالہ جانور کو کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے لئے دوندا جانور ہونا چاہیے اگر دو دانتہ نہ مل سکے تو یکسالہ بھیڑ کا بچہ قربانی کے طور پر ذبح کیا جا سکتا ہے۔ دوندا جانور نہ ملنے کی دو صورتیں ہیں:

☆ انسان کے پاس رقم موجود ہے لیکن دو دانتہ جانور مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہوتا۔

☆ مارکیٹ میں دو دانتہ جانور دستیاب ہے لیکن انسان کی قوتِ خرید سے باہر ہے۔ ان دو صورتوں میں بھیڑ کا جذعہ یعنی کھیرا ذبح کیا جا سکتا ہے، البتہ بکری کا یکسالہ جانور تو کسی صورت میں جائز نہیں۔ جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے ماموں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے ہی قربانی کر لی تھی، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری بکری صرف گوشت کی بکری ہے۔''

---

❶ الانعام: ۱۴۵۔ ❷ مجموع الفتاویٰ ص ۵۲۲ ج ۲۱۔ ❸ صحیح مسلم، الاضاحی: ۱۹۶۳۔

انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے پاس بکری کا ایک یکسالہ بچہ ہے؟ آپ نے اسے فرمایا: ''تم اسے ہی ذبح ہی کرلو لیکن تمہارے بعد کسی اور کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔'' ❶

اسی طرح حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ بکریاں تقسیم کے لئے دیں، انہوں نے وہ صحابہ کرام میں بانٹ دیں اور صرف بکری کا ایک سالہ بچہ باقی رہ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے تم خود قربانی کے طور پر ذبح کردو۔'' ❷ اسے بھی حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت پر محمول کیا جاتا ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے: ''تیرے بعد کسی دوسرے کے لئے یہ رخصت نہیں۔'' ❸

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بکری کا کھیرا جانور کسی صورت میں قربانی کے لئے جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

قربانی کے عیوب

سوال وہ کون کون سے عیوب ہیں جن کی موجودگی میں جانور قربانی کے قابل نہیں رہتا، قرآن وحدیث کے دلائل سے ان کی نشاندہی کریں؟

جواب قربانی کے جانور میں عیوب پائے جاتے ہیں، ان کی دو اقسام ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) ☆ ایسے عیوب جن کی موجودگی میں جانور قربانی کے قابل نہیں رہتا وہ یہ ہیں:

☆ کانا پن جو بالکل نمایاں ہو، اگر جانور بالکل اندھا ہے جسے نظر ہی نہیں آتا تو بالاولیٰ قربانی کے طور پر ذبح نہیں کیا جاسکتا۔

☆ ایسا بیمار جس کی بیماری ظاہر اور نمایاں ہو، اگر معمولی بیمار ہے تو اسے قربانی کے طور پر ذبح کیا جاسکتا ہے۔

☆ لنگڑا پن جو بالکل نمایاں ہو، اگر جانور کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے یا ٹوٹی ہوئی ہے وہ بھی قربانی کے لائق نہیں۔

☆ ایسا کمزور اور لاغر جانور جس میں کمزوری کی وجہ سے گودا وغیرہ نہ ہو۔

ان چار عیوب کے متعلق احادیث میں صاف وضاحت ہے کہ ان کی موجودگی میں جانور قربانی کے قابل نہیں رہتا۔ ❹

جس جانور کے کان کٹے ہوئے ہوں یا سینگ ٹوٹے ہوئے ہوں وہ بھی قربانی کے طور پر ذبح نہیں کئے جاسکتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیتے تھے کہ قربانی کرتے وقت جانور کی آنکھیں اور کان بغور دیکھ لیا کریں۔ ❺

کچھ عیوب ایسے ہیں کہ ان کی موجودگی میں جانور بطور قربانی ذبح کیا جاسکتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(ب) ☆ وہ جانور جس کے تھن مرے ہوئے ہوں، ☆ وہ جانور جن کی دم کٹی ہوئی ہو۔ ☆ وہ جانور جن کی ناک کٹی ہوئی ہو۔ ☆ وہ جانور جن کے دانت نہ ہوں۔ ☆ وہ جانور جو مخنث ہوں، اگرچہ جاہل لوگ اس قسم کے جانور کو ''بزرگ'' خیال کرتے ہیں، اسے گوشت کے لئے ذبح کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں، لیکن شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں، اسی طرح وہ جانور جس کے سینگ پیدائشی نہ ہوں، اسے بھی قربانی میں ذبح کیا جاسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح البخاري، الاضاحی: ٥٥٥٦۔ ❷ صحیح البخاري، الاضاحی: ٥٥٥٥۔

❸ سنن البیهقي ص ٧٠ ج ٩۔ ❹ مسند أحمد ص ٢٨٤ ج ٤۔ ❺ مسند أحمد ص ٩٥ ج ١۔

قربانی سے ممنوع انتفاع

سوال قربانی سے کس قسم کا انتفاع منع ہے اور کس قسم کا انتفاع جائز ہے، اس کے متعلق ہمیں تفصیل سے آگاہ کریں۔

جواب قربانی کا گوشت خود کھانا، دوسروں کو کھلانا اور اس کا ذخیرہ کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اس کی کھال کو ذاتی مصرف میں بھی لایا جاسکتا ہے لیکن قربانی کی کوئی چیز فروخت کرنا منع ہے۔ اس کی کھال، اس کی اون، اس کے بال، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں وغیرہ کو بیچا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ جو چیز اللہ کی راہ میں وقف ہو جائے، وقف کنندہ اسے فروخت نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ھدی اور قربانی کے گوشت کو مت فروخت کرو بلکہ اسے خود کھاؤ، صدقہ کرو اور اس کے چمڑے کو بھی اپنے استعمال میں لاؤ۔'' [1]

اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کا معنی صحیح ہے، دیگر آثار وقرائن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے فروخت کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے عوض ملنے والی رقم کو صدقہ کر دیا جائے، لیکن صحیح موقف یہی ہے کہ قربانی کی کسی چیز کو فروخت کرنا صحیح نہیں۔ کھال وغیرہ اگر کسی کو دے دی جائے تو وہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ اسی طرح قربانی کے گوشت سے قصاب کی اجرت نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی اس کی کھال بطور اجرت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا: ''قربانی کا گوشت، اس کی کھالیں اور ان کے اوپر والی چادریں غرباء میں تقسیم کر دی جائیں، اس کے علاوہ قصاب کو بطور اجرت اس سے کچھ نہ دیا جائے۔'' [2] ایک روایت میں صراحت ہے کہ ہم قصاب کو ذبح کرنے اور گوشت بنانے کی اجرت اپنی طرف سے دیتے تھے۔ [3] (واللہ اعلم)

خصی جانور کی قربانی

سوال قربانی میں خصی جانور ذبح کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہمارے ہاں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ خصی جانور کی قربانی ناجائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کو خصی کرنے سے منع فرمایا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ سے خصی اور نر دونوں قسم کے جانور بطور قربانی ذبح کرنا ثابت ہے جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایسا مینڈھا قربان کیا کرتے تھے جو سینگوں والا نر ہوتا تھا۔ [4] اس طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے دن دو مینڈھے ذبح کیے جو سینگوں والے چتکبرے اور خصی تھے۔ [5] خصی جانور کے بارے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی احادیث مروی ہیں۔ [6]

---

[1] مسند أحمد ص ١٥ ج ٤۔ [2] صحیح البخاري، الحج : ١٧١٧۔ [3] صحیح مسلم، المناسك : ١٣١٧۔
[4] ترمذی، الاضاحی : ١٤٩٦۔ [5] ابو داود، الضحایا ٢٧٩٥۔ [6] ابن ماجه الاضاحی: ٣١٢٢۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خصی جانور کی قربانی درست ہے، اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔ دراصل کسی جانور کو خصی کرنے کے مثبت اور منفی دو پہلو ہیں، مثبت پہلو یہ ہے کہ خصی جانور کا گوشت عمدہ اور بہتر ہوتا ہے جبکہ غیر خصی جانور کے گوشت میں ایک ناگواری بو پیدا ہو جاتی ہے جس کے تناول میں تکدر پیدا ہوتا ہے اور اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ جانور کو خصی کرنے سے اس کی فحولیت (نر ہونا) ختم ہو جاتا ہے اور وہ افزائش نسل کے قابل نہیں رہتا۔

قربانی کے متعلق مثبت پہلو یہ ہے کہ جانور کو خصی کرنے سے اس کے گوشت میں عمدگی پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''قربانی کے جانور کا خصی ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ خصی ہونے سے اس کے گوشت کی عمدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔'' [1]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اس امر کی صراحت کی ہے کہ جانور کو خصی کرنے سے اس کا گوشت عمدہ ہو جاتا ہے اور قربانی کے لئے یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ [2]

قربانی کے ذریعے چونکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے قربانی کا جانور واقعی بے عیب اور تندرست ہونا چاہیے۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے چند ایک ایسے عیوب کی نشاندہی فرمائی ہے جو قربانی کے لئے رکاوٹ کا باعث ہیں تاہم قربانی کے لئے جانور کا خصی ہونا کوئی عیب نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ایسے جانور کو قربانی کے لئے قطعی طور پر منتخب نہ فرماتے۔ چنانچہ احادیث میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو ایسے مینڈھوں کی قربانی دیتے جو خصی اور گوشت سے بھرپور ہوتے تھے۔ [3]

اس بناء پر کچھ لوگوں کا ان دنوں پروپیگنڈا کرنا کہ خصی جانور کی قربانی ناجائز ہے بددیانتی پر مبنی ہے۔ اس وضاحت کے بعد ہم جانور کو خصی کرنے کی شرعی حیثیت بیان کرتے ہیں۔ جانور کو خصی کرنے کے متعلق علمائے متقدمین میں اختلاف ہے، ایک گروہ اس عمل کو مطلق طور پر حرام کہتا ہے خواہ وہ جانور حلال ہو یا حرام۔ جبکہ کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ خصی کرنے کی حرمت صرف حرام جانوروں سے متعلق ہے، ان کے نزدیک حلال جانور کو خصی کرنا جائز ہے۔ جو حضرات مطلق طور پر حدیث کے قائل ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

☆ اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے متعلق ابلیس لعین کا ایک طریقہ واردات بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ''میں انہیں حکم دوں گا کہ وہ میرے کہنے پر ضرور اللہ کی تخلیق میں بگاڑ پیدا کریں گے۔'' [4]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے مراد جانوروں کا خصی کرنا ہے۔ [5]

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں اور دیگر جانوروں کو خصی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [6]

☆ حضرت نافع، جناب ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ خصی کرنے کے عمل کو مکروہ خیال کرتے تھے۔ [7]

☆ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ تابعی جانوروں کے خصی کرنے کو مکروہ خیال کرتے تھے۔ [8]

---

[1] فتح الباري ص ٧ ج١٠۔ [2] سنن البيهقي ص ٢٥ ج١٠۔ [3] مسند أحمد ص ١٩٦ ج ٥۔
[4] النساء: ١١٩۔ [5] تفسير ابن كثير ص ٦١٢ ج١۔ [6] مسند أحمد ص ٢٤ ج٢۔
[7] موطا إمام مالك ص ٩٤٨ ج٢ ح ٢٧٢٩۔ [8] مصنف ابن أبي شيبة ص ٢٢٦ ج١٢۔

دوسرے حضرات کی طرف سے مذکورہ دلائل کا بایں طور جواب دیا گیا ہے کہ آیت کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات کسی صحیح، ضعیف اور مرفوع حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ جہاں تک سلف کے اقوال کا تعلق ہے تو اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، مجاہد، قتادہ اور سعید بن مسیب رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد اللہ کا دین ہے کہ وہ لوگ شیطان کے کہنے پر حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرائیں گے جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز تفسیر میں ان اقوال کو نقل فرمایا ہے۔ [1]

جب سلف صالحین سے آیت مذکورہ کی مختلف تفاسیر منقول ہیں تو اس کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ چونکہ اس کی تفسیر میں کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں، لہٰذا '' لا تبدیل لخلق اللّٰہ '' اللہ کے دین میں کوئی تبدیلی نہیں، اس کے پیش نظر آیت مذکورہ میں ''خلق اللہ'' سے مراد اللہ کا دین ہی ہے جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ [2]

مسند امام احمد کے حوالے سے جو مرفوع حدیث بیان کی جاتی ہے وہ محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتی کیونکہ اس میں ایک راوی عبداللہ بن نافع ضعیف ہے۔ اس کی تفصیل مسند احمد کے حاشیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [3]

جب ہم علمائے متقدمین کو دیکھتے ہیں تو ان میں بیشتر حضرات جانوروں کو خصی کرنے کے قائل اور فاعل ہیں، چنانچہ حضرت بشیر کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے دور حکومت میں خود مجھے حکم دیا تھا کہ میں ان کے خچر کو خصی کروں۔ [4]

حضرت طاؤس رحمہ اللہ نے اپنے اونٹ کو خصی کروایا تھا نیز عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر نر جانور کے کاٹنے یا اس کے نقصان کا اندیشہ ہو تو اسے خصی کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [5]

ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے والد عروہ بن زبیر نے اپنا ایک خچر خصی کرایا تھا۔ [6]

ان اقوال کے پیش نظر یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ کسی ضرورت کے پیش نظر جانور کو خصی کیا جا سکتا ہے لیکن بلا وجہ یہ عمل مکروہ اور ناپسندیدہ ہے جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب کوئی واقعی ضرورت درپیش ہو تو جانور کو خصی کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے تابعین کرام سے یہ اقوال بیان کیے ہیں۔'' [7]

مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی جانور کو قربانی کے لئے خصی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اس کا گوشت عمدہ ہو جاتا ہے اور جن روایات میں امتناعی حکم ہے اسے ان جانوروں کے متعلق محمول کیا جائے جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا یا اس سے جانوروں کو بلا وجہ خصی کرنا مراد ہے۔

بہرحال خصی جانور کی قربانی بالکل جائز اور درست ہے کیونکہ خصی ہونا ان عیوب سے نہیں جو قربانی کے لئے رکاوٹ کا باعث ہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا: ''امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔'' [8]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ٦١٢ ج١۔
[2] سنن البیهقي ص ٢٥ ج١٠۔
[3] مسند أحمد : ٤٧٦٩۔
[4] سنن البیهقي ص ٢٥ ج١٠۔
[5] شرح معاني الآثار ص ٣٨٣ ج٢۔
[6] مصنف ابن أبي شیبة ص ٢٢٦ ج١٢۔
[7] سنن البیهقي ص ٢٦ ج١٠۔
[8] مسائل إمام أحمد و إسحاق : ٢٨٦٣۔

آداب و اخلاق

آداب و اخلاق
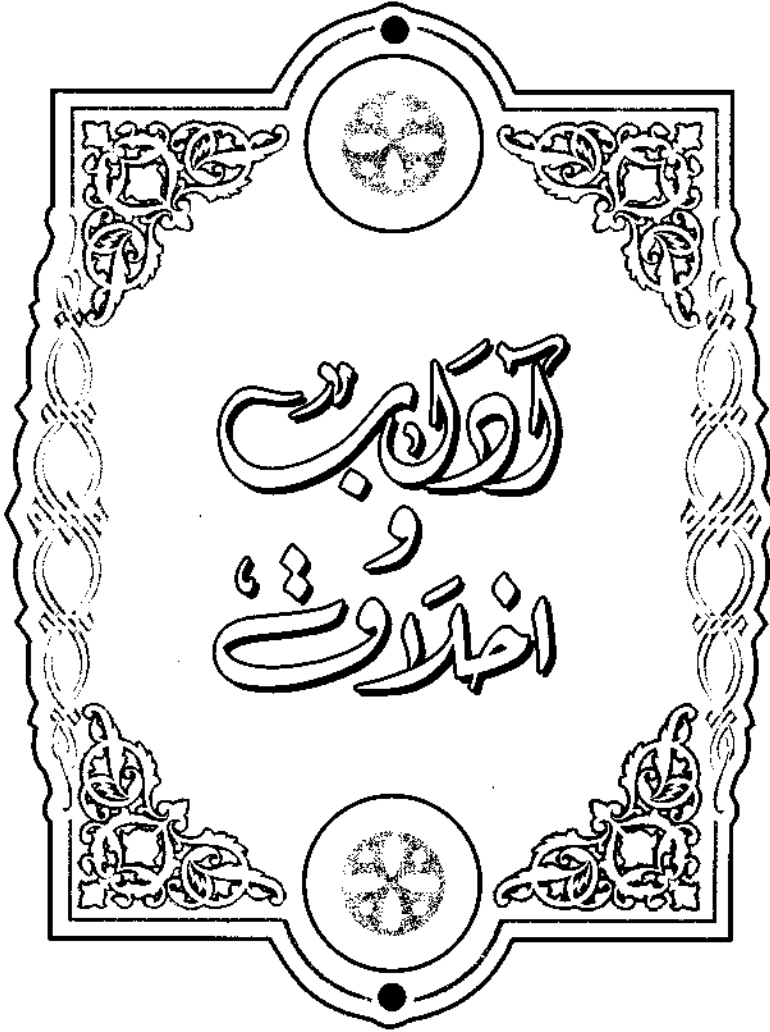
خاوند کی اجازت سے اعتکاف بیٹھنا

سوال میں نے اپنے خاوند کی اجازت سے اعتکاف بیٹھنے کا پروگرام بنایا، لیکن بعد میں اس نے مجھے روک دیا، کیا خاوند کو یہ حق ہے کہ اجازت دینے کے بعد اعتکاف بیٹھنے سے منع کرے، کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب اعتکاف دو طرح کے ہیں، ایک اعتکاف نذر ہے کہ عورت نے نذر مانی تھی اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں ماہ رمضان میں اعتکاف کروں گی اس طرح کی نذر کا پورا کرنا ضروری ہے، اگر کوئی عورت خاوند کی اجازت سے اس قسم کا اعتکاف بیٹھی ہے تو خاوند کو اٹھانے کی اجازت نہیں کیونکہ یہ حج کی طرح ہے کہ جب عورت نے حج کا احرام باندھ لیا تو پھر اسے مکمل ہی کرنا ہو گا اور اگر اعتکاف نذر کے بغیر ہے تو بیوی اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس قسم کا نفلی اعتکاف نہیں کر سکتی، اگر کسی خاوند نے اپنی بیوی کو اعتکاف بیٹھنے کی اجازت دی، پھر کسی ضرورت کے تحت اپنی بیوی کو اعتکاف گاہ سے نکالنا چاہیے تو اسے یہ حق حاصل ہے جیسا کہ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو نماز فجر ادا کرنے کے بعد اعتکاف گاہ میں داخل ہو جاتے، ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان شریف کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرنا چاہا، آپ نے خیمہ لگانے کا حکم دیا تو خیمہ لگا دیا گیا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنا خیمہ لگانے کا حکم دیا تو ان کا خیمہ بھی لگا دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ازواج مطہرات نے اپنے اپنے خیمے لگانے کا حکم دیا تو ان کے خیمے بھی لگا دیئے گئے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی تو دیکھا کہ بہت سے خیمے لگے ہوئے ہیں، یہ دیکھ آپ نے فرمایا: ’’کیا یہ نیکی چاہتی ہیں؟ پھر آپ نے ان کے خیمے اکھاڑ دینے کا حکم دیا اور اپنا بھی اعتکاف چھوڑ دیا پھر آپ نے شوال کے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا۔[1]

ازواج مطہرات کے اس فعل پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے انکار کیا تھا کہ شاید وہ اپنے اعتکاف میں مخلص نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد صرف آپ کے قریب رہنا ہو، یا آپ پر غیرت کرتے ہوئے یا جن ازواج کو اجازت ملی، ان پر غیرت کرتے ہوئے اعتکاف بیٹھ رہی تھیں، اس لئے آپ نے تمام ازواج کا اعتکاف ختم کرا دیا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحيح البخاري، الاعتكاف: ٢٠٣٣۔

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر بیوی اعتکاف نہیں کر سکتی اور اگر خاوند، بیوی کو اعتکاف کرنے کی اجازت دے دے تو کسی ضرورت کے پیش نظر اپنی اجازت کو منسوخ کر سکتا ہے، اگر چہ عورت اعتکاف بیٹھ ہی کیوں نہ جائے، البتہ کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ اگر خاوند نے بیوی کو اعتکاف کرنے کی اجازت دے دی اور پھر اس سے منع کر دیا تو وہ ایسا کرنے میں گنہگار ہوگا تاہم عورت کو چاہیے کہ وہ اعتکاف سے رُک جائے۔ لیکن ہمارا رجحان یہ ہے کہ اگر کوئی بیوی خاوند کی اجازت سے اعتکاف بیٹھ جائے تو پھر بھی خاوند کو یہ حق ہے کہ وہ اجازت واپس لیتے ہوئے اسے اعتکاف سے روک دے، درج بالا حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

ایک معاشرتی مسئلہ

سوال میری شادی کو چھ ماہ ہوئے ہیں، بیوی دینی تعلیم سے آراستہ ہے، میرے ماموں اور اس کے بیٹے ملاقات کے لئے گھر آئے، میں اس وقت گھر میں نہیں تھا، ماموں نے گھنٹی بجائی تو بیوی نے آواز دی کہ شوہر گھر میں نہیں ہیں، انہوں نے بتایا کہ میں تمہارا ماموں ہوں اور میرا نام یہ ہے، لیکن بیوی نے کہا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں، یہ سن کر وہ واپس چلے گئے، اس وقت سے آج تک ماموں ناراض اور ان کے بیٹے بھی خفا ہیں۔ مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اس مسئلہ کے متعلق ہماری راہنمائی فرمائیں کہ اگر بیوی کسی رشتہ دار کو بیٹھک کا دروازہ کھول کر بٹھا دے تو کیا یہ پردہ داری کے خلاف ہے؟

جواب اس میں شک نہیں ہے کہ بیوی کا فرمانبردار ہونا بہت بڑی نعمت ہے اگر چہ وہ دینی تعلیم سے آراستہ نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا کہ کونسی عورت بہتر ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جو اپنے خاوند کو خوش کر دے جب وہ اسے دیکھے، جب وہ اسے کوئی حکم دے تو اس کی بجا آوری کرے اور اپنے مال و جان میں خاوند کی مرضی کے خلاف ایسا کام نہ کرے جو اسے ناپسند ہو۔'' [1]

بیوی کا دینی تعلیم سے آراستہ ہونا بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے بشرطیکہ وہ اپنے خاوند کے گھر میں مخدوم بننے کے بجائے خادم بن کر رہے۔ صورت مسئولہ کس قدر تکلیف دہ ہے کہ بیوی کی ظاہری دینداری نے قطع رحمی تک پہنچا دیا ہے، اگر چہ خاوند کا ماموں، بیوی کا ماموں نہیں بن جاتا، اس سے پردہ کے احکام وہی ہیں جو کسی اجنبی سے پردہ کرنے کے ہوتے ہیں لیکن پردہ میں رہتے ہوئے مہمان نوازی اور رواداری کا مظاہرہ کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ اگر بیوی، بیٹھک کا دروازہ کھول کر انہیں بٹھا دیتی اور ان کی احوال پرسی کر لیتی تو ایسا کرنے سے اس کا پردہ محفوظ رہتا، لیکن بیوی کی ظاہری دینداری سے معاملہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں بیسیوں لوگ اس قسم کے مسائل سے دو چار ہیں، ان پر گہری نظر اور سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا ہمیں خیر القرون کے ایک واقعہ سے اس قسم کے مسائل کے متعلق راہنمائی ملتی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''کسی روز یا کسی رات رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوگئی، آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: اس وقت تمہیں کس چیز نے تمہارے گھروں سے نکالا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہمیں بھوک نے ستایا ہے، آپ ﷺ

---

[1] سنن النسائي، النكاح: ٣٢٣١۔

نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مجھے بھی اسی چیز نے نکالا جس نے تمہیں نکالا ہے۔ چلو، چنانچہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ چل دیئے، آپ ﷺ ایک انصاری کے پاس تشریف لائے لیکن اتفاق سے وہ گھر میں نہیں تھے، جب اس کی اہلیہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو انہیں خوش آمدید کہا، رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: فلاں کہاں ہے؟ اس نے عرض کیا وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گئے ہیں، اتنے میں وہ انصاری بھی آ گئے، جب اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو دیکھا تو خوشی سے پکار اٹھا: الحمد للہ! مہمانی کے لحاظ سے آج کا دن میرے لئے بہت ہی باعث عزت ہے۔ چنانچہ وہ شخص گیا اور باغ سے کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لایا جس میں کچی، پکی اور عمدہ ہر قسم کی کھجوریں تھیں، اس نے عرض کیا: آپ انہیں تناول فرمائیں۔ (1)

اس حدیث سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی مجبوری کے وقت عورت کسی اجنبی سے بات کر سکتی ہے اور اسے جواب بھی دے سکتی ہے نیز وہ عورت ایسے اجنبی کو گھر میں بلا سکتی ہے اور اکرام وعزت کے ساتھ بٹھا سکتی ہے جس کے آنے سے خاوند راضی ہو، ایسا کرنا پردہ داری اور دینداری کے خلاف نہیں ہے، اسی طرح کے ایک دوسرے واقعہ سے بھی راہنمائی ملتی ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جس وقت میری شادی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو اس وقت ہمارے گھر میں بہت غربت تھی، میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی خوراک کا خود بندوبست کرتی تھی اور مدینہ سے چھ میل دور ان کے باغ سے کھجور کی گٹھلیاں اپنے سر پر اٹھا کر لاتی تھی، ایک دن میں آ رہی تھی کہ راستہ میں رسول اللہ ﷺ انصار کے چند لوگوں کے ہمراہ میرے سامنے آئے، انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے اپنے پیچھے سوار کرنے کے لئے اپنی سواری کو بٹھایا لیکن مجھے حیا دامن گیر ہوا کہ میں اجنبی آدمیوں کے ساتھ سفر کروں پھر مجھے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کی غیرت کا بھی خیال آیا اور وہ اس سلسلہ میں بہت غیور شخص تھے، جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مجھے شرم آ رہی ہے تو آپ وہاں سے چل دیئے، بہر حال میں اسی حالت میں پیدل چلتے چلتے اپنے گھر کو آ گئی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے سارا واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! آپ کا اتنی دور سے سر پر گٹھلیاں اٹھا کر لانا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سوار ہونے سے زیادہ گراں تھا۔'' (2)

اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اس قسم کی مصنوعی پردہ داری کا رواج نہ تھا جو ہمارے معاشرہ میں در آئی ہے اور اس نے رشتہ داروں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ جو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے لئے غیر محرم تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے اسے اپنے پیچھے بٹھانے کی پیشکش کی۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی حیاداری اپنی جگہ ہے لیکن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا جواب کہ تیرا اتنے دور سے اپنے سر پر گٹھلیاں اٹھا کر لانا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سوار ہونے سے زیادہ گراں تھا۔ انہوں نے بھی دبے الفاظ میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی شرم وحیا کو اچھا خیال نہیں کیا، بہر حال خاوند کی عدم موجودگی میں گھر مہمان آ جائے تو اس کی تکریم میں ہماری مروجہ حیاداری حائل نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے پردے کے احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے: ''تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے کامل پاکیزگی یہی ہے۔'' (3)

---

(1) صحيح مسلم، الاشربة: ٥٣١٣۔ (2) صحيح البخاري، النكاح: ٥٢٢٤۔ (3) الاحزاب: ٥٣۔

اس ارشادِ باری تعالیٰ میں پردے کا مقصد قلب ونظر کی طہارت اور عصمت وناموس کی حفاظت قرار دیا گیا ہے، اس کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''عورتو! تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر شاہد ہے۔'' ❶

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو تقویٰ شعاری کا حکم دے کر یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر تمہارے دلوں میں تقویٰ ہو گا تو پردے کا اصل مقصد قلب ونظر کی طہارت یقیناً تمہیں حاصل ہو گی۔ بصورت دیگر ہم نے خود دیکھا ہے کہ حجاب کی ظاہری پابندیاں گناہ میں ملوث ہونے سے نہ بچا سکیں اور لمبے لمبے گھونگٹ نکالنے والی بظاہر دیندار دوشیزائیں رات کی تاریکی میں اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگ کر اپنے والدین اور بھائیوں کی عزت وناموس خاک میں ملا دیتی ہیں۔ اعاذنا اللہ منہ

واضح رہے کہ ہماری درازنفسی کا مطلب پردے کے احکام میں نرمی کرنا قطعاً نہیں بلکہ ہم صرف کہنا چاہتے ہیں کہ شرعی پردے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے حقوق بھی ادا کرنے چاہئیں تاکہ ہم کسی بھی قسم کی اخلاقی گراوٹ یا بے مروتی کا شکار نہ ہوں۔ (واللہ اعلم)

سوال میری دو ماہ قبل شادی ہوئی ہے، میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ جب گھر میں میرے بھائی، ماموں یا چچا آئیں تو ان سے احوال گیری کر لیا کرو، لیکن اس پر دینداری کا غلبہ ہے جس کی بنا پر وہ اس طرح مزاج پرسی کرنے کو شرعی پردہ کے خلاف سمجھتی ہے، مجھے اس کی دینداری کی وجہ سے سخت امتحان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، ممکن ہے کہ میری طرح دیگر قارئین بھی اس قسم کی آزمائش سے دوچار ہوں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے خاوند کو قیم یعنی گھر کا سربراہ کہا ہے۔ ❷

رسول اللہ ﷺ نے خاوند کو اس کی بیوی کے لئے جنت یا دوزخ قرار دیا ہے۔ ❸

شریعت نے نیک بیوی کو بھی بہت اہمیت دی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ دنیا کا بہترین متاع انسان کی نیک بیوی ہے۔ ❹

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس انسان کو نیک بیوی مل گئی اسے گویا دنیا وآخرت کی خیر وبرکت مل جاتی ہے۔ ❺

بہر حال دین اسلام میں اچھے خاوند اور نیک بیوی کو بہت اہمیت دی گئی ہے لیکن افسوس کہ فریقین کی طرف سے اس سلسلہ میں افراط وتفریط کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، ہم اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اتفاقاً یہ سوال سامنے آ گیا، لہٰذا اس کے جواب میں ہماری کچھ گزارشات ہدیہ قارئین ہیں:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ تحریم میں رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے مقابلہ میں متبادل بیویوں کی جن صفات کا ذکر کیا ہے ان میں علم کے بجائے عمل وکردار کو نمایاں کیا گیا ہے، ویسے بھی جن بیویوں کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہو اور وہ عمل وکردار سے عاری ہوں تو ان میں خادمیت کے بجائے مخدومیت کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے جو گھریلو زندگی کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں

---

❶ الاحزاب: ٥٥۔ ❷ النساء: ٣٤۔ ❸ مستدرک حاکم ص ١٨٩ ج ٢۔
❹ صحیح مسلم، الرضاع: ١٣٦٧۔ ❺ شعب الایمان ص ٢٣٣ ج ٤۔

گھریلو عائلی زندگی کے تنازعات میں مسئلہ خدمت ہی زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر ساس اپنی بہو کو پاؤں کا جوتا خیال کرتی ہے جبکہ بیوی یہ سمجھتی ہے کہ میرا نکاح جس خاوند سے ہوا ہے وہی مجھ سے واجبی سی خدمت لینے کا روادار ہے، اس سے گھریلو جھگڑے جنم لیتے ہیں اور زندگی اجیرن اور زہر کی طرح کڑوی بن جاتی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں دینی تعلیم سے آراستہ لڑکیاں جب شادی کے بعد اپنے خاوند کے گھر جاتی ہیں تو ان کے جذبہ دینداری کو خوب کچلا جاتا ہے اور بات بات پر ان کی دینداری کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ مجھے کئی ایک ایسی بچیوں کے فون آتے ہیں، جس میں وہ اپنی اس آزمائش کا واویلا کرتی ہیں، ایک لڑکی جو پردے کی پابند ہوتی ہے شادی کے بعد اس کے دیور اس کی چادر تار تار کر دیتے ہیں اور خاوند دیوث بن کر کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا ہوتا ہے، ایک لڑکی جس کا خاوند گھر سے باہر ہے اور وہ اس کی عدم موجودگی میں سادگی کے ساتھ زندگی کے ایام گزارتی ہے، زیور اور بھڑکیلا لباس نہیں پہنتی تو خاوند کی طرف سے اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ تم میری عدم موجودگی میں بھی زیب و زینت سے آراستہ رہا کرو تاکہ مجھے اپنے بھائیوں کی طرف سے طعنے وغیرہ نہ ملیں۔

دوسری طرف کچھ تعلیم یافتہ ایسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں کہ شادی کے بعد ان کا علم انہیں غرور و تکبر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ کسی رشتہ دار کی مزاج پرسی کرنے کو عار خیال کرتی ہیں بلکہ اسے اپنی دینداری کے خلاف سمجھتی ہیں جیسا کہ سوال میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، اگر کوئی عورت اپنی چادر اور چار دیواری کا تحفظ کرتے ہوئے خاوند کے قریبی رشتہ داروں کی حال گیری اور مزاج پرسی کرتی ہے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، اگر اپنی مصنوعی دینداری کو قائم رکھتے ہوئے ترش روئی اور قطع تعلقی کا مظاہرہ کیا جائے تو اس رویے کے منفی اثرات بھی برآمد ہو سکتے ہیں، بلکہ بیسیوں واقعات ہمارے علم میں ہیں کہ خاوند نے اپنی بیوی کو تنگ مزاجی بلکہ بے مروتی کے پیش نظر اسے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا جبکہ ہماری اسلاف خواتین کے ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ شب عروسی کے بعد خود دلہن نے ولیمہ کے لئے کھانا تیار کیا اور خود ہی مہمانوں کے ہاں اسے پیش فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابو اُسید ساعدی رضی اللہ عنہ کی جب شادی ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لئے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا، اس وقت ان کی دلہن نے ہی کھانا تیار کیا اور اسے مہمانوں کے لیے پیش کیا۔ [1]

بلکہ ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''اس دن دلہن ہونے کے باوجود ابو اسید ساعدی رضی اللہ عنہ کی بیوی ہی ان مہمانوں کی خدمت گزار تھی۔'' [2]

اس حدیث کے پیش نظر ہمیں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا چاہیے، اپنے پردے کے تحفظ کے ساتھ اگر مہمانوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ مزاج پرسی کر لی جائے تو شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور نہ ہی اسلام اس قسم کے خشک زہد کی اجازت دیتا ہے۔ میرے علم میں چند گھرانے ایسے بھی ہیں کہ وہ بیوی کے خشک رویے کے پیش نظر انتہائی قریبی رشتے داروں سے کٹ گئے ہیں اور آپس میں تعلقات بھی خراب ہو گئے۔ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ کچھ خاوند سہل پرست اور کچھ انتہا پسند بھی ہوتے ہیں، ان کی سہل پرستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنی بیوی کو حکم دیتے ہیں کہ تو نے میرے فلاں دوست سے پردہ نہیں کرنا ہے اور میرے فلاں

---

[1] صحيح البخاري، النكاح: ٥٩٨٢۔ ، [2] صحيح البخاري، النكاح: ٥١٨٣۔

رشتہ دار کے سامنے کھلے منہ آنا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ اجازت نہ تھی کہ کھلے بندوں ازواج مطہرات سے کوئی چیز طلب کریں بلکہ انہیں یہ حکم تھا: ''جب تم نبی ﷺ کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو۔'' [1]

آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ پردہ تو آنکھوں اور دل کا ہونا چاہیے جبکہ اللہ تعالیٰ پردے کی علت اور حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے کامل پاکیزگی یہی ہے۔'' [2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شرعی پردے سے مرد اور عورت دونوں کے دل ریب و شک سے محفوظ اور ایک دوسرے کے ساتھ فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہیں گے۔ خاوند کے چھوٹے بڑے بالغ بھائیوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر ان کے ساتھ بے تکلف ہونے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو۔'' یہ سن کر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! دیور کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''دیور تو موت ہے۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاوند کے بھائی اور دوسرے قریبی رشتہ دار بیوی کے لئے محرم نہیں ہیں لہٰذا عورت کو چاہیے کہ اپنی عزت و آبرو کے تحفظ کے پیش نظر ان سے اختلاط نہ کرے بلکہ خلوت و تنہائی سے بھی محتاط رہنا چاہیے۔ ہمارے ہاں معاشرتی بگاڑ کی ایک وجہ خاوند کا دینی معاملات میں انتہائی تشدد بھی ہے، اس کی والدہ اور دولہا کا دوست جو اس نکاح میں واسطہ تھا، بیٹھ کر گئے، لڑکی کے گھر جانے کے بجائے مسجد میں ڈیرہ لگایا اور وضو کی ٹوٹیوں سے پانی پیا پھر سادگی کے ساتھ مسجد میں نکاح ہوا۔ دلہا میاں اپنے ساتھ دلہن کے لئے دھلے ہوئے کپڑے لے کر گیا تھا وہ کپڑے دلہن کو پہنا دیے گئے اور چاند گاڑی کی ایک سیٹ جو خالی رکھی گئی تھی، اس پر اسے بٹھا کر اپنے گھر لے آئے، اس نکاح کا علاقہ بھر میں بہت چرچا ہوا لیکن اس نکاح کا دوسرا رخ جو انتہائی تکلیف دہ اور روح فرسا تھا وہ یہ کہ دو ماہ بعد لڑکی کا والد میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میری بیٹی اپنے سسرال جانے کے لئے آمادہ نہیں ہے، اس کا کہنا ہے کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو، یہ مجھے منظور ہے لیکن میں ان کے ہاں نہیں جانا چاہتی۔ میں نے اس لڑکی کو اپنے گھر بلایا اور اپنی اہلیہ مرحومہ کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے اپنے سسرال جانے پر آمادہ کرے۔ کیونکہ نکاح کا بندھن کوئی بجلی کا بلب نہیں کہ ایک کی جگہ دوسرا لگا کر کام چلا لیا جائے، اہلیہ نے بہت سمجھایا لیکن لڑکی کسی بھی طرح سسرال جانے پر آمادہ نہ ہوئی، آخر کار یہ کمان میں نے اپنے ہاتھ میں لی اور سسرال کے ہاں نہ جانے کی وجہ معلوم کرنا چاہی، لڑکی نے بتایا کہ سسرال کے ہاں صرف تین افراد ہیں، ایک میرے میاں دوسرے اس کے چھوٹے بھائی اور تیسری اسکی والدہ لیکن وہاں مجھ پر پردہ کے سلسلہ میں اس قدر سختی کی جاتی ہے گھر میں دوپٹہ یا چادر اوڑھنے کی اجازت نہیں بلکہ مجھے ایک موٹا کھیس دیا گیا ہے کہ گھر میں بھائی کی موجودگی میں اسے اپنے اوپر لینا ہے، اب میں گھر میں اس قدر دلبرداشتہ ہوں کہ مجھے موت قبول ہے لیکن وہاں نہیں جاؤں گی، دلہا سے طلاق لے کر لڑکی کی جان بخشی کرنا پڑی کیونکہ دلہا میاں اعلیٰ نسل کے مسلمان ہونے کی بنا پر اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور وہ اس میں کسی طرح

---

[1] الاحزاب: ۵۳۔ [2] الاحزاب: ۵۳۔ [3] صحيح البخاري، النكاح: ۵۲۳۲۔

سے نرمی کرنے پر آمادہ نہیں تھے، آخر یہ کون سا اسلام ہے جس پر ہم عمل پیرا ہیں؟ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ ''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے وہ آپ کے ساتھ کبھی ایک انداز پر گذر بسر نہیں کرے گی اگر تم اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے ٹیڑھے پن کے ساتھ ہی اس سے فائدہ حاصل کرو اور اگر تم نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو تم اسے توڑ بیٹھو گے اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے۔ ❶

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مومن شوہر اپنی مومن بیوی سے بغض نہ رکھے، اگر اس کی کوئی عادت اسے ناپسند ہے تو اسے اس کی کوئی دوسری عادت پسند بھی ہوگی۔'' ❷

رسول اللہ ﷺ نے نیک خاتون کو اس طرح تلقین فرمائی کہ جو عورت اس حال میں فوت ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔ ❸

ہماری اس دراز نفسی کا مطلب یہ ہے کہ بیوی خاوند دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے اور دین اسلام میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا خیال رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

پردہ میں تخفیف کن عورتوں کے لئے ہے

سوال قرآن کریم میں خاص قسم کی عورتوں کو پردے میں تخفیف کا حکم ہے، وہ کونسی عورتیں ہیں اور پردے میں تخفیف سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت کردیں؟

جواب وہ آیت جس میں پردے کے متعلق کچھ تخفیف کا حکم ہے، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: ''اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں اور نکاح کی توقع نہ رکھتی ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار لیا کریں تو ان پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ زیب و زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں تاہم اگر وہ پرہیز ہی کریں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔'' ❹

اس آیت کریمہ میں ''القواعد'' سے مراد بوڑھی اور عمر رسیدہ عورتیں ہیں، جنہیں بڑھاپے کی وجہ سے حیض آنا بند ہو گیا ہو اور وہ ازدواجی زندگی کے کام کاج سے فارغ ہو چکی ہوں، نیز وہ اولاد جنم دینے کے قابل نہ رہی ہوں، جنکی جنسی خواہش اس قدر مر چکی ہو کہ اگر کوئی مرد انہیں دیکھے تو اس کے صنفی جذبات میں تحریک پیدا نہ ہو یعنی بوڑھی کھوسٹ عورتیں، ایسی عورتوں سے ''وضع ثیاب'' سے بدن کے کپڑے اتار دینا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان عورتوں سے حجاب کی پابندیاں اٹھ جاتی ہیں اور کپڑے اتارنے سے مراد حجاب کے کپڑے اتار دینا ہے اور وہ دو ہیں:

(الف) ایک دوپٹہ ہے جس سے عورتیں اپنا سر اور گریبان ڈھانپتی ہیں اور اس کا تعلق گھر کے اندر کی دنیا سے ہے، یعنی بوڑھی عورتیں اگر گھر کے اندر اپنا دوپٹہ اتار دیں تو انہیں رخصت ہے۔

---

❶ صحیح مسلم، الرضاع: ٣٦٤٣۔ ❷ صحیح مسلم، الرضاع: ٣٦٤٥۔
❸ سنن الترمذي، الرضاع: ١١٦١۔ ❹ النور: ٦٠۔

(ب) بڑی چادر، جس کے ذریعے باہر نکلتے وقت اپنی زیب و زینت کو ڈھانپا جاتا ہے، بوڑھی عورتوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گھر سے باہر نکلتے وقت بڑی چادر سے پورے جسم کو ڈھانپ کر نکلیں۔

قرآن کی ہدایت کے مطابق یہ رخصت بھی صرف اس صورت میں ہے جب انہوں نے سنگھار اور میک اپ وغیرہ نہ کیا ہو، اگر ایسی صورت ہو اور انہیں اپنی زیب و زینت کا اظہار مقصود ہو تو پھر انہیں یہ رخصت نہیں ملے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی عورت اپنی جنسی کشش کھو جانے کے باوجود بناؤ سنگھار کے ذریعے اپنی ''حیثیت'' کو نمایاں کرنے کے مرض میں مبتلا ہو تو پردہ میں تخفیف سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گی بلکہ انہیں گھر کے اندر دوپٹہ اور باہر نکلتے وقت بڑی چادر یا برقعہ اوڑھنا ہوگا اور انہیں مکمل پردہ کرنا ہوگا۔

قرآن کریم نے یہ بھی تلقین کی ہے کہ اگر بڑی بوڑھی عورتیں اس رخصت سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہی بات ان کے حق میں بہتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے دیکھنے والے تمام بوڑھے یا متقی نہیں ہوتے بلکہ عرب کا محاورہ ہے:

''ہر گری پڑی چیز کو کوئی اٹھانے والا ضرور ہوتا ہے۔'' ہوسکتا ہے کوئی شہوت کا مارا ہوا اوباش ان سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کردے، لہٰذا بوڑھی عورتیں بھی اس رخصت کا استعمال موقع و محل کا لحاظ رکھ کر کریں، بصورت دیگر وہ اس رخصت پر عمل نہ کریں یہی بات ان کے حق میں اور معاشرہ کے حق میں بہتر ہے۔

ہمارا رجحان یہ ہے کہ دور حاضر میں اگر بہت بوڑھی عورتیں بھی پردے میں تخفیف نہ کریں بلکہ بدستور بڑی چادر یا برقعہ کا استعمال کریں تو یہ زیادہ بہتر اور عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ (واللہ اعلم)

عورتوں کا مردوں کو دیکھنا

سوال اگر کوئی عورت اپنے کام کے لئے بازار جائے تو کیا وہ مردوں کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب عورت کا مردوں کو دیکھنا دو طرح کا ہوسکتا ہے اور ہر قسم کا حکم الگ ہے، اگر کوئی عورت مردوں کو لطف اندوزی اور شہوت انگیزی کے لئے دیکھتی ہے تو اس طرح کی نظر بازی حرام اور ناجائز ہے کیونکہ اس سے فتنہ و فساد کے جنم لینے کا اندیشہ ہے، قرآن کریم میں غالباً اسی فتنے کی روک تھام کے لئے خواتین کو غضِ بصر کا حکم دیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''آپ مسلمان خواتین سے کہہ دیں کہ وہ بھی اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔'' [1]

اس کے برعکس اگر کوئی عورت شہوت انگیزی اور لطف اندوزی کے بغیر مردوں کو دیکھتی ہے تو اس میں چنداں حرج نہیں ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ وہ اہل حبشہ کا کھیل دیکھتی رہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں چھپا رکھا تھا، بلکہ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ [2]

اس حدیث کے پیش نظر اہل علم نے شہوت کے بغیر عورتوں کو مردوں کی طرف دیکھنے کی اجازت دی ہے، اگرچہ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ کے پیش نظر جس طرح مردوں کے لئے عورتوں کو دیکھنا منع ہے، اسی طرح مطلق طور پر عورتوں کے

---

[1] النور: ۳۱۔ [2] صحیح البخاري، الصلوٰۃ: ٤٥٤۔

لئے مردوں کو دیکھنا منع ہے لیکن ان کا یہ موقف حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے پیش نظر مرجوح معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

شعائر اسلام سے مذاق

سوال ہمارے سامنے 11 جولائی 2011ء کا نوائے وقت ہے، محکمہ بہبودی آبادی حکومت پنجاب کی طرف سے ''عالمی یوم آبادی'' کے عنوان سے اس کا خصوصی ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جس میں ''آبادی زیادہ، وسائل کم'' کے عنوان سے ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرانے کا اعلان ہے۔ اس اعلان کے ایک طرف حاملہ عورت کی تصویر ہے جس کے حمل کو خوب نمایاں کیا گیا ہے اور وہ دو چھوٹے بچے اٹھائے ہوئے دکھائی گئی ہے پھر اس کی چٹیا کے ساتھ کپڑے کا ایک کنارہ باندھا گیا ہے، اس کا دوسرا کنارہ ایک مرد درویش کی داڑھی سے باندھ کر ایک جھولا بنایا گیا ہے جس میں شیر خوار بچہ لیٹا ہوا ہے، اس طرح عورت اور داڑھی دونوں کی تذلیل کی گئی ہے۔ دین اسلام میں شعائر دین کے ساتھ اس طرح کا مذاق کرنے والوں کی کیا سزا ہے؟ ہم حیران ہیں کہ اس قسم کے استہزاء و مذاق وہ بھی صنف نازک اور شریعت مطہرہ کے ساتھ، ایسے لوگوں کے متعلق شرعی فتویٰ درکار ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین

جواب خاندانی منصوبہ بندی جس کا نیا نام محکمہ بہبود آبادی ہے، آئے دن پاکستانی آبادی کنٹرول کرنے کے لئے نئے نئے تجربے کرتا ہے، لیکن اللہ کی تقدیر کے سامنے بے بس و لاچار ہے، چنانچہ اسی اخبار میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے: ''شرح پیدائش میں کمی اور آبادی پر کنٹرول کرنے کی محکمہ بہبود آبادی کی کاوشوں کی نیم قدامت پسند اور مذہبی تعلیمات کا ادراک نہ رکھنے والے طبقوں کی طرف سے ہمیشہ مخالفت کی جاتی رہی ہے۔ لوگ تقدیر اور قضاء و قدر پر کچھ اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ بہبود آبادی کے ضمن میں دیئے جانے والے دلائل انہیں قائل نہیں کر پاتے۔''

بہر حال محکمہ بہبود آبادی اور اس کی حمایت کرنے والوں کی پسپائی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، ایسے حضرات کی طرف سے شعائر اسلام کی توہین اور تذلیل بعید از عقل نہیں۔ انہیں یہ غم ہلکان کئے جا رہا ہے کہ پانی کی طرح پیسہ خرچ کرنے کے باوجود انہیں کامیابی کیوں نہیں ملتی، اس طرح توہین آمیز اشتہارات ان کے اندرونی غم و غصے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بہر حال دین اسلام میں داڑھی کا جو مقام ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، داڑھی، شعائر اسلام سے ہے اور یہ ایک مسلمان کے لئے شناختی علامت اور امتیازی نشان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کئی ایک طریقوں سے اس کی حیثیت و اہمیت سے آگاہ فرمایا ہے، درج ذیل حقائق سے ہم اس کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''داڑھی بڑھانے کا بیان۔'' [1]

اس کے تحت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مونچھوں کو پست کرو اور داڑھی کو بڑھاؤ۔'' [2]

داڑھی بڑھانے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ آپ کا امر وجوب کے لئے ہے الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ صارفہ ہو۔

---

[1] صحيح البخاري، اللباس باب نمبر ٦٥۔ [2] صحيح البخاري، اللباس باب نمبر ٥٨٩٢۔

☆ داڑھی سے چھیڑ چھاڑ کرنا یہود ونصاریٰ اور مشرکین ومجوس کا عمل ہے، جبکہ ہمیں اس سلسلہ میں ان کی مخالفت کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے یہود ونصاریٰ کی مخالفت کرنے کے متعلق فرمایا: ''تم اہل کتاب کی مخالفت کرو اپنی داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایرانی مجوسیوں کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: ''یہ لوگ اپنی مونچھیں بڑھاتے ہیں اور داڑھی منڈواتے ہیں، تم ان کی مخالفت کرو، اپنی داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں چھوٹی کرو۔'' [3]

☆ داڑھی بڑھانا امور فطرت سے ہے جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فطری امور دس ہیں، مونچھیں کتروانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن تراشنا، جوڑوں کا دھونا، بغلوں کے بال اکھیڑنا، زیر ناف بالوں کی صفائی کرنا، استنجا کرنا اور کلی کرنا۔'' [4]

ان امور کا اختیار کرنا اس قدر اہم ہے گویا جبلی اور خلقی ہیں، تمام انبیائے کرام نے ان امور کا التزام کیا ہے اور یہ امور اسلامی شعار بھی ہیں۔ اس حدیث کے پیش نظر داڑھی کو اپنی فطرتی حالت میں رہنے دیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی غیر فطرتی عمل نہ کیا جائے۔

☆ قرآن کریم میں ابلیس لعین کے حوالے سے یہ بیان ہوا ہے کہ میں انہیں حکم دوں گا چنانچہ لوگ اللہ تعالیٰ کی خلقت کو تبدیل کریں گے۔ [5]

اس آیت کے پیش نظر جن امور فطرت میں اللہ تعالیٰ نے تبدیلی کرنے کا حکم دیا ہے وہ جائز اور مباح ہیں مثلاً ختنہ کرنا، زیر ناف بال صاف کرنا، البتہ داڑھی کے متعلق تبدیلی کرنے کا کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا ہے۔ لہٰذا اس کی کانٹ چھانٹ کرنا ان شیطانی امور سے ہے جن کا ابلیس نے اولاد آدم کو حکم دیا۔ اور وہ اس کی بجا آوری کر رہے ہیں، اس پہلو سے بھی داڑھی کے معاملہ پر غور کرنا چاہیے۔ نیز اس سے داڑھی کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کا اسلام میں کیا مقام ہے۔

☆ ہمیں نسوانی مشابہت کرنے سے منع کیا گیا ہے بلکہ حدیث میں ایسے مردوں پر لعنت کی گئی ہے جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی ملعون قرار دیا گیا ہے جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ [6]

عورتوں کی داڑھی نہیں ہوتی، ہم داڑھی منڈوا کر عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں جو کہ باعث لعنت ہے، اس سے محفوظ رہنے کا یہی طریقہ ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر رہنے دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔

☆ داڑھی کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو ایرانی آئے جن کی داڑھیاں مونڈی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اظہار نفرت کرتے ہوئے انہیں دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ مجھے تو

---

[1] صحیح البخاري، اللباس: ٥٨٩٢۔ [2] مسند إمام أحمد ص ٢٦٥ ج ٥۔ [3] ابن حبان ص ٤٠٨ ج ١۔
[4] صحیح مسلم، الطهارة: ٢٦١۔ [5] النساء: ١١٩۔ [6] صحیح البخاري، اللباس: ٥٨٨٥۔

میرے رب نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے اور تمہیں یہ شکل وصورت بنانے کا کس نے حکم دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں بھی ہمارے رب (بادشاہ) نے اس بات کا حکم دیا ہے۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں داڑھی کا بہت اونچا مقام ہے۔ اب جو لوگ اس داڑھی کو اپنی حالت میں رکھنے کی بجائے اس کے ساتھ غیر فطرتی سلوک کرتے ہیں بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں جیسا کہ سوال میں ذکر ہوا ہے، ان کے متعلق قرآن کریم کا صریح حکم ہے کہ قرآنی آیات یا اسلامی شعائر کے ساتھ مذاق کرنا سنگین جرم ہے۔ چنانچہ مکہ میں رہتے ہوئے مشرکین مکہ اسلامی شعائر کا مذاق اڑاتے تھے تو مسلمانوں کو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے منع فرما دیا گیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں نکتہ چینیاں کرتے ہیں تو ان کے پاس بیٹھنے سے اعراض کریں تا آنکہ وہ کسی دوسری بات میں مصروف ہو جائیں۔'' [1]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو انسان اسلامی شعائر کے ساتھ مذاق کرتا ہے وہ اس قدر بدبخت ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے، مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ گئے تو وہاں منافقین اور یہود و نصاریٰ بھی کفار مکہ کا کردار ادا کرنے لگے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے دوبارہ مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یہ حکم پہلے نازل کر چکا ہے کہ تم جب سنو، آیات الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ مذاق اڑایا جا رہا ہے تو وہاں ان کے ساتھ مت بیٹھو، تا آنکہ یہ لوگ اپنا موضوع بدل لیں۔ بصورت دیگر تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو جاؤ گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔'' [2]

یعنی جو لوگ ایسی مجالس میں بیٹھیں جہاں علانیہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اور شعائر اسلام کی توہین کی جا رہی ہو یا سرے سے ان کا انکار کیا جا رہا ہو اور وہ ایسی باتیں سن کر ٹھنڈے دل سے سن کر وہیں بیٹھے رہیں اور ان کی غیرت ایمانی کو ذرا بھی جنبش نہ آئے تو ان میں اور کافروں میں کوئی فرق نہیں رہتا، ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر دے اور ان کی زبانیں بند کرنے کے لئے کوئی حیلہ گری کرے اور اگر دلائل سے انہیں حق بات کا قائل کر سکتا ہو تو ضرور کرے اور اگر یہ دونوں کام نہیں کر سکتا تو کم از کم خود وہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔ واضح رہے کہ سورۃ انعام مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی اور مکہ میں شعائر اسلام اور آیات الٰہی کا تمسخر کرنے والے کفار مکہ تھے اور سورۃ النساء مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ یہاں اللہ کی آیات اور شعائر اسلام کا مذاق کرنے والے یہود مدینہ اور منافقین تھے گویا آیات الٰہی اور شعائر اسلام کا مذاق اڑانا ہر طرح کے کافروں کا پرانا دستور ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہہ دیں گے، ہم تو صرف مذاق اور دل لگی کر رہے تھے، آپ ان سے کہہ دیں کہ کیا تمہاری ہنسی اور دل لگی، اللہ اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہی ہوتی ہے، بہانے نہ بناؤ تم واقعی ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔'' [3]

یہ آیات غزوہ تبوک کے موقع پر نازل ہوئیں، اس وقت مسلمانوں کے ساتھ منافقین کی ایک جماعت بھی شامل تھی، اسلام اور اہل اسلام سے مذاق کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، جب ان سے باز پرس کی گئی تو کہنے لگے کہ ہم تو یہ باتیں اس طویل سفر میں محض دل

---

[1] الانعام: ٦٧۔ [2] النساء: ١٤٠۔ [3] التوبة: ٦٦۔

بہلاوے کے طور پر کر رہے تھے، سنجیدگی سے نہیں کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا کہ کیا انہیں اس دل بہلاوے اور ہنسی مذاق کے لئے ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں جن میں اللہ اور اس کے رسول کی سبکی ہوتی ہو اور اسلام کی سربلندی کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہو؟ تمہارے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تم اسلام سے خارج ہو چکے ہو۔

اخبار کے خصوصی ایڈیشن میں جو مزاحیہ مشاعرہ کا اعلان ہوا ہے اور اس کے ساتھ جو مزاحیہ تصویر شائع ہوئی ہے، اس میں بھی ایک صنف نازک کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے کہ اس کے حمل کو خوب نمایاں کیا گیا ہے پھر داڑھی کے ساتھ کپڑا باندھ کر اس کا مذاق کیا گیا ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگ بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، اگر وہ صدق دل سے توبہ کر لیں اور اخبار میں اپنی معذرت شائع کر دیں تو یہ جرم معاف ہو سکتا ہے بصورت دیگر ان کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہل اسلام کو چاہیے کہ اس قماش کے لوگوں اور یہ گھناؤنا کردار ادا کرنے والے اخبارات کا بائیکاٹ کریں اگر اہل اسلام ایسا نہیں کریں گے تو قرآن کریم کے مطابق یہ ٹھنڈے پیٹ اس جرم کو برداشت کرنے والے بھی جرم کرنے والوں کی طرح ہوں گے۔ (واللہ اعلم)

دوران تلاوت سلام کا جواب دینا

سوال اگر کوئی آدمی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو تو کیا اسے سلام کہا جا سکتا ہے، اگر سلام کہنا جائز ہے تو کیا وہ دوران تلاوت سلام کا جواب دے سکتا ہے، قرآن و حدیث کے مطابق اس کا جواب دیں؟

جواب ہمارے ہاں کچھ مسائل ایسے ہیں جو لوگوں میں مشہور ہیں لیکن کتاب و سنت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں، مثلاً: کھانا کھانے والے اور دوران جماعت نماز پڑھنے والوں کو سلام نہیں کرنا چاہیے، حالانکہ قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کوئی ممانعت وارد نہیں۔ اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ جب کوئی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو تو اسے سلام نہیں کرنا چاہیے اور نہ اسے سلام کا جواب دینے کی اجازت ہے حالانکہ احادیث میں وارد رسول اللہ ﷺ کے عمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مسجد میں بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اس دوران رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، آپ نے ہمیں سلام کیا تو ہم نے آپ کے سلام کا جواب دیا۔ [1]

اس حدیث سے درج ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

☆ مسجد میں داخل ہوتے وقت حاضرین کو سلام کہنا رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے۔ ☆ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کو سلام کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ ☆ قرآن مجید پڑھنے والا دوران تلاوت سلام کا جواب دے سکتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید کی تلاوت سلام کہنے اور جواب دینے کے لئے رکاوٹ کا باعث نہیں ہے۔

خلوت کا مفہوم

سوال احادیث میں اجنبی مرد و عورت کی خلوت ممنوع ہے، اس خلوت کا کیا مفہوم ہے، کیا اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے لوگوں سے اوجھل ہوں؟

---

[1] مسند أحمد ص ١٥٠ ج ٤۔

جواب غیر محرم کے ساتھ کسی بھی عورت کا تنہائی اختیار کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی عورت بھی کسی مرد سے محرم کی موجودگی کے بغیر خلوت نہ کرے۔'' ❶

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! جو آدمی بھی کسی غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرتا ہے ان دونوں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔'' ❷

شرعی طور پر حرام خلوت سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر کسی گھر میں خلوت کرے اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کرے بلکہ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ دونوں کسی جگہ پر اکیلے ہوں اور ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے پھریں، ان دونوں کے درمیان بات چیت کا دور چلے خواہ وہ لوگوں کے سامنے ہی کیوں نہ ہو اور لوگ ان کی باتیں نہ سن سکیں، یہ بھی حرام خلوت میں شامل ہے۔ دور حاضر میں خلوت کا بدترین ذریعہ موبائل فون اس میں شامل ہے۔ اس کے ذریعے ماں باپ، بھائیوں کے سامنے خلوت کی جاتی ہے، اس کے ذریعے بات چیت سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے بلکہ گھر سے فرار ہونے کے پروگرام بنائے جاتے ہیں، اللہ کی شریعت میں خلوت اس لئے حرام کی گئی ہے کہ یہ زنا اور بدکاری کا وسیلہ اور اس کا پیغام ہے، لہٰذا یہ جس صورت میں بھی پایا جائے وہ خلوت حرام میں داخل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔'' ❸

والدین کو چاہیے کہ وہ اس پہلو سے بھی اپنی اولاد پر نظر رکھیں، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن اولاد کے ساتھ انہیں بھی دھر لیا جائے اور دنیا میں جو رسوائی اور جگ ہنسائی ہوگی وہ اس کے علاوہ ہوگی۔ واللہ المستعان

بیوی کو اپنے والدین کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا

سوال میری شادی آٹھ سال قبل ہوئی تھی، اب میرا ساس، سسر اور دیور کے ساتھ رہنا مشکل ہے۔ میں نے اپنے خاوند سے علیحدہ رہائش کا مطالبہ کیا ہے لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں۔ کیا میرا یہ مطالبہ غیر شرعی ہے، اس کے متعلق شرعی ہدایات مطلوب ہیں؟

جواب خاوند نے جس عورت کو طلاق رجعی دے رکھی ہو اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''تم اپنی طاقت کے مطابق جہاں تم خود رہتے ہو وہاں ان (طلاق والی) عورتوں کو رکھو۔'' ❹

اس آیت کریمہ کے مطابق مطلقہ رجعیہ کے لیے رہائش ثابت ہے لیکن جو عورت آدمی کے نکاح میں ہے، اس کے لئے تو بالاولیٰ واجب ہے۔ نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''(ترجمہ) ''تم ان عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے کے ساتھ بود و باش اختیار کرو۔'' ❺

یہ بات معاشرتی طور پر معروف ہے کہ عورت کے لئے ایسی رہائش کا بندوبست ہونا چاہیے جہاں اس کی چادر چار دیواری کا

---

❶ مسند أحمد ص ۳۳۹ ج ۳۔ ❷ جامع ترمذي، الفتن: ۲۱۶۵۔

❸ صحیح البخاري، النکاح: ۵۰۹۶۔ ❹ الطلاق: ۶۔ ❺ النساء: ۱۹۔

تحفظ ہو، لوگوں کی نگاہوں سے بھی اوجھل رہے پھر مال و متاع کی حفاظت اور تعلقات زن وشوئی کے لئے بھی "معقول رہائش" کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق عورت کا یہ مطالبہ بے جا نہیں کہ اس کے لئے علیحدہ اور الگ رہائش کا بندوبست ہو، اگر وقتی طور پر ایسی رہائش ممکن نہیں تو گھر میں کسی الگ کمرے میں رہائش کا بندوبست کر دیا جائے تا کہ کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو اور نہ ہی بالغ افراد کے ساتھ خلوت کا خدشہ ہو، اگر گھر میں خاوند کے بالغ بھائی موجود ہیں تو معاملہ مزید نازک ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"تم عورتوں کے پاس جانے سے گریز کرو، ایک انصاری نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! خاوند کے عزیز واقارب کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خاوند کے عزیز واقارب تو موت ہیں۔" [1]

اس حدیث کے پیش نظر ہم خاوند کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی اور بال بچوں کے لئے علیحدہ رہائش یا کم از کم الگ کمرے کا بندوبست کرے، اس میں خیر و برکت ہے لیکن اگر اس کے والدین بوڑھے ہیں اور اپنے بیٹے کے محتاج ہیں تو ہم اس کی بیوی کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ انہیں اپنے والدین کا مقام دے کر ان کی خدمت کرے اور ان کی دعائیں لے۔ اگر ان سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو اس پر صبر کرے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت گزاری کے بدلے خیر کثیر سے نوازے گا۔ کوشش کی جائے کہ اپنے خاوند اور اس کے والدین کو زیادہ سے زیادہ سہولت اور آرام دیا جائے۔ خاوند کو بھی چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں بردباری اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرے اور گاہے بگاہے اپنے والدین سے عرض کرتا رہے کہ وہ اپنی بہو کے ساتھ محبت و پیار سے پیش آئیں اور اسے اپنی حقیقی بیٹی کا مقام دیں، اس سے حالات کے خوشگوار ہونے میں بہت مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کتاب وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے۔ آمین!

چھوٹی بچیوں کو غیر شرعی لباس پہنانا

سوال ہمارے ہاں خواتین چھوٹی بچیوں کو مختصر لباس پہنا دیتی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ بچیاں مکمل لباس پہننے کی مکلف نہیں ہیں، کیا ایسا کرنا درست ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب ہمارے رجحان کے مطابق خواتین کا یہ طریقہ درست نہیں ہے کیونکہ اگر بچیوں کو بچپن میں مختصر لباس پہننے کی عادت پختہ ہو گئی تو بڑی عمر میں انہیں مکمل لباس پہننے میں دشواری آسکتی ہے، اس لئے ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنی بچیوں کی بچپن میں صحیح تربیت کریں اور انہیں ایسا لباس پہنائیں جو شریعت کے مطابق ہو جیسا کہ صحابیات کے متعلق احادیث میں ہے کہ وہ عاشوراء کا روزہ رکھنے کی عادت ڈالنے کے لئے شیر خوار بچوں کو ان کے اوقات میں دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ انہیں کھلونوں میں مصروف رکھتی تھیں تا کہ انہیں روزہ رکھنے کی عادت پڑ جائے۔ [2]

خواتین کو چاہیے کہ وہ اس پہلو کو نظر انداز نہ کریں اور بچیوں کی تربیت پر خاص توجہ دیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح مسلم، السلام: ۲۱۷۲۔ [2] صحیح البخاری، الصوم: ۱۹۶۰۔

قبلہ کی طرف تھوکنا

سوال ہمارے ہاں عام طور پر لوگ بے خیالی میں قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوک دیتے ہیں، میں نے اس کے متعلق ایک عالم دین سے سخت وعید سنی تھی، اب یاد نہیں آ رہا۔ آپ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب قبلہ شریف ہمارے لئے انتہائی قابل احترام ہے، اسی لئے بول و براز کے وقت اس طرف منہ یا پیٹھ کرنا منع ہے ۔اسی طرح اس طرف منہ کر کے تھوکنا، بلغم پھینکنا بھی ناجائز ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوکے گا، قیامت کے دن اسے اس انداز میں اٹھایا جائے گا کہ وہ تھوک اس کے منہ پر ہوگا۔'' [1]

اگرچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں : '' قبلہ مسجد'' کے الفاظ ہیں، یعنی مسجد میں قبلہ کی طرف تھوکنے کی ممانعت ہے۔ [2]

(1) لیکن اسے اپنے عموم پر محمول کرنا زیادہ قرین قیاس ہے، مسجد میں قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوکنا اس کے گناہ میں مزید سنگینی کا باعث ہے۔ پھر دوران نماز یہ کام کرنا انتہائی برا اور گنوار پن کی علامت ہے۔ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو وہ اپنے سامنے نہ تھوکے کیونکہ وہ اپنے رب سے مناجات اور راز و نیاز میں مصروف ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی دائیں جانب تھوکے کیونکہ اس کی دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے، ہاں بائیں جانب یا قدم کے نیچے تھوکنے کی اجازت اس وقت ہے جب مسجد میں چٹائیاں یا قالین وغیرہ بچھا ہوا نہ ہو، اگر قالین وغیرہ بچھا ہے تو ایسی مجبوری کے وقت اپنے کپڑے میں تھوک کر اسے مسل دے، جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص نے اپنی قوم کی امامت کرائی تو اس نے دوران نماز قبلے کی طرف تھوک دیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ رہے تھے، آپ نے اسے منصب امامت سے معزول کر دیا اور فرمایا کہ تو نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دی ہے۔ [4]

تھوک بلغم اور ناک کی آلائش نجس نہیں لیکن نظافت اور صفائی کے بالکل منافی ہیں۔ قبلہ، مساجد اور دیگر محترم مقامات کا ادب و احترام انتہائی ضروری ہے، ان کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہیے۔ لہٰذا ہمارے رجحان کے مطابق قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوکنا خلاف ادب و احترام ہے بلکہ مذکورہ بالا احادیث کے پیش نظر اس پر سخت وعید آئی ہے۔ (واللہ اعلم)

سفید بالوں کا اکھاڑنا

سوال میرے ایک ساتھی عالم دین ہیں، انہوں نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ سفید بالوں کا اکھاڑنا جائز نہیں لیکن وہ قرآن و حدیث سے اس کا حوالہ نہیں دے سکے، قرآن و حدیث سے اس کا حوالہ درکار ہے؟

---

[1] صحيح ابن خزيمة ص ٢٧٨ ج٢۔ [2] صحيح البخاري، الصوم : ١٩٦٠۔
[3] سنن أبي داود، الصلوٰة: ٤٨٠۔ [4] سنن أبي داوٗد، الصلوٰة : ٤٨١۔

جواب سفید بال خواہ سر میں ہوں یا داڑھی میں انہیں اکھاڑنا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بڑھاپے کے (سفید) بال اکھاڑنے سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے کہ وہ مومن کا نور ہیں۔ [1]

ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سفید بال مت نوچا کرو کیونکہ جس کسی مسلمان کے بال حالتِ اسلام میں سفید ہو جائیں تو قیامت کے دن یہ اس کے لئے نور کا باعث ہوں گے۔''

ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایک بال کے عوض اس کی نیکی لکھتا ہے اور ایک گناہ دور کرتا ہے۔ [2]

ان احادیث کے پیش نظر سفید بال داڑھی میں ہوں یا سر میں انہیں دانتوں سے کاٹنا یا اکھاڑنا جائز نہیں اور نہ ہی کالا رنگ کرنا جائز ہے البتہ سیاہ رنگ کے علاوہ دوسرا کوئی بھی رنگ کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سفید بال اکھاڑنے کی ممانعت فرمائی تو ایک آدمی نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! لوگ تو بڑھاپے کے سفید بال اکھاڑتے ہیں، آپ نے فرمایا: جو چاہے اپنے نور کو اکھاڑے۔ [3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ آدمی اپنے سر اور اپنی داڑھی کے سفید بالوں کو اکھاڑے۔ [4]

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے سر یا داڑھی کی سفید بالوں کو نوچنے یا اکھاڑنے سے اجتناب کرے۔

انگوٹھی کس ہاتھ میں پہنی جائے

سوال انگوٹھی کس ہاتھ میں پہنی جائے اور پھر کس انگلی میں اسے پہننا چاہیے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کوئی وضاحت ہے تو راہنمائی فرمائیں؟

جواب انگوٹھی دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں میں پہنی جا سکتی ہے البتہ دائیں ہاتھ میں پہننا بہتر ہے اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث سے راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ [5]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ [6]

شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف ابی داؤد میں درج کیا ہے اور اسے شاذ قرار دیا ہے۔ [7]

آپ فرماتے ہیں کہ یسارہ کے بجائے یمینہ کے الفاظ محفوظ ہیں، تاہم بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت نافع کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ [8]

اسے کس انگلی میں پہننا چاہیے؟ حدیث میں ہے کہ انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں انگوٹھی نہ پہنی جائے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس اور اس یعنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔ [9]

---

[1] ابن ماجه، الادب: ٣٧٢١۔ [2] سنن أبي داوٗد: ٤٢٠٢۔ [3] كشف الاستار: ٢٩٧٣۔
[4] صحيح مسلم، الفضائل: ٢٣٤١۔ [5] سنن أبي داوٗد: ٤٢٢٦۔ [6] سنن أبي داوٗد، الخاتم: ٤٢٢٧۔
[7] ضعيف أبي داوٗد: ٩٠٨۔ [8] سنن أبي داوٗد: ٤٢٢٨۔ [9] ابن ماجه، اللباس: ٣٦٤٨۔

سب سے چھوٹی انگلی میں انگوٹھی پہننے کا بھی اثبات ہے۔ ❶

اس کے ساتھ والی انگلی میں بھی انگوٹھی پہنی جا سکتی ہے، ان کے علاوہ کسی بھی انگلی میں انگوٹھی پہننے سے اجتناب کیا جائے۔ انگوٹھے میں ملنگ، بہلول اور بے وقوف انگوٹھی پہنتے ہیں جبکہ مند آدمی کو تو اس سے گھن آتی ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد میں گندی ہوا چھوڑنا

سوال مساجد میں بعض اوقات لوگ مولی کھا کر نماز پڑھنے کے لئے آجاتے ہیں، جن کے منہ سے گندی ہوا آتی ہے اور یہ ہوا دوسرے نمازیوں کے لئے بہت ہی ناگوار ہوتی ہے، کیا مسجد میں بایں حالت آنا جائز ہے؟

جواب مساجد کو صاف ستھرا اور خوشبودار رکھنے کا حکم ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ محلوں میں مساجد بنانے، انہیں صاف ستھرا رکھنے اور انہیں خوشبودار کرنے کا حکم دیتے تھے۔ ❷

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے مساجد کی نظافت کے پیش نظر فرمایا کہ اگر کوئی پیاز لہسن کھاتا ہے تو اسے چاہیے کہ ہماری مساجد کے قریب نہ آئے۔ ❸

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو انسان بدبودار چیز کھاتا ہے، وہ ہمارے قریب نہ آئے اور نہ ہی وہ ہمارے ساتھ نماز پڑھے۔'' ❹

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوران خطبہ فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اگر کسی کے منہ سے لہسن یا پیاز کی ناگوار بو آتی تو اسے مسجد سے نکال کر بقیع کی طرف دھکیل دیا جاتا تھا۔ ❺

ان احادیث کی بنا پر مسجد میں گندی ہوا چھوڑنا، مولی، پیاز، لہسن کھا کر آنا، سگریٹ نوشی کر کے ماحول کو گندا کرنا یا بدبودار جرابیں پہننے پر اصرار کرنا جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

میت کے ذمے قرض کی ادائیگی

سوال میرے والد جب فوت ہوئے ان کے ذمے ڈھیروں قرضہ تھا، بھائیوں نے ان کی جائیداد تقسیم کر لی ان کے ذمے قرض کی ادائیگی نہیں کی، میں خود مالی لحاظ سے اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ ان کا قرض اتار سکوں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب قرآن کریم نے ہماری راہنمائی کی ہے کہ مرنے والے کی جائیداد وصیت کی تکمیل اور ادائے قرض کے بعد تقسیم ہونی چاہیے۔ ❻

قرآنی آیت میں اگرچہ وصیت کا ذکر پہلے ہے لیکن احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ میت کے قرضے اس کی وصیت کے اجراء سے پہلے ادا ہونے چاہئیں۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم قرآن مجید میں وصیت کا ذکر قرضے سے پہلے پڑھتے ہو، لیکن

---

❶ صحيح مسلم: ٢٠٩٥۔ ❷ سنن أبي داؤد، الصلوٰة: ٤٥٥۔ ❸ صحيح البخاري، الاذان: ٨٥٣۔
❹ صحيح البخاري، الاذان: ٨٥٦۔ ❺ صحيح مسلم، المساجد: ٥٦٧۔ ❻ النساء: ١١۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے فیصلہ میں قرض کی دائیگی کو تکمیل وصیت پر مقدم رکھا ہے۔ ❶

میت کے قرض کی ادائیگی کس قدر ضروری ہے اس کی اہمیت کا اس حدیث سے پتہ چلتا ہے: ''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مومن کی جان اس کے ذمے قرض کے ساتھ لٹکی رہتی ہے، حتیٰ کہ اسے ادا کر دیا جائے۔'' ❷

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میت کے ذمے قرض کی عدم ادائیگی کی وجہ سے اسے جنت میں جانے سے روک دیا جاتا ہے، جب تک اسے ادا نہ کیا جائے وہ جنت سے محروم رہتا ہے، صورت مسئولہ میں یہ چاہیے تھا کہ میت کی جائیداد تقسیم کرنے سے قبل اس کے ذمے قرض کو ادا کیا جاتا، بہر حال میت کے قرض کی ادائیگی انتہائی ضروری ہے، خواہ اسے ادا کرنے والے اقارب ہوں یا اجنبی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مقروض کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تو حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ اس کا جنازہ پڑھائیں، اس کا قرض میں ادا کروں گا۔ ❸

پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھایا۔ میت کے قرض کی ادائیگی درج ذیل طریقہ سے کی جائے:

☆ اس کا ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے ترکہ سے قرض ادا کیا جائے۔ ☆ اگر ترکہ نہ ہو تو کوئی بھی مسلمان اس قرض کو ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے۔ ☆ اگر کوئی ذمہ نہ اٹھائے تو بیت المال سے اس کی ادائیگی کی جائے۔ ☆ اگر بیت المال نہ ہو تو محلے کے مسلمان مل کر میت کا قرض ادا کریں۔ (واللہ اعلم)

امام کیسا ہو؟

سوال ہمارا امام ایک کاروباری آدمی ہے اور کاروبار کرتے وقت وہ غلط کام بھی کر لیتا ہے، ایسے حالات میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، قرآن وحدیث کے مطابق امام کیسا ہونا چاہیے؟

جواب انسان ہونے کے ناطے کسی سے غلط کام ہو جانا بعید از عقل نہیں، امام بھی انسانوں میں سے ہے، اس سے بھی غلط کام ہو سکتا ہے، اس لئے ائمہ حضرات کی خردہ گیری نہیں کرنا چاہیے اور امام کا کاروباری ہونا بھی منصب امامت کے منافی نہیں۔ اگرچہ امام کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ ہو اور اعمال واخلاق کے اعتبار سے اپنے مقتدیوں سے بہتر ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ایسے لوگوں کو امام بناؤ جو تم میں بہتر ہوں، کیونکہ وہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایک قاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ❹

اگرچہ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں سلام بن سلیمان مدائنی راوی قابل حجت نہیں جیسا کہ امام ذہبی نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ❺

تاہم دیگر صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کو لوگوں کا ناپسندیدہ شخص نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے

---

❶ سنن الترمذي، الفرائض: ۲۰۹۴۔ ❷ سنن الترمذي، الجنائز: ۱۰۷۸۔

❸ صحيح البخاري، الكفالة: ۲۲۸۹۔ ❹ سنن البيهقي ص ۹۰ ج ۳۔

❺ ميزان الاعتدال ص ۱۷۸ ج ۲۔

مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین آدمیوں سے اللہ نماز قبول نہیں کرتا، ایک وہ جو (امامت کے لئے) قوم کے آگے ہوتا ہے لیکن وہ لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں۔'' ❶

ان احادیث کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ مسجد کے امام کو دوسرے لوگوں سے بہتر ہونا چاہیے لیکن وہ آخر انسان ہے اور اس سے کمی کوتاہی ہوسکتی ہے لہٰذا درگزر اور چشم پوشی سے کام لینا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

عورتوں کا لمبے لمبے ناخن رکھنا

سوال آج کی فیشن زدہ عورتیں لمبے لمبے ناخن رکھتی ہیں، کیا شریعت اسلامیہ میں ایسا کرنا جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں؟

جواب ناخن بڑھانا خلاف سنت ہے، یہ حکم مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''پانچ چیزیں فطرت سے ہیں: ختنہ کرنا، زیر ناف بال لینا، بغلوں کے بال اکھاڑنا، ناخن تراشنا اور مونچھیں کاٹنا۔'' ❷

اسلام میں اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ دونوں کی حد بندی بھی کی گئی ہے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمارے لئے مونچھیں کاٹنے، ناخن تراشنے، بغلوں کے بال اکھاڑنے اور زیر ناف بال مونڈنے کے لئے وقت مقرر کیا گیا ہے کہ ہم انہیں چالیس دن سے زیادہ نہ چھوڑیں۔ ❸

لہٰذا ایک عورت کے لئے جائز نہیں کہ فیشن کے طور پر لمبے لمبے ناخن رکھے یا مصنوعی ناخن استعمال کرے، اس کے علاوہ ناخن بڑھانا، درندوں اور کفار سے مشابہت بھی ہے، لہٰذا ممانعت کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے، بہرحال عورت کو اس طرح کے غیر فطری امور سے پرہیز کرنا چاہیے۔

امام راتب کی موجودگی میں دوسرے شخص کا جماعت کرانا

سوال میں ایک مسجد میں امام ہوں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میں کسی ذاتی مصروفیت کی وجہ سے دو یا تین منٹ لیٹ ہو جاتا ہوں تو ایک شخص خود مصلیٰ پر کھڑا ہوتا ہے اور جماعت کرادیتا ہے، میرا انتظار نہیں کیا جاتا، ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں کوئی عالم دین مہمان آتا ہے تو میری اجازت کے بغیر اسے مصلیٰ پر کھڑا کر دیا جاتا ہے، کیا شرعی طور پر ایسا کیا جاسکتا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں؟

جواب شریعت میں امامت ایک منصب اور عہدہ ہے لیکن ہمارے ہاں اسے ایک پیشہ خیال کیا جاتا ہے۔ برصغیر میں جس وقت انگریز کی حکومت تھی، اس نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اس منصب کو عام پیشوں کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اب انگریز کی حکومت اگرچہ ختم ہو چکی ہے لیکن ہمارے ذہنوں میں بدستور اس کی چھاپ موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں آج کسی امام کو ایک پیشہ ور ملازم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، دراصل شوئ قسمت سے اس پرفتن دور میں جو لوگ مساجد اور دینی مراکز چلانے کی

---

❶ سنن أبي داؤد، الصلوٰة: ٥٩٣۔ ❷ صحيح البخاري، اللباس: ٥٨٨٩۔

❸ سنن أبي داؤد، الرجل: ٤٢٠٠۔

صلاحیت واستعداد رکھتے ہیں وہ وسائل سے محروم ہیں اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مالی وسائل مہیا کر رکھے ہیں وہ ان اسلامی چشموں کو رواں دواں رکھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ اس کے باوجود ہم اپنے معزز ائمہ کرام کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ کسی بھی صورت میں اپنی خودداری کو مجروح نہ ہونے دیں، وہ ہر وقت اپنے منصب کا خیال رکھیں۔ سوال میں جن دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اگرچہ ایک امام کے لئے بہت ہی حوصلہ شکن اور روح فرسا ہیں، تاہم وہ صبر سے کام لیں اور استقامت کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضائع نہیں کرتا۔ جب ہم شریعت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ میں اگر امام کو دیر ہو جاتی اور اس کے آنے کی امید نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جاتا تھا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض وفات کے متعلق بیان کرتی ہیں: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ ہم نے عرض کیا نہیں، یا رسول اللہ! وہ آپ کے انتظار میں ہیں، آپ نے وقفہ وقفہ سے تین دفعہ یہی دریافت فرمایا اور ہر دفعہ یہی جواب دیا گیا کہ وہ آپ کے انتظار میں ہیں۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام نے آپ کے انتظار میں کافی تاخیر کی کیونکہ انہیں توقع تھی کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے، اس لئے اگر امام کے آنے کی امید غالب ہو تو اس کا انتظار کرنا چاہیے، اگر آنے کی امید غالب نہ ہو تو کسی دوسرے کو مصلیٰ امامت پر کھڑا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ بنو عمرو بن عوف کے ہاں صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مصلیٰ امامت پر کھڑا کر دیا گیا، اسی طرح آپ غزوہ تبوک کے موقع پر قضاء حاجت کے لئے باہر تشریف لے گئے تو آپ کی عدم موجودگی میں صحابہ کرام نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کی، یہ احادیث صحیح مسلم میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ [2]

اگر امام مسجد میں موجود ہے تو اس کی اجازت کے بغیر مصلیٰ امامت پر خود کھڑا ہونا چاہیے اور نہ کسی کو کھڑا کرنا چاہیے، ہاں اگر وہ اجازت دے دے تو الگ بات ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''کوئی شخص کسی دوسرے کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرائے اور نہ ہی اس کے حلقہ عمل میں بالا اجازت کوئی اس کے مصلیٰ امامت پر کھڑا ہو۔ [3]

ان احادیث کے پیش نظر مقتدی حضرات کو چاہیے کہ وہ ذرا صبر سے کام لے کر امام کا کچھ انتظار کر لیا کریں اور اگر کسی کا کوئی معزز مہمان ہے جو صاحب علم ہے تو بھی پہلے امام صاحب سے بات کر کے اسے اعتماد میں لے لیا جائے بلکہ امام خود پیش کش کرے کہ آپ امامت کا فریضہ سر انجام دیں تو یہ بہت خوش کن بات ہے۔ بہر حال امام کے منصب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، اسے تنخواہ دار ملازم خیال کرنا اس کے اس منصب کی توہین ہے جس سے ہمیں اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

کرسمس ڈے کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے ہاں کچھ مسلمان کرسمس ڈے کو بڑے احترام سے مناتے ہیں اور عیسائیوں کے ساتھ یکجہتی اور رواداری کے طور پر ان کے خصوصی مشاغل میں حصہ لیتے ہیں، شریعت کے نظر میں کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

---

[1] صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ٣٩٦۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ: ٩٣٦، ٩٥٢۔

[3] سنن أبي داوٗد، الصلوٰۃ: ٥٨٢۔

جواب کرسمس دو الفاظ سے مرکب ہے یعنی Christ (کرائسٹ) اس کا معنی مسیح اور Mass (ماس) اس کا معنی عبادت ہے یعنی اس کا مکمل معنی ''مسیح کے یوم ولادت کی عبادت'' ہے، عام طور پر اسے ولادت مسیح کا دن کہا جاتا ہے، 25 دسمبر کو عیسائی حضرات اسے مذہبی تہوار کے طور پر مناتے ہیں۔

موسوی شریعت کے مطابق پیدائش کے ایک ہفتے بعد بچے کا نام رکھا جاتا تھا اس لئے اس روایت کے مطابق مسیح کا نام بھی ایک ہفتہ بعد رکھا گیا، اس لئے عیسائیوں کے ہاں پیدائش کا دن 25 دسمبر کو منایا جاتا ہے، البتہ سال کا آغاز یکم جنوری سے ہوتا ہے، بہرحال کرسمس ذے عیسائیوں کا ایک مقدس تہوار ہے اوران کے ہاں یہ عبادت کے طور پر منایا جاتا ہے ہماری شریعت میں یہ حکم ہے کہ یہود ونصاریٰ کی عبادات میں مخالفت کی جائے اوران کی مشابہت سے اجتناب کیا جائے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیگر دنوں کی نسبت ہفتہ اور اتوار کا روزہ رکھتے تھے اوراس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: ''دو دن مشرکین کے لئے عید کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ ان کی مخالفت کروں۔''[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار ومشرکین کی عیدوں میں ان کی مخالفت کرنے کو پسند کرتے تھے، لہٰذا جو لوگ کرسمس کے دن عیسائیوں کی عید میں شرکت کرتے ہیں یا خوشی کا کیک کاٹتے ہیں یا انہیں تحفے دیتے ہیں وہ تمام معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں، اس کے متعلق قرآن کریم کی سخت وعید حسب ذیل ہے: ''جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے مبادا ان پر کوئی آفت پڑ جائے یا انہیں تکلیف دہ عذاب آ پکڑے۔''[2]

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''وہ جھوٹے کاموں میں شرکت نہیں کرتے۔''[3] اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: ''ابوالعالیہ طاؤس، محمد بن سیرین، ضحاک، ربیع بن انس اور دیگر اہل علم نے کہا ہے کہ ''زور'' سے مراد مشرکین کی عیدیں ہیں۔''[4]

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی قوم کی مشابہت کی وہ انہی میں سے ہوگا۔''[5]

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ کفار کی عیدوں، موسمی تہواروں اور عبادات میں ان کی مشابہت اختیار کریں۔''[6]

ہمیں چاہیے کہ اپنے عقائد ونظریات اور اخلاق وکردار کا تحفظ کرتے ہوئے کفار ومشرکین اور یہود ونصاریٰ کی عیدوں میں شرکت نہ کریں اور نہ ہی تحائف کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ (واللہ اعلم)

کسی کے لئے احتراماً کھڑے ہونا

سوال ہمارے ہاں ٹیچر حضرات جب کلاس میں آتے ہیں تو کلاس کے تمام لڑکے احتراماً کھڑے ہوجاتے ہیں، شریعت میں اس عمل کی کیا حیثیت ہے؟

---

[1] مسند أحمد ص ٣٢٤ ج٦۔ [2] النور: ٦٣۔ [3] الفرقان: ٧٢۔
[4] ابن كثير ص ٣٦٢ ج٣۔ [5] مسند أحمد ص ٥٠ ج٢۔ [6] البداية والنهاية ص ١٣٤ ج٢۔

جواب کسی کے لئے کھڑے ہونے کی دو اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ آنے والے کا آگے بڑھ کر استقبال کرنا، اس طرح احتراماً استقبال کرنا جائز ہے، شریعت میں اس کا ثبوت ملتا ہے، آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ پر احتراماً کھڑے ہونا، اس کی شرعاً ممانعت ہے، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص اپنے لئے لوگوں کا کھڑے رہنا پسند کرے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔'' [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی دوسرا شخص محبوب نہ تھا اس کے باوجود وہ حضرات رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری پر کھڑے نہ ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ [2]

ان احادیث کی بناء پر ہمارے اساتذہ کرام کو چاہیے کہ وہ اسلامی تہذیب کو اختیار کریں اور فرنگی ثقافت کو ترک کر کے دینی غیرت کا ثبوت دیں۔ یہ حکم مردوں، عورتوں سب کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے ناپسندیدہ افعال سے بچنے کی توفیق دے۔ آمین

بچے کی پرورش کا حق کس کو ہے؟

سوال میرے چھوٹے بھائی کی شہادت کے چھ ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا عطا فرمایا، اس وقت اس کی بیوی اپنے والدین کے پاس تھی، ہماری خواہش ہے کہ بھائی کی بیوی بچے سمیت ہمارے پاس رہے لیکن بچے کی نانی نے سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب ددھیال والوں کا کوئی حق نہیں رہا، وہ اپنی بیٹی کا سامان وغیرہ بھی لے گئے ہیں، بھائی کی شہادت کے ڈیڑھ سال بعد اس کی بیوی نے دوسری شادی بھی کر لی ہے، ہماری خواہش ہے کہ بھائی کا بیٹا ہمارے ہاں پرورش پائے، قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں کہ یتیم بچے کی پرورش کا حق کسے ہے؟ جبکہ ننھیال والے بچے کو ددھیال والوں سے ملنے ملانے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔

جواب شریعت اسلامیہ نے بچے کی پرورش و پرداخت کا حقدار ماں کو ٹھہرایا ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرا یہ بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کے لئے برتن تھا، میری چھاتی اس کے لئے مشکیزہ تھی اور میری آغوش اس کے لئے جائے قرار تھی، اس کے والد نے بھی مجھے طلاق دے دی ہے اور وہ مجھ سے اس بچے کو بھی چھیننا چاہتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو اس بچے کی زیادہ حقدار ہے جب تک عقد ثانی نہیں کرتی۔ [3]

اس حدیث میں ایسے تین اوصاف بیان ہوئے ہیں جو بچے کی پرورش کے سلسلہ میں ماں کے ساتھ خاص ہیں، رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ اس بناء پر دیا کہ بچے کے حق میں ماں انتہائی مہربان ہوتی ہے اور اس کی پرورش و نگرانی میں وہ مرد کی نسبت زیادہ قدرت رکھتی ہے، ہاں اگر ایسے عوارض پیش آ جائیں جن کی وجہ سے بچے کے حق میں ماں کی اس محبت و شفقت کے معدوم ہو

---

[1] سنن أبي داؤد، الادب: ٥٢٢٩۔ [2] سنن الترمذي، الادب: ٢٧٥٤۔

[3] سنن أبي داؤد، الطلاق: ٢٢٧٦۔

جانے کا اندیشہ ہو تو ماں کا حق پرورش ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے مقصود بچے کی فلاح و بہبود ہے اور پرورش کے معاملہ میں بچے کی بہبود کو فوقیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عقد ثانی کے بعد ماں کو اس حق سے محروم قرار دیا ہے کیونکہ اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ شوہر ثانی کے حقوق کی ادائیگی میں مصروف رہنے کی وجہ سے اپنے سابق شوہر کے بچے کی پرورش کا حق صحیح طور پر ادا نہ ہو سکے گا، اس لئے ضروری ہے کہ حق پرورش کے معاملہ میں بچے کی فلاح و بہبود کا لحاظ رکھا جائے اور حالات کے تقاضے کو نظر انداز نہ کیا جائے، جہاں تک ممکن ہو ماں کو اولیت دی جائے تاکہ اس کی مامتا کا تحفظ ہو بشرطیکہ وہاں کوئی امر مانع نہ ہو۔ چنانچہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جس امر میں بچے کے لئے مصلحت و خیر خواہی کا پہلو زیادہ ہو اسے اختیار کرنا چاہیے اگر باپ کے مقابلہ میں ماں زیادہ صحیح تربیت و حفاظت کر سکتی ہو اور غیرت مند عورت ہو تو ماں کو باپ پر ترجیح دی جائے گی، اس صورت میں قرعہ اندازی اور اختیار میں سے کسی چیز کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا کیونکہ بچہ تو کم فہم، نادان اور ناعاقبت اندیش ہوتا ہے، ماں باپ میں سے جو بچے کا زیادہ خیال رکھنے والا ہو بچہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔'' [1]

یہ بھی واضح رہے کہ فلاح و بہبود سے مراد صرف جسمانی طور پر پرورش و پرداخت کرنا مقصود نہیں بلکہ حسن تربیت اور ذہنی نشو و نما میں رخنہ اندازی کا باعث ہو تو اس قسم کی عورت کو بھی حق پرورش سے محروم کر دیا جائے گا۔'' (حوالہ مذکورہ)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اگر ماں کسی غیر محفوظ مقام پر رہائش رکھے ہوئے ہے یا اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے تو باپ کو اپنی اولاد کی پرورش کا حق حاصل ہوگا۔'' [2]

صورت مسئولہ میں عورت نے عقد ثانی کر لیا ہے، اس لئے حدیث کے مطابق اسے حق پرورش سے محروم ہونا چاہیے، بہر حال بچہ کسی کے پاس بھی ہو، اس کی ملاقات پر قدغن لگانا مستحسن اقدام نہیں۔ صورت مسئولہ میں ننھیال والوں کا کردار انتہائی محل نظر ہے، انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اندر نرم گوشہ پیدا کریں اور ددھیال والوں کو بچے سے ملنے کے معاملہ میں اس قدر سختی نہ کریں۔ (واللہ اعلم)

مردوں کے لئے مہندی کا استعمال

سوال کیا مرد حضرات ہاتھ یا پاؤں پر مہندی لگا سکتے ہیں، ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر مرد بھی مہندی لگاتے ہیں، اس کے متعلق وضاحت درکار ہے؟

جواب مہندی سے ہاتھ پاؤں رنگنا عورتوں کی زینت ہے، مردوں کو ایسی زینت سے منع کیا گیا ہے جسے عورتیں استعمال کرتی ہوں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ایسا ہیجڑہ لایا گیا جس نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی لگا رکھی تھی، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟'' عرض کیا گیا یا رسول اللہ! اسی طرح یہ عورتوں سے مشابہت اختیار کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ اسے مدینہ کی آبادی سے نکال کر نقیع کے علاقہ میں چھوڑ آؤ، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اسے قتل نہ کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے نمازی حضرات کو قتل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔'' [3]

---

[1] زاد المعاد ص ٤٧٤ ج٥۔ [2] فتاویٰ ص ٣٤ ج١٣١۔ [3] سنن أبي داؤد، الادب: ٤٩٢٨۔

راوی ابو اسامہ بیان کرتے ہیں کہ نقیع ، مدینہ طیبہ سے ایک جانب جگہ کا نام ہے جو بقیع سے الگ ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مہندی لگانا عورتوں کی زینت ہے اور مرد حضرات کو اس کی اجازت نہیں، اس ممانعت کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی جسے حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مرد حضرات کو زعفران لگانے سے منع کیا ہے۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مردوں کو ہاتھ اور پاؤں رنگنے کی ممانعت ہے ہاں بطور دواء مہندی استعمال کی جاسکتی ہے۔'' [2]

بطور دواء استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گرمی یا آگ سے جلنے کی وجہ سے ہاتھ اور پاؤں پر چھالے پڑ جائیں تو زخموں پر مہندی لگانے میں چنداں حرج نہیں لیکن بطور فیشن مہندی کے ساتھ اپنے ہاتھ اور پاؤں رنگنا مردوں کے لئے جائز نہیں، لہٰذا شادی کے موقع پر مرد حضرات کو مہندی استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

دینی کتب واپس کرنے سے انکار

سوال ہم نے اپنی مسجد میں ایک دینی لائبریری بنا رکھی ہے، لیکن جو حضرات کتاب لے جاتے ہیں اسے واپس نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے کہ علم کی نشر و اشاعت پڑھنے پڑھانے سے ہے، لائبریری میں رکھنے سے نہیں، بلکہ کچھ ''اہل علم'' اسے کتمان علم سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی وضاحت کریں؟

جواب مساجد میں لائبریری کا قیام ایک مستحسن اقدام ہے کہ مسجد میں آنے والے حضرات دینی کتب سے استفادہ کریں اور فارغ اوقات میں ان کا مطالعہ کریں، لیکن سوال میں ذکر کردہ صورت انتہائی تکلیف دہ ہے بلکہ اس سے زیادہ پریشان کن یہ معاملہ ہے کہ مساجد میں قائم کردہ لائبریری سے خطیب حضرات امہات الکتب عاریتاً لینے کے بعد انہیں واپس نہیں کرتے بلکہ واپس کرنے کو ''کتمان علم'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل اس نفسا نفسی کے دور میں اخلاقی اقدار بدل گئی ہیں، روزمرہ کی اشیاء عاریتاً دینے کا رواج باہمی تعاون اور ہمدردی کا آئینہ دار تھا، جو اب معدوم ہوتا جارہا ہے۔ اس وجہ سے لوگ عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتے بلکہ ان کے خیال کے مطابق مانگی ہوئی چیز کی واپسی کا مطالبہ کرنا شرافت سے بعید ہے، خاص کر دینی کتب کا معاملہ تو انتہائی سنگین صورت حال سے دوچار ہے۔ اہل علم اور خطباء حضرات کو اس کے متعلق کچھ غور کرنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس ہاتھ نے جو کچھ لیا ہے، اس پر اس کا ادا کرنا واجب ہے۔'' [3]

بلکہ حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے بطور خاص ذکر کیا کہ ''مانگی ہوئی چیز واپس کی جائے۔'' [4]

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ مانگی ہوئی چیز (کتب وغیرہ) کا اگر نقصان ہوجائے، یا گم ہوجائے یا ضائع ہوجائے تو لینے والے کو اس کی جگہ نئی چیز یا اس کی قیمت واپس کرنا پڑے گی۔ بہرحال مانگی ہوئی چیز کو شیر مادر سمجھ کر اسے ہضم کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، خصوصاً عاریتاً لی ہوئی دینی کتب کے متعلق ہمیں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحيح البخاري، اللباس: ٥٨٤٦۔

[2] فتح الباري ص ٣٦٧ ج ١٠۔

[3] سنن أبي داوٗد، البيوع : ٣٥٦١۔

[4] ترمذی ، البیوع: ١٢٦٥۔

امتحان میں ناجائز ذرائع استعمال کرنا

سوال کچھ طلباء امتحان میں نقل لگاتے ہیں یا دیگر ذرائع استعمال کر لیتے ہیں، شریعت اسلامیہ میں اس کے متعلق کیا وعید ہے، کیا اس نتیجہ سے حاصل کردہ ڈگری کی بنیاد پر ملازمت کرنا صحیح ہے؟

جواب امتحان میں نقل لگا کر کامیابی حاصل کرنا یا دیگر ناجائز ذرائع کر کے ڈگری حاصل کرنا جائز نہیں کیونکہ امتحان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ مضمون میں طالب علم کی اہلیت اور استعداد کو معلوم کیا جا سکے، جبکہ ناجائز ذرائع کے استعمال سے اس کی اہلیت پر پردہ پڑا رہتا ہے بلکہ وہ دھوکہ دہی کا مرتکب ہوتا ہے جس کی شرعاً ممانعت ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جو شخص ہم کو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں۔'' [1]

ایسا کرنے سے دوسرے محنتی طلباء کی حق تلفی ہوتی ہے اور دھوکہ دہی کے مرتکب کام چور کو ایک محنتی شخص پر ترجیح دینا لازم آتا ہے جس کی شرعی طور پر اجازت نہیں، ایسا طالب علم دھوکہ دہی سے ایسی ڈگری لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کی وہ اہلیت نہیں رکھتا اور اس منصب پر فائز ہو جائے گا جس کا وہ اہل نہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق وہ درج ذیل حدیث کا مصداق ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب امانت کا ضیاع ہونے لگے تو قیامت کا انتظار کرنا، عرض کیا گیا کہ امانت کا ضیاع کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب معاملات ایسے لوگوں کے سپرد کئے جائیں جو ان کے قطعاً اہل نہ ہوں۔'' [2]

بہر حال نقل لگا کر یا دیگر ناجائز ذرائع استعمال کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنا، اجتماعی نقصان اور دھوکہ دہی ہے جس سے ایک مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ ڈگری کی بنیاد پر ملازمت حاصل کرنا بھی ناجائز ہے کیونکہ اس سے حقدار حضرات کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حصول دنیا کے لئے ناجائز طریقہ استعمال نہ کریں بلکہ جائز ذرائع سے دنیا کو حاصل کریں جس سے جسم اور روح کا رشتہ قائم رہ سکے، اس سے بڑھ کر ہمیں ایمان کی حفاظت کرنا چاہیے۔ ایمان کو ٹھکانے لگا کر اگر دنیا حاصل کی تو قیامت کے دن یہی دنیا ہمارے پاؤں کی بیڑی بن جائے گی، پھر اس سے متعلق ہمیں اللہ کے حضور باز پرس بھی ہو گی، اللہ تعالیٰ ہمیں اچھی کمائی اور نیک اعمال کی توفیق دے۔ آمین!

بچوں کے ساتھ محبت و پیار میں مساویانہ سلوک

سوال مالی معاملات میں تو حکم ہے کہ باپ کو اولاد سے مساویانہ سلوک کرنا چاہیے، کیا محبت و پیار میں بھی مساوات کا حکم ہے اور اسے تمام بچوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق اسلامی ہدایات کیا ہیں؟

جواب والدین عموماً اپنی اولاد کے لئے مہربان ہوتے ہیں اور اپنے بچوں سے محبت و پیار سے پیش آتے ہیں، مگر بعض اوقات کسی وجہ سے رحمت و شفقت کا جذبہ کم و بیش ہو سکتا ہے کیونکہ جذبہ اطاعت گزاری اور والدین سے حسن سلوک یا بچے کی کوئی بیماری یا کمزوری والدین کی طرف سے زیادہ التفات اور ترجیح کا باعث بن سکتی ہے، ویسے بھی ضروریات میں تو مساوات نہیں ہو

---

[1] صحيح مسلم، الايمان: ١٦٤۔ [2] صحيح البخاري، العلم: ٥٩۔

سکتی، البتہ ضروریات کے علاوہ تحفہ وغیرہ دینے میں اللہ تعالیٰ نے باپ کو پابند کیا ہے کہ وہ عدل و انصاف اور مساوات سے کام لے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اللہ سے ڈرو اور اپنے بچوں کے درمیان عدل و انصاف اور مساوات کرو۔'' [1]

لیکن محبت و پیار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں مساوات انسانی بس میں نہیں، اگرچہ ہمارے بعض اسلاف عدل و انصاف کے پیش نظر بچوں کو بوسہ دیتے وقت بھی برابری کا خیال رکھتے تھے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اس دوران اس کا بیٹا بھی آ گیا، اس نے اپنے بیٹے کا منہ چوما اور اسے اپنی ران پر بٹھا لیا پھر اس کی بیٹی آئی تو اس نے اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا، یہ انداز اور رویہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو نے ان دونوں کے درمیان عدل کیوں نہیں کیا۔'' [2]

بہر حال والدین کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ اپنی اولاد میں محبت اور پیار کرنے میں بھی عدل و انصاف کریں اور دانستہ طور پر کسی بچے کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں، اگر کسی وقت ایسا ہو جائے تو اس کی کسی مناسب وقت میں تلافی کر دینا چاہیے تاکہ بچوں میں باہمی نفرت و کدورت کے جذبات پروان نہ چڑھیں۔ (واللہ اعلم)

خاوند کے لئے سسرال کا احترام کرنا

سوال میرا خاوند بہت نیک اور پارسا انسان ہے لیکن میرے والدین کا احترام نہیں کرتا بلکہ انہیں برے الفاظ سے یاد کرتا ہے، ایسا کرنے سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، شریعت مطہرہ کی روشنی میں میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب والدین کا اولاد پر احسان عظیم ہے، لیکن شادی کے بعد خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری بیوی پر فرض ہو جاتی ہے، خاوند کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے، خاوند کا بیوی کے والدین کو خوش رکھنا بھی بیوی کے حقوق میں سے ہے۔ لہٰذا خاوند کو چاہیے کہ وہ بلاوجہ بیوی کے والدین کو سخت سست نہ کہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم اپنی بیویوں سے اچھے انداز کے ساتھ بودوباش اختیار کرو۔'' [3]

اس آیت کریمہ کے پیش نظر بیوی کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا بھی شامل ہے کیونکہ ایسا کرنے سے بیوی خوش ہوگی۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ بیوی کے والدین کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے بیوی کو تکلیف ہو گی۔ بیوی کو بھی چاہیے کہ اگر اس کے والدین میں کوئی کمی کوتاہی ہے جس کی بنا پر خاوند ان سے اچھا سلوک نہیں کرتا تو اسے اپنے والدین کو اچھے انداز کے ساتھ سمجھانا چاہیے، اس سلسلہ میں بیوی ہی اچھا کردار ادا کر سکتی ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق اگر والدین اپنی بیٹی کو کسی کام کا حکم دیں لیکن خاوند اس حکم کی بجا آوری پر آمادہ نہیں تو خاوند کی بات کو مانا جائے گا بشرطیکہ خاوند کی بات شریعت کے دائرہ میں ہو، لیکن اگر خاوند اپنی بیوی کو کسی ایسی بات کا حکم دیتا ہے جو شریعت کی خلاف ورزی پر مبنی ہے تو اس صورت میں خاوند کی بھی بات کو نہیں مانا جائے گا۔ ہمارے نزدیک والدین اور خاوند کے حکم میں تعارض

---

[1] صحیح البخاري، الحصبة : ۲۵۸۷۔ [2] سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۳۰۹۸۔ [3] النساء : ۱۹۔

ہو تو خاوند کے حکم کو ترجیح ہوگی۔ (واللہ اعلم)

موبائل میں گھنٹی کے بجائے قرآنی آیات کی آواز

سوال ہمارے ہاں کچھ موبائل ایسے ہیں کہ جب فون دوسرے سے ملایا جاتا ہے تو گھنٹی کے بجائے قرآنی آیات پڑھنے کی آواز آتی ہے، کیا موبائل میں قرآنی آیات داخل کی جا سکتی ہیں؟

جواب موجودہ دور میں موبائل کی ایجاد انتہائی سودمند ہے، اس کا اہم فائدہ یہ ہے کہ انسان رابطے میں رہتا ہے، لیکن اس کے غلط استعمال نے ہمارے معاشرہ میں بہت سے مفاسد پھیلا دیئے ہیں۔ موبائل میں قرآنی آیات داخل کرنا درست نہیں کیونکہ اس سے درج ذیل مفاسد جنم لیتے ہیں:

☆ قرآن کریم کو ایک حقیر دنیوی مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے اور اس سے عملی طور پر معاشرہ میں صالح انقلاب مقصود ہے، جبکہ موبائل میں انہیں داخل کرنا اس عظیم مقصد کے برعکس ہے۔

☆ بعض اوقات آیات کو سننے کے بجائے انہیں درمیان میں ہی قطع کرنا پڑتا ہے جو کہ قرآن کریم کی انتہائی بے ادبی ہے۔

☆ بعض اوقات انسان لیٹرین میں ہوتا ہے کہ اچانک موبائل میں قرآنی آیات نشر ہونا شروع ہو جاتی ہیں جو کہ قرآنی ادب و احترام کے منافی ہے۔

☆ ہمارے اسلاف قرآن کریم کو دنیاوی اغراض و مقاصد کے لئے انتہائی ناپسند کرتے تھے۔

اس لئے ہمارے رجحان کے مطابق اپنے موبائل میں سادہ گھنٹی کی آواز ہی سیٹ کر لی جائے اور قرآن کے داخل کرنے سے اجتناب کرنا اچاہیے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کی حیثیت سے زیادہ کا مطالبہ

سوال میں ایک غریب آدمی ہوں اور محنت مزدوری سے اپنے اہل خانہ کا پیٹ پالتا ہوں لیکن بعض اوقات میری بیوی مالی حیثیت سے زیادہ کا مطالبہ کر دیتی ہے، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب شادی کے بعد خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی کے اخراجات برداشت کرے اور کھانے پینے، رہنے سہنے اور پہننے کی ضروریات کو پورا کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا کہ ہم پر بیوی کا کیا حق ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم خود کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اور جب تم خود لباس پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔'' [1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! تم پر ان بیویوں کا حق ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور انہیں کھانا پینا اور رہائش وغیرہ اچھے طریقے سے دو۔'' [2]

---

[1] سنن أبي داود، النكاح: ٢١٤٢۔ [2] مسند أحمد ص ٤٢٦ ج٣۔

لیکن اس سلسلہ میں خاوند کی مالی حیثیت کو ضرور مدنظر رکھا جائے گا، اس لئے بیوی کو یہ حق نہیں کہ مطالبات میں کثرت کے ذریعے اسے مشکلات میں ڈالے، خاوند کے ذمے صرف اسی حساب سے خرچ کرنا واجب ہے، جس قدر اس کی طاقت اور ہمت ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''کشادگی والے کو اپنی کشادگی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرے، اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔'' [1]

بیوی کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خاوند کو بے جا قسم کے مطالبات کے ذریعے تنگ کرنا تباہی کا راستہ ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک حدیث بطور نصیحت ذکر کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل کی ابتدائی ہلاکت یہ تھی کہ تنگ دست کی بیوی اسے لباس یا زیورات لانے کی اتنی تکلیف دیتی تھی جتنی مالدار خاوند کی بیوی اپنے خاوند کو دیتی تھی۔'' [2]

اس حوالے سے ہم خاوند کو بھی نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو زہد و قناعت کی تلقین کرتا رہے اور حسب توفیق خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لے اور اس سے یہ وعدہ کرے کہ اللہ تعالیٰ جب کشادگی فرمائے گا تو مطالبات کو بھی پورا کر دیا جائے گا۔''

(واللہ اعلم)

نیوتا کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے ہاں شادی کے موقع پر لین دین اور تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے لیکن دل میں یہ ہوتا ہے کہ آئندہ ایسے موقع پر مجھے بھی دیا جائے، ایسے حالات میں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب شادی کے موقع پر طبعی خوشی ہوتی ہے اور تحفے تحائف کا تبادلہ طبعی خوشی کا حصہ ہے، شریعت میں اس کی ممانعت نہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایسے موقع پر تحائف وغیرہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک یہ ہے کہ تعاون کی نیت ہوتی ہے اور ایسا کرنے سے غریب آدمی کو کچھ سہارا مل جاتا ہے، اس کے جواز میں کوئی شک نہیں بشرطیکہ دینے والا صرف تعاون یا تحفے کی نیت سے دے اور واپسی کی نیت نہ ہو۔ ایسے موقع پر تحائف دینے کی دوسری صورت یہ ہے کہ تعاون سے بڑھ کر ایک سودی قرض کی صورت اختیار کر جائے جیسا کہ بالعموم ہمارے ہاں ہوتا ہے، دینے والا اس نیت سے دیتا ہے کہ اگر میں آج سو روپیہ دوں تو کل میرے بیٹے یا بیٹی کی شادی پر اس سے دوگنا یا ڈیڑھ گنا مل جائے گا اور اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یوں تعاون کے بجائے ایک سودی ذہنیت بن گئی ہے، اس کا نام تحفہ یا سلامی رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس رواج کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے نزدیک اس کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ شادی کے موقع پر اس قسم کے تحائف کے تبادلہ کو یکسر بند کر دیا جائے جو نیوتا کا نام بدل کر وصول کیے جاتے ہیں، ہاں اگر شادی سے پہلے غریب کے ساتھ تعاون کر دیا جائے یا اسے قرض حسنہ آسان شرائط کے ساتھ دے دیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، لیکن ہمارے ہاں موجودہ صورت حال کو تحائف کی آڑ میں جائز قرار دینا انتہائی محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] اطلاق: ۷۔ [2] سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۵۹۱۔

تکلیف دہ بلی کو مارنا

سوال ہمارے گھر میں ایک بلی آتی ہے اور گھر میں رکھے ہوئے چوزوں کو کھا جاتی ہے، کیا ایسی بلی کو قتل کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ تکلیف کا باعث ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے؟

جواب بلی ایک پالتو جانور ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے خادم سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ پلید نہیں بلکہ یہ تو گھر میں چکر لگانے والوں میں سے ہے۔ ❶

بلی کی تمام تر قباحتوں کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ نرمی کا اظہار فرمایا ہے، ہمیں بھی آپ کی اقتداء کرتے ہوئے اس کے ساتھ نرمی کرنا چاہیے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی اشیاء کی خود حفاظت کریں، بلی پر ظلم وستم کرنے کی راہیں تلاش نہ کریں، اس پر ظلم کی پاداش میں ایک عورت کو جہنم میں داخل کر دیا گیا، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''ایک عورت کو بلی کے سبب عذاب دیا گیا، اس نے بلی کو قیدی بنائے رکھا، یہاں تک کہ وہ مرگئی، اس وجہ سے وہ عورت آگ میں داخل ہوئی اسے بلاوجہ روکے رکھا، اسے کھانے پینے کو کچھ نہ دیا اور نہ ہی اسے آزاد کیا تاکہ وہ خود کیڑے مکوڑے کھا کر گزارا کر لیتی۔'' ❷

اگر کوئی بلی خون خوار ہے اور گھر کا نقصان کرتی ہے تو اسے مارنے کے بجائے پکڑ کر کسی دور دراز علاقہ میں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنا ٹھکانہ بدل لے لیکن اسے قتل کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ (واللہ اعلم)

قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہنا

سوال میں نے ایک حدیث میں پڑھا ہے کہ جس شخص نے قسم کھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ دیا وہ حانث نہیں ہوگا، اس حدیث کا کیا مفہوم ہے؟

جواب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ لیا وہ حانث نہیں ہوگا۔ ❸

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ دے پھر وہ قسم کو پورا نہ کر سکے تو اس پر قسم توڑنے کا کفارہ نہیں ہوگا، مثلاً وہ یوں کہتا ہے: ''اللہ کی قسم! میں ان شاء اللہ یہ کام ضرور کروں گا۔'' پھر وہ کام نہ کرے یا یوں کہے: ''اللہ کی قسم! میں ان شاء اللہ یہ کام نہیں کروں گا'' پھر وہ کام کر گزرے تو ایسے حالات میں اس پر کفارہ قسم واجب نہیں ہوگا، لہٰذا قسم اٹھاتے وقت انسان کو ان شاء اللہ کہہ لینا چاہیے تاکہ اگر کسی وجہ سے قسم پوری نہ کر سکے تو اسے کفارہ ادا نہ کرنا پڑے، اس کے علاوہ قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اسے قسم کو پورا کرنے میں سہولت میسر آئے گی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کے لئے کافی ہے، اللہ تعالیٰ اپنا کام بہر حال پورا کر کے رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔'' ❹

---

❶ سنن الترمذي، الطهارة: ٩٢۔ ❷ صحيح البخاري، المساقاة: ٢٣٦٥۔

❸ سنن أبي داؤد، الايمان: ٣٢٦٢۔ ❹ الطلاق: ٣۔

بہر حال قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ لینا بہت ہی خیر و برکت کا باعث ہے، لہٰذا انسان کو اس میں کوتاہی نہیں کرنا چاہیے۔

غیر محرم سے مصافحہ

سوال عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ عورتیں غیر محرم مردوں سے مصافحہ کرتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے نفرت ختم ہو جاتی ہے اور باہمی محبت بڑھتی ہے، کیا واقعی ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب عورتوں کا غیر محرم لوگوں سے مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت بھی ان سے مصافحہ نہیں کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا، آپ ان عورتوں سے صرف زبانی بیعت لیتے تھے۔ [1]

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی وضاحت فرمائی ہے: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں۔'' [2]

یہ وضاحت آپ نے اس وقت فرمائی جب عورتوں کی طرف سے بیعت کے وقت مصافحہ کرنے کی خواہش کا اظہار ہوا۔ لہٰذا اس کام سے اجتناب کرنا چاہیے، اس کی ممانعت اس لئے ہے کہ مصافحہ کرنے سے دونوں جانب فتنے کے اسباب پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس بناء پر مصافحہ کے بغیر صرف سلام یا اس کا جواب دینے پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ عورتوں کا عورتوں سے یا محرم رشتے داروں مثلاً خاوند، باپ، بھائی اور بیٹا وغیرہ ان سے مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان کے علاوہ دوسروں سے مصافحہ کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

لمبے ناخن رکھنا

سوال دور حاضر میں بعض عورتیں لمبے ناخن رکھتی ہیں، اسی طرح کچھ نوجوان بھی ایسا کرتے ہیں، کیا شرعاً لمبے ناخن رکھنے کی گنجائش ہے؟

جواب شرعی طور پر ناخن لمبے رکھنے کی گنجائش نہیں کیونکہ خصائل فطرت میں سے ایک خصلت ناخن تراشنا ہے، بڑھانا نہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''پانچ چیزیں امور فطرت میں سے ہیں، ختنہ کرنا، زیر ناف بالوں کو صاف کرنا، مونچھیں ترشوانا، ناخن تراشنا اور بغلوں کے بال اکھیڑنا۔'' [3]

ناخن تراشنے کا عمل جسمانی صفائی کا ایک حصہ ہے کیونکہ ناخنوں کو تراشنے سے ان کے نیچے جما ہوا میل کچیل دور ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ درندوں اور حیوانوں کے ساتھ مشابہت سے بھی اجتناب ہوتا ہے کیونکہ حیوانوں اور درندوں کے ناخن بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں انسان بنایا ہے اس لئے حیوانات سے مشابہت کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ لیکن کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ہپی ازم کے دلدادہ ہمارے منچلے نوجوان اور شوخ لڑکیاں لمبے لمبے ناخن رکھتے ہیں جو کہ فطرتی خصلتوں کی مخالفت ہے نیز سیرت نبوی سے اعراض اور جہلاء کی تقلید ہے۔ آج کل تو بازار سے لمبے لمبے مصنوعی ناخن مل جاتے ہیں، کچھ لڑکیاں

---

[1] صحیح البخاري، الطلاق: ٥٢٨٨۔ [2] سنن ابن ماجه، الجهاد: ٢٨٧٤۔

[3] صحیح البخاري، اللباس: ٥٩٣٩۔

انہیں لگا کر مغربی تہذیب کا شوق پورا کر لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اسلامی تہذیب سے وابستہ رکھے۔ آمین!

کتا پالنا

سوال ہمارے گھر میں ایک کتیا ہے جو ہم سے بہت مانوس ہو چکی ہے، ہم اسے جان سے مارنا بھی نہیں چاہتے، کیا اسے رکھنے میں کوئی شرعی قباحت ہے؟

جواب کتا ایک خبیث اور نجس جانور ہے، اس کی نجاست تمام جانوروں سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے نجاست آلود برتن پاک کرنے کے لئے اسے سات مرتبہ دھونا پڑتا ہے، ان میں ایک بار اسے مٹی سے دھویا جاتا ہے۔ اس لئے ایک مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ اس فضول شوق میں اپنا وقت اور پیسہ برباد کرے۔ البتہ کتے کو تین مقاصد کے لئے رکھنے کی اجازت ہے جو حسب ذیل ہے: ① شکار کرنے کے لئے ② مال مویشی کی حفاظت کے لیے ③ کھیتی کی نگرانی کے لئے۔

ان تین مقاصد کے علاوہ کتا پالنا حرام ہے، اگر کوئی مسلمان ان مقاصد کے علاوہ کتا گھر میں رکھتا ہے تو اس کے اجر سے روزانہ دو قیراط کی کمی ہوتی رہتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس گھرانے نے جانوروں کی حفاظت اور شکاری کتے کے علاوہ کتا پالا تو ان کے اجر سے ہر روز دو قیراط ثواب کم ہو جاتا ہے۔'' [1]

اجر میں کمی کا مطلب اس شخص کا گنہگار ہونا ہے، اس بناء پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ بلا مقصد گھر میں کتا رکھنا، یہ کفار کی تقلید ہے ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔

سوال میں ہے کہ کتیا گھر سے مانوس ہو چکی ہے اس لئے وہ گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ اہل خانہ اسے گھر سے نکال دیں اور اپنے گھر میں نہ رہنے دیں وہ گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے خود بخود ایسی جگہ کا رخ کرے گی جہاں اسے کھانے پینے کے لئے کچھ ملے گا جیسا کہ دوسرے کتوں کو ملتا ہے۔ بہر حال اس کا گھر سے مانوس ہونا اسے گھر میں رکھنے کا کوئی معقول بہانہ نہیں۔ اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے جس گھر میں کتا موجود ہوتا ہے۔ [2]

(واللہ اعلم)

تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا

سوال ہمارے ہاں خوشی کے موقع پر تالی پیٹنے یا سیٹی بجانے کا رواج ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کوئی ممانعت ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کفار کی ایک عادت بایں الفاظ بیان کی ہے: ''ان کفار کی نماز بیت اللہ کے پاس یہ تھی کہ وہ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے تھے۔'' [3]

مشرکین جس طرح بیت اللہ کا ننگے ہو کر طواف کرتے تھے، اسی طرح دوران طواف وہ انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹیاں بجاتے

---

[1] بخاری، اللباس: ۵۹۴۹۔ [2] صحیح البخاري، الذبائح: ۵۴۷۹۔ [3] الانفال: ۳۵۔

اور ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے تھے اور اسے وہ نیکی اور عبادت خیال کرتے تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں بلکہ کفار و مشرکین کی عادت ہے۔ ہمارے ہاں خوشی کے موقع پر سیٹیاں بجانا اور تالی پیٹنا بھی مغربی تہذیب سے اخذ کردہ عادات ہیں لہٰذا ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ ایسے موقع پر کفار کی عادت کو اختیار کرے۔ اگر کوئی چیز پسند آئے تو اللہ اکبر یا سبحان اللہ کہا جائے، وہ بھی انفرادی طور پر ایسا کہا جا سکتا ہے اجتماعی طور پر یہ کام کرنے کی بھی اجازت نہیں، بہر حال تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا مسلمانوں کا کام نہیں۔ (واللہ اعلم)

ابرو کے بال باریک کرنا

سوال میری نئی نئی شادی ہوئی ہے، میرے شوہر مجھے کہتے ہیں کہ تم اپنے ابرو کے بالوں کو باریک کیا کرو، اس سے خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے، مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟

جواب ابرو کے بال اتار کر انہیں خوبصورتی کے لئے باریک کرنا ایک حرام اور ناجائز عمل ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، بلکہ اسے باعث لعنت قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ بال اکھاڑنے والی (نامصة) اور اکھاڑنے کا مطالبہ کرنے والی (متنمصة) دونوں پر لعنت کی ہے۔'' [1]

خاوند کی اس حد تک ماننے کی اجازت ہے جہاں خالق کی نافرمانی نہ ہو، اگر خاوند کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی ہوتی ہو تو خاوند کی بات کو نہیں مانا جائے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔'' [2]

ایک واقعہ سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اپنی بیٹی کی شادی کی ہے اور بیماری کی وجہ سے اس کے بال گر گئے ہیں اور اس کا خاوند ہمیں مصنوعی بال لگانے کے متعلق کہتا ہے، کیا میں بیٹی کے سر پر مصنوعی بال لگوا دوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بالوں کو پیوند لگانے والی اور اس کا مطالبہ کرنے والی دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ملعون قرار دیا ہے۔'' [3]

اس میں قطعاً خوبصورتی نہیں بلکہ احسن الخالقین کی خلقت میں تبدیلی ہے، جس کا اشارہ خود حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایسی عورتیں اللہ کی خلقت کو بدلنے والی ہیں۔ [4]

اس اشارہ کی وضاحت اس طرح ہے کہ شیطان لعین نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا:

''میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا، میں انہیں ضرور آرزوئیں دلاؤں گا، میں انہیں ضرور حکم دوں گا تو وہ چوپاؤں کے کان کاٹیں گے اور میں انہیں ضرور حکم دوں گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی صورت ضرور بدلیں گے اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بناتا ہے تو اس نے کھلے طور پر خسارہ اٹھایا ہے۔'' [5]

---

[1] صحيح البخاري، اللباس: ٥٩٤٣۔ [2] مسند أحمد ص ٦٦ ج٥۔
[3] صحيح بخاري، اللباس: ٥٩٤٣۔ [4] صحيح البخاري، اللباس: ٥٩٤٣۔ [5] النساء: ١١٩۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ابرو کے بالوں کو باریک کرنا، اللہ کی بنائی صورت کو بدلنا ہے اور ایسا کرنا شیطان کے حکم کی بجا آوری ہے۔ اس لئے خاوند حضرات کو چاہیے کہ وہ خوبصورتی کے لئے اپنی بیویوں کو ایسی بات کا حکم نہ دیں جس سے اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ (واللہ اعلم)

دھوپ اور سائے میں بیٹھنا

سوال نماز پڑھتے وقت بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نماز کا کچھ حصہ دھوپ میں اور کچھ سایہ میں ہوتا ہے، ایک عالم دین نے مسئلہ بیان کیا ہے کہ شریعت میں ایسا کرنا منع ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا کہ انسان کا کچھ حصہ دھوپ میں ہو اور کچھ سایہ میں۔ چنانچہ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ سائے اور کچھ دھوپ میں بیٹھنے سے منع فرمایا۔ [1]

اس روایت کی مزید وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص سایہ میں بیٹھا ہو پھر اس سے سایہ ٹل جائے اور وہ کچھ دھوپ میں آجائے اور کچھ سائے میں تو وہاں سے اٹھ جائے۔'' [2]

ایک روایت میں اس طرح بیٹھنے کو شیطان کا بیٹھنا قرار دیا گیا ہے۔ [3]

حضرت عکرمہ تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو شخص دھوپ اور سائے میں بیٹھتا ہے تو ایسا بیٹھنا شیطان کا بیٹھنا ہے۔ [4]

گرا ہوا لقمہ

سوال ہمارے ہاں شادی بیاہ کی تقریبات میں کھانے کو بڑی بے دردی سے ضائع کیا جاتا ہے، شریعت میں گرے ہوئے لقمہ کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟ قرآن و حدیث کے مطابق اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب اس میں شک نہیں کہ ہم شادی بیاہ کے موقع پر اپنی دولت کی نمائش کو باعث فخر خیال کرتے ہیں، بالخصوص کھانے کے موقع پر کھانے پینے کے معاملات میں بہت غیر محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کھانے کے دوران کسی کا لقمہ گر جائے تو چاہیے کہ اسے اٹھائے اور اس سے لگی آلودگی کو دور کر کے اسے کھالے، اسے شیطان کے لئے نہ چھوڑ دے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم پلیٹ کو انگلی سے صاف کرلیا کریں اور آپ فرمایا کرتے تھے: ''تم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ کھانے کے کس حصہ میں اس کے لئے برکت ڈال دی گئی ہے۔'' [5]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گرا ہوا لقمہ صاف کر کے کھا لینا چاہیے، قابل استعمال کھانے کو ضائع کرنا شیطان کے مترادف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی پلیٹ میں کھانا اتنا ہی لینا چاہیے جتنی اسے ضرورت ہو۔ کھانے کے بعد برتن کو اچھی طرح صاف کرنا چاہیے، یہ کوئی معیوب کام نہیں بلکہ عین سنت ہے، ایسا کرنے میں دماغ کے غرور اور تکبر کا علاج بھی ہے۔ اسی طرح

---

[1] ابن ماجه، الادب: ٣٧٢٢۔ [2] سنن أبي داؤد، الادب: ٤٨٢١۔ [3] شرح السنة ص ٣٠١ ج١٢۔
[4] مصنف ابن أبي شيبة ص ٤٩١ ج ٨۔ [5] سنن أبي داؤد، الاطعمة: ٣٨٤٥۔

روٹی کے ٹکڑے بھی ضائع کرنا جائز نہیں، نامعلوم کس ٹکڑے میں برکت ہو۔لیکن افسوس کہ ہم شادی کے موقع پر حیوانوں کی طرح کھانا استعمال کرتے ہیں، متنوع قسم کے کھانوں سے پلیٹیں بھر لیتے ہیں، پھر چند لقمے لے کر باقی ضائع کر دیا جاتا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ نان اور روٹی کے ٹکڑوں سے ہم اپنے ہاتھ صاف کرتے ہیں پھر انہیں ضائع کر کے پھینک دیتے ہیں۔اس طرح کھانے کا ضیاع ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ عطا فرمائے۔آمین!

کھانے پینے کی اشیاء میں مکھی گر جائے تو

سوال میرے ایک ساتھی نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء میں اگر مکھی گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالنے کا حکم ہے، حالانکہ اسے ڈبونے سے اس کی تمام آلائش کھانے پینے میں شامل ہو جاتی ہے، اس کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب مکھی کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث حسب ذیل ہے: ''اگر تم میں سے کسی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے چاہیے کہ اس کو مشروب میں ڈبکی دے پھر اسے نکال پھینکے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری تو دوسرے میں شفا ہے۔''[1]

ایک دوسری روایت میں کچھ تفصیل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تمہارے کسی کے برتن میں مکھی گر جائے تو اسے اس میں ڈبو لو کیونکہ اس کے ایک پَر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے اور یہ بیماری والے پر سے اپنا بچاؤ کرتی ہے لہٰذا اسے مکمل طور پر ڈبو لینا چاہیے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ مکھی اپنے جسم کے کچھ اعضاء میں ایسے جراثیم اٹھائے پھرتی ہے جو بیماری پیدا کرنے والے ہیں، ساتھ ان جراثیم کا تریاق بھی لئے پھرتی ہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب انسان زہریلے جراثیم اور ان کے تریاق کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔

طب جدید کے حالیہ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکھی اپنے ساتھ بیماری کے جراثیم اور بیماری کے خلاف دفاع کو مضبوط کرنے والا عنصر (تریاق) اٹھائے پھرتی ہے، جب وہ کوئی مائع پر بیٹھتی ہے تو اس میں وہ جراثیم منتقل کر دیتی ہے جو بیماری کا باعث ہوتے ہیں اور اپنے جسم کے ان حصوں کو ڈوبنے سے بچاتی ہے جن میں بیماری سے بچاؤ کا عنصر ہوتا ہے۔اگر مکھی پوری ڈوب جائے تو وہ بچاؤ دینے والا تریاق بھی مائع میں منتقل ہو کر بیماری کے خطرے کو کم کر دیتا ہے۔اس عمل کے بعد اگر کسی کا دل اس مشروب کو استعمال کرنے پر آمادہ نہ ہو تو شریعت اسے مجبور نہیں کرتی، البتہ صحابہ کرام کی سیرت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اسے استعمال میں لاتے تھے جیسا کہ ایک تابعی حضرت ثمامہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے، اس دوران (پینے کے) برتن میں مکھی گری تو انہوں نے اسے تین دفعہ ڈبویا اور پھر فرمایا بسم اللہ مزید کہتا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسی امر کا حکم دیا تھا۔[3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے یا پینے والی چیز میں اگر مکھی گر کر مر جائے تو وہ غذا یا مشروب اس سے پلید نہیں ہوتا کیونکہ اگر

---

[1] صحیح البخاري، بدء الخلق: ۳۳۲۰۔ [2] سنن أبي داؤد، الأطعمة: ۳۸۴۴۔

[3] فتح الباري ص ۳۰۸ ج ۱۰۔

مکھی کی موت کھانے یا مشروب کو ناپاک بنانے والی ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اسے پھینک دینے کا حکم دیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں فرمایا: شہد کی مکھی، بھڑ، مکڑی اور دیگر کیڑے مکوڑے بھی مکھی کی طرح ہیں، کیونکہ اس حدیث سے ماخوذ حکم عام ہے۔ (واللہ اعلم)

فیملی ڈرائیور کے ساتھ عورت کا سفر

سوال خواتین کا اپنے فیملی ڈرائیور کے ہمراہ محرم کے بغیر سفر کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کچھ عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کو ہمراہ لے جاتی ہیں، کیا چھوٹے بچے محرم کے قائم مقام ہو سکتے ہیں؟ کیا تبلیغی سفر کرنا بھی درست نہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں تفصیل سے آگاہ کریں؟

جواب کسی خاتون کا محرم کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں، خواہ اکیلی ہو یا جماعت کے ساتھ، دوران سفر محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ یہ سفر خواہ کسی دنیاوی غرض کے لئے ہو یا اس سے مقصود تبلیغ کرنا ہو، سرپرست اور محرم حضرات کا اس سلسلہ میں تساہل اور چشم پوشی کرنا درست نہیں، اس سے کئی ایک خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ عورت خواہ بڑی عمر کی ہی کیوں نہ ہو، اس کے لئے بھی جائز نہیں کہ اپنے فیملی ڈرائیور کے ساتھ تنہا سفر کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔'' [1]

جو حضرات اپنی محرم خواتین کے لئے اس امر کو پسند کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیوث جیسے بدترین شخص سے یاد کیا ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق اگر کسی خاتون کے ساتھ اس کے نابالغ بچے بھی ہوں تب بھی محرم کے بغیر اس کا سفر کرنا جائز نہیں۔ بچے کسی صورت میں محرم کے قائم مقام نہیں ہو سکتے، جس شخص کے ذریعے ممنوعہ خلوت ختم کی جا سکتی ہے، اس کا بڑا ہونا ضروری ہے، اس بنا پر کم سن کا موجود ہونا کافی نہیں۔ خواتین کا یہ تصور کہ اگر انہوں نے اپنے ساتھ کسی بچے کو لے لیا ہے تو خلوت ختم ہو گئی بہت خطرناک اور انتہائی غلط ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اگر کوئی اجنبی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ کسی تیسرے شخص محرم کے بغیر خلوت کرتا ہے تو بالاتفاق علماء یہ فعل حرام ہے۔ اسی طرح اگر دونوں کے ساتھ کوئی ایسا شخص ہو جس سے اس کی کم سنی کی وجہ سے شرم و حیا نہ کی جاتی ہو تو اس کے ذریعے ممنوعہ خلوت ختم نہیں ہو سکتی۔ [2]

خواتین کی جماعت کا اکیلے ڈرائیور کے ساتھ تبلیغی سفر کرنا بھی صحیح نہیں اور مدرسہ کا ناظم بھی اس سلسلہ میں محرم نہیں بن سکتا، خواہ وہ بڑی عمر کا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ جس شخص سے نکاح ہو سکتا ہے وہ محرم نہیں ہو سکتا۔ اس بناء پر عورت کا اجنبی مرد یا فیملی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں سفر کرنا کسی بھی جگہ خلوت اختیار کرنے سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ جس شخص سے نکاح ہو سکتا ہے وہ محرم نہیں ہو سکتا۔ اس بناء پر عورت کا اجنبی مرد یا فیملی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں سفر کرنا کسی بھی جگہ خلوت اختیار کرنے سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ عورت کو شہر کے اندر یا شہر کے باہر اس کی رضامندی یا اس کی رضا کے بغیر کہیں لے جا سکتا ہے، اس سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی، وہ مجرد خلوت سے زیادہ خطرناک اور سنگین ہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] مسند أحمد ص ١٨ ج ١۔ [2] شرح نووي ص ٤٣٤ ج ١۔

سوال آج کل بازاروں میں صورت حال یہ ہے کہ عورتیں عریاں قسم کا لباس پہنے ہوئے ہوتی ہیں، وہاں مرد وزن کا اختلاط بھی ہوتا ہے، اس قسم کے بازار میں جانے کا کیا حکم ہے؟

جواب اس قسم کے بازار میں ضرورت کے بغیر جانا درست نہیں۔ ویسے بھی بازار کا شور وشغب ایک مسلمان کے لئے موزوں نہیں، بالخصوص جب وہاں اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے جو سوال میں ذکر کی گئی ہے، تاہم اگر سخت ضرورت کے پیش نظر وہاں جانا ناگزیر ہو تو ان امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

① نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرے، مسلمان کے لئے یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔

② نظریں جھکاتے ہوئے اور اسباب فتنہ سے بچتے ہوئے وہاں جائے۔

③ اپنے دین اور عزت کی حفاظت کی حرص لے کر اور شر کے وسائل سے دور رہتے ہوئے وہاں جائے، اگر اس میں طاقت ہو تو اس قسم کے بازار میں برائی سے روکنے کے لئے جانا باعث اجر وثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس امت کے متعلق فرماتے ہیں:

''تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر وبھلائی کی طرف لوگوں کو دعوت دے، نیکی کی تلقین کرے اور برے کاموں سے روکے، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: جب لوگ برائی دیکھنے کے بعد اسے نہیں روکیں گے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا میں انہیں بھی شامل کرلے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے اس کی برائی بیان کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اپنے دل میں ہی اسے برا خیال کرے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ [3]

ان آیات واحادیث کے پیش نظر ایک مسلمان کسی سخت ضرورت کے پیش نظر بازار میں جا سکتا ہے البتہ اسے درج بالا آداب کو ضرور ملحوظ رکھنا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

سوال میری بیوی حمل کے آخری مرحلہ میں ہے، کیا اس حالت میں اس سے ہم بستری کرنا جائز ہے، کتاب وسنت کے مطابق میری راہنمائی کریں؟

جواب انسان، دوران حمل اپنی بیوی سے جب چاہے ہم بستری کر سکتا ہے۔ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں لیکن اگر ایسا کرنے سے کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ ہو تو یہ فعل حرام ہے۔ اگر نقصان کا اندیشہ نہیں البتہ تکلیف اور مشقت ہو تو اس صورت میں بہتر ہے کہ ہم بستری نہ کی جائے کیونکہ بیوی کو مشقت میں ڈالنا حسن معاشرت کے خلاف ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ان عورتوں سے احسن انداز میں معاشرت اختیار کرو۔'' [4]

بہر حال صورت مسئولہ میں دوران حمل آدمی اپنی بیوی سے ہم بستری کر سکتا ہے بشرطیکہ کسی قسم کے نقصان کا خطرہ نہ ہو اور اگر

---

[1] آل عمران: ۱۰۴۔ [2] ابن ماجہ، الفتن: ۴۰۰۵۔ [3] ابن ماجہ، الفتن: ۴۰۱۳۔ [4] النساء: ۱۱۔

اس سے بیوی تکلیف محسوس کرے تو بھی اس سے اجتناب بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کے غیر عادی بال

سوال اگر عورت کے چہرے پر بال اُگ آئیں تو کیا انہیں صاف کیا جا سکتا ہے، قرآن و حدیث میں ایسے بالوں کے متعلق کیا وضاحت ہے؟

جواب چہرے پر اُگنے والے بال دو قسم کے ہیں اور دونوں احکام الگ الگ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

☆ چہرے پر اُگنے والے عادی بال مثلاً ابرو کے بال، اس قسم کے بالوں کو اتارنا یا باریک کرنا حرام ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ [1]

☆ چہرے پر اُگنے والے غیر عادی بال مثلاً داڑھی یا مونچھوں کے بال۔ ان کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ نووی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے: ''چہرے کے بال نوچنے حرام ہیں لیکن عورت کی داڑھی اور مونچھیں وغیرہ، اس سے مستثنیٰ ہیں۔ عورت کا انہیں زائل کرنا حرام نہیں بلکہ مستحب ہے۔'' [2]

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ایسے بال جو جسم کے ان حصوں میں اُگ آئیں جہاں عادتاً بال نہیں اُگتے مثلاً عورت کی مونچھیں اُگ آئیں یا رخساروں پر بال آجائیں تو ایسے بالوں کو اتارنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ خلاف عادت ہونے کے علاوہ چہرے کے لئے بدنمائی کا باعث ہیں۔ [3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے سوال کیا کہ عورت اپنے خاوند کی خاطر پیشانی کے بال صاف کر سکتی ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اس اذیت کو تم اپنی ہمت کے مطابق دور کر سکتی ہو۔'' [4]

بہر حال عورت اپنے چہرے پر اُگنے والے غیر عادی بالوں کو زائل کر سکتی ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، البتہ بھنوؤں کا باریک کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کی آواز کا شرعی حکم

سوال اگر کوئی خاتون قرآن کریم کو بہترین آواز میں پڑھتی ہے یا وہ اچھے انداز میں تقریر کرتی ہے تو اس کی تلاوت سننا یا اس کی تقریر سننا شرعی طور پر کیسا ہے، کیا عورت کی آواز قابل ستر ہے کہ دوسرے آدمی اسے نہ سنیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے؟

جواب قرآن و حدیث میں ہمیں کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی جس سے معلوم ہو کہ عورت کی آواز قابل ستر ہے اور اس آواز کو اجنبی مرد نہیں سن سکتے۔ بلکہ ازواج مطہرات کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، الادب: ٥٩٣٩۔
[2] فتح الباري ص ٤٦٣ ج ١٠۔
[3] فتاویٰ برائے خواتین ص ٤٧٣۔
[4] فتح الباري ص ٤٦٣ ج ١٠۔

''اے نبی کی بیویو!تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو،اگر تم پرہیز گاری اختیار کرو تو نرم لہجے میں بات نہ کرو مبادا جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال وابستہ کرلے اور قاعدہ کے مطابق گفتگو کرو۔'' ❶

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو آواز کے متعلق ہدایات دی ہیں کہ وہ مردوں سے گفتگو کرتے وقت قصداً ایسا لب ولہجہ اختیار نہ کریں جس کی وجہ سے کوئی بد باطن اپنے دل میں کوئی برا خیال پیدا کرلے۔ چونکہ عورت کی آواز میں فطری طور پر دلکشی، نرمی اور نزاکت ہے جو مرد کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اس بناء پر بات کرنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ نرم اور لچکدار لب ولہجہ سے منع کیا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی آواز ستر میں داخل نہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(ترجمہ) ''جب تم نبی ﷺ کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو۔'' ❷

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی آواز قابل ستر نہیں کیونکہ کوئی چیز طلب کرنے میں بات کرنا ضروری ہے، بعض دفعہ عورت کو بھی بات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہر حال قرآن وحدیث میں کسی بھی دلیل سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عورت کی آواز قابل ستر ہے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ جیسے فقیہ اور عالم صحابی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علم وفضل کے متعلق اپنا اور اپنے جیسے دوسرے ساتھیوں کا تجربہ بایں الفاظ بیان کرتے ہیں: ''ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ کو جب کبھی کسی حدیث کے معاملہ میں کوئی مشکل پیش آئی اور ہم نے اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا تو ان کے پاس اس کا علم پایا۔'' ❸

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، صحابہ کرام میں ایک مرجع کی حیثیت رکھتی تھیں اور مشکل مسائل کے لئے صحابہ کرام آپ سے رابطہ کرتے تو ان کا حل انہیں بتاتی تھیں، اگر آواز پردہ ہوتی تو مسائل وغیرہ کے لئے رجوع نہ کیا جاسکتا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اجنبی عورت کی گفتگو سننا جائز ہے اور عورت کی آواز قابل ستر نہیں۔ ❹

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث کی تشریح میں امام نووی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ ضرورت کے وقت اجنبی عورت کی گفتگو سننا جائز ہے اور عورت کی آواز پردہ میں شامل نہیں۔ ❺

ہمارے رجحان کے مطابق اگر کوئی عورت خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کرتی ہے تو اس کی تلاوت مرد سن سکتے ہیں اور اسی طرح اس کی تقریر سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، کتاب وسنت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے معلوم ہوتا ہو کہ عورت کی آواز پردے کا حصہ ہے۔ صرف اتنی پابندی ہے کہ عام لوگوں سے گفتگو کرتے وقت لب ولہجہ ذرا سخت ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کا بیوی سے الگ رہنا

سوال ہمارے ہاں کچھ لوگ ملازمت کے لئے بیرون ملک جاتے ہیں جبکہ وہ شادی شدہ ہوتے ہیں پھر سال، دو سال

---

❶ الاحزاب: ۳۲۔ ❷ الاحزاب: ۵۳۔ ❸ ترمذي، المناقب: ۳۸۸۳۔
❹ فتح الباري ص ۲۵۲ ج۱۳۔ ❺ شرح نووي ص ۱۱ ج۱۳۔

بعد واپس آتے ہیں، اس دوران یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گھریلو حالات خراب ہو جاتے ہیں۔ قرآن وسنت کے مطابق خاوند کتنا عرصہ اپنے گھر سے باہر رہ سکتا ہے؟

جواب شریعت نے اس سلسلہ میں کسی مدت کا تعین نہیں کیا کہ خاوند اتنی مدت سے زیادہ باہر نہیں رہ سکتا، کیونکہ یہ میاں بیوی کا باہمی معاملہ ہے، البتہ قرآن وحدیث نے ہمیں اس امر سے آگاہ ضرور کیا ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں اور بلاوجہ ایک دوسرے کو تکلیف نہ دیں۔ بیوی کے متعلق تو خاص ہدایات ہیں کہ اس کے ساتھ حسن معاشرت کا مظاہرہ کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کرو۔'' [1]

عورتوں کے متعلق ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور انہیں تکلیف دینے کی غرض سے مت روکے رکھو تاکہ تم زیادتی کرتے رہو۔'' [2]

احادیث میں بھی عورتوں سے حسن معاشرت کی بہت تاکید آئی ہے اور یہ کوئی حسن معاشرت نہیں کہ روزگار کے لئے انسان بیرون ملک چلا جائے اور بیوی کے حقوق کو نظر انداز کر کے سال دو سال تک باہر ہی رہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس سلسلہ میں بہت حساس طبیعت رکھتے تھے، انہوں نے یہ قانون مقرر کیا تھا کہ کوئی فوجی چار ماہ سے زیادہ اپنے گھر سے باہر نہ رہے۔ چنانچہ آپ عام مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے رات کو گشت کرتے تھے۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ کسی مکان سے گزرتے وقت ایک عورت کی پُرسوز آواز سنی۔ اس کے لئے اپنے شوہر نامدار کی جدائی ناقابل برداشت ہو رہی تھی جو جہاد وقتال میں مصروف تھا اور کئی مہینوں سے گھر نہیں آسکا تھا، اس کے جذبات دلسوز اشعار کی صورت میں ابل پڑے تھے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی سے دریافت کرنے پر ہر فوجی نوجوان کے لئے چار ماہ کے بعد اپنے گھر جانا لازم قرار دیا۔ [3]

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق کسی بھی شوہر کو اپنے گھر سے اتنی مدت کے لئے غیر حاضر نہیں رہنا چاہیے جس میں گھریلو حالات خراب ہو جائیں۔ (واللہ اعلم)

چھپکلی کو مارنا

سوال ہمارے گھر میں بہت چھپکلیاں ہیں، کیا انہیں زہریلی دوائی سے مارا جا سکتا ہے، کیا انہیں مارنے سے ثواب بھی ملتا ہے، اس کے متعلق ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے، اس حدیث کی بھی وضاحت کریں؟

جواب چھپکلی ایک موذی جانور ہے، یہ گھروں اور جنگلات میں ہوتا ہے، اس میں زہر بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے مارنے کا حکم دیا ہے اور اسے ضرر رساں قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھپکلی کو قتل کر دینے کا حکم دیا ہے اور اسے نقصان دہ جانور کہا ہے۔ [4] گرگٹ بھی اسی نسل سے ہے، ایک حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ یہ نسل حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ پھونکنے میں شریک تھی۔ [5]

---

[1] النساء: ١٩۔ [2] البقرة: ٢٣١۔ [3] سنن البيهقي ص ٢٩ ج ٩۔

[4] صحيح مسلم، السلام: ٢٢٣٨۔ [5] صحيح البخاري، أحاديث الانبياء: ٢٣٥٩۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے چھپکلی کو پہلی چوٹ میں مارا، اسے اتنا ثواب ہے اور جس نے اسے دوسری چوٹ میں مارا اسے اتنا اتنا ثواب ہے یعنی پہلے سے کم اور جس نے اسے تیسری چوٹ میں مارا، اس کے لئے اتنا اتنا ثواب ہے یعنی دوسری بار سے بھی کم۔'' [1]

ایک روایت میں ہے کہ جس نے چھپکلی کو پہلی چوٹ میں مار دیا اس کے لئے ستر نیکیاں ہیں۔ [2]

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق پہلی چوٹ سے مار دینے میں سو نیکیاں ہیں۔ [3]

مذکورہ ثواب اس مسلمان کے لئے ہے جو جرأت مند اور کامل نشانے والا ہو۔ بہر حال گھروں میں جو چھپکلیاں رہتی ہیں انہیں مارنا چاہیے، اگر یہ کسی کھانے میں گر جائے تو اس کے زہر کے اثرات سے بہت نقصان کا اندیشہ ہے۔ انہیں زہریلی ادویات سے بھی مارا جا سکتا ہے۔ گھر میں ان کے سدباب کے لئے سپرے وغیرہ بھی چھڑکی جا سکتی ہے۔ بہر حال ان کے مارنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، بلکہ بعض اوقات انہیں مارنا ثواب کا باعث ہے۔ (واللہ اعلم)

سوتے وقت بجلی کے بلب گل کرنا

سوال حدیث میں ہے کہ رات کو سوتے وقت آگ کو بجھا دیا کرو، کیا بجلی کے بلب رات کے وقت بجھا دینے چاہئیں یا زیرو کا بلب جلتا ہوا رہنے دیا جائے تا کہ رات کو گھر والوں کو تکلیف نہ ہو۔

جواب آگ کے متعلق تو حدیث میں صراحت ہے کہ رات کو سوتے وقت اسے جلتا ہوا نہیں رہنے دینا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سوتے وقت اپنے گھروں میں آگ نہ رہنے دیا کرو۔'' [4]

اس حدیث کا تقاضا ہے کہ رات کو سوتے وقت گھر میں آگ، کوئلوں کی انگیٹھی، گیس یا بجلی کے چولہے اور ہیٹر وغیرہ بند کر دیئے جائیں بصورت دیگر نقصان کا اندیشہ ہے ہم اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ رات کے وقت کسی گھر میں آگ لگ گئی وغیرہ ،اس حدیث کے مطابق احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ بجلی کے بلب بھی بجھا دیئے جائیں۔ کیونکہ بجلی آگ کی ایک قسم ہے، اس کے علاوہ اندھیرے میں سونا طبی لحاظ سے بہت زیادہ مفید ہے۔ سوال میں زیرو کے بلب کی افادیت کو بیان کیا گیا ہے کہ اس سے رات کو اٹھنے والوں کو سہولت ہے۔ یہ سہولت تو موقع پر بلب جلا کر بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہمارا رجحان یہی ہے کہ اس قسم کے بلب کو بھی رات سوتے وقت گل کر دینا چاہیے۔ اگر جلتا رہے گا تو سرکٹ شارٹ ہونے سے گھر کا نقصان ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گھروں کو آگ لگنے میں شیطانی حرکت کا عمل دخل ہوا کرتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب تم سونے لگو تو اپنے چراغ بجھا دیا کرو بلاشبہ شیطان چوہیا جیسی مخلوق کو اس قسم (جلا دینے کا) کام سمجھا دیتا ہے اور تمہارے گھروں میں آگ لگا دیتا ہے۔'' [5]

---

[1] سنن أبي داؤد، الادب: ٥٢٦٣۔
[2] سنن أبي داؤد، الادب: ٥٢٦٤۔
[3] صحيح مسلم، السلام: ٢٢٤٠۔
[4] صحيح البخاري، الاستيذان: ٦٢٩٣۔
[5] سنن أبي داؤد، الادب۔

ان احادیث کی روشنی میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احتیاطی تدابیر پر عمل کرتے ہوئے شیطان کے شر سے بھی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس لعین کی شرارتوں سے محفوظ فرمائے۔آمین!

مجبوری کے وقت پردہ اتارنا

سوال میری شادی کو ایک سال گزر چکا ہے، میرے میاں بیرون ملک ملازمت کرتے ہیں، میرے سسرال کی طرف سے پردہ نہ کرنے پر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور یہ دباؤ دن بدن بڑھتا جارہا ہے، ایسے حالات میں میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب عورت کو یہ حکم ہے کہ وہ اجنبی مردوزن سے اپنے جسمانی محاسن کو چھپائے، انہیں کسی صورت میں ظاہر نہ ہونے دے بصورت دیگر وہ فتنہ وفساد کا شکار ہوسکتی ہے، پردہ کی حکمت بھی یہی ہے۔قرآن کریم نے پردہ کی حکمت ان الفاظ میں بیان کی ہے: (ترجمہ) ''پردہ کرنا تمہارے دلوں اوران کے دلوں کی پاکیزگی کا ایک موثر سبب ہے۔'' [1]

دوسری آیت میں فرمایا: (ترجمہ) ''یہ زیادہ مناسب ہے کہ انہیں پہچانا جائے پھر انہیں ایذا نہ دی جائے۔'' [2]

جو عورت پردہ نہیں کرتی وہ دل کی گندگی کا شکار ہوجاتی ہے اور دوسروں کی طرف سے اذیت رسانی سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اگر کوئی خاوند یا محرم رشتہ دار پردہ اتارنے پر مجبور کرتا ہے تو عورت کو چاہیے کہ وہ استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پردہ پر ڈٹ جائے، اگر حالات زیادہ ہی سنگین صورت حال اختیار کرجائیں تو پردہ کرنے میں نرمی کی جاسکتی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جتنی تم میں طاقت ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔'' [3]

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے حالات میں پردہ اتارنے پر مواخذہ نہیں کریں گے، ممکن ہے کہ سسرال والوں کو پردہ کی اہمیت کا علم نہ ہو، اس لئے پہلے تو ان کی ذہن سازی کرنا ہوگی۔اگر حق بات کہنے کے باوجود بھی وہ پردہ اتار دینے پر اصرار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرمائے گا۔اسے چاہیے کہ وہ اس معاملہ پر صبر کرے اور اللہ تعالیٰ سے حالات درست ہونے کی دعا کرتی رہے۔

مردوزن کا اختلاط

سوال ہمارہاں بعض سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھے تعلیم دی جاتی ہے اور مردانہ زنانہ سٹاف بھی اکٹھا ہوتا ہے، شریعت میں مردوں اور عورتوں کو اکٹھا رہنے کی کہاں تک اجازت ہے؟

جواب اسلام میں مرد اور عورت کا دائرہ عمل الگ الگ ہے، لڑکیوں کو تعلیم دینا ایک مستحسن اقدام ہے لیکن انہیں اکٹھا رکھنا کئی ایک فتنوں کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔اسی زنانہ سٹاف کی بے پردگی ہی مردانہ سٹاف کے ساتھ ملنے جلنے کا سبب بنتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورتیں، مردوں سے شرم وحیا محسوس نہیں کرتیں اور اس طرح کا میل جول بہت بڑے فتنے اور تباہی کا سبب بنتا ہے۔ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مسجد سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ مرد اور عورتیں ایک راستے پر چل رہے ہیں، آپ نے یہ منظر دیکھ کر عورتوں سے فرمایا: ''ایک طرف ہٹ جاؤ، راستے کے درمیان چلنا تمہارے لئے بہتر نہیں، ایک طرف ہوکر چلا کرو۔''

---

[1] الاحزاب: ۵۳۔ [2] الاحزاب: ۵۹۔ [3] التغابن: ۱۶

رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے بعد عورتوں نے اس پر بایں طور پر عمل کیا کہ انہوں نے راستہ میں ایک طرف ہو کر چلنے کا معمول بنالیا، وہ اس قدر راستے سے ہٹ کر چلتی تھیں کہ بعض اوقات ان کی چادریں دیواروں سے چپک جاتی تھیں۔ ❶

اس روایت کو بعض اہل علم نے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس میں شداد بن ابی عمرو نامی راوی مجہول ہے لیکن کچھ حضرات نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ ❷

قرآن کریم سے مذکورہ حدیث کے مفہوم کی تائید ہوتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کے ایک کنویں پر پہنچے تو انہوں نے وہاں لوگوں کی ایک بھیڑ کو پایا جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے، وہاں دو لڑکیاں بھی دیکھیں جنہوں نے اپنی بکریوں کو روک رکھا تھا۔ ❸

ان لڑکیوں نے مردوں کے ساتھ اختلاط کو گوارا نہیں کیا بہرحال مرد و زن کا یہ میل فتنے کا باعث ہو سکتا ہے، ایسا کرنا منع ہے۔ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں سے راستہ میں الگ رہیں اور گلی یا سڑک کے عین وسط میں چلنے کے بجائے اس کی ایک جانب ہو کر چلیں، یہ کیفیت ان کے باحیا اور باوقار ہونے کی علامت ہے۔ اس میں عورتوں کے لئے امن بھی ہے کہ کوئی اوباش انہیں پریشان نہیں کرے گا اور نہ ہی ان سے کوئی غلط توقع وابستہ کر سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بچوں میں مساوات

سوال میری چھوٹی بچی بہت فرماں بردار اور خدمت گزار ہے، میں اسے کچھ عطیہ نقدی کی صورت میں دینا چاہتی ہوں جبکہ میرے دوسرے بچے بھی ہیں، کیا شریعت میں ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب والدین اپنے بچوں کے لئے بہت مہربان ہوتے ہیں، بعض اوقات والدین سے حسن سلوک اور جذبہ اطاعت گزاری کی بنیاد پر محبت و پیار میں فرق آ سکتا ہے جو انسان کے بس میں نہیں۔ اگرچہ حدیث میں اس قسم کے تفاوت کو پسند نہیں کیا گیا جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ اس کا بیٹا وہاں آ گیا، اس شخص نے اپنے بیٹے کا منہ چوما اور اسے اپنی ران پر بٹھالیا، پھر اس کی بیٹی آئی تو اس نے اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا، اس تفاوت کو دیکھ کر آپ نے فرمایا: ''تم نے ان دونوں کے درمیان عدل کیوں نہیں کیا۔'' ❹

تاہم بعض اوقات انسان بے اختیار ہوتا ہے لیکن مالی معاملات میں ایسا کرنا ناجائز اور حرام ہے کہ انسان اپنی اولاد میں سے کسی کو مالی عطیہ دے اور دوسروں کو محروم کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ سے ڈرو اور اپنے بچوں کے درمیان عدل و انصاف کرو۔'' ❺

اس حدیث کے پیش نظر والدین کو چاہیے کہ وہ مالی معاملات میں اپنی اولاد کے متعلق عدل و انصاف سے کام لیں، کیونکہ بعض اوقات اس قسم کی ناانصافی سے بچوں میں بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

---

❶ سنن أبي داود، الادب: ۵۲۷۲۔ ❷ الاحادیث الصحیحة: ۸۵۶۔ ❸ القصص: ۲۳۔
❹ أحادیث الصحیحة: ۳۰۹۸۔ ❺ صحیح البخاري، الهبة: ۲۵۸۷۔

عیسائیوں کے برتن

سوال میرے ساتھ کچھ عیسائی طالب علم رہتے ہیں، ان کے برتنوں میں کھانے پینے کا کیا حکم ہے، کیا ہم انہیں استعمال کر سکتے ہیں؟

جواب عیسائیوں کے برتن نجس نہیں ہیں، ان کا استعمال جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اہل کتاب کے کھانے کو حلال قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اہل کتاب کا کھانا تمھارے لئے حلال ہے۔'' ❶

رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے موقع پر اہل کتاب کے گھر کھانا کھایا تھا، یہ کھانا بھی ان کے برتنوں کے پاک ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو ایک مشرکہ عورت کے مشکیزے سے پانی پینے اور وضو کرنے کا حکم دیا تھا۔ ❷

البتہ ایک حدیث میں اہل کتاب کے برتنوں کو دھو کر استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ❸

یہ اس لئے تھا کہ وہ لوگ ان برتنوں میں شراب پیتے اور خنزیر کا گوشت پکاتے تھے، لہٰذا ایسے برتنوں کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہاں اگر عیسائی طہارت و نظافت کا خیال نہیں رکھتے جیسا کہ ہمارے ہاں نالیاں وغیرہ صاف کرتے ہیں یا گھروں سے کوڑا کرکٹ اٹھاتے ہیں، ایسے لوگوں کے برتنوں کو استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے اگر کبھی ضرورت پڑ جائے تو انہیں پہلے دھو لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

سوال کرنے کے آداب

سوال بعض دفعہ ایسے سوالات بھی سامنے آتے ہیں جن کا معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ بظاہر فضول نظر آتے ہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں سوالات کے آداب سے آگاہ فرمائیں۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اللہ کی وحی سے مطلع کرنے کے لئے کئی ایک طریقے استعمال فرمائے، ان میں کامیاب اور کارگر ذریعہ سوال و جواب کا ہے۔ بعض اوقات خود وحی بھی سوال و جواب کی صورت اختیار کر لیتی تھی جیسا کہ حدیث جبرائیل علیہ السلام سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں فرشتہ وحی خود کسی دینی معاملہ کے متعلق سوال کرتا ہے پھر خود ہی رسول اللہ ﷺ کے جوابات کی تصدیق کرتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ صورتحال دیکھ کر تعجب ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے جو تمہیں دین کی باتیں سکھانے کے لئے یہ انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔'' ❹

اللہ تعالیٰ نے خود اس امت کو یہ انداز اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہیں کسی بات کا علم نہ ہو تو اہل ذکر سے دریافت کر لیا کرو۔'' ❺

اس قرآنی ہدایت کے بعد صحابہ کرام کو اگر کسی دینی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تو سرخیل اہل ذکر جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرے۔ قرآن کریم نے ''یسئلونك'' کے انداز سے ایسے کئی ایک مسائل کی نشاندہی کی ہے جو صحابہ کرام نے

---

❶ المائدة: ٥۔ ❷ صحيح البخاري، الوضوء: ٢٤٤۔ ❸ مستدرك ص١٤٤ ج١۔

❹ صحيح البخاري، الايمان: ٥٠۔ ❺ النحل: ٤٣۔

رسول اللہ ﷺ سے دریافت کئے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ان کے جوابات دیئے۔

عہد رسالت میں بعض اوقات ایسے سوالات بھی سامنے آئے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے مزاج کے خلاف تھے اور ان میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے محدود پیمانے پر اس سلسلہ میں کچھ پابندی عائد کردی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کیا کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔'' [1]

اس کے بعد لوگوں پر پابندی عائد کردی گئی کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے سوالات نہ کئے جائیں جن میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو کیونکہ خواہ مخواہ سوال پوچھنے سے انسان کو نقصان ہی ہوتا ہے یا اس پر کوئی پابندی عائد کردی جاتی ہے۔ ویسے بھی رسول اللہ ﷺ نے بے فائدہ گفتگو کرنے، زیادہ سوالات پوچھنے، مال و دولت کو ضائع کرنے، ماؤں کو ستانے، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے اور دوسروں کا حق دبانے سے منع فرمایا ہے۔ [2]

ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا جیسا کہ کچھ لوگ قرآنی آیات سے استدلال کر کے باطل چیزوں کے امکان پر بحث و سوال کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ اگر سب کچھ جانتا ہے تو کیا جادو بھی جانتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو کیا وہ جھوٹ بولنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ ہر شخص کی شاہ رگ سے بھی قریب تر ہے تو وہ عرش پر کیسے مستوی ہو سکتا ہے؟ العیاذ باللہ

اب ہم فضول اور بے فائدہ سوالات کی کچھ اقسام بیان کرتے ہیں تاکہ آپ حضرات بھی اس قسم کے سوالات پوچھنے سے اجتناب کریں۔

① ایسے سوالات جن میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو جیسا کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کی تعیین کے لئے سوال کیا تھا۔ [3]

② ضرورت پوری ہونے کے بعد بلاوجہ مزید سوالات کا سلسلہ جاری رکھنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کی فرضیت کو بیان فرمایا تو ایک آدمی نے سوال کر دیا کہ ہر سال حج کرنا فرض ہے۔ [4]

③ ایسے معاملات کے متعلق سوالات کرنا، جن کے متعلق شریعت کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا بلکہ شارع علیہ السلام کا سکوت ہی اس کے جواز کے لئے کافی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس معاملہ کو میں نے چھوڑ دیا ہے تم بھی اسے چھوڑ دو، تم سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے بلاوجہ اپنے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف کر کے سوالات کی بھرمار کردی تھی۔ [5]

④ مشکل ترین اور حساس معاملات کے متعلق سوالات کرنا تاکہ جواب دینے والا کسی الجھن اور پیچیدگی کا شکار ہو جائے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معمہ جات اور پہیلیوں (اغلوطات) کی صورت میں سوالات کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [6]

⑤ تعبدی احکام کی غرض و غایت اور اس کی علت سے متعلق سوال کرنا۔ جیسا کہ حضرت معاذہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا تھا

---

[1] المائدة: ١٠١۔ [2] صحيح البخاري، الاعتصام: ٧٢٨٩۔ [3] صحيح البخاري، العلم: ٨٠۔
[4] صحيح مسلم، الحج: ٤١٢۔ [5] صحيح مسلم، الحج: ٤١٢۔ [6] سنن أبي داود، العلم: ٣٦٥٦۔

کہ حائضہ عورت روزے کی قضاء تو دیتی ہے لیکن اس کے لئے نماز کی قضا دینا کیوں ضروری نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سوال ناپسند کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''تو حروریہ معلوم ہوتی ہے۔'' ❶

⑥ تکلف کرتے ہوئے کسی چیز کی گہرائی اور اس کی حقیقت کے متعلق سوال کرنا۔ جیسا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک حوض کے متعلق اس کے مالک سے دریافت کیا تھا کہ یہاں درندوں کی آمد و رفت تو نہیں ہوتی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا: تجھے اس کے متعلق ہمیں بتانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ❷

⑦ ایسے سوالات جن میں عقل و قیاس کے ذریعے کتاب و سنت کی صریح نصوص کا رد مقصود ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ شکم مادر میں قتل ہونے والے بچے کے متعلق فیصلہ فرمایا تھا کہ اس کے بدلے ایک لونڈی یا غلام تاوان دیا جائے، تو جس کے خلاف یہ فیصلہ ہوا کہنے لگا کہ میں اس بچے کا تاوان کیوں دوں جس نے کھایا ہے نہ پیا ہے اور نہ وہ بولا اور چلا ہے، ایسے بچے کا خون تو رائیگاں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے انداز گفتگو کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ تو کاہنوں کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔'' ❸

⑧ متشابہات کے متعلق سوالات کرنا بھی ممنوعہ قبیل سے ہے۔ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے کسی نے یہ آیت پڑھی: ''رحمٰن نے اپنے عرش پر قرار پکڑا۔'' (طٰہٰ: ۵) پھر امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ استواء کیا ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''استواء تو معروف ہے، اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔'' ❹

⑨ اسلاف کے باہمی مشاجرات کے متعلق سوالات کرنا۔ جیسا کہ اہل صفین کے بارے میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کے خون سے میرے ہاتھوں کو محفوظ رکھا، میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی زبان کو اس میں ملوث کروں۔'' ❺

⑩ کٹ بحثی، کٹ حجتی اور دوسرے فریق کو لاجواب اور خاموش کرنے کے لئے سوالات کرنا۔ جیسا کہ مشرکین اور یہود مدینہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبات اور سوالات کرتے تھے۔ ان کا ہرگز مطلب یہ نہ تھا کہ اگر انہیں معقول جواب مل جائے تو حق کو تسلیم کرلیں گے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے سوالات میں الجھا کر کم از کم دوسروں کو حق سے دور رکھا جائے، قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔ ❻

⑪ بے ضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں دماغ سوزی کرنا۔ جیسا کہ زلیخا کی شادی حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی تھی یا نہیں؟ اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کیسا تھا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام کیا تھا؟ اس قسم کے سوالات ممنوع ہیں کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے۔

⑫ فرضی مسائل کھڑے کر کے ان کے متعلق غور و خوض کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے ایک ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جس کا ابھی وقوع نہیں ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

---

❶ صحیح مسلم، الحیض: ٦٩۔ ❷ موطا إمام مالك، الطهارة: ١٤۔ ❸ صحیح مسلم، القيامة: ١٦٨٢۔
❹ مختصر العلو للذهبي، ص ١٤١۔ ❺ موافقات للشاطبي ص ٣٢٠ ج ٤۔ ❻ الزخرف: ٥٨۔

''ایسی چیز کے متعلق سوال نہ کرو جو ابھی واقع نہیں ہوئی، ہم نے اپنے والد گرامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ ایسے شخص پر لعنت کرتے تھے جو ایسی اشیاء کے متعلق سوالات کرتا جو واقع نہ ہوئی ہوں۔ ❶

ہم نے کتاب وسنت کی روشنی میں سوالات کی چند اقسام سے آپ کو آگاہ کیا ہے جو مستحسن نہیں ہیں۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ ایسے سوالات کریں جن کا تعلق آپ کی عملی زندگی سے ہے یا آپ عمل وکردار کے لحاظ سے کسی الجھن کا شکار ہیں۔ ہم اللہ کے فضل وکرم سے آپ کی راہنمائی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ (آمین!)

جوان شاگردوں سے پردہ

سوال میں اپنے گھر میں بچوں اور بچیوں کو قرآن پڑھاتی ہوں، کچھ میرے شاگرد جو جوان ہو چکے ہیں وہ مجھے ملنے کیلئے آتے ہیں، کیا مجھے ان سے بھی پردہ کرنا چاہیے جبکہ میں ان کے لئے والدہ کی جگہ پر ہوں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب پردہ، عورت کے لئے ایک زینت ہے۔ اس کے متعلق گنجائش طلب کرنے کے بجائے اس کی پابندی کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۵۴ میں پردہ کا حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے: ''اور جب تمہیں رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگنا ہو تو پردے پیچھے رہ کر مانگو۔'' ❷

اس آیت حجاب کے نزول کے بعد پردہ اسلامی طرز معاشرت کا ایک حصہ بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات امت کے اہل ایمان مردوں کی روحانی مائیں ہیں۔ اب اگر کسی شخص کو اپنی روحانی ماؤں سے کوئی بات پوچھنا ہو یا ضرورت کی کوئی چیز مانگنا ہو تو اسے حکم ہے کہ وہ پردے کے پیچھے رہ کر سوال کرے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب آیت حجاب نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا لیا۔ ❸

اس حدیث کے پیش نظر ہماری خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں سے پردہ کریں جب وہ سن بلوغت کو پہنچ جائیں۔ قرآن کریم نے اس کی وجہ بایں الفاظ بیان کی ہے: ''یہ پردہ تمہارے اور ازواج مطہرات کے دلوں کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔''

گویا معاشرہ سے بے حیائی اور فحاشی کے خاتمہ کے لئے پردہ انتہائی ضروری چیز ہے، اس کی پابندی سے مرد اور عورت دونوں کے دلی شک وشبہ سے محفوظ رہیں گے نیز ایک دوسرے کے ساتھ فتنے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا، ازواج مطہرات نے اس پردہ کی پابندی کس قدر کی، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے:

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک آدمی نے کسی دوسرے کی لونڈی سے زنا کیا اور اپنے بھائی کو وصیت کر دی کہ اس لونڈی سے جو بچہ پیدا ہوا تو اسے اپنے قبضہ میں لے لینا کیونکہ وہ میرے نطفے سے ہے، فتح مکہ کے موقع پر اس کے بھائی نے اس بچے کو پکڑ لیا لیکن جس گھر میں پیدا ہوا تھا، اس کے بیٹے نے کہا کہ یہ بچہ میرے باپ کی لونڈی کا ہے لہٰذا اس پر میرا استحقاق ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس لڑکے کے متعلق فیصلہ کیا کہ زانی کے لیے تو پتھر ہیں اور یہ بچہ اس کو ملے گا جس کے گھر پیدا ہوا ہے، چونکہ اس بچے کی شکل وشباہت زانی کے ساتھ ملتی جلتی تھی اس لیے آپ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر چہ یہ بچہ تیرا قانونی بھائی

---

❶ مسند الدارمي: ۱۲٦۔ ❷ الاحزاب: ٥٤۔ ❸ صحيح البخاري، التفسير: ٤٧٩١۔

ہے لیکن تو نے اس سے پردہ کرنا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں کہ اس کے بعد حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے کبھی اس لڑکے کو نہیں دیکھا۔ [1]
اور نہ ہی اس لڑکے نے مرتے دم تک حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا۔ [2]

حالانکہ وہ بچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے باپ کے گھر میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا اور پرورش پائی اس لئے ہمیں بھی پردہ کی پابندی کرنا چاہیے چاہے وہ ہمارے شاگرد ہی کیوں نہ ہوں، ازواج مطہرات کے تلامذہ بھی پس پردہ ہی سوالات کرتے تھے اور ازواج مطہرات پردہ میں رہتے ہوئے انہیں جواب دیتی تھیں۔ (واللہ اعلم)

بیوی کو زدوکوب کرنا

سوال میرا خاوند بہت سخت مزاج ہے وہ معمولی بات پر مجھے پیٹتا ہے اور گالی گلوچ سے میری تذلیل کرتا رہتا ہے، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خاوند کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ احسان کرے اور اس کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کرے، حتیٰ کہ اگر دلی محبت نہیں تو بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
''ان عورتوں کے ساتھ اچھے انداز میں بود و باش اختیار کرو، اگر تم ان میں کوئی ناگواری محسوس کرو تو بھی اچھا برتاؤ کرو، ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو برا جانو لیکن اللہ تعالیٰ اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔'' [3]

رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو بہتر قرار دیا جو اپنے گھر والوں سے حسن سلوک کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے سب سے بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے زیادہ بہتر ہوں۔'' [4]

ہاں اگر بیوی سرکشی کرتی ہے اور بات بات پر خاوند کی مخالفت کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے تو اس صورت میں اسے تین طریقے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے: ☆ وعظ و نصیحت ☆ بستر سے علیحدگی ☆ ہلکی پھلکی مار۔
جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جن عورتوں کی نافرمانی اور بد دماغی کا تمہیں اندیشہ ہو تو پہلے تم انہیں نصیحت کرو اور انہیں الگ بستروں پر چھوڑ دو نیز انہیں مار کی سزا دو۔'' [5]

اس آیت کریمہ میں مار اور زدوکوب کو آخر بیان کیا ہے۔ حدیث میں اس کی بھی وضاحت ہے کہ وہ شدید قسم کی مار نہ ہو جس سے اسے زخم یا پھر ہڈی ٹوٹنے کا خدشہ ہو۔ بہر حال صورت مسئولہ میں خاوند کا رویہ انتہائی قابل مذمت ہے، اسے احسن انداز سے سمجھانا چاہیے اور بیوی کو چاہیے کہ وہ صبر کرے اور اللہ سے دعا کرتی رہے، اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا، انتہائی مہربان ہے۔

غیبت کیا ہے؟

سوال اگر کوئی شخص کسی کاروبار، رشتہ یا کسی بھی ضرورت کے پیش نظر دوسرے کے متعلق سوال کرے تو کیا اس کے

---

[1] صحیح البخاري، البیوع: ٢٢١٨۔ [2] صحیح البخاري، البیوع: ٢٠٥٣۔ [3] النساء: ١٩۔
[4] سنن الترمذي، النکاح: ٣٨٩٥۔ [5] النساء: ٣٤۔

عیوب سے آگاہ کرنا غیبت ہے، کیا ایسے حالات میں بھائی کے عیوب اس کی عدم موجودگی میں بتائے جاسکتے ہیں؟

جواب قرآن کریم نے غیبت کی بہت مذمت کی ہے اور سختی کے ساتھ اس سے منع فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ بلکہ تمہیں خود اس سے گھن آتی ہے۔'' [1]

غیبت کی تعریف خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، آپ سے پوچھا گیا کہ غیبت کیا ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو، عرض کیا گیا اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو کیا یہ بھی غیبت ہے؟ آپ نے فرمایا: غیبت تو یہی ہے کہ اس کے عیب کو اس کی عدم موجودگی میں بیان کیا جائے اور اگر اس میں وہ عیب نہیں تو آپ نے اس پر بہتان لگایا ہے۔ [2]

بہر حال غیبت بہت بڑا اخلاقی جرم ہے اور یہ کسی زندہ انسان کی اس کی پیٹھ پیچھے کی جائے یا کسی فوت شدہ انسان کی، جرم کی نوعیت کے لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ شریعت نے کسی اہم ضرورت کے پیش نظر چند صورتوں کو اس حرمت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ حاکم کے سامنے یا فتویٰ لینے کے لئے مفتی کو کسی کا عیب بتایا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ میرا خاوند بہت کنجوس ہے اور وہ گھر کے اخراجات کے لیے معقول خرچہ نہیں دیتا۔ کیا میں اس کے علم کے بغیر اس کی رقم لے سکتی ہوں تو آپ نے فرمایا کہ ہاں تم اتنی رقم لے سکتی ہو جس قدر معروف طریقہ کے مطابق گھر کے اخراجات پورے ہوجائیں۔ [3]

☆ کسی کے شر سے بچنے کے لئے اپنے مومن بھائی کو اس کے عیوب سے مطلع کردینا تاکہ وہ اس کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ مثلاً کوئی رشتہ کرنا چاہتا ہو، یا کسی سے کاروباری شراکت کا پروگرام ہے یا کسی کے ہمسایہ میں مکان خریدنا چاہتا ہے تو مشورہ دیتے وقت نہایت احتیاط اور دیانتداری سے متعلقہ شخص کے عیوب بیان کردے تاکہ وہ کسی دھوکہ میں نہ رہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کے متعلق فرمایا: ''یہ اپنے خاندان کا بدترین آدمی ہے۔'' [4]

☆ انسان کو ایسی غرض لاحق ہو کہ غیبت کے بغیر وہ پوری نہ ہوسکتی ہو، اگر غیبت نہ کی جائے تو اس غیبت سے زیادہ برائی لازم آتی ہو۔ جیسا کہ محدثین کا قانون جرح وتعدیل ہے، جس پر تمام ذخیرہ احادیث کی جانچ پڑتال کا انحصار ہے۔ ایسی صورت میں راویوں کے عیوب بیان کرنا جائز نہیں بلکہ واجب ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے فرمایا تھا کہ نکاح کرنے کے لئے انصار کی عورتوں کو دیکھ لیا کرو کیونکہ ان کی آنکھوں میں کچھ بھینگا پن ہوتا ہے۔ [5]

☆ ایسے لوگوں کے خلاف علی الاعلان آواز بلند کرنا اور ان کی برائیوں پر تنقید کرنا جو فسق وفجور پھیلا رہے ہوں یا بدعات ورسوم کی

---

[1] الحجرات : ١٢۔ [2] صحیح مسلم، البر والصلة: ٢٥٨٩۔ [3] صحیح البخاري، النفقات : ٣٥٦٣۔
[4] صحیح البخاري، الادب : ٦٠٥٤۔ [5] صحیح مسلم، النکاح : ١٤٣٤۔

اشاعت کر رہے ہوں یا اللہ کی مخلوق کے بے دینی اور ظلم و جور کے فتنوں میں مبتلا کر رہے ہوں۔ اس کی بنیاد یہ آیت کریمہ ہے: ''اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی علانیہ کسی برائی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔'' [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم کے خلاف آواز بلند کرنا جائز ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''اہل فساد اور فتنہ برپا کرنے والوں کی غیبت جائز ہے۔'' [2]

مذکورہ صورتوں کے علاوہ خواہ مخواہ کسی مسلمان کے بارے میں پروپیگنڈا کرنا انتہائی مذموم، غیبت اور بہتان ہے۔ لہٰذا یہ حرام اور ناجائز ہے نیز ان کا تعلق کبیرہ گناہوں سے ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں ان اخلاقی برائیوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

باآواز بلند قرأت کرنا

سوال مسجد میں باآواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، جبکہ اس کی تلاوت دوسرے نمازیوں کے لئے تشویش کا باعث ہو، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب جب مسجد میں لوگ نماز پڑھ رہے ہوں اور قرآن کی تلاوت ان نمازیوں کے لئے خلل کا باعث ہو تو ایسی حالت میں باآواز بلند تلاوت کرنا حرام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ ایک مرتبہ مسجد میں تشریف لائے جبکہ لوگ اس طرح نماز پڑھ رہے تھے کہ تلاوت کرتے وقت ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں تو آپ نے فرمایا: ''بے شک نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر ایک کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے رب سے کیا سرگوشی کر رہا ہے اور کوئی کسی سے بڑھ کر بلند آواز میں تلاوت نہ کرے۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نمازیوں کے پاس باآواز بلند قرآن پاک کی تلاوت کرنا درست نہیں کیونکہ ایسا کرنا نمازیوں کے لئے تشویش کا باعث ہے۔

میاں بیوی کا ہاتھ پکڑ کر بازار جانا

سوال اکثر دیکھا جاتا ہے کہ میاں بیوی جب بازار جاتے ہیں تو انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا ہوتا ہے، کیا برسرعام بیوی کا ہاتھ پکڑ کر چلنا جائز ہے؟

جواب میاں بیوی کا بازار میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھومنا پھرنا انسانی اوقات کے خلاف اور لوگوں کے سامنے بے شرمی اور بے حیائی کا اظہار ہے۔ اسلامی تہذیب میں ایسا کرنا درست نہیں بلکہ یہ مغربی تہذیب ہے کہ وہ برسرعام ایک دوسرے کو بوس و کنار کرتے ہیں جبکہ اسلام اسے بے حیائی اور بے شرمی قرار دیتا ہے۔ محبت کے اظہار کے لئے اور بہت سے طریقے ہیں، جب انہیں خلوت ملے تو محبت کا اس انداز سے اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر عورت بیمار یا نابینا ہے تو اس کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بوقت ضرورت بیوی اپنے خاوند کا ہاتھ بھی پکڑ سکتی ہے لیکن اظہار محبت کے لئے برسرعام ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلنا انسانی شرف و وقار اور اسلامی روایات کے خلاف ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] النساء: ١٤٨۔ [2] صحیح البخاري، الادب باب ٤٨۔ [3] سنن أبي داؤد، الصلوة: ١٣٣٢۔
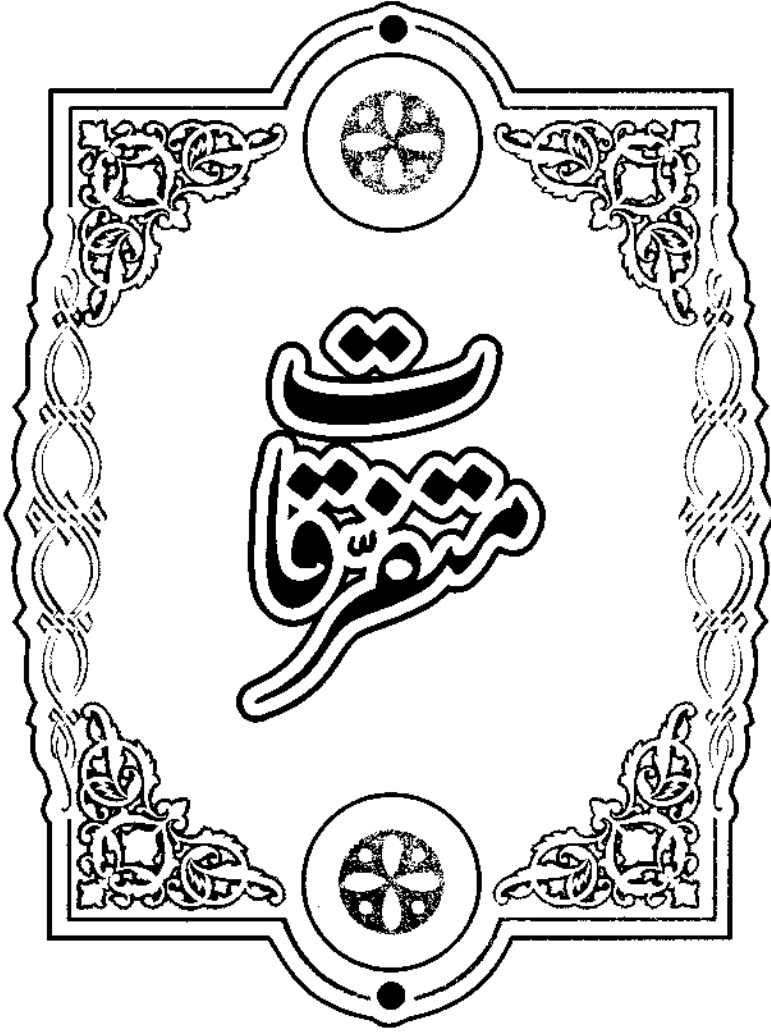
متفرقات

متفرّقات

غیر ملک میں ملازمت کرنا

سوال میرے خاوند غیر ملک میں ملازت کرتے ہیں، دو سال کے بعد انہیں چھٹی ملتی ہے تو گھر آتے ہیں، کیا شرعاً اس طرح کی ملازمت کی جاسکتی ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے نکاح کے مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے سکون پاؤ، اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کردی یقیناً غور کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔'' [1]

اس آیت کے مطابق دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے باعث اطمینان وسکون ہیں۔ مرد، بیوی سے بے پناہ پیار کرتا ہے اور بیوی، اپنے خاوند کے ساتھ جذبہ فدائیت رکھتی ہے اس سلسلہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔'' [2]

اس سلسلہ میں متعدد احادیث بھی وارد ہیں، لیکن حصول دنیا نے ہمارے ذہنی سکون کو برباد کر دیا ہے۔ بلاشبہ دنیاوی زندگی میں خواہشات بہت زیادہ ہیں، اور انسان کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان مختلف قسم کے طریقے استعمال کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اپنے بیوی بچوں کو تنہا چھوڑ کر بیرون ملک ملازمت بھی اسی قسم کا ایک جھانسہ ہے، اس لئے خاوند کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں احتیاط سے کام لے، اللہ تعالیٰ نے اس پر بیوی اور بچوں کے متعلق بہت بھاری ذمہ داری عائد کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور اس کے ماتحت رہنے والوں کے متعلق اس سے سوال ہوگا، امام نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ مرد اپنے گھر کا نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔'' [3]

اس حدیث کا تقاضا ہے کہ خاوند، اپنے بیوی بچوں میں رہتے ہوئے ان کی نگرانی کرے اور ان کی تعلیم وتربیت کا خیال رکھے نیز یہ بھی یاد رہے کہ عورت بھی ایک گوشت اور خون سے پیدا شدہ انسان ہے، وہ کوئی لکڑی یا پتھر سے تراشا ہوا بت نہیں ہے۔ اس پرفتن دور میں وہ بھی مختلف قسم کے لوگوں کو دیکھ کر یا ان کی باتیں سن کر متاثر ہوسکتی ہے، اس لئے خاوند کے لئے اس پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور غلط قسم کی اثر انداز ہونے والی سوسائٹی سے اپنے بیوی بچوں کو بچانا اس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایک مسلمان خاوند کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صرف حصول دنیا کے لئے ہی زندگی بسر نہ کرے اور ایک گونگی اور بے حس

---

[1] الروم: ۲۱۔ [2] النساء: ۱۹۔ [3] صحیح بخاری، الجمعة: ۸۹۳۔

مشین کی طرح صرف دنیا کمانے میں نہ لگا رہے اگرچہ مال کی خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے اور بیرون ملک جانے کی کڑوی اور زہریلی گولی کو صرف اسی مقصد کے پیش نظر نگلا جاتا ہے لیکن جو چیز اللہ کے پاس ہے وہ زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، لہٰذا اسے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کم وقت والا کام کرے، خواہ اس میں اجرت کم ہی ہو اور اپنے ملک میں رہتے ہوئے محنت ومزدوری کر لے تاکہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی وقت نکال سکے اور ان کی تربیت کی طرف توجہ دے سکے۔ دو، دو سال تک عورت کو گھر میں اکیلا رکھنا کسی طرح سے بھی مناسب نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ اگر بیرون ملک جانے کے بغیر چارہ نہ ہو تو انہیں اپنے ساتھ رکھنے کا کوئی بندوبست کرے، اگر اکیلا بندوبست نہیں کر سکتا تو چند ساتھی مل کر کوئی مکان کرایہ پر لے لیں تاکہ اہل وعیال کے لئے ایک اسلامی فضا اور صاف ستھرا ماحول تیار کیا جا سکے اور جو لوگ کفار کے ممالک میں حصول ملازمت کے لئے جاتے ہیں انہیں تو خاص طور پر اس پہلو کو مدنظر رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔ آمین!

ازدواجی راز افشاء کرنا

سوال میری بیوی، ہمارے مابین ازدواجی راز دوسری عورتوں کو بتاتی ہے، کئی بار میں نے اسے منع کیا ہے لیکن وہ باز نہیں آتی، اس کے متعلق شرعی حکم واضح کریں؟

جواب کچھ عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ گھر کی باتیں یا ازدواجی راز دوسری عورتوں کو بتاتی ہیں، یہ نازیبا حرکت حرام اور ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک بیویوں کی بایں الفاظ تعریف کی ہے: ''نیک فرمانبردار بیویاں خاوند کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت سے نگہداشت رکھنے والی ہوتی ہیں۔'' [1]

سوال میں جو صورت حال بیان ہوئی ہے وہ شریعت میں انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''قیامت کے دن اللہ کے ہاں لوگوں میں سے بدترین درجہ اس شخص کا ہوگا جو اپنی بیوی سے ملتا ہے اور وہ اس سے ملتی ہے اور پھر وہ اس کے راز افشاء کرتا ہے۔'' [2]

یہی حکم بیوی کا ہے، اسے چاہیے کہ اگر خاوند میں کوئی کوتاہی ہے تو اسے آگاہ کرے، دوسروں کو بتانا اس کی خیانت کرنا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا دم کرنا

سوال عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مرد حضرات ہی دم کرتے ہیں، کیا عورت بھی یہ کام کر سکتی ہے، اگر عورت اپنے بچوں یا خاوند پر دم کرے تو کیا یہ جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب دم کرنے کے سلسلہ میں شرعی اعتبار سے کوئی پابندی نہیں ہے، دم خواہ مرد کرے یا عورت، دونوں کے لئے جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا عام ارشاد ہے: ''تم میں سے جو بھی اپنے بھائی کو نفع پہنچانے کی طاقت رکھتا ہو تو وہ ایسا ضرور کرے۔'' [3]

اس حدیث کے علاوہ کچھ روایات میں عورت کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ دم کر سکتی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

---

[1] النساء: ۳٤۔ [2] صحیح مسلم، النکاح: ۳٥٤۲۔ [3] صحیح مسلم، السلام: ۲۱۹۹۔

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ نظر بد لگ جانے پر دم کیا جائے۔'' [1]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے گھر میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پر سیاہ داغ تھے تو آپ نے فرمایا: اسے دم کرو کیونکہ اسے نظر بد لگی ہے۔ [2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مرض وفات میں خود پر معوذات پڑھ کر دم کرتے تھے لیکن جب آپ کے لئے یہ کام دشوار ہو گیا تو میں یہ معوذات پڑھ کر آپ پر دم کرتی تھی اور حصول برکت کے لئے آپ کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھیرتی تھی، راوی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح دم کرتے تھے؟ آپ نے جواب دیا کہ اپنے ہاتھ پر دم کر کے ہاتھ کو چہرے پر پھیرا کرتے تھے۔ [3]

ایک روایت میں مزید وضاحت ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب محو استراحت ہونے کے لئے بستر پر آتے تو قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر پھونک مارتے پھر انہیں چہرے اور جسم پر جہاں تک ہاتھ پہنچ سکتا تھا اسے پھیر لیتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کو اس طریقہ کے مطابق دم کروں۔ [4]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت دم کر سکتی ہے لیکن اپنے دم اور نفع رسانی کے کام کو صرف محارم تک محدود رکھے، اس فیض کو عام نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

شیو کی اجرت

سوال شیو (داڑھی مونڈنا) کی کمائی اور اس کے لئے دکان کرایہ پر دینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب داڑھی مونڈنا حرام ہے اور اس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے، کیونکہ جو اعمال حرام ہوتے ہیں، ان پر اجرت لینا بھی حرام ہے۔ شراب نوشی حرام ہے اور اسے کشید کرنے کی اجرت لینا بھی حرام ہے۔ اسی طرح حرام کے لئے دکان کرایہ پر دینا بھی شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے حرام کام میں تعاون کرنا لازم آتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ''گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو۔'' [5]

لہٰذا شیو کے لئے دکان کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے جیسا کہ بنک کو دکان کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

ابلیس جن تھا یا فرشتہ؟

سوال ابلیس کے متعلق وضاحت درکار ہے کہ وہ جن تھا یا فرشتہ کچھ لوگ بعض آیات کے پیش نظر فرشتہ ثابت کرتے ہیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کریں؟

جواب اس قسم کے سوالات کا ہماری عملی زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، ہم نے متعدد مرتبہ اپنے معزز قارئین کرام

---

[1] صحیح بخاری، الطب: ۵۷۳۸۔ [2] صحیح بخاری، الطب: ۵۷۳۹۔

[3] صحیح بخاری، الطب: ۵۷۳۵۔ [4] صحیح بخاری، الطب: ۵۷۴۸۔ [5] المائدۃ: ۲۔

سے گذارش کی ہے کہ ایسے سوالات دریافت کیے جائیں جن کا ہماری عملی زندگی سے تعلق ہے تاہم اس وضاحت کے بعد مذکورہ سوال کے متعلق ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے، ابلیس کو آگ کے تیز شعلے سے اور حضرت آدم کو اس مٹی سے پیدا کیا گیا جس کی حالت تمہارے سامنے بیان کی گی ہے۔ ❶

ایک روایت میں ابلیس کے بجائے جنات کی پیدائش کا ذکر ہے۔ ❷

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس، فرشتوں سے نہیں ہے بلکہ جنات سے ہے جنہیں شعلے والی آگ سے پیدا کیا گیا ہے، جو اہل علم کہتے ہیں کہ ابلیس، فرشتوں میں سے تھا، ان کے پاس کوئی صحیح اور صریح دلیل نہیں بلکہ اس آیت سے استنباط کرتے ہیں: ''جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب فرشتوں نے انہیں سجدہ کیا۔'' ❸

ان حضرات کا کہنا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا کیونکہ آدم کو سجدہ کرنے کا حکم بھی فرشتوں کو دیا گیا تھا، لیکن اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ وہ اصل کے اعتبار سے تو جنات کی جنس سے تھا لیکن اپنی عبادت گزاری کی کثرت کی بنا پر فرشتوں میں گھلا ملا رہتا تھا چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب نے سجدہ کیا یہ جنوں سے تھا، اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔'' (الکہف: ۵۰)

اس آیت سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس جنوں سے تھا اور فرشتوں میں سے نہیں تھا اگر وہ فرشتوں سے ہوتا تو اسے حکم الٰہی سے سرتابی کی مجال ہی نہ ہوتی کیونکہ فرشتوں کے متعلق حکم الٰہی ہے: ''وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔'' ❹

اس پر ایک اشکال ہے کہ جب وہ فرشتہ نہیں تھا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کا مخاطب ہی نہیں تھا کیونکہ حکمِ سجدہ کے مخاطب تو فرشتے تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ فرشتوں کے ساتھ ہی رہتا تھا تو ان کے ساتھ ہی حکم میں شامل تھا، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اسے خصوصی طور پر آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو پھر تو نے سجدہ کیوں نہ کیا۔'' ❺

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق ابلیس فرشتوں سے نہیں تھا بلکہ یہ جنات کی جنس سے تھا، ہمارے اس رجحان کی درج ذیل وجوہات ہیں: ① قرآن مجید میں اس کی صراحت ہے، ② حدیث میں ابلیس کی پیدائش آگ سے اور فرشتوں کی نور سے بیان کی گئی ہے۔ ③ فرشتوں کی اولاد نہیں ہوتی جبکہ ابلیس کی اولاد کا ذکر قرآن میں ہے۔ ❻ ④ فرشتے اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے جبکہ ابلیس نے اس کے حکم سے سرتابی کی۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح مسلم، الزھد: ۷۴۷۵۔ ❷ کتاب التوحید لابن مندۃ ص ۲۰۸ ج ۱۔ ❸ البقرۃ: ۳۴۔
❹ التحریم: ۶۔ ❺ الاعراف: ۱۲۔ ❻ الکہف: ۵۰۔

اصحاب کہف کا کتا

سوال عام لوگوں میں مشہور ہے کہ اصحاب کہف کا کتا بھی جنت میں جائے گا، کیا یہ صحیح ہے، حالانکہ جنت تو پاک جگہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے پرہیزگاروں کے لئے تیار کیا ہے جبکہ کتا ناپاک ہے، اس کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب ہمارے ہاں خطباء حضرات اس واقعہ کو بھی زور وشور سے بیان کرتے ہیں کہ اصحاب کہف سے وفاداری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کے کتے کو بھی جنت میں جگہ دے گا اور اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے کہ اس نے اصحاب کہف کی پاسبانی کی تھی وغیرہ وغیرہ۔ علامہ دمیریؒ نے اپنی تالیف حیات الحیوان میں اس کے متعلق لکھا ہے: ''جنت میں تین جانوروں کے علاوہ اور کوئی جانور نہیں جائے گا، ان میں سے ایک اصحاب کہف کا کتا، حضرت عزیر علیہ السلام کا گدھا اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی۔ [1]

بعض حضرات نے ان کے جانوروں کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دنبے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے براق کا بھی ذکر کیا ہے، کچھ اہل علم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گائے، حضرت یونس علیہ السلام کی مچھلی، حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی اور بلقیس کے ہدہد کا بھی ذکر کیا ہے، کچھ منچلے حضرات نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بھیڑیے کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ بھی جنت میں جائے گا، بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں والا معاملہ ہے، یہ سب بے سند باتیں ہیں جن کی علمی طور پر کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کو اپنے مقربین اہل تقویٰ کے لئے بنایا ہے، ان کتوں، بھیڑیوں کے لئے یہ جنت تیار نہیں کی گئی، اللہ تعالیٰ ہمارے خطباء حضرات کو یہ توفیق دے کہ وہ منبر پر کھڑے ہو کر صرف مستند باتیں اور واقعات بیان کریں، بے اصل داستانیں بیان کرنا ان کے شایان شان نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سیہہ حلال ہے

سوال خارپشت جسے سیہہ کہا جاتا ہے، اس کے متعلق علماء امت نے کیا فیصلہ کیا ہے، یہ حلال ہے یا حرام؟ کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے؟

جواب خارپشت یعنی سیہہ کے متعلق علماء میں اختلاف ہے، کچھ اسے حرام کہتے ہیں جبکہ اکثر علماء کے نزدیک یہ حلال ہے کیونکہ حیوانات کے متعلق اصل حلت اور اباحت ہے اور ان میں وہی جانور حرام ہیں جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ حرام جانوروں کے متعلق کچھ اصول بیان ہوئے ہیں اور اس کی بابت شریعت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس کی بنا پر اسے حرام قرار دیا جائے اور نہ ہی یہ ان اصولوں کی زد میں آتی ہے جو کسی چیز کو حرام قرار دینے کے لئے علماء امت نے وضع کئے ہیں، یہ جانور خرگوش اور ہرن کی طرح نباتات کھاتا ہے اور کچلی سے شکار کرنے والی درندوں میں سے بھی نہیں ہے، البتہ کتب حدیث میں اس کے متعلق ایک حدیث آئی ہے جو درج ذیل ہے:

---

[1] حیات الحیوان ص ٢٦٢ ج ٢۔

حضرت نمیلہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا، ان سے کسی نے خارپشت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے درج ذیل آیت پڑھ دی: ''کہہ دیں، بذریعہ وحی جو احکام میرے پاس آئے ہیں ان میں سے کسی کھانے والے کے لئے کوئی چیز جسے وہ کھانا چاہے میں حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت۔ وہ ناپاک ہے یا وہ فسق کہ اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو پھر جو شخص مجبور ہو جائے اور وہ سرکشی کرنے والا یا حد سے گزرنے والا نہ ہو تو بے شک آپ کا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے۔'' ❶

مجلس میں موجود ایک بڑی عمر کے آدمی نے کہا: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کا ذکر ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ خبیث جانوروں میں سے ایک خبیث جانور ہے، یہ سن کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو پھر بات وہی فیصلہ کن ہے جس کا ہمیں علم نہیں۔ ❷

اس روایت کے متعلق بعض اہل علم نے کہا ہے کہ خارپشت (سیہہ) خبیث جانور ہونے کی وجہ سے حرام ہے لیکن محققین اہل علم نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کے دو راوی عیسیٰ بن نمیلہ اور اس کا باپ دونوں مجہول ہیں، پھر روایت میں بڑی عمر والے شیخ کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کون ہے، اس بنا پر یہ روایت قابل حجت نہیں۔ ہمارے رجحان کے مطابق خارپشت حلال ہے لیکن اگر کسی کا دل اس کے کھانے پر آمادہ نہ ہو تو الگ بات ہے۔ (واللہ اعلم)

خرگوش کو حیض نہیں آتا

سوال کچھ لوگ خرگوش کو اس لئے حرام کہتے ہیں کہ اس کی مادہ کو ہر ماہ حیض آتا ہے، کیا واقعی ایسا ہے، کتاب وسنت میں اس کی حلت وحرمت کے متعلق کیا بیان ہوا ہے، وضاحت فرمائیں؟

جواب کسی صحیح روایت میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ خرگوش کی مادہ کو حیض آتا ہے، اس سلسلہ میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک آدمی خرگوش شکار کر کے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس لایا اور دریافت کیا کہ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ جانور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تھا جبکہ میں بھی اس وقت آپ کے پاس موجود تھا، آپ نے اسے نہ کھایا اور نہ کھانے سے منع فرمایا لیکن یہ کہا کہ اسے حیض آتا ہے۔ ❸

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک روایت ذکر کی ہے جس کے الفاظ ہیں کہ اسے خون آتا ہے لیکن یہ دونوں روایات ضعیف ہیں۔ ❹

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح بھی ہوں تو بھی حرمت یا کراہت پر دلالت نہیں کرتیں۔ بہرحال ہمارے رجحان کے مطابق یہ روایات صحیح نہیں ہیں، تاہم اگر اسے حیض آتا ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ یہ حقیقت ہے کہ خرگوش کا پیشاب گاہے بگاہے رنگ دار ہو جاتا ہے کبھی تیز سرخ اور کبھی نارنجی رنگ جیسا، معروف حیض یا متعارف خون مراد نہیں، علم الحیوانات کے ماہرین کی یہی

---

❶ الانعام: ۱۴۵۔
❷ ابوداؤد، الاطعمہ: ۳۷۹۹۔
❸ ابوداؤد، الاطعمہ: ۳۷۹۲۔
❹ فتح الباری، ص ۸۱۹ ج ۹۔

رائے ہے، خرگوش کے حلال ہونے کے متعلق مستند روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان کی ہے: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مرالظہران میں تھے کہ ایک خرگوش کا پیچھا کیا گیا، لوگ اس کے پیچھے دوڑے لیکن تھک ہار کر بیٹھ گئے، میں اسے پکڑ کر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا، انہوں نے ذبح کر کے اس کے دونوں کولہے یا دونوں رانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمایا۔ ❶

ایک دوسری روایت میں الفاظ اس طرح ہیں: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں ایک نوخیز مضبوط لڑکا تھا، میں نے ایک خرگوش کا شکار کیا اور اسے بھون لیا، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس کا پچھلا دھڑ مجھے دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا چنانچہ میں اسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے قبول فرمایا۔ ❷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس ہدیے کو قبول فرمانا اس کے حلال ہونے کی واضح دلیل ہے ، ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کو کھانے کی بھی صراحت ہے۔ ❸

بہر حال خرگوش حلال ہے اور اس کو حرام قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں، جس وجہ سے اسے حرام کہا جاتا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سرکاری اہل کار کو تحفہ

سوال جو اہل کار سرکاری طور پر کسی کام کے لئے تعینات ہوتے ہیں، ان کو تحفہ وغیرہ دینا اور ان کا تحائف قبول کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، تفصیل سے ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب سرکاری طور پر جو آدمی کسی کے لئے تعینات ہے اور اسے باقاعدہ اس کام کی تنخواہ ملتی ہے تو ایسے لوگوں کو تحائف دینا اور ان کے تحائف قبول کرنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ وہ اس کام کرنے کی باقاعدہ حکومت سے تنخواہ لیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جس شخص کو ہم کسی کام پر تعینات کریں اور ہم اسے اس کام کا مقررہ معاوضہ بھی دیں تو پھر وہ جو کچھ بھی اس تنخواہ کے علاوہ لے گا وہ خیانت ہوگی۔ ❹

سرکاری اہل کار کو چاہیے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ اپنا کام سرانجام دے، اس پر وہ کسی قسم کا تحفہ قبول نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا رشوت اور خیانت میں شامل ہے ہاں اگر تحفہ کسی غرض کے بغیر ہو اور اسے عہدہ سے پہلے بھی تحفہ دیا جاتا تھا تو اسے قبول کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو لازماً تحفہ دینے والا سرکاری اہل کار کو اپنی طرف مائل کر کے اپنے مقاصد کو اس کے ذریعے پورا کرنا چاہتا ہے اور اپنے حق میں فیصلہ کرانا چاہتا ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں سرکاری اہل کار کو تحفہ دینے اور اسے قبول کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے بھائی کی سفارش کرے پھر اسے تحائف دیئے جائیں اور وہ انہیں قبول کرے تو یہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے کو آیا ہے۔ ❺

---

❶ صحیح بخاری، الذبائح : ۵۵۳۵۔ ❷ ابو داؤد، الاطعمہ : ۳۷۹۱۔ ❸ صحیح بخاری، الھبہ : ۲۵۷۲۔
❹ ابو داؤد : ۲۹۴۳۔ ❺ ابو داؤد، البیوع: ۳۵۴۱۔

لہٰذا ایسے حالات میں تحائف دینے اور لینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم

گرہن کے اثرات

سوال میری بیوی حاملہ ہے اور محلے کی عورتیں اسے کہتی ہیں کہ جب سورج یا چاند گرہن لگے تو اس وقت باہر نہیں نکلنا چاہیے کیونکہ گرہن کے وقت حمل پر برے اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ ہے، کیا واقعی گرہن کے وقت ایسے برے اثرات کا اندیشہ ہوتا ہے؟

جواب سوال میں ذکر کردہ باتیں دورِ جاہلیت کی یادگار ہیں، مسلمان کو اس قسم کے توہمات کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ اسلام میں ان باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں سورج کو گرہن لگا، اتفاق سے اس وقت آپ کے لختِ جگر حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی فوت ہوئے تو لوگوں میں اس طرح کی باتیں ہونے لگیں، آپ نے وضاحت فرمائی کہ بے شک سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، سورج اور چاند کو کسی شخص کی موت یا اس کی پیدائش کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا، لہٰذا جب تم گرہن دیکھو تو اللہ کا ذکر کرو، نماز پڑھو اور صدقہ کرو۔ [1]

اس حدیث کی بنا پر سورج گرہن کے وقت اللہ کا ذکر کرنا چاہیے اور صدقہ وخیرات دینا چاہیے۔ اس وقت حمل پر کسی قسم کے اثرات مرتب نہیں ہوتے، اس قسم کی دیگر باتیں عقیدہ کی کمزوری کی وجہ سے ہوتی ہیں، اللہ ہمیں ان سے محفوظ رکھے۔ آمین!

نوکرانی کا حکم

سوال ہمارے گھر میں ایک نوکرانی کام کاج کرتی ہے، بعض اوقات میں گھر میں نہیں ہوتی، صرف میرے میاں ہوتے ہیں اور وہ نوکرانی گھر میں کام کرتی رہتی ہے، اس کے متعلق کتاب وسنت کا کیا حکم ہے، براہ کرم ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب گھر میں کام کرنے والی نوکرانی پر وہی احکام نافذ ہیں جو عام عورتوں کے لئے ہیں، وہ غیر محرم لوگوں سے پردہ کرے گی اور آپ کے میاں اس کے لئے غیر محرم ہیں، اس کے سامنے نوکرانی کا اپنی زیب وزینت کا اظہار کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اگر گھر میں آپ کے میاں اکیلے ہیں تو نوکرانی کا گھر میں کام کاج کرنا بھی محل نظر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''کوئی آدمی کسی عورت کے محرم کے بغیر اس کے ساتھ خلوت نہ کرے۔'' [2]

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ خلوت نہیں کرتا مگر تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔'' [3]

ان احادیث کی روشنی میں ہمیں اپنی گھریلو طرزِ معاشرت کے متعلق غور کرنا ہوگا، گھر میں کام کاج کرنے والی نوکرانی بھی عورت ہے اور اس پر وہی پابندیاں ہیں جو عام عورت کے لئے ہوتی ہیں، لہٰذا نوکرانی کو بھی آپ کے میاں سے پردہ کرنا ہوگا اور ان دونوں کا اکیلے گھر میں اکٹھے رہنا بھی کئی ایک فتنوں کا پیش خیمہ بن سکتا ہے بلکہ ایسے واقعات ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے ہیں جو

---

[1] صحیح بخاری، الکسوف: ۱۰۴۴۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ۵۲۳۳۔

[3] مسند امام احمد ص ۱۸ ج ۱۔

ہماری ندامت اور ذلت کا باعث ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے حالت میں قوانین اسلام پر عمل کرنا ہوگا، اسی میں ہماری عافیت ہے۔ (واللہ اعلم)

قرآن خوانی

سوال ہمارے ہاں یہ روایت ہے کہ قبرستان میں قرآن خوانی کے لئے حفاظ کرام کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، وہ قبروں کے پاس شبینہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کردیں؟

جواب قبرستان قرأت قرآن کا محل نہیں ہے لہٰذا ان میں قرآن خوانی کا اہتمام خلاف شریعت ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث میں اس کا واضح اشارہ ملتا ہے: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ بقرۃ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گھروں میں قرآن مجید کی تلاوت کا اہتمام کرنا چاہیے اور انہیں قبرستان نہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ قبرستان قرآن پڑھنے کا محل نہیں ہے۔ حفاظ کرام کو بھی چاہیے کہ وہ ناجائز کام کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے سے گریز کیا کریں۔ (واللہ اعلم)

دوران جمعہ ایام آنا

سوال میں مسجد میں جمعہ ادا کرنے کے لئے گئی وہاں مجھے حیض سے دو چار ہونا پڑا، میں نماز سے فراغت تک مسجد میں رہی، کیا اس صورت میں مجھے گناہ ہوگا؟

جواب عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ ناپاکی کی صورت میں مسجد کے اندر جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''میں حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد کو حلال نہیں سمجھتا ہوں۔'' [2]

اگر عورت کو مسجد میں حیض آجائے تو اگر وہ اکیلی باہر نکل سکتی ہے تو فوراً مسجد سے باہر آجانا چاہیے اور اگر تنہا مسجد سے نکلنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں مسجد میں بوقت مجبوری ٹھہرا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے میں امید ہے کہ گناہ نہیں ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے، قرآن کریم میں ہے: ''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز تک نہ جاؤ تا آنکہ تمہیں یہ معلوم ہوسکے کہ تم نماز میں کیا کہہ رہے ہو، اور نہ ہی جنبی نہائے بغیر نماز کے قریب جائے الا یہ کہ وہ راہ طے کر رہا ہو۔'' [3]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ معنوی نجاست کے ساتھ مسجد سے گذرا جاسکتا ہے جبکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جہاں تک ہوسکے اللہ سے ڈرتے رہو۔'' [4] ہمارے رجحان کے مطابق اگر کوئی عورت جمعہ کی ادائیگی کے لئے مسجد میں گئی اور وہاں اسے حیض آجائے تو اسے فوراً وہاں سے نکل آنا چاہیے، اگر باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو تو فراغت تک وہاں بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ نماز وغیرہ ادا نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] مسند امام احمد ص ۲۷-۲۸۴۔ [2] ابو داؤد، الطھارۃ: ۲۳۲۔ [3] النساء: ۴۳۔ [4] التغابن: ۱۶۔

کیا گائے کا گوشت بیماری کا باعث ہے؟

سوال کیا احادیث میں اس طرح کی صراحت ہے کہ گائے کا گوشت بیماری کا باعث ہے، اگر یہ بات صحیح ہے تو قربانی میں گائے کو کیوں ذبح کیا جاتا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب گائے کے دودھ کے متعلق احادیث میں صراحت ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے استعمال کرنے کی ترغیب دلائی ہے، ارشاد نبوی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری نہیں اتاری مگر اس کی شفاء بھی نازل کی ہے، البتہ بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں ہے، تم گائے کا دودھ استعمال کیا کرو کیونکہ وہ ہر درخت سے پتے وغیرہ کھاتی ہے۔'' [1]

یہ روایت معمولی تبدیلی کے ساتھ مسند امام احمد میں بھی موجود ہے۔ [2]

البتہ اس کے گوشت کے متعلق بعض روایات میں صراحت ہے کہ یہ بیماری کا باعث ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم گائے کا دودھ اور گھی استعمال کیا کرو اور اس کے گوشت سے گریز کرو کیونکہ اس کا دودھ اور گھی باعث دواء اور ذریعہ شفاء ہے لیکن اس کے گوشت کا استعمال بیماری کا باعث ہے۔'' [3]

ممکن ہے کہ علاقائی طور پر ایسا ہو کیونکہ حجاز کی سرزمین میں خشکی ہے اور اس کے گوشت میں بھی یبوست ہے، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اس کے گوشت میں بیماری ہے۔ البتہ جو علاقے خشک نہیں جیسا کہ ہمارا برصغیر ہے۔ یہاں بیماری کا اندیشہ نہیں ہے، البتہ اس کی قربانی کی جاسکتی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی بیویوں کی طرف سے گائے ذبح کی تھی جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے ذبح کی تھی۔ [4]

ایک روایت میں تفصیل ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گائے کا گوشت لایا گیا، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کہاں سے آیا ہے، آپ کو جواب دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے ذبح کی ہے۔ [5]

رسول اللہ ﷺ کی طرح قربانی دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا عملی ثبوت ملتا ہے اگرچہ اس کے متعلق صراحت ہے کہ اس کا گوشت بیماری کا باعث ہے۔ ممکن ہے کہ علاقائی طور پر سرزمین حجاز میں یہ مفید نہ ہو البتہ جو علاقے خشک نہیں ہیں، وہاں اس کا گوشت بھی ضرررساں نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

چاند گرہن کے وقت کیا کرنا چاہیے؟

سوال پچھلے دنوں ماہ جون میں چاند گرہن لگا، جو رات گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک جاری رہا، پورا چاند گرہن کی لپیٹ میں آگیا حتی کہ اندھیرا ہو گیا، حاملہ خواتین چلتی پھرتی رہیں، مبادا ان کا حمل ضائع ہو جائے، اس سلسلہ میں عورتوں کو ہدایات دی جاتی رہیں، کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟ نیز بتائیں کہ چاند یا سورج گرہن کے وقت کیا کرنا چاہیے؟

---

[1] مستدرک حاکم ص ۱۹۷ ج ٤۔ [2] مسند امام احمد ص ۳۱۵ ج ٤۔ [3] مستدرک ص ٥٠٧ ج ٥۔
[4] صحیح بخاری، الحیض : ۲۹٤۔ [5] صحیح بخاری، الحج : ۱۷۰۹۔

جواب رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس آئے تو آپ کے لخت جگر حضرت ابراہیم فوت ہو گئے، اتفاقاً اس دن سورج کو گرہن لگ گیا تو لوگوں میں یہ خیال جنم لینے لگا کہ رسول اللہ ﷺ کے لخت جگر کی وفات کی بنا پر سورج بے نور ہوا ہے۔ اس وقت آپ نے لوگوں کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے خطبہ دیا اور فرمایا: ''سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے انہیں گرہن نہیں لگتا جب تم یہ حالت دیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔'' [1]

سورج یا چاند کے گرہن کے وقت درج ذیل باتوں کا اہتمام کرنا چاہیے:

☆ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور تکبیر واذکار کا خاص اہتمام کیا جائے۔ ☆ صلوٰۃ کسوف کا اہتمام کیا جائے۔

☆ گرہن صاف ہونے تک نماز پڑھتے رہنا چاہیے۔ ☆ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں صدقہ خیرات کی جائے۔

یہ تمام باتیں احادیث سے ثابت ہیں [2]

باقی رہا حاملہ خواتین کے حمل ضائع ہونے کا اندیشہ، یہ خواتین کی طرف سے خود ساختہ پابندیاں ہیں، احادیث میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس قسم کی باتوں پر کان نہیں دھرنا چاہیے۔ یہ معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ عجیب بات ہے کہ جن باتوں کا گرہن کے وقت اہتمام کرنا چاہیے، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اور جن باتوں کا شریعت میں کوئی ذکر نہیں ہے، اس کی طرف بہت توجہ دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں دین سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔ آمین!

موبائل پر اجنبی عورت سے گفتگو کرنا

سوال موبائل فون دور حاضر کی کارآمد ایجاد ہے لیکن اس کا استعمال بہت غلط ہو رہا ہے، کالج کے طلباء موبائل پر نوجوان لڑکیوں سے گھنٹوں محو گفتگو رہتے ہیں، اس طرح گفتگو کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اجنبی اور غیر محرم لڑکی کے ساتھ ناز ونخرے کے انداز میں شہوت انگیز گفتگو کرنا جائز نہیں ہے، ایسی گفتگو موبائل پر ہو یا روبرو کی جائے، بالکل حرام اور ناجائز ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم پرہیز گاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے گفتگو نہ کرو مبادا جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے۔'' [3]

اللہ تعالیٰ نے جس طرح عورت کے وجود کے اندر مرد کے لئے جنسی کشش رکھی ہے، اسی طرح عورت کی آواز میں بھی فطری طور پر نرمی اور نزاکت رکھی ہے جو مرد کو اپنی طرف کھینچتی ہے اس لئے عورتوں کو آواز کے متعلق یہ ہدایت جاری کی گئی ہے۔ ہاں، اگر گفتگو کسی فتنہ کا پیش خیمہ نہ ہو تو ضرورت کے پیش نظر کسی سے بھی بقدر ضرورت گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور جب تم نبی کی بیویوں سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی یہی ہے۔'' [4] بہرحال نوجوان لڑکوں کا موبائل پر لڑکیوں سے گھنٹوں محو گفتگو رہنا مفاسد سے خالی نہیں، اس لئے شریعت کی رو سے ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحيح بخاري، الكسوف: ١٠٤٧۔
[2] صحيح بخاري، الكسوف: ١٠٤٤۔
[3] الاحزاب: ٣٢۔
[4] الاحزاب: ٥٧۔

ایک روایت کی تحقیق

سوال میرا یہ معمول ہے کہ میں فجر اور مغرب کی نماز کے بعد کسی سے ہم کلام ہونے سے پہلے یہ دُعا پڑھتا ہوں: ''اللهم اجرني من النار'' اے اللہ! مجھے آگ سے پناہ عطا فرما۔لیکن ہمارے امام مسجد نے مجھے بتایا ہے کہ اس حدیث کی سند کمزور ہے،آپ اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب مذکورہ دعا مولانا عطاء اللہ حنیف نے ''پیارے رسول کی پیاری دعائیں'' میں صبح وشام کے وقت کی دعائیں کے زیر عنوان چودھویں حدیث کے تحت لکھی ہے اور مشکوٰۃ المصابیح کا حوالہ دیا ہے،صاحب مشکوٰۃ نے ابوداؤد سے نقل کی ہے،اس پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے '' و إسناده ضعيف '' لکھا ہے،غالباً مذکورہ امام مسجد نے انہی الفاظ کو بنیاد بنا کر اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے،یہ روایت درج ذیل کتب حدیث میں مروی ہے: ☆ ابوداؤد،الصلوٰۃ:۵۰۷۹،☆ امام احمد ص ۲۳۴ ج ۴،☆ صحیح ابن حبان حدیث نمبر:۲۳۴۶۔اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ [1]

لیکن مسلم بن حارث رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا اس کا بیٹا حارث بن مسلم مجہول ہے،اس لئے یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ خود ہی فرماتے ہیں: اگرچہ ابن حبان نے اس روایت کو اپنی صحیح میں بیان کیا ہے لیکن دارقطنی نے اس کے راوی حارث بن مسلم کو مجہول قرار دیا ہے اور وہ اپنے باپ سے بیان کرنے میں منفرد ہے،اس لئے ابن حبان کا اسے صحیح کہنا بہت بعید ہے۔ [2]

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے،لہٰذا اس دعا کے بجائے کثرت کے ساتھ یہ دعا پڑھی جائے: '' اللهم أعوذبك من النار '' کیونکہ حدیث میں ہے جو شخص اللہ تعالیٰ سے آگ کی پناہ مانگتا ہے تو خود آگ کہتی ہے کہ اے اللہ! اسے آگ سے پناہ دے۔ [3] اس کی سند بھی صحیح ہے۔ (واللہ اعلم)

''اتفاقاً ایسا ہوا'' الفاظ کہنا

سوال ''اتفاقاً ایسا ہوا'' کیا اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں کیونکہ بظاہر یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے منافی معلوم ہوتے ہیں،وضاحت فرمائیں؟

جواب اگر کوئی چیز غیر شعوری اور غیر متوقع طور پر سامنے آجائے تو اس وقت ''اتفاقاً ایسا ہوا'' کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں،انسان کے حوالے سے کسی چیز کا اتفاقاً پیش آجانا تو امر واقع ہے،ایسے حالات میں ''اتفاق'' کے الفاظ استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔احادیث میں بکثرت اس طرح کے اتفاقات مروی ہیں جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ایسا مروی ہے: ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ آپ سے چکی پیسنے کی مشقت بیان کریں،کیونکہ آپ کو اطلاع ملی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غلام آئے ہیں،لیکن اتفاق سے ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ ہو سکی تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا....'' [4]

---

[1] نتائج الافکار ص ۳۱۰ ج ۲۔
[2] تہذیب ص ۱۱۳ ج ۱۰۔
[3] مسند امام احمد ص ۲۰۸ ج ۳۔
[4] صحیح بخاری، التفات: ۵۳۶۱۔

اس حدیث میں ایک اتفاق بیان ہوا ہے جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے پیش آیا لیکن اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے، اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے، اس کے ہاں کوئی چیز اتفاق سے پیش نہیں آتی۔ البتہ انسان کو کوئی چیز کسی وعدہ یا پیشگی اطلاع کے بغیر اتفاق سے پیش آسکتی ہے، اس بنا پر انسان کے حوالے سے اتفاق کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع اور سوء ادبی ہے۔

مسجد میں گمشدگی کا اعلان

سوال مسجد میں گم شدہ بچوں کا اعلان کرنا جائز ہے یا نہیں، والدین جو بچے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اگر مسجد میں اعلان کر دیا جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب مسجد میں کسی بھی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا شرعاً منع ہے کیونکہ مساجد اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں، اس طرح کے اعلانات عبادت کے منافی ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی کسی آدمی کو مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو اسے یوں جواب دے: اللہ کرے وہ چیز تجھے واپس نہ ملے۔ کیونکہ مساجد اس مقصد کے لئے نہیں بنائی گئیں۔ [1]

ایسے حالات میں والدین سے ہمدردی کرنے کی یہ صورت ہونا چاہیے کہ مسجد سے باہر کسی حجرہ میں الگ سپیکر کا انتظام کر دیا جائے جو اس طرح کے اعلانات کے لئے وقف ہو، بہر حال مساجد میں کسی قسم کی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا منع ہے۔ لہٰذا اسے ایک جذباتی مسئلہ بنانے کے بجائے اس امتناعی حکم پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

ہنی مون کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے مسلم معاشرہ میں ہنی مون پر بھاری سرمایہ خرچ کیا جاتا ہے، کیا شریعت میں اس کی کوئی گنجائش ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب شادی کی تقریبات میں اسراف وتبذیر کی اسلام اجازت نہیں دیتا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''فضول خرچی مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' [2]

اس سلسلہ میں ہنی مون کی رسم تو غیر مسلموں کی نقالی کرتے ہوئے منائی جاتی ہے جو انتہائی قابل نفرت اور برا عمل ہے، ہمارے اسلاف میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ انہوں نے اپنے علاقہ یا شہر سے باہر جا کر ہنی مون منایا ہو، ہاں اگر کوئی انسان شادی کر کے اپنی بیوی کے ساتھ عمرہ کی نیت سے حرمین شریفین کا سفر کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اس کے علاوہ دوسرے ممالک کا سفر کرنا کئی ایک مفاسد کا پیش خیمہ ہے، لہٰذا اس سے ایک مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح مسلم، المساجد: ٥٦٨۔ [2] الانعام: ١٤١۔

موت کی دُعا

سوال میرے پیٹ میں کینسر ہے، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے، آج کل بہت تکلیف کا شکار ہوں، بعض اوقات تنگ دل ہو کر اپنے اللہ سے فریاد کرتی ہوں کہ وہ میری زندگی کا خاتمہ کر دے، کیا ایسے مایوس کن حالات میں اللہ تعالیٰ سے اپنی موت کی دعا کی جا سکتی ہے؟

جواب ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی سے نوازے اور آپ کا خاتمہ ایمان پر کرے، کسی مصیبت کے پیش نظر موت کی آرزو کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے پیٹ میں زخم تھے، انہیں سات مرتبہ آگ سے داغ دیا گیا، پھر بھی آرام نہ آیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر رسول اللہ نے ایسے حالات میں موت کی دُعا کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو میں ضرور موت کے لئے اللہ سے دعا کرتا۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص بھی اس مصیبت کی وجہ سے جو اسے پہنچی ہے موت کی تمنا نہ کرے اگر اسے ضرور ہی کرنا ہے تو یوں کہہ لے: ''جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لئے موت بہتر ہو مجھے موت دے دینا۔ [2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ تم میں سے کوئی بھی موت کی آرزو نہ کرے کیونکہ اگر وہ نیک ہے تو شاید اس کی بقیہ زندگی نیکیوں میں اضافے کا باعث ہو اور اگر برا ہے تو شاید اسے توبہ کی توفیق مل جائے۔ [3]

ان احادیث کے پیش نظر کسی بھی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ موت کی دعا کرے یا موت کی آرزو کرے، ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ صبر کرے اور اللہ تعالیٰ سے حسن ثواب کی امید رکھے، حالات کی بہتری کے لئے درج ذیل حدیث کو سامنے رکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جان لیں کہ ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرنے میں بہت سی خیر و برکت ہے، یقیناً مدد، صبر کے ساتھ اور کشادگی مصیبت کے ساتھ وابستہ ہے، یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ [4]

ہر مصیبت زدہ شخص کو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کے مصائب و آلام اس کی گذشتہ خطاؤں کا کفارہ بن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تلقین کی ہے کہ ایسے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے پیغمبر! آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیں وہ لوگ جب انہیں کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں۔ ہم سب اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف لوٹنا ہے۔ [5]

جو انسان اپنی مشکلات کا حل، اپنی موت کو سمجھتا ہے اس کی یہ غلط فکر ہے کیونکہ بسا اوقات مرنے کے بعد اللہ کے ہاں عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے جو دنیا کے مصائب سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے، اس کے برعکس اگر انسان زندہ رہے تو شاید اللہ تعالیٰ اسے توبہ اور استغفار کی توفیق عطا کر دیتا اور یہ توفیق اس کے لئے قیامت کے دن خیر و برکت کا پیش خیمہ ہوتی، لہٰذا ہم آخر میں یہی کہتے ہیں کہ

---

[1] صحیح بخاری، الدعوات: ٦٣٥٠۔
[2] صحیح بخاری، المرضی: ٥٦٧١۔
[3] الصحیح، المرضی: ٥٦٧٣۔
[4] مسند امام احمد ص ٣٠٧ ج ١۔
[5] البقرة: ١٥٥۔١٥٦۔

بیماری اور مصیبت کے وقت صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ آسانی وابستہ ہے۔ [1]

معاشرتی مسئلہ

سوال ہم عورتیں بچوں کی صفائی کے وقت ان کے آگے یا پیچھے ہاتھ لگاتی ہیں، کیا ایسا کرنے سے ہمارا وضو ٹوٹ جائے گا، جب کہ پہلے سے وضو کر رکھا ہو، اس مسئلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: جس شخص نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا اسے چاہیے کہ وضو کرے۔ [2]

جبکہ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے وضو نہیں ٹوٹتا چنانچہ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے وضو کرنے کے بعد اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا تو آپ نے فرمایا: وہ تو اس کے جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔ [3]

ان دونوں احادیث کے پیش نظر اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق راجح بات یہ ہے کہ شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ کسی رکاوٹ کے بغیر ہاتھ لگایا جائے اگر کپڑے وغیرہ کی رکاوٹ کے ساتھ ہاتھ لگایا تو وضو نہیں ٹوٹتا جیسا کہ ایک روایت میں اس کی صراحت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی آدمی اپنی شرمگاہ کو بغیر کسی رکاوٹ کے ہاتھ لگائے تو اسے چاہیے کہ وضو کرے۔ [4]

صورت مسئولہ میں بچوں کی صفائی کے پیش نظر ان کی شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا کیونکہ بچے کی شرمگاہ، بہن کے لئے محل شہوت نہیں۔ نیز اگر بچے کی شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جائے تو یہ عام مصیبت بن جائے گی کیونکہ ان میں بہت تکلیف اور تنگی ہے۔ اگر یہ عمل نواقض وضو سے ہوتا تو صحابہ کرام اور تابعین عظام سے اس کی وضاحت ضرور منقول ہوتی، اس کے علاوہ حدیث کے الفاظ "ذَكَرَهُ یا فَرْجَهُ" وارد ہیں یعنی اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ بچے کی شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ (واللہ اعلم)

سفید لباس

سوال میں سفید لباس کو پسند اور اسے زیب تن کرتی ہوں، جب کہ مرد حضرات بھی سفید لباس کو پسند کرتے ہیں اور اسے پہنتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، کیا عورتوں کے لئے سفید لباس مردوں سے مشابہت کے ضمن میں آئے گا، اگر ایسا ہے تو کیا اس میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب شریعت اسلامیہ میں مردوں کو عورتوں اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ

---

[1] الانشراح: ٥-٦۔ [2] ابو داود، الطهارة: ١٨١۔

[3] مسند امام احمد ص ٢٣ ج٤۔ [4] مسند امام احمد ص ٣٣٣ ج٢۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں سے اور مردوں مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ❶

لباس کے متعلق خصوصیت کے ساتھ وعید آئی ہے کہ مردوں کو عورتوں کا اور عورتوں کو مردوں کا لباس زیب تن نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورت کا لباس پہنتا ہے اور ایسی عورت کو بھی ملعون قرار دیا ہے جو مردوں جیسا لباس پہنتی ہے۔ ❷

ان احادیث کے پیش نظر عورتوں کو کوئی بھی ایسی ادا اختیار کرنے کی اجازت نہیں جو مردوں کا شعار ہے اور اسی طرح عورتوں کو ایسی کوئی عادت اپنانے کی اجازت نہیں جو عادت مردوں کی علامت اور شعار ہے، اسی طرح کسی بھی عورت کے لئے مردوں کا مخصوص لباس اور کسی بھی مرد کے لئے عورتوں کا مخصوص لباس پہننا جائز نہیں ہے، لیکن اس امر کا جاننا بھی ضروری ہے کہ خصوصیت کا مفہوم کیا ہے؟ خصوصیت صرف رنگ میں نہیں بلکہ رنگ اور صفت دونوں کے مجموعے کا نام ہے، اس وضاحت کے پیش نظر عورت کے لئے سفید رنگ کا لباس پہننا تو جائز ہے لیکن لباس میں مردوں جیسی تراش خراش اور وضع قطع اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ یعنی جو لباس مردوں کا شعار ہے، اسے عورتوں کو پہننا جائز نہیں ہے، جب یہ ثابت ہو گیا کہ مردوں کے ساتھ مشابہ مخصوص لباس عورتوں پر حرام ہے تو اس قسم کے لباس میں نماز ادا کرنے کے متعلق اہل علم میں اختلاف ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے: ☆ اس قسم کے لباس میں عورت کی نماز درست نہیں کیونکہ واجب الستر اعضاء کا چھپانا شرائط نماز میں سے ہے اور ضروری ہے کہ ساتر لباس ایسا ہو جس کے پہنے کی اللہ نے اجازت دی ہے، اگر اللہ نے اس کی اجازت نہیں دی تو ایسا لباس شرعی طور پر ساتر نہیں ہوگا۔ ☆ اس قسم کے لباس میں نماز جائز ہے کیونکہ ستر تو حاصل ہو چکا ہے جب کہ اس طرح کا لباس پہننے سے گناہ ضرور ہوگا اور گناہ کا معاملہ نماز سے خارج ہے اور یہ گناہ نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق حرام لباس زیب تن کر کے نماز پڑھنے والا نمازی اس خطرے سے تو دو چار رہے گا کہ اس کی نماز رد کر دی جائے اور شاید وہ شرف قبولیت سے محروم رہے، اس لئے ناجائز لباس میں نماز ادا کرنے سے گریز کرنا ہی بہتر ہے اگرچہ فقہی اعتبار سے شاید فرض کی ادائیگی ہو جائے۔ (واللہ اعلم)

حضرت خالد بن ولیدؓ کی ٹوپی میں متبرک بال

سوال یہ واقعہ مشہور ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال رکھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے انہیں ہر میدان میں فتح ہوتی تھی، اس کی وضاحت درکار ہے؟

جواب ہمارے خطباء حضرات اپنی تقاریر میں یہ واقعہ بکثرت بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ یرموک ہوئی تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی وہاں گم ہو گئی، تلاش بسیار کے بعد وہ مل گئی، جس سے آپ کو اطمینان اور سکون میسر آیا، آپ کے ساتھیوں نے اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمرہ کیا تو اپنے بال منڈوائے، اس وقت لوگوں نے آپ کے موئے مبارک لینے کے لئے جلدی کی، میں نے آپ کی پیشانی کے بال حاصل کر لئے پھر میں نے ان بالوں کو اس ٹوپی میں رکھ دیا۔

---

❶ صحیح بخاری، اللباس: ۵۸۸۵۔ ❷ ابو داود، اللباس: ۴۰۹۸۔

ہر میدان جنگ میں اس ٹوپی کو پہن لیتا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے مجھے فتح ونصرت سے ہمکنار کرتا ہے۔'' ❶

لیکن یہ واقعہ محدثین کرام کے قائم کردہ معیار صحت پر پورا نہیں اترتا، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی جعفر بن عبداللہ بن حکم ہے جو خود تو ثقہ ہے لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے اس کی ملاقات ثابت نہیں ہے، اگرچہ کچھ محدثین نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے لیکن اس کی سند منقطع ہے جیسا کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے۔ ❷

علامہ ہیثمی نے بھی اس کے منقطع ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، آپ فرماتے ہیں: اس روایت کو امام طبرانی اور ابو یعلی نے بیان کیا ہے اور اس کے راوی بھی ''صحیح'' کے راوی ہیں، اس کے علاوہ جعفر کا متعدد صحابہ کرام سے سماع بھی ثابت ہے لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے حضرت خالد بن ولید سے سنا ہے یا نہیں۔ ❸

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کو سننا تو درکنار بلکہ ان کا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زندگی میں پیدا ہونا بھی ثابت نہیں، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ۲۲ ہجری کے لگ بھگ فوت ہوئے تھے، جو صحابہ کرام دیر سے فوت ہوئے ہیں، اگرچہ ان سے اس کا سماع ثابت ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے بھی ملاقات کی ہے یا ان سے کچھ احادیث سنی ہیں۔

بہرحال یہ روایت منقطع ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں، ہم کراماتِ اولیاء کے قائل ہیں لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مذکورہ کرامت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے اگرچہ ہمارے خطباء حضرات اسے بڑی شد ومد سے بیان کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

سعودی عرب کے قومی دن پر ایک پیغام

سوال سعودی عرب کے ''الیوم الوطنی'' کے موقع پر آپ پاکستانی قوم کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں تو اس کی وضاحت کریں؟

جواب عالم اسلام میں صرف دو حکومتیں ایسی ہیں جو ایک نظریے کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں، ان کا تعلق جغرافیائی حدود و قیود سے نہیں ہے، پہلی حکومت جو نظریہ توحید پر قائم ہوئی وہ حکومت سعودیہ ہے، آج تک یہ حکومت توحید اور اس کے تقاضوں کو پورا کررہی ہے، اس کے متعلق کسی قسم کی مداہنت یا مفاہمت نہیں کی گئی، اللہ تعالیٰ نے توحید کے تحفظ کے پیش نظر اسے ہر قسم کے دنیاوی وسائل سے مالا مال کررکھا ہے۔ دوسری حکومت جو ایک نظریہ کی مرہون منت ہے وہ حکومت پاکستان ہے، اس کی بنیاد بھی لا الہ الا اللہ ہے، یہ فقرہ تو زبان زد خاص وعام ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ''، لیکن ہمیں بدقسمتی سے ایسے حکمران ملے ہیں جنہیں ذاتی مفادات اور اقربا نوازی کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لئے فرصت نہیں ہے۔ ملک بھر میں کفر وشرک کے اڈے موجود ہیں، فحاشی اور بے حیائی کھلے بندوں ہوتی ہے لیکن اس کی روک تھام کے لئے ہمارے ہاں کوئی قانون نہیں ہے جبکہ حکومت سعودیہ آج بھی اپنے نظریہ توحید پر قائم ہے اور توحید کے تحفظ کے لئے ہر قسم کی قربانی دیتی ہے، اس حکومت کو عوام سے کس قدر ہمدردی ہے، صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

---

❶ مستدرک حاکم ص ۲۹۹ ج۳۔ ❷ مستدرک حاکم ص ۲۹۹ ج ۳۔ ❸ مجمع الزوائد ص ۳۴۹ ج۹۔

1974ء کی بات ہے کہ میرا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں ہوا، سالانہ تعطیلات میں پاکستان آنے کی بجائے میں نے وہاں رہنے کا پروگرام بنایا، تین ماہ چھٹیوں کا وظیفہ مبلغ پندرہ سو ریال جیب میں ڈال کر عمرہ کی ادائیگی کے لئے مکہ مکرمہ آیا، دوران طواف کسی نے میرا وظیفہ چرالیا، اس پر مجھے بہت پریشانی ہوئی، اس وقت شاہ فہد مرحوم مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے، میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں انہیں خط لکھا: ''میں مدینہ یونیورسٹی کا ایک طالب علم ہوں اور دوران طواف کسی نے میرے مبلغ پندرہ سو ریال چرا لیے ہے، اگر آپ ہمارا تحفظ نہیں کر سکتے تو اس عہدے پر فائز رہنے کا چنداں فائدہ نہیں ہے۔ والسلام''

خط لکھنے کے دس دن بعد میں واپس مدینہ طیبہ گیا تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں ہر روز ایک ہرکارہ آتا ہے اور آپ کے متعلق پوچھ کر چلا جاتا ہے، اگلے دن میں نائب رئیس کے دفتر میں گیا تو وہ میرے انتظار میں تھے، انہوں شاہ فہد کی طرف سے آیا ہوا پندرہ سو ریال کا چیک دیا اور یونیورسٹی کی طرف سے ایک شکریے کے خط پر دستخط لئے اور کہا کہ مدینہ طیبہ کے کسی بھی بینک میں جا کر مبلغ پندرہ سو ریال وصول کر سکتے ہیں۔ میں نے آتے ہی بنک میں چیک جمع کرایا اور اسی وقت مذکورہ رقم وصول کر لی۔

اس طرح یہ حکومت آج تک اپنے نظریے توحید پر قائم ہے اور اسے کسی بھی موقع پر اپنے مفادات کے لئے استعمال نہیں کرتی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے:

جب عراق نے سعودیہ کے دارالحکومت ریاض پر حملہ کیا تو اس وقت پاکستانی عوام ایک عجیب وغریب کیفیت سے دوچار ہوئے، ہر جگہ عراق کی حمایت میں سعودیہ کے خلاف جلوس نکلنا شروع ہوئے ہم چونکہ وزارت اوقاف سعودی عرب کی طرف سے پاکستان میں بحیثیت داعی اور مبلغ مبعوث ہیں، اس لئے ہم نے سعودیہ کے موقف کی تائید میں اپنے جذبات سے اپنے ڈائریکٹر شیخ عبدالعزیز العتیق حفظہ اللہ کو آگاہ کیا۔ انہوں نے ہمارے جذبات وزارت اوقاف کو پہنچائے تو درج ذیل جواب آیا: ''وزارت نے آپ حضرات کی تعیناتی توحید کی آبیاری کے لئے ہے، آپ اپنا کام خلوص نیت سے جاری رکھیں، ہمارے دفاع یا ہماری تائید کے لئے ہم آپ کو گلی کوچوں میں نکلنے کی اجازت نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ والسلام

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت سعودیہ کو اپنے اللہ پر کس قدر یقین محکم ہے، وہ توحید کی ترویج واشاعت کے لئے جو خرچ کرتی ہے اس کے عوض اپنا دفاع یا اپنی تائید اسے قطعاً ناپسند ہے اس حوالے ہم اپنے قارئین کرام کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ ممکن حد تک حکومت سعودیہ کی تائید کرتے رہیں اور اس کے لئے دعاؤں کا سلسلہ بھی جاری رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اسے قائم و دائم رکھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کچھ شر پسند عناصر حکومت سعودیہ کے خلاف سرگرم عمل ہیں اور حرمین شریفین کو کھلا علاقہ قرار دینے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، تاکہ وہ وہاں اپنی مرضی سے بدعات، خرافات کو رواج دے سکیں، ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیں گے۔ ان شاء اللہ

درازی عمر کی دعا

سوال اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ رکھے یا اللہ تعالیٰ آپ کی عمر طویل کرے، اس طرح کی دیگر دعائیں شرعاً کیا حیثیت رکھتی ہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کسی کو دعا دینے کے آداب سکھائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ دعا کرنے میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مذکورہ پہلی دعا اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حد سے تجاوز کرنا ہے کیونکہ دنیا میں دوام اور ہمیشگی محال ہے۔ ہمیشہ رہنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یہ کسی اور کے لئے نہیں مانگی جاسکتی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو کچھ زمین میں ہے، سب نے فنا ہونا ہے، صرف تمہارے رب کے چہرے کو بقا ہے جو صاحب جلال وعظمت ہے۔'' ❶

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے خطاب فرمایا: ''اے پیغمبر ﷺ! ہم نے آپ سے پہلے کسی آدمی کو بقاء اور دوام نہیں بخشا، اگر آپ فوت ہو جائیں تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔'' ❷

ان تصریحات کی وجہ سے کسی کے لئے ہمیشہ رہنے کی دعا نہیں کرنی چاہیے، اسی طرح کسی کو یہ دعا دینا کہ اللہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے، یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ طول وبقا اچھی اور بری دونوں ممکن ہیں۔ وہ انسان انتہائی برا ہے جس کی عمر طویل ہو لیکن کردار انتہائی گندا ہو، اگر اس میں خیر وبرکت کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے تو اس میں چنداں حرج نہیں مثلاً یوں کہا جائے: ''اللہ خیر وبرکت کے ساتھ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے یا اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی اطاعت وفرمانبرداری میں دراز عمر عطا کرے۔'' بہر حال کسی کے لئے بھلائی کی دعا کرنی چاہیے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس کے لئے وہی کچھ مانگتا ہے جو یہ دوسرے انسان کے لئے اللہ سے طلب کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بگلے کی حلت

سوال سفید رنگ کا بگلا جو فصلوں میں عام دیکھا جاتا ہے جب انہیں پانی دیا گیا ہو، قرآن وحدیث میں اس کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق کیا وارد ہے؟

جواب اصل کے اعتبار سے ہر چیز حلال ہے اور حرام صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہو اور جس سے انہوں نے خاموشی اختیار کی ہو وہ بھی معاف ہے چنانچہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے وہ ان اشیاء سے ہے جن سے اس نے درگذر فرما دیا ہے۔ ❸

''نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ نبی ان کے لئے پاکیزہ اشیاء حلال قرار دیتا ہے اور خبیث اشیاء ان پر حرام کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ غیر خبیث اشیاء پاکیزہ اور حلال ہیں نیز حدیث بالا کے مطابق جس چیز کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے وہ بھی قابل معافی ہے، ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر رحمت کرتے ہوئے کچھ چیزوں سے خاموشی اختیار کی ہے لہٰذا تم ان کی کرید نہ کرو۔ ❹

اشیاء کی خباثت کو مندرجہ ذیل امور سے معلوم کیا جاسکتا ہے:

---

❶ الرحمٰن: ۲۶۔۲۷۔ ❷ الانبیاء: ۳۴۔ ❸ ابن ماجه، الاطعمه: ۳۳۶۷۔
❹ الاعراف: ۱۵۷۔ ❺ دارقطنی ص ۱۸۳ ج ٤۔

☆ شریعت میں اس کی حرمت کے متعلق نص موجود ہو، مثلاً گھریلو گدھے۔ ☆ جن جانوروں کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے مثلاً چوہا، سانپ اور چیل وغیرہ۔ ☆ جن جانوروں کو مارنے سے منع کیا گیا ہو مثلاً بلی وغیرہ۔ ☆ جو چیز انسان کے لئے جسمانی طور پر ضرر رساں ہو مثلاً زہر۔ ☆ جو چیز عقل کو نقصان پہنچاتی ہو جیسے تمام نشہ آور اشیاء شراب وغیرہ۔ ☆ جو جانور مردار کھاتا ہو جیسے گدھ وغیرہ۔ ☆ جسے ناجائز طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو مثلاً غیر اللہ کے لئے ذبح کردہ یا کافر کا ذبح کردہ۔ ہر کچلی والا جانور اور ہر چنگال والا پرندہ۔

مذکورہ بالا امور کی روشنی میں جب بگلے کو دیکھا جاتا ہے تو وہ ان میں سے کسی کی زد میں نہیں آتا، وہ ایک پرندہ ہے پنجے سے شکار کر کے اپنے پنجے میں پکڑ کر نہیں کھاتا، وہ صرف فصلوں سے نکلنے والے حشرات کو کھاتا ہے، اس لئے اسے حلال قرار دیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس کی حرمت کے متعلق کوئی واضح دلیل موجود نہیں، اس لئے اصل کے اعتبار سے بھی حلال معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ ایسی اشیاء سے ہے جن کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے لہٰذا یہ حلال ہے۔ (واللہ اعلم)

کرسمس ڈے

سوال کرسمس کے موقع پر عیسائیوں کو تحائف وغیرہ دینے کی شرعاً گنجائش ہے یا نہیں ایسے موقع پر کچھ نہ دیا جائے، جب کہ وہ ہمیں اسلامی تہوار کے موقع پر تحائف دیتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب مشرکین اور کفار کی دو اقسام ہیں: ① جو کھلے بندوں مسلمانوں سے دشمنی کرتے ہیں، ② جو کفر و شرک پر رہتے ہوئے مسلمانوں سے دشمنی نہیں کرتے۔

سورۂ ممتحنہ آیت ۸، ۹ میں ان دونوں اقسام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو کافر اور مشرک خواہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہوں، مسلمانوں سے کھلے طور پر دشمنی رکھتے ہیں۔ انہیں تحائف دینا یا ان سے تحائف لینا شرعاً جائز نہیں کیونکہ ان تحائف سے محبت اور تعلق و خاطر کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور ایسے کفار و مشرکین سے دوستی اور موالات سے منع کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری قسم کے کفار و مشرکین سے حسن سلوک اور رواداری کرنے کی اجازت ہے، انہیں تحائف دیئے جا سکتے ہیں اور ان سے تحائف لینے کی بھی اجازت ہے جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے:

☆ فردہ جذامی نے رسول اللہ ﷺ کو ایک خچر بطور ہدیہ دیا تھا اور آپ نے حنین کے دن اس پر سواری کی تھی۔ [1]

☆ دومۃ الجندل کے سردار نے رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی جبہ بطور ہدیہ دیا تھا جسے آپ نے قبول فرمایا۔ [2]

☆ غزوہ خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے زہر آلود بکری بطور ہدیہ دی تھی جو بطور دعوت پیش کی گئی، آپ نے اس دعوت کو قبول فرمایا۔ [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایران کے بادشاہ نے رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ بھیجا تو آپ نے اسے قبول فرمایا، روم کے

---

[1] صحیح مسلم، الجهاد والسير: ۱۷۷۵۔ [2] صحیح بخاری، الهبة: ۲٦۱۵۔

[3] صحیح بخاری، الهبة: ۲٦۱۷۔

بادشاہ نے آپ کو تحفہ بھیجا تو آپ نے اسے بھی قبول فرمایا، اسی طرح مختلف بادشاہوں نے آپ کو تحائف بھیجے اور آپ نے ان سب کو قبول فرمایا۔ ❶

صورت مسئولہ میں کرسمس کے موقع پر عیسائیوں کو کوئی تحفہ دینا ان کے تہوار میں شریک ہونا ہے، ایسی حالت میں انہیں کوئی تحفہ نہ دیا جائے تاکہ انہیں اپنے باطل مذہب پر قائم رہنے کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور نہ ان سے تحائف لینے چاہئیں۔ چونکہ ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے مشرکین کی میل کچیل سے منع کیا گیا ہے، آپ نے یہ اس وقت فرمایا تھا جب عیاض بن حماد رضی اللہ عنہ نے حالت شرک میں آپ کو ایک اونٹنی بطور ہدیہ دینے کی پیش کش کی تھی۔ ❷

ہمارے نزدیک مذکورہ احادیث میں تطبیق کی یہ صورت معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کا ہدیہ قبول کرنے سے انکار کیا جو اپنے ہدیے کے ذریعے محض دوستی اور اظہار محبت چاہتا تھا اور آپ نے ان لوگوں کے ہدیے قبول فرمائے جن سے امید تھی کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں گے اور ان کے دلوں میں اسلام کی محبت و الفت اتر جائے گی، ان کے قومی تہوار کے موقع پر انہیں ہدیہ دینا یا اپنے قومی تہوار کے موقع پر غیر مسلم حضرات کے ہدایا قبول کرتے وقت مذکورہ بالا امر کو ضرور ملحوظ رکھا جائے، بہرحال ہم اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ قومی تہوار کے علاوہ دنوں میں تحائف کا تبادلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ محض اظہار محبت مقصود نہ ہو بلکہ انہیں اسلام سے مانوس کرنا پیش نظر ہو۔ (واللہ اعلم)

سیر و تفریح کے لیے غیر مسلم ممالک کا سفر

سوال اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہم مسلمان سیر و تفریح کے لئے کسی کافر ملک کا انتخاب کرتے ہیں کیا سیر و سیاحت کے لئے ایسے ممالک میں جانا جائز ہے جہاں غیر مسلم لوگوں کی حکومت ہو؟

جواب کفار کے ممالک کی طرف بوقت ضرورت سفر کرنا جائز ہے، لیکن اس کے لئے تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو حسب ذیل ہیں:

☆ اس کے پاس شرعی علم اس قدر ہو کہ وہ کفار کے شکوک و شبہات کا شافی جواب دے سکے۔

☆ اس پر دینی رنگ اس قدر غالب ہو کہ غیر مسلم لوگوں کی تہذیب سے متاثر نہ ہو سکے۔

☆ اسے سفر کرنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو جو اسلامی ممالک میں پوری نہ ہو سکتی ہو۔

اگر مذکورہ شرائط کسی میں نہیں پائی جاتی تو اسے غیر مسلم ممالک کا سفر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس میں اس کے اخلاق و کردار کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے، ہاں اگر علاج یا تعلیم وغیرہ کے حصول کے لئے غیر مسلم ممالک میں جانا ہے جو اپنے ملک میں حاصل نہ ہو سکتی ہو تو مذکورہ شرائط کے ساتھ سفر کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، جہاں تک سیر و تفریح اور سیاحت کا تعلق ہے، اس کے لئے مسلم ممالک میں بہت سے تفریحی مقامات ہیں جنہیں دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا اگر انسان کے پاس فرصت کے لمحات میسر ہوں اور وہ سیر و سیاحت کا شوق پورا کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے مسلم ممالک کا رخ کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ ترمذی، السیر: ۱۵۷۲۔ ❷ ابو داود، الخراج: ۲۶۳۰۔

سالگرہ منانا اور کیک کاٹنا

سوال بچے کی پیدائش کے بعد جب اس کی ولادت کا دن دوبارہ آتا ہے تو سالگرہ منائی جاتی ہے، اس موقع پر سالگرہ کا کیک کاٹا جاتا ہے اور تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے، خوشی و مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کے متعلق شرعی حیثیت واضح کریں؟

جواب اہل اسلام کے ہاں اس انداز سے سالگرہ منانا مستحسن امر نہیں ہے، یہ سالگرہ جواز کی نسبت بدعت کے زیادہ قریب ہے، مغربی لوگ اس طرح سے سالگرہ مناتے ہیں اور کیک وغیرہ کاٹتے ہیں۔ مسلمان کو ایسے مواقع پر اہل مغرب کی مخالفت کا حکم ہے، اگر کوئی اس کا اہتمام ثواب سمجھ کر کرتا ہے تو اس کے ناجائز ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں کی ولادت یا آئندہ یوم ولادت کے موقع پر ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بچے کی ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کرنے کا حکم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بھی بچوں کی پیدائش ہوتی تھی انہوں نے آئندہ یوم ولادت کے وقت سالگرہ منانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا، لہٰذا ہمیں بھی ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے جنہیں رسول اللہ ﷺ کے بعد تین افضل صدیوں میں نہیں کیا گیا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔'' [1]

ایک حدیث بایں الفاظ منقول ہے: ''جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہ ہو تو وہ بھی مردود ہے۔'' [2]

بہر حال بچوں کی سالگرہ کو اگر دینی رنگ نہ بھی دیا جائے تو بھی مغربی تہذیب سے تعلق کی بناء پر اسے اختیار کرنا اور اس کے متعلق خصوصی اہتمام کرنا ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

کہانت اور جادو کی حقیقت

سوال جادو اور کہانت کیا چیز ہیں، اس سے کام لینا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب لغوی طور پر ہر اس چیز کو جادو کہا جاتا ہے جس کا سبب اور تاثیر مخفی ہو اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو، اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ غیر شرعی تعویذات اور دم جھاڑ ہے جو عقل و جسم پر اثر انداز ہو اور محبت و نفرت کا باعث ہو۔ جادو کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے بلکہ اس کا مرتکب کافر اور دین اسلام سے خارج ہے کیونکہ اس میں شیاطین کا بہت عمل دخل ہوتا ہے، لہٰذا اسے کسی صورت میں اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح کہانت کا لغوی معنی اندازہ لگانا ہے، اصطلاحی طور پر ایسے امور کے ذریعے سے حقیقت تلاش کرنا جن کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ اسے بطور پیشہ کرتے تھے، ان کا براہ راست شیاطین سے رابطہ ہوتا تھا، وہ شیاطین کی باتوں میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے دوسروں سے بات کرتے تھے ہمارے رجحان کے مطابق کاہن وہ ہے جو لوگوں کو امور غیب سے مطلع کرنے کا دعویدار ہو، ہمارے ہاں اس کی کئی صورتیں رائج ہیں مثلاً:

☆ کسی نابالغ بچے کو سامنے بٹھا کر اس کے ناخن پر سیاہی لگا دیتے ہیں پھر اس میں مختلف شکلیں دکھانے کا دعویٰ کر کے لوگوں کو فریب دیا جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، الصلح: ۲۶۹۷۔ [2] صحیح مسلم، الاقضیہ: ۱۷۱۸۔

☆ مریض کے کسی کپڑے کی پیمائش کی جاتی ہے، پھر اس کے کم وبیش ہونے کی صورت میں بیماری، آسیب یا سایہ وغیرہ سے مطلع کیا جاتا ہے۔

☆ پانی دم کرکے پلایا جاتا ہے پھر اس کے ذائقہ کی تبدیلی کے بہانے مختلف بیماریوں یا جن بھوت کے اثر انداز ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

☆ کسی پرندے یا طوطے وغیرہ سے پرچی نکالی جاتی ہے پھر اس پر تحریر شدہ عبارت کی روشنی میں متاثرہ لوگوں کی قسمت بتائی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے رجحان کے مطابق ان کے پاس جانے کی تین صورتیں ہیں:

☆ کاہن کے پاس جاکر اس سے مختلف سوالات کرنا مگر اس کی باتوں کی تصدیق نہ کرنا، ایسا کرنا بھی حرام اور ناجائز ہے، کیونکہ ایسا کرنا چالیس دن کی نمازوں سے محرومی کا باعث ہے جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی کاہن کے پاس گیا اور اس سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا تو اس کی چالیس رات کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔'' [1]

☆ دوسری صورت میں یہ ہے کہ انسان کسی کاہن کے پاس جائے اور اس سے اپنی قسمت کے متعلق سوالات کرے پھر اسے سچا بھی خیال کرے، ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اس نے کاہن کے دعویٰ غیب دانی کی تصدیق کی ہے اور یہ کفر ہے۔ حدیث میں ہے: ''جو شخص کسی کاہن کے پاس جائے تو اس نے ان تعلیمات کا انکار کردیا جو حضرت محمد ﷺ پر نازل کی گئی ہیں۔'' [2]

☆ تیسری قسم یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کاہن کے پاس جائے اور اس سے اس بنا پر سوال کرے کہ لوگوں سے اس کی بے بسی اور لاچارگی بیان کی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ یہ شعبدہ بازی اور ملمع سازی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ ابن صیاد کے پاس گئے تھے اور اس سے سوالات بھی کئے تھے تو آپ نے فرمایا تھا کہ تو ذلیل ورسوا ہو جا، تو اپنی حیثیت سے آگے نہیں بڑھے گا۔ [3] اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال کاہن کے پاس جانا اس سے اپنی قسمت کے متعلق سوال کرنا پھر اسے سچا خیال کرنا بہت بڑا گناہ ہے، انسان ایسا کرنے سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں محفوظ رکھے۔

قیامت کے دن کس نام سے پکار جائے گا؟

سوال ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر پردہ پوشی کرے، اس حدیث کی وضاحت کریں؟

جواب سوال میں ذکر کردہ حدیث موضوع اور خود ساختہ ہے جیسا کہ علامہ سیوطی نے لکھا ہے کیونکہ اس کی سند میں

---

[1] صحیح مسلم، السلام: ۲۲۳۰۔ [2] ابن ماجه، الطهارة: ٦٣٩۔

[3] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۳۵٤۔

ابوحذیفہ اسحاق بن بشیر نامی راوی متروک ہے۔ ❶

اس راوی کے متعلق ابن حبان لکھتے ہیں کہ یہ ثقہ راویوں کے نام پر احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ ❷

ایک روایت میں امہاتہم کے الفاظ کے بجائے اسمائھم کے الفاظ ہیں۔ ❸

اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو قیامت کے دن ان کے ناموں سے ہی آواز دی جائے گی۔ بہر حال روایت کے الفاظ اسمائھم ہوں یا امہاتہم، یہ موضوع اور بناوٹی ہیں، جب دنیا میں کسی کو پکارا جاتا ہے تو اسے باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو قیامت کے دن اسی قانون کے مطابق آواز دی جائے گی، کسی انسان کی غلط کاری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے قانون کو تبدیل نہیں کرے گا، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''باب ما یدعی الناس بآبائهم'' ❹ ''لوگوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا جائے پھر اس عنوان کو ثابت کرنے کے لئے ایک حدیث پیش کی ہے جسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن غداری کرنے والے کے لئے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں کے بیٹے فلاں کی غداری ہے۔'' ❺

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کے نام سے آواز دی جائے گی، صرف حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ (واللہ اعلم)

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی ہیں؟

سوال ہمارے ہاں کچھ لوگ پرپیگنڈہ کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی نہیں تھے، کیا ایسا ہی ہے؟ احادیث سے ثابت کریں کہ واقعی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وحی لکھا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کام پر مامور کیا تھا؟

جواب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بے شمار فضائل ومناقب احادیث میں مروی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وحی لکھنے پر مامور تھے، اس کا ذکر کئی ایک احادیث میں ہے، ہم صرف ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں بچوں کے ہمراہ کھیل رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لائے، میرے دل میں خیال آیا کہ آپ مجھے بلانے کے لئے آئے ہیں، میں دروازے کی اوٹ میں چھپ گیا، آپ نے مجھے وہاں سے کھینچا اور فرمایا: ''جاؤ اور معاویہ کو بلا لاؤ۔ اور وہ وحی لکھا کرتے تھے۔'' ❻

اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وحی لکھا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس کام پر مامور کیا تھا۔ (واللہ اعلم)

---

❶ اللالی المصنوعه ص ٤٤٩ ج٢۔
❷ المجروحین ص ١٣٥ ج١۔
❸ مجمع الزوائد ص ٥٣٩ ج١٠۔
❹ صحیح بخاری، الادب: باب نمبر ٩٩۔
❺ صحیح بخاری، الادب: ٦١٧٧۔
❻ دلائل النبوۃ ص ٢٤٣ ج٦۔

سورۃ یٰسین قرآن کا دل ہے؟

سوال ایک عالم دین نے دوران خطبہ سورۃ یٰسین کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سورت قرآن مجید کا دل ہے، اس کی تحقیق درکار ہے؟

جواب فضائل قرآن کے سلسلہ میں بعض روایات ہمارے ہاں بہت مشہور ہیں لیکن استنادی طور پر ان کی حیثیت بہت کمزور ہے، اس لئے ہمارے خطباء کو چاہیے کہ وہ صحیح روایات سے فضائل و احکام بیان کریں۔

سورۃ یٰسین کے فضائل میں درج ذیل حدیث بیان کی جاتی ہے: ''ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل سورۃ یٰسین ہے جو شخص ایک مرتبہ سورۃ یٰسین پڑھتا ہے تو اس کی قرأت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے لئے دس مرتبہ قرآن پڑھنے کا ثواب لکھ دیتا ہے۔'' [1]

یہ روایت ہارون ابو محمد کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ خود ہی اس روایت کے بعد فرماتے ہیں: ''ہارون ابو محمد ایک مجہول شخص ہے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ [2]

سورۃ یٰسین کے فضائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا درج ذیل قول صحیح ہے، آپ فرماتے ہیں: ''جو شخص صبح کے وقت پڑھے تو اسے شام تک آسانی ہوگی اور جو شخص رات کے وقت اس کی تلاوت کرے تو اسے صبح تک سہولت میسر ہوگی۔'' [3]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص رات دن سورۃ یٰسین پڑھنے کا معمول اختیار کرتا ہے تو اس کی زندگی آرام و راحت اور سہولت سے گزرے گی، یقیناً جو شخص اس کے معانی پر غور و فکر کرے گا، اس کے ایمان میں اضافہ ہوگا، اس کا اللہ پر اعتماد اور یقین بڑھے گا جو دنیا میں آرام و سکون کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو دنیا میں آرام و سکون عطا فرمائے۔ آمین!

حافظ قرآن اور رشتہ داروں کی سفارش

سوال ہمارے ہاں حفظ قرآن کی ایک تقریب میں کہا گیا کہ حافظ قرآن قیامت کے دن اپنے رشتے داروں کی سفارش کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی۔ اس روایت کے متعلق وضاحت درکار ہے، اولین فرصت میں جواب دیں؟

جواب ہمارے واعظین کا معاملہ بہت عجیب ہے، وہ دوران وعظ ضعیف اور موضوع روایات کو بڑے مزے سے بیان کرتے ہیں اور ان کے نتائج سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ مذکورہ سوال میں جس روایت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ بھی اسی طرح کی ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن پڑھا اور اسے یاد کر لیا، اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا اور اس کے اہل خانہ کے متعلق اس کی سفارش قبول کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی۔'' [4]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔ (حدیث نمبر ۲۹۰۵) آپ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث غریب ہے، اس کی کوئی سند صحیح نہیں کیونکہ اس میں ایک راوی حفص بن سلیمان ابو عمر البزار کوفی ہے، جسے حدیث میں ضعیف سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] ترمذی، فضائل القرآن: ۲۸۸۷۔ [2] الضعیفہ ص ۳۱۲ ج ۱۔
[3] دارمی ص ۴۸۷ ج ۱۔ [4] مسند امام احمد ص ۱۴۸ ج ۱۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ محدثین نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ ❶

اسی طرح دور حاضر کے عظیم محدث علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعیف الترغیب ص ۴۳۲ ج ۱)

بہر حال یہ روایت سخت ضعیف ہے، ہمارے واعظین کو چاہیے کہ اس قسم کی کمزور روایات بیان کرنے سے اجتناب کیا کریں۔ (واللہ اعلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ

سوال ربیع اول کے مہینہ میں کچھ علماء کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ آپکا سایہ نہیں تھا، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں، کیا کتاب وسنت میں آپ کا سایہ ہونے یا نہ ہونے کا کوئی صریح حوالہ ملتا ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے جو بھی چیز پیدا کی ہے، اس کا سایہ قرآن مجید سے ثابت ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''کیا انہوں نے اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ اس کا سایہ دائیں بائیں جھکتا ہے اور وہ اللہ کے حضور سر بسجود ہو کر اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔'' ❷

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کا سایہ ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا عرش بھی اللہ کی مخلوق ہے، اس کا سایہ بھی ہے، جس کا احادیث میں ذکر ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اس لئے آپ کا بھی سایہ ہے، اس بات کی مزید وضاحت درج ذیل احادیث سے ہوتی ہے:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک سفر میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ چلنے سے عاجز آ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تم اپنا ایک فالتو اونٹ، صفیہ کو دے دو، انہوں نے ذرا نامناسب انداز میں جواب دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتی طور پر ان سے بات چیت ختم کر دی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب اس ''خاموش احتجاج'' پر دو تین ماہ گزر گئے اور میں آپ سے مایوس ہو گئی تو ایک دن اچانک دوپہر کے وقت میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ دیکھا، آپ اس وقت میرے گھر تشریف لائے۔ ❸

اس حدیث میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اس کا مشاہدہ فرمایا، اس واقعہ کی مزید وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بائیکاٹ کا یہ واقعہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیش آیا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب قطع کلامی پر ذوالحجہ محرم اور صفر کا مہینہ گزر گیا پھر ربیع الاول کا مہینہ آیا اور میں آپ سے مایوس ہو گئی تو میں نے اچانک اپنے گھر میں کسی کا سایہ دیکھا، میں نے دل میں سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو مجھ سے ناراض ہیں اور یہ سایہ کسی آدمی کا ہو سکتا ہے، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ❹

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھ پر آگ پیش کی گئی جو

---

❶ کتاب الضعفاء۔ ❷ النحل: ۴۸۔

❸ مسند امام احمد ص ۱۳۲ ج ۶۔ ❹ مسند امام احمد ۳۳۸ ج ۶۔

میرے اور تمہارے درمیان تھی، حتیٰ کہ میں نے اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا۔'' ❶

ان تینوں احادیث میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ تھا جس کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا تھا۔لٰہذا یہ سب بے سروپا باتیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہیں تھا کسی صحیح حدیث میں اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

رات کی آخری تہائی

سوال احادیث میں رات کی آخری تہائی کی فضیلت آئی ہے، اس کی تعیین گھنٹوں میں کیسے ہو سکتی ہے، اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں؟

جواب شرعی اعتبار سے رات، غروب آفتاب سے شروع ہوتی ہے اور طلوع فجر تک رہتی ہے، طلوع فجر کے بعد رات ختم ہو جاتی ہے، چونکہ رات کا درانیہ مختلف ہوتا ہے اس لئے گھنٹوں میں اس کی تعیین ممکن نہیں، البتہ اس کی پہچان ہر انسان کے لئے ممکن ہے، وہ اس طرح کہ غروب آفتاب کے بعد طلوع فجر تک کے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، پہلے دو حصے چھوڑ کر آخری حصہ وہ رات کی آخری تہائی ہے، اس کی حدیث میں واقعی بہت فضیلت آئی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور فرماتے ہیں: کون ہے جو مجھے پکارے، میں اس کی حاجت برآوری کروں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے میں اسے معاف کروں، کون ہے جو مجھ سے مانگے میں اسے عطا کروں۔ (صحیح بخاری)

بندہ مومن کو چاہیے کہ وہ ان مبارک لمحات کو غنیمت خیال کرے، وہ اس وقت ضرور اپنے اللہ کے ساتھ مناجات میں مصروف ہو اگرچہ تھوڑے سے وقت میں ہو، ممکن ہے کہ اسے اللہ کی طرف سے فضل عظیم میسر آ جائے شاید اسے اللہ تعالیٰ کے بے پایاں رحمت کا کچھ حصہ مل جائے اور اس کی دعائیں شرف قبولیت سے نواز دی جائیں، اللہ تعالیٰ ان مبارک ساعتوں میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ دست سوال دراز کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

لفظ ''حنّان'' کی حیثیت؟

سوال ہمارے ہاں عام طور پر یا حنّان، یا منّان پکار کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے جبکہ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ حنان کا نام اسمائے حسنیٰ سے نہیں ہے، قرآن مجید و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت درکار ہے؟

جواب عربی زبان میں لفظ حنان دو طرح سے استعمال ہوتا ہے ایک تخفیف کے ساتھ یعنی شدّ کے بغیر بطور مصدر مستعمل ہے جس کا معنی رحمت و شفقت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً'' ❷ ''ہم نے یحییٰ کو اپنی طرف سے رحمت و شفقت اور پاکیزگی عطا کی فرمائی ہے۔''

اس آیت کریمہ میں حنان اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر واقع ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جہنم پر ''تحنن'' اپنی رحمت سے شفقت فرمائے گا۔ ❸

---

❶ صحیح ابن خزیمہ ص ۵۱ ج۲۔ ❷ مریم: ۱۳۔ ❸ مسند احمد ص ۱۱ ج۳۔

دوسرا لفظ حنّان شد کے ساتھ بطور نام استعمال ہوتا ہے، اس کا معنی شفقت کرنے والا ہے، کچھ اہل علم نے اس لفظ کو اسمائے حسنیٰ میں شمار کیا ہے جبکہ محققین اہل علم کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا نام نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں یعنی جو نام اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہیں یا رسول اللہ ﷺ نے ان کی نشاندہی کی ہے انہیں اسماء حسنیٰ کا درجہ دیا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے پیش نظر کسی لفظ کو اسماء حسنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ یا حنّان یا حنّان کے الفاظ سے دعا کرنے کو مکروہ خیال کرتے تھے۔ [1]

البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک حلقہ میں تھا جبکہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا، اس نے تشہد کے دوران میں یہ دعا پڑھی: ’’ اللهم إني اسئلك بان لك الحمد لا اله الا انت الحنان‘‘ رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات سن کر فرمایا کہ اس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔ [2]

اس حدیث میں لفظ حنّان بطور اسم حسنیٰ استعمال ہوا ہے اور یہ روایت مسند امام احمد کے دیگر مقامات کے علاوہ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں بھی ہے لیکن کسی مقام میں یہ لفظ نہیں آیا، اس بناء پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ اس لفظ کے متعلق توقف اختیار کیا جائے، اگر استعمال کرنا ہو تو یا ذالحنّان کہہ دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

چاند کا ثبوت

سوال ہمارے ہاں عام طور پر جب چاند عام معمول سے کچھ بڑا طلوع ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ گزشتہ کل کا چاند ہے، کیا چاند کے بڑے ہونے پر اس کے نوزائدہ ہونے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، کتاب و سنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب اسلامی مہینے کا آغاز چاند کے بڑے ہونے کو قرار نہیں دیا جا سکتا، شرعی طور پر اسلامی مہینے کا آغاز تین طریقوں سے ممکن ہے جو حسب ذیل ہیں:

☆ چاند نظر آ جائے جیسا کہ رمضان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ’’رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھو۔‘‘ [3]

☆ چاند دیکھنے کی شہادت مل جائے، شہادت کے لئے آدمی کا عاقل، بالغ اور مسلمان ہونا ضروری ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کی، مجھے چاند نظر آ گیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی، اس اطلاع کے بعد آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ [4]

☆ گزشتہ مہینے کے تیس دن مکمل ہونے کے بعد اگلے مہینے کا آغاز ہو جاتا ہے جبکہ گزشتہ مہینے کی انتیس تاریخ کو مطلع صاف ہونے کی باوجود چاند نظر نہ آئے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ’’مہینہ انتیس کا بھی ہوتا ہے، جب چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی عید الفطر کرو، اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن پورے کرو۔‘‘ [5]

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۷۸۵ ج ۱۰۔ [2] مسند امام احمد ص ۱۵۸ ج ۳۔

[3] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۰۹۔ [4] ابو داود، الصیام: ۲۳۴۲۔ [5] صحیح مسلم، الصیام: ۱۰۸۰۔

شریعت اسلامیہ میں ان تین طریقوں سے اسلامی مہینے کا آغاز کیا جا سکتا ہے، چاند کے چھوٹے یا بڑے ہونے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ (واللہ اعلم)

دیور تو موت ہے

سوال حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری سے فرمایا تھا: ''دیور تو موت ہے'' اس کا کیا معنی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح موت سے بچنا ممکن نہیں اس طرح دیور کا حال ہے، لہٰذا اس سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں، براہ کرم اس حدیث کی وضاحت کریں؟

جواب سوال میں ذکر کردہ حدیث کا مکمل متن حسب ذیل ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کیا کرو، ایک انصاری آدمی کہنے لگا، یا رسول اللہ! دیور کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''دیور تو موت ہے۔'' [1]

واضح رہے کہ ''حمو'' سے مراد صرف خاوند کا بھائی ''دیور'' ہی نہیں بلکہ مطلق طور پر خاوند کے رشتہ دار مراد ہیں یعنی اس کے آباؤ اجداد اور اولاد کے علاوہ دوسرے رشتہ دار ہیں مثلاً بھائی، چچا، بھتیجے اور چچا کے بیٹے (کزن) وغیرہ، یہ سب عورت کے لئے اجنبی ہیں، عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہیے۔ سوال میں ذکر کردہ حدیث کا مفہوم صحیح نہیں کہ اس سے اجتناب نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس سے پردہ نہ کیا جائے۔ رسول ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے زیادہ خاوند کے رشتہ داروں سے زیادہ خدشہ اور فتنے میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے اس لئے کہ عورت کے پاس جانا اور اس سے خلوت کرنا ان کے لئے آسانی کے ساتھ ممکن ہے کیونکہ گھر میں ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا، اس کے مقابلے میں اجنبی آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ گھر میں بلا اجازت نہیں آ سکتا۔

موقع کی مناسبت سے ہم یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مشاہدہ کے مطابق کچھ دیور ایسے ہوتے ہیں جو عورت کی چادر اور چاردیواری کا تحفظ نہیں کرتے بلکہ اس کی چادر کو تار تار کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اور یہ ان کی صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا عورت کو چاہیے کہ وہ اپنی عزت و ناموس کے تحفظ کے پیش نظر دیور کے ساتھ بے تکلف ہونے سے اجتناب کرے اور اپنے پردے کو کسی صورت میں قربان نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

کیا ڈاکو کو اپنا مال دے دیا جائے؟

سوال آج کل راہ زنی، ڈکیتی اور چوری چکاری کا دور ہے، بعض دفعہ گھر میں ڈاکو آ جاتے ہیں اور مال و دولت کا مطالبہ کرتے ہیں، اگر مال وغیرہ نہ دیا جائے تو مارتے پیٹتے ہیں، اگر مال دے دیا جائے تو ضمیر ملامت کرتا ہے، ایسے حالات میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کیا ہیں، اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ راہنمائی کریں؟

---

[1] صحیح بخاری، النکاح: ۲۵۳۲۔

جواب موجودہ حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کے ساتھ ساتھ اپنے حفاظتی اقدامات کو نظر انداز نہ کریں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کا کیا خیال ہے اگر کوئی آدمی میرا مال چھیننا چاہے تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو اسے اپنا مال نہ دے، اس نے عرض کیا اگر وہ میرے ساتھ جنگ وقتال پر اتر آئے؟ آپ نے فرمایا: تو بھی اس کے ساتھ جنگ وقتال کر، اس نے عرض کیا اگر اس نے مجھے قتل کر دیا تو؟ آپ نے فرمایا کہ ایسے حالات میں تو شہید ہوگا، اس نے عرض کیا اگر میں اسے قتل کر دوں تو؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تو اسے قتل کر دے تو وہ آگ میں ہے۔'' [1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ گھر والوں کے لئے عزیمت کا یہی راستہ ہے کہ وہ ڈاکو کو اپنا مال نہ دیں، بلکہ اس سے جنگ وقتال کیا جائے، اگر ایسے حالات میں گھر والا مارا گیا تو وہ شہید اور اگر ڈاکو مارا گیا تو وہ جہنم میں اور اس کا خون ضائع ہے لیکن اگر اس کے ساتھ جنگ وقتال کرنے سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہو مثلاً وہ گھر والوں کا اکیلا ہی سرپرست ہے اور اہل خانہ میں اور کوئی لواحقین کی نگہداشت کرنے والا نہیں یا وہ اہل علم سے ہے اور اپنے علم سے لوگوں کی تشنگی دور کرتا ہے تو ایسے حالات میں رخصت ہے کہ وہ اپنا مال اس کے حوالے کر کے اپنی جان اور عزت و ناموس کو محفوظ کرے، اس بات کا اندازہ وہ خود لگا سکتا ہے کہ اس نے کونسا راستہ اختیار کرنا ہے، عزیمت کا یا رخصت سے فائدہ اٹھانا ہے۔ (واللہ اعلم)

مردار جانور کی قابل استعمال چیزیں

سوال اگر بکری وغیرہ ذبح کئے بغیر مر جائے تو اس کی کون کون سی اشیاء استعمال کی جا سکتی ہیں، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب شرعی طریقہ سے ذبح کئے بغیر جو جانور مر جائے اسے مردار کہتے ہیں، قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تم پر مردار حرام ہے۔'' [2]

لیکن حدیث نے ان مرداروں سے دو چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے اور وہ حلال ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے دو مردار حلال کر دیئے گئے ہیں: ایک مچھلی اور دوسری مکڑی'' [3]

مچھلی اور مکڑی کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ دونوں مردار حلال کر دیئے ہیں۔ مردار بکری کی کھال قابل استعمال ہے بشرطیکہ اسے دباغت دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب کھال کو دباغت دی جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔'' [4] اس کے علاوہ مردار جانور کی ہڈیاں، سینگ، کھر، بال اور پر وغیرہ بھی قابل استعمال ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ مردار ہاتھی وغیرہ کی ہڈیوں کے متعلق فرماتے ہیں: میں نے ایسے اہل علم اسلاف کو دیکھا ہے جو ہڈیوں سے بنی ہوئی کنگھی کرتے تھے اور ان میں تیل بھی ڈال لیا کرتے تھے۔ [5]

---

[1] صحیح مسلم، الایمان: ۲۲۵۔ [2] سورۃ مائدۃ: ۳۔ [3] مسند امام احمد ص ۹۷ ج ۲۔
[4] مسلم، الطہارۃ: ۸۱۲۔ [5] صحیح بخاری، تعلیقاً کتاب الوضوء باب نمبر ۶۷۔

حضرت حماد فرماتے ہیں کہ مردہ پرندوں کے پروں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ❶

مردہ مچھر اور مکھی کا حکم

سوال اگر دودھ یا پانی میں مکھی یا مچھر گر کر مر جائے تو اس کا کیا حکم ہے، جبکہ قرآن کریم نے مردار کو حرام قرار دیا ہے، اس کی قرآن و حدیث کی رو سے وضاحت کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب بلاشبہ قرآن کریم کی نص کے مطابق مردار حرام ہے اور مردار نجس ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مردار کے چمڑے کو پاک کرنے کا طریقہ بتایا ہے کہ اسے رنگا جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسے دباغت نہ دی جائے تو وہ نجس ہے۔ اس پر علماء امت کا اجماع ہے لیکن مردار نجس ہونے سے وہ مردار مستثنیٰ ہے جس میں بہنے والا خون نہ ہو جیسے مکھی، کیڑے مکوڑے، چیونٹی اور مچھر وغیرہ۔ ان میں اتنا خون نہیں ہوتا جو زمین پر بہنے لگے۔

اس طرح کے حشرات اور کیڑے مکوڑے مر جائیں تو وہ نجس نہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مکھی کے متعلق فرمایا ہے: ''جب مکھی تم میں سے کسی کے مشروب میں گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالا جائے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔'' ❷

بعض روایات میں کھانے میں گرنے کے الفاظ بھی ہیں۔ ❸

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مکھی جب سالن، پانی، دودھ یا چائے وغیرہ میں گر جائے تو کھانے پینے کی چیز کو ضائع کر دینا جائز نہیں بلکہ اسے استعمال میں لانا جائز ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کا مردار نجس نہیں۔ مچھر، شہد کی مکھی، چیونٹی اور دیگر حشرات کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ حدیث اس امر پر بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ قلیل پانی ایسی چیز کے گرنے سے پلید نہیں ہوتا جس میں اتنا خون نہیں جو بہنے والا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایسی چیز کو ڈبونے کا حکم نہیں دیتے جس کے مرنے سے پانی پلید ہو جاتا ہو۔'' ❹

لہٰذا مچھر، مکھی وغیرہ گرنے اور مرنے سے کوئی چیز پلید نہیں ہوتی۔ (واللہ اعلم)

کیا علاج معالجہ توکل کے منافی ہے؟

سوال میری دونوں آنکھوں میں موتیا آ چکا ہے، دیکھنے میں کافی دقت محسوس ہوتی ہے، میرا حج بیت اللہ کا بھی ارادہ ہے، لیکن تادم تحریر علاج کرانے سے انکاری ہوں، جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا وہ فرمان ہے کہ جو لوگ علاج اور دم وغیرہ نہیں کراتے وہ جنت میں بغیر حساب و کتاب داخل ہوں گے، میں بھی یہ فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہوں، اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں اور اپنے رجحان کا صاف اظہار کریں؟

---

❶ صحیح بخاری۔
❷ صحیح بخاری، بدء الخلق: ٣٣٢٠۔
❸ ابن ماجه، الطب: ٣٥٠٤۔
❹ فتح الباری ص ٣٠٩ ج ١٠۔

جواب سوال میں جس حدیث کو بنیاد بنا کر علاج معالجہ کو توکل کے منافی قرار دیا گیا ہے اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے، جو دم جھاڑ نہیں کرائیں گے اور بدشگونی بھی نہیں لیں گے اور وہ اپنے رب پر توکل کریں گے۔'' [1]

ایک روایت میں ہے کہ وہ علاج کی خاطر آگ سے داغ نہیں دیں گے۔ [2]

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ وہ دم کریں گے اور نہ کروائیں گے۔ [3]

اس حدیث کو بنیاد بنا کر علاج معالجے کو توکل کے منافی خیال کیا جاتا ہے جیسا کہ سائل نے وضاحت کی ہے کہ وہ مذکورہ فضیلت حاصل کرنے کے لئے اپنی آنکھوں کے موتیا کا علاج نہیں کروا رہے، حالانکہ اس حدیث میں مطلق علاج کی نفی نہیں بلکہ علاج کی ایک صورت کو بیان کیا گیا ہے کہ آگ کے ذریعے علاج کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں فرمائی ہے، آپ نے فرمایا: ''تین قسم کی دواؤں میں خیر و برکت ہے: ① شہد پینے میں، ② سینگی کے نشتر میں اور ③ آگ کے داغنے میں۔ لیکن میں اپنی امت کو آگ کے داغنے سے منع کرتا ہوں۔'' [4]

اس حدیث کی روشنی میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ مطلق طور پر علاج معالجہ توکل کے منافی نہیں بلکہ وہ علاج توکل کے منافی ہے جو آگ سے داغ دینے کے ذریعے ہو۔ اس لئے سائل کو اپنے علاج معالجے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ (واللہ اعلم)

جسم کی سرجری کرانا

سوال میرے ہونٹ پیدائشی طور پر نقص زدہ ہیں جس کی بنا پر کھانے پینے اور بات کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی ہے، اس سلسلہ میں جب ڈاکٹروں سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ چہرے کی پلاسٹک سرجری ضروری ہے اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چہرے پر بال نہ ہوں جبکہ میں نے داڑھی رکھی ہوئی ہے، اب میں بہت پریشان ہوں کہ جس داڑھی کو میں نے سنت سمجھ کر رکھا تھا، اسے کیوں منڈواؤں؟ اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں؟

جواب قدرت کا نظام ہے کہ عام طور پر جب بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو بالکل صحیح و سالم ہوتا ہے لیکن بعض اوقات غذائی مواد کی کمی یا کسی کیمیاوی تبدیلی کی وجہ سے بچہ ناقص الخلقت پیدا ہوتا ہے، یہ نقص کبھی تو قابل اصلاح ہوتا ہے اور کبھی اصلاح کے قابل نہیں ہوتا بعض بچوں کے پاؤں پیدائشی ٹیڑھے ہوتے ہیں جنہیں بذریعہ علاج سیدھا کیا جا سکتا ہے، بعض اوقات بچے کے دونوں ہونٹ جڑے ہوتے ہیں، انہیں بھی آپریشن کے ذریعے الگ کیا جا سکتا ہے، بعض دفعہ انسان موتیا پڑنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو جاتا ہے تو آپریشن کے ذریعے اس کی بینائی بحال کی جا سکتی ہے۔

صورت مسئولہ میں سائل بھی اسی قسم کی پریشانی میں مبتلا ہے، شرعاً اس طرح کے علاج میں کوئی قباحت نہیں اور جدید طب سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ سائل کو چاہیے کہ وہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرائے، اس میں شرعی طور پر کوئی حرج نہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، الرقاق: ٦٤٧٢۔ [2] صحیح بخاری، الرقاق: ٥٤٤١۔
[3] صحیح مسلم، الایمان: ٣٧٤۔ [4] صحیح بخاری، الطب: ٥٧٠٢۔

اگر چہ آج کل اس جدید طریقہ علاج سے غلط فائدہ بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ ''فیشن ایبل اور غلط کار'' عورتوں کے چہروں پر عمر رسیدگی یا اپنے دھندے کی نحوست کی بنا پر جھریاں پڑ جاتی ہیں تو وہ اپنے حسن کو بحال کرانے کے لئے پلاسٹک سرجری کا سہارا لیتی ہیں، ہمارے نزدیک ایسا کرنا جرم اور حرام ہے کیونکہ اس سے دھوکہ دہی مقصود ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایسی مجبوری نہیں کہ اس کی خاطر فطرت سے چھیڑ چھاڑ کی جائے۔

البتہ صورت مسئولہ میں ایسی مجبوری ہے کہ جس کے پیش نظر چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کھانے پینے اور بات چیت کرنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

باقی رہا داڑھی کا مسئلہ تو اس کا انحصار نیت پر ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے حالت میں اس کے متعلق باز پرس نہیں کریں گے اور اس کی بھی امید ہے کہ علاج کے بعد اسے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے دوبارہ اُگا دیں گے۔ '' وما ذلك على الله بعزيز''

پیوند کاری کے لئے خنزیر کے اعضاء کا استعمال کرنا

سوال کیا کسی مجبوری کی بناء پر انسانی جسم کی پیوند کاری کے لئے خنزیر کے اعضاء استعمال کئے جا سکتے ہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی حیثیت واضح کریں؟

جواب خنزیر بہت بُری اور گندی طبیعت کا حامل جانور ہے، اس کے بدن میں تمام جہان کی بیماریاں اور نجاستیں ہیں جو کسی بھی طرح کی صفائی سے دور نہیں ہو سکتیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے بلکہ قرآن کریم نے اسے ''رجس'' سے تعبیر کیا ہے اور یہ ایک ایسا جامع کلمہ ہے جس کے اندر گندگی، نجاست، اذیت اور ضرر رسانی کا ہر مفہوم شامل ہے۔ بوقت ضرورت انسانی جسم کی پیوند کاری کی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت عرفجہ بن اسعد رضی اللہ عنہ کی ناک دور جاہلیت میں جنگ کلاب کے دوران کٹ گئی تھی تو انہوں نے چاندی کی ناک لگوائی لیکن وہ جسم کے موافق نہ آئی اور اس میں تعفن پڑ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سونے کی ناک لگوانے کی اجازت دے دی۔ [1]

لیکن پیوند کاری کے لئے خنزیر کے کسی عضو کو استعمال کرنا کس طرح بھی درست نہیں کیونکہ یہ حرام اور نجس ہے اور شریعت نے اسے انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ہی حرام کیا ہے۔ یہ حرام اشیاء کبھی تو جسمانی طور پر انسان کے لئے ضرر رساں ہوتی ہیں اور کبھی اس کے اخلاق و کردار کو تباہ کر دیتی ہیں، اگرچہ ظاہری طور پر ان میں کوئی فائدہ بھی ہوتا ہے تاہم ان میں نقصان کا پہلو بہر صورت غالب رہتا ہے، بعض اوقات ہماری ظاہر بین آنکھیں اس نقصان کے ادراک سے قاصر رہتی ہیں۔

خنزیر ناپاک اور نجس ہونے کی بنا پر سراسر نقصان دہ اور ضرر رساں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں کسی بھی پہلو سے فائدہ نہیں رکھا۔ قرآن مجید میں اگرچہ اس کے گوشت کا ذکر ہے تاہم اس کے بال، ہڈیاں اور پوست و پٹھے وغیرہ سب حرام اور نجس ہیں، اس لئے ہمارے رجحان کے مطابق اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی انسانی جسم کے لئے بطور پیوند کاری استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] نسائی، الزینة : ٥١٦٤۔

جھوٹے قصے کہانیاں

سوال ہمارے ہاں اکثر جرائد و رسائل میں جھوٹے قصے کہانیاں، افسانے، ناول اور سنسنی خیز لٹریچر شائع ہوتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب جھوٹے قصے اور کہانیاں شائع کرنا دل بہلاوے کے طور پر پڑھنا شرعاً درست نہیں۔ دور جاہلیت میں لوگوں کی قرآن کریم سے توجہ ہٹانے کے لئے یہی حربہ استعمال کیا گیا تھا بلکہ ایک ازلی بدبخت نضر بن حارث کا یہی کاروبار تھا کہ وہ مکہ سے عراق اور فارس وغیرہ جاتا، وہاں سے شاہانِ عجم کے قصے اور رستم و اسفندیار کی کہانیاں لا کر قصہ گوئی کی محفلیں جماتا تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن کریم سے ہٹ جائے اور وہ اس قسم کی کہانیوں میں مصروف ہو جائیں تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ [1]

''اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے، ایسے لوگوں کے لئے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔''

''لہو الحدیث'' سے مراد ہر وہ بات ہے جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کر کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے، قرآن کریم نے اس قسم کی اشیاء کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس قسم کے لٹریچر سے اجتناب کرنا چاہیے جو محض جھوٹ پر مبنی ہو اور اس میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے خلاف حقیقت واقعات پر مشتمل ہو۔ ہمارے ہاں بیشتر قسم کے ڈائجسٹ اور رسالے اس قسم کے لٹریچر پر مشتمل ہوتے ہیں، نیز ان سے بے راہ روی کا درس ملتا ہے جس سے انسان کی عاقبت خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

عورتوں کے لئے سونا پہننا

سوال کیا عورتیں سونے کے زیورات پہن سکتی ہیں، ہمارے ہاں کچھ اہل علم کا کہنا ہے کہ عورتیں سونے کے زیورات نہیں پہن سکتیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب عورتوں کا سونے کے زیوارت سے زینت حاصل کرنا جائز ہے، قرآن کریم میں اس کے متعلق واضح اشارہ ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''کیا جو زیورات میں پرورش پائے اور گفتگو کرتے وقت صاف بات نہ کر سکے (وہ اللہ کی اولاد بننے کے قابل ہے؟) [2]

اللہ تعالیٰ کے اس عمومی فرمان میں عورتوں کے لئے سونا پہننا جائز ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو، کیونکہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے زیور کو عورت کے خاص وصف کے طور پر بیان کیا ہے خواہ وہ زیور سونے کا ہو یا کسی اور قیمتی دھات کا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس امر کی مزید وضاحت فرمائی ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ریشم کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور سونے کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر فرمایا: ''یہ دونوں چیزیں میری امت کے لئے جائز ہیں۔'' [3]

---

[1] لقمان: ٦۔ [2] الزخرف: ١٨۔ [3] ابن ماجه، اللباس: ٣٥٩٥۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے حلال کیا گیا ہے جبکہ مردوں کے لئے حرام ہے۔'' [1]

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اس قسم کی احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''عورتوں کے لئے ریشم اور سونا پہننا'' [2]

مذکورہ احادیث وآثار کے پیش نظر عورتوں کے لئے سونے کے زیورات زیب تن کرنا جائز ہے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق اس سلسلہ میں میانہ روی اختیار کی جائے کیونکہ زیادہ زیورات پہننے سے فخر وتکبر کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے غرباء کا دل بھی دکھتا ہے، اس لئے زیورات کی بہتات اور کثرت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

گھر میں موجود کیڑے مکوڑوں کو جلانا

سوال ہمارے گھر میں چیونٹیوں کے بہت بل ہیں، کیا انہیں آگ سے جلانا جائز ہے اگر ایسا کرنا جائز ہیں تو ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟

جواب گھر میں موجود کیڑے مکوڑے اگر تکلیف کا باعث ہوں مثلاً وہ کھانے پینے کی چیزوں میں داخل ہوں یا گھر کے اشیاء کو خراب کریں تو انہیں مارا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جانوروں کو ''فواسق'' قرار دیا ہے اور انہیں حل وحرم ہر جگہ قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ [3]

اسی طرح دیگر کیڑے مکوڑے جو ایذاء کا باعث ہوں، انہیں مارا جا سکتا ہے، لیکن مارنے کے لئے کیڑے مار ادویات کا استعمال کیا جائے۔ اس کے لئے بازار سے پاؤڈر اور سپرے مل جاتی ہیں انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن آگ کے ذریعے انہیں ختم کرنا شرعاً جائز نہیں، اس کی ممانعت ہے۔ اس بناء پر گھر میں نکلنے والی چیونٹیاں اگر ایذاء کا باعث ہوں تو جراثیم کش ادویات سے انہیں ختم کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے کسی طور بھی آگ استعمال نہ کی جائے۔ (واللہ اعلم)

مشکوک کمائی سے تیار کردہ کھانا

سوال میرے ایک دوست تجارت پیشہ ہیں، لیکن میرے خیال کے مطابق وہ غلط کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی کمائی حرام نہیں تو مشکوک ضرور ہے، کیا میں جب کبھی اس کے گھر جاؤں تو اس کے گھر سے کھا پی لیا کروں، قرآن وحدیث کی روشنی میں میری راہنمائی کریں؟

جواب اگر کسی کی کمائی خاص حرام کی ہے تو اس کے ہاں کھانا پینا جائز نہیں لیکن مشکوک کمائی کے معاملہ میں اس قدر سختی کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے، میرے خیال کے مطابق اس کا مال خبیث یا حرام ہے، وہ مجھے بعض اوقات کھانے کی دعوت دے دیتا ہے، کیا مجھے دعوت قبول کرنی چاہیے؟ واضح رہے کہ اگر میں اس کے ہاں نہ جاؤں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس کے گھر جاؤ اور اس کی دعوت

---

[1] سنن نسائی، الزنیة: ۵۱۵۱۔ [2] ابن ماجه، اللباس باب نمبر ۱۹۔

[3] صحیح بخاری، جزاء الصید: ۱۸۲۹۔

کو قبول کرو، اس کا گناہ صرف اسی پر ہوگا۔'' [1]

ہاں اگر معلوم ہوجائے کہ کھانا حرام مال سے تیار کیا گیا ہے تو اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور اسے تناول نہیں کرنا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی، جب کھانا پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ گوشت ایسی بکری کا ہے جسے اس کے مالک کی اجازت کے بغیر لیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے یہ کھانا خود نہیں کھایا بلکہ فرمایا کہ یہ کھانا قیدیوں کو کھلا دیا جائے۔ [2]

بہرحال ایسے دوست کا بائیکاٹ نہ کیا جائے بلکہ اسے قرآن وحدیث سے وعظ کرتے رہنا چاہیے ممکن ہے کہ وعظ ونصیحت کرنے سے وہ غلط کاروبار سے توبہ کرلے۔ ہاں اگر ایسے آدمی کی دعوت قبول نہ کرنے میں یہ امکان ہو کہ وہ توبہ کرکے غلط کاروبار چھوڑ دے گا تو اچھے انداز میں بائیکاٹ کیا جاسکتا ہے تاکہ اسے احساس ہو کہ میرے غلط کام کرنے پر میرے دوست گھر آنا جانا چھوڑ دیں گے، آدمی کو موقع محل دیکھ کر کوئی مناسب اقدام کرنا چاہیے۔

مریضہ کا دودھ

سوال ایک عورت کو ایڈز کا مرض لاحق ہے، کیا وہ ایسے حالات میں اپنے تندرست بچے کو دودھ پلا سکتی ہے اور اس کی پرورش کرنے میں کوئی حرج تو نہیں؟

جواب طب جدید نے اس سلسلہ میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان کے مطابق ایڈز کی شکار ماں اپنے بچے کو دودھ پلا سکتی ہے اور اس کی پرورش کرسکتی ہے کیونکہ بچے کو دودھ پلانے اور اس کی پرورش کرنے سے بچے کو خطرہ یقینی نہیں۔ اس سلسلہ میں اس کی حالت عام ہے جس میں ایک دوسرے سے میل جول ہوسکتا ہے البتہ یہ بیماری جنسی ملاپ سے آگے پھیلتی ہے اس لئے میاں بیوی میں سے جو تندرست ہو اسے یہ حق ہے کہ وہ ایڈز کے مریض سے الگ ہوجائے خواہ وہ خاوند ہو یا بیوی۔ اطباء کا کہنا ہے کہ ایڈز کا مرض جنسی تعلقات قائم کرنے سے دوسرے کو بھی لگ جاتا ہے۔ بہرحال دودھ پلانے اور بچوں کی پرورش کرنے سے اس کا کوئی اندیشہ نہیں لہٰذا ایڈز کی شکار ماں اپنے تندرست بچے کو دودھ پلا سکتی ہے۔ شریعت میں اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں۔ اگر طبی طور پر کوئی ممانعت نہیں تو وہ اپنے بچے کی پرورش کرسکتی ہے اور اسے دودھ بھی پلا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

سونے چاندی کے برتن بطور زینت گھر میں رکھنا

سوال سونے اور چاندی کے برتن خوبصورتی اور زینت کے لئے گھر میں رکھنا جائز ہیں یا نہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا اور پینا تو بالاتفاق جائز نہیں، چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نہ ہی ان سے بنی ہوئی پلیٹوں میں کھاؤ، کیونکہ دنیا میں یہ

---

[1] بیہقی ص ۳۳۵ ج۵۔ [2] ابو داؤد، البیوع: ۳۳۳۲۔

کافروں کے لئے ہیں اور آخرت میں ہمارے لئے ہوں گے۔'' ❶

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔'' ❷

امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ہر چیز میں اصل حلت ہے جس کی حرمت موجود نہیں وہ حلال ہے۔ اس لئے چاندی اور سونے کے برتنوں کو کھانے پینے کے علاوہ کسی بھی استعمال کے لئے رکھا جا سکتا ہے۔ ❸

لیکن ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کھانے پینے کی حرمت بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے: ''یہ برتن کافروں کے لئے دنیا میں ہیں اور ہمارے لئے آخرت میں ہیں۔''

اس بناء پر ہمارا رجحان ہے کہ یہ کھانے پینے کے علاوہ گھر کی خوبصورتی کے لئے بھی نہ رکھے جائیں کیونکہ اس میں اپنے مال کی نمود ونمائش اور اسراف وتبذیر ہے۔ اس بناء پر سونے اور چاندی کے برتنوں سے اجتناب کیا جائے۔

یتیم کا مفہوم؟

سوال اگر کسی کا والد فوت ہو جائے تو وہ کس وقت تک یتیم رہتا ہے، شریعت نے اس کی کیا حد مقرر کی ہے، کتاب و سنت سے اس کی وضاحت کریں؟

جواب اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ احتلام کے بعد یتیم نہیں۔ ❹

امام ابوداود رحمہ اللہ نے اس پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''یتیمی کب ختم ہوتی ہے؟'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے اس وقت تک یتیم رہتے ہیں، جب تک وہ بالغ نہ ہوں، اگر بالغ ہو جائیں تو شرعاً یہ حالت ختم ہو جاتی ہے۔ اب یہ سوال کہ انسان بالغ کب ہوتا ہے؟ مختلف احادیث کے پیش نظر اس کی تین علامتیں ہیں: (۱) بچے کو احتلام آ جائے یا بچی حالتِ حیض سے دوچار ہو جائے جیسا کہ مذکورہ حدیث میں ہے۔

(۲) جب بچے یا بچی کی عمر پندرہ سال ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ غزوہ احد کے دن وہ چودہ سال کے تھے تو انہیں جنگ میں شرکت کی اجازت نہ ملی لیکن آئندہ سال جب وہ پندرہ برس کے ہوئے تو غزوہ خندق میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ ❺

(۳) زیر ناف بال اگ آئیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ غزوہ بنی قریظہ کے دن جس شخص کے زیر ناف بال اگے ہوئے تھے اسے قتل کر دیا جاتا اور جس کے بال نہ ہوتے اسے چھوڑ دیا جاتا۔ ❻

بہر حال بلوغ کے بعد یتیمی کی حالت ختم ہو جاتی ہے اور بلوغ کی مذکورہ بالا تین علامتیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح بخاری، الاطعمہ: ٥٤٢٤۔ ❷ صحیح بخاری، الاشربة: ٥٦٣٤۔ ❸ نیل الاوطار ص ١٢٧۔
❹ بیهقی ص ٣٢٠ ج ٧۔ ❺ صحیح بخاری، المغازی: ٤٠٩٧۔ ❻ ابو داود، حدود: ٤٤٠٤۔

شادی کے سات ماہ بعد بچہ جنم دینا

سوال میری شادی جنوری ۲۰۱۲ء کے آغاز میں ہوئی، جولائی کے وسط میں بیوی نے بچہ جنم دیا، میں شکوک وشبہات کا شکار ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب محض شکوک وشبہات کی بناء پر بچے کا انکار کرنا شرعاً جائز نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور عرض کرنے لگا کہ میری بیوی نے ایک سیاہ بچہ جنم دیا ہے جبکہ میں اس کا انکار کرتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: ان کا رنگ کیسا ہے؟ جواب دیا وہ سرخ رنگ کے ہیں، آپ نے فرمایا: کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ والا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں، ان میں خاکستری رنگ والے اونٹ بھی ہیں، آپ نے فرمایا: وہ کہاں سے آ گئے؟ جواب دیا شاید ان کے آباء واجداد کی خونی رگ نے جوش مارا ہو اور ان کا رنگ خاکستری ہو گیا ہو، آپ نے فرمایا کہ تیرے بیٹے کے ساتھ شاید یہی معاملہ ہوا ہو، آپ نے اسے انکار کرنے کی اجازت نہیں دی۔ [1]

صورت مسئولہ میں بھی اسی طرح کے شکوک وشبہات ہیں، شریعت میں اگر شادی کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو جائے تو اسے صحیح النسب تسلیم کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اس کا واضح اشارہ ملتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ایک مقام پر حمل اور دودھ کی مدت تیس ماہ بیان کی گئی ہے: ’’اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگے۔‘‘ [2]

اس آیت کریمہ میں حمل اور مدت رضاعت کا بیان ہے جبکہ دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ کامل مدت رضاعت دو سال ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ’’جو شخص مدت رضاعت پوری کرنا چاہے وہ جان لے کہ وہ دو سال ہے۔‘‘ [3]

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے کیونکہ مدت رضاعت چوبیس ماہ (دو سال) تیس ماہ سے منہا کر دی جائے تو باقی مدت حمل چھ ماہ رہ جاتی ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر فتح القدیر میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ نیز حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی رائے ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے۔ صورت مسئولہ میں عورت نے شادی کے سات ماہ بعد بچہ جنم دیا ہے تو یہ بچہ صحیح النسب ہے خواہ مخواہ شکوک وشبہات میں نہیں پڑنا چاہیے۔

(واللہ اعلم)

حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نسبت

سوال حدیث میں ہے: ’’جو اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نسبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے، یہ حدیث کہاں ہے، اس کی نشاندہی کریں؟

جواب شریعت میں والد گرامی کی بہت اہمیت ہے، اس سے روگردانی کو کفر قرار دیا گیا ہے، چنانچہ حضرت

---

[1] صحیح بخاری، الاعتصام: ۷۳۱۴۔ [2] الاحقاف: ۱۵۔ [3] البقرۃ: ۲۳۳۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''اپنے باپ دادا سے بے رغبتی کا اظہار نہ کرو، جب انسان اپنے باپ سے بے رغبتی کرتا ہے تو اس کا یہ کام کفر ہے۔'' ❶ اس سے بڑھ کر جرم یہ ہے کہ انسان اپنے اصل باپ کے سوا کسی دوسرے آدمی کو اپنا باپ قرار دے لے، اس کے متعلق حدیث میں بہت وعید آئی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے والد کے سوا کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے تو وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا حالانکہ اس کی خوشبو پانچ صد سال کے فاصلے سے محسوس ہوگی۔'' ❷

جنت کی خوشبو نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوگا بلکہ جنت کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گا، یعنی وہ جہنم میں جائے گا۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو باپ بنانے کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ دوسرا اس کا باپ نہیں، اس پر جنت حرام ہے۔ ❸

ایک روایت میں اسے اللہ کے ساتھ کفر قرار دیا گیا ہے۔ ❹ دوسری روایت میں اسے بہت بڑا بہتان کہا گیا ہے۔ ❺

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف نسبت کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔'' ❻

بعض دفعہ بہو اپنے سسر کو ''ابو'' کہہ دیتی ہے یا پیار سے کسی کو بیٹا کہہ دیا جاتا ہے، یہ اس وعید میں شامل نہیں۔ حرمت اس وقت ہے جب اس مصنوعی رشتے کو اصلی رشتے کا مقام دینے کی کوشش کی جائے یا باپ کو حقیر خیال کرتے ہوئے اپنی نسبت کسی دوسرے کی طرف کی جائے۔ بہرحال سوال میں ذکر کردہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں آئی ہے جس کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

غفران ذنوب اور تکفیر سیئات میں فرق

سوال قرآن مجید میں ہے: ''اے ہمارے رب! تو ہمارے گناہ بخش دے (فاغفرلنا ذنوبنا)اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے،(وکفر عنا سیاتنا) اس آیت کریمہ میں غفران ذنوب اور تکفیر سیئات سے کیا مراد ہے، بظاہر دونوں کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے؟

جواب مفسرین کرام نے غفران ذنوب اور تکفیر سیئات کے متعلق کئی ایک توجیہات بیان کی ہیں، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ کچھ حضرات نے ان دونوں کو مترادف و ہم معنی قرار دیا ہے، ان کے نزدیک غفران ذنوب اور تکفیر سیئات سے مراد ایک ہی چیز ہے کہ اے اللہ! ہمارے گناہ معاف کر دے لیکن یہ معنی قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٦٨۔
❷ ابن ماجه، الحدود: ٢٦١١۔
❸ صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٦٦۔
❹ صحیح بخاری، المناقب: ٣٥٠٨۔
❺ صحیح بخاری، المناقب: ٣٥٠٩۔
❻ ابن ماجه، الحدود: ٢٦٠٩۔

☆ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ غفران ذنوب سے مراد کبیرہ گناہوں کی معافی اور تکفیر سیئات کا معنی صغیرہ گناہوں کا ڈھل جانا ہے یعنی اس کا معنی یہ ہے کہ بڑے اور چھوٹے سب گناہ معاف کردے۔

☆ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ ذنوب سے مراد ترک طاعات یعنی شرعی طور پر جو کرنے کے کام ہیں انہیں چھوڑ دینا مثلاً ترک نماز وغیرہ اور سیئات سے مراد ارتکاب معاصی یعنی شرعی طور پر جو باز رہنے کے کام ہیں ان کا ارتکاب کرنا مثلاً شراب پینا اور جوا کھیلنا وغیرہ۔ اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہم سے جو کام کرنے کے رہ گئے ہیں، ان کی معافی اور جو باز رہنے والے کاموں کا ہم نے ارتکاب کیا ہے ان سے درگزر فرما۔

دراصل اس دعا میں چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کی وضاحت کے بعد ہم اپنا رجحان بیان کریں گے، وہ چار الفاظ اور ان کی تشریح حسب ذیل ہے:

☆ **غفر:** لغوی طور پر اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز پر کوئی ایسی چیز پہنا دینا جو اسے میل کچیل یا دوسری مضرت سے محفوظ رکھے۔ اللہ کی طرف سے غفران کا یہ معنی ہے کہ وہ گناہوں کی سزا سے انسان کو چھپالے، یہ اس کی طرف سے عذاب کے ساقط ہونے کی مقتضی ہے اور یہی بات ثواب کو واجب کر دیتی ہے۔

☆ **ذنب:** ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کا انجام برا ہو، اس کا اطلاق اس قدر عام ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی لغزش سے لے کر بڑے سے بڑے گناہ پر اس لفظ کو بولا جاتا ہے۔

☆ **تکفیر:** لغوی طور پر اس لفظ کا معنی چھپانا ہے، اس سے ''کفارة'' کا لفظ بنا ہے۔ اس سے مراد وہ عمل جس کی ادائیگی پر گناہ سے پردہ پوشی ہو جائے، یہ لفظ سیئات کو حسنات کے ذریعے ختم اور معاف کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

☆ **سیئات:** بدصورت یا ناگوار قول و فعل کو کہتے ہیں جو ظاہری، بدصورتی اور معنوی خرابی دونوں کے لئے آتا ہے یعنی سیئات بُرے کام اور اس کی ضد حسنات ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حسنات، سیئات کو ختم کر دیتی ہیں۔[1]

ہمارے رجحان کے مطابق اللہ کی عبادت میں کوتاہی کا نام ذنوب ہے یعنی ایسے معاملات سے پہلو تہی کرنا جو اللہ اور بندے کے درمیان ہیں، اسے ذنوب سے تعبیر کیا گیا ہے اور حقوق العباد میں کوتاہی کا نام سیئات ہے یعنی بندوں کے جو باہمی حقوق ہیں ان کی ادائیگی سے روگردانی کرنا سیئات کہلاتا ہے۔ اس دعا کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! جو تیرے حقوق کے متعلق ہم سے کوتاہی ہوئی ہے اس پر پردہ ڈال دے اور ہمیں سزا سے دو چار نہ کر اور حقوق العباد کے متعلق کوتاہی کو بالکل ختم کر دے اور ہمیں اس کے بارے میں باز پرس نہ کر۔ اس مفہوم کو علامہ محمد رشید رضا نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔[2]

دانیال نام رکھنا

سوال: ہم اپنے بچے کا نام دانیال رکھنا چاہتے ہیں، آپ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں کہ یہ نام رکھا جا سکتا ہے اور اس کا معنی کیا ہے؟

---

[1] هود: ١١٤۔ [2] المنار ص ٣٠٣ ج ٤۔

جواب والدین کے لئے ضروری ہے کہ جب ان کے ہاں بچے کی پیدائش ہو تو با معنی، خوبصورت اور کسی اسلامی نام کا انتخاب کریں۔ نام کا شخصیت پر اثر ہوتا ہے اس لئے نام کے سلسلہ میں درج ذیل اقسام کے ناموں سے اجتناب کیا جائے:

☆ جو انتہائی قبیح اور برا ہو، جس سے انسان کی عزت پر حرف آئے اور وہ اپنے نام کی وجہ سے لوگوں کے استہزاء کا نشانہ بنا رہے، رسول اللہ ﷺ برے نام تبدیل کر دیتے تھے۔ ❶

مثلاً آپ نے ایک لڑکی عاصیہ کا نام جمیلہ رکھا تھا۔ ❷

☆ ایسے نام جن سے نحوست اور بدشگونی کے معانی ظاہر ہوتے ہیں مثلاً ''حزن'' نام رکھنا۔ اس کا معنی غم اور پریشانی ہے۔

☆ ایسے ناموں سے بھی اجتناب کیا جائے جو اللہ رب العزت کے لئے خاص ہیں، مثلاً الرحمٰن، الخالق، الرازق وغیرہ، ان کے آغاز میں لفظ ''عبد'' لگا کر رکھے جا سکتے ہیں۔

☆ ایسے نام بھی نہیں رکھنے چاہئیں جن میں لفظ عبد کو غیر اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہو، مثلاً عبد الرسول، عبد العزی اور عبد الکعبہ وغیرہ۔

☆ ایسے ناموں سے بھی پرہیز کیا جائے جن کے رکھنے سے کفار کے ساتھ مشابہت ہوتی ہو یا بدکردار لوگوں کے نام ہوں، مثلاً قیصر، کسریٰ وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ دو نام اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں یعنی عبد اللہ اور عبد الرحمٰن۔ ❸

یہ نام اس لئے پسند ہیں کہ ان میں اللہ کی عبودیت کا اظہار ہے جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ دانیال حضرات انبیاء میں سے ایک نبی کا نام ہے، شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ یہ وہی نبی ہیں جن کے بے جان جسم سے جاہل لوگ تبرک حاصل کرتے تھے، جب تستر فتح ہوا تو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ منظر بچشم خود دیکھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا، آپ نے جواب دیا کہ دن کے وقت تیرہ قبریں کھود کر رات کے وقت انہیں کسی قبر میں دفن کر دیں اور اس کے ساتھ باقی قبروں کو بھی تیار کر دیں تاکہ ان کی قبر کا لوگوں کو پتہ نہ چل سکے۔ ❹

بہر حال دانیال ایک نبی کا نام ہے اور یہ نام کسی بھی بچے کا رکھا جا سکتا ہے تاکہ مستقبل میں اس نبی کی سیرت کی جھلک بچے میں نظر آ سکے۔ (واللہ اعلم)

الفاظ حدیث کی وضاحت

سوال مختلف احادیث میں درج ذیل معاملات سے منع کیا گیا ہے، ان کی وضاحت کر دیں۔ مہر البغی، حلوان الکاهن، عسب الفحل، قفیز الطحان....؟

جواب سوال میں ذکر کردہ الفاظ کی وضاحت مع حدیث درج ذیل ہے:

---

❶ ترمذی، الادب: ۲۸۳۹۔
❷ صحیح مسلم، الآداب: ۲۱۳۹۔
❸ صحیح مسلم، الآداب: ۲۱۳۲۔
❹ فتاوی ابن تیمیه ص ۱۵۴ ج ۱۵۔

☆ **مهر البغی:** اس سے مراد زنا کے عوض زانیہ کو ملنے والی اجرت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بدکار عورت کی کمائی کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''بدکار عورت کی اجرت حرام ہے۔'' ❶

☆ **حلوان الکاهن:** جادوگر یا کہانت پیشہ انسان کو جو تحائف و عطیات ملتے ہیں یہ بھی حرام ہیں۔ چونکہ کہانت حرام ہے، اس لیے اس کا معاوضہ بھی حرام ہے۔ حدیث میں ہے: ''آپ نے کاہن کی شیرینی سے منع فرمایا ہے۔'' ❷

☆ **عسب الفحل:** نر کو کہتے ہیں، مادہ جانور سے اس کی جفتی اور افزائش نسل کے لئے اس کے مادہ کو فروخت کرنا منع ہے کیونکہ اس کی ضرورت عام پیش آتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے نر کی جفتی پر معاوضہ لینے سے منع فرمایا۔'' ❸

☆ **قفیز الطحان:** مجہول غلے کے ڈھیر کو پیسنے کی اجرت بھی منع ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قفیز الطحان سے منع فرمایا ہے۔ ❹

ممانعت کا سبب یہ اندیشہ ہے کہ کہیں مجہول غلے کا ڈھیر وزن میں زیادہ او راس کا معاوضہ کم یا معاوضہ زیادہ اور وزن کم نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

عورت کا ملازمت کرنا

سوال میرے شوہر فوت ہو چکے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں، والدین انتہائی ضعیف العمر ہیں، میرے علاوہ ان کا کوئی پرسان حال نہیں، کیونکہ میرا کوئی بھائی بھی نہیں۔ میں ایک ایسے سرکاری محکمہ میں ملازمت کرتی ہوں جہاں عورتوں کے ساتھ مردوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے، کیا ایسے حالات میں میرے لئے ملازمت کرنا جائز ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کا دائرہ عمل الگ الگ بیان کیا ہے، مالی کفالت مرد کے ذمہ ہے جبکہ اندرون خانہ کام کاج عورت کا فرض ہے، لیکن موجودہ صورت حال انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہو چکا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں پھر اس کے والدین بھی انتہائی ضعیف و ناتواں ہیں اور ان کی مالی خدمت اس کے ذمے ہے۔ اس سلسلہ میں جو اسے ملازمت ملی ہے، اس میں مرد و زن کا اختلاط ہوتا ہے جو شریعت کے منافی ہے۔ اس تمام صورت حال کے تناظر میں ہم کہتے ہیں کہ:

☆ عورت کے لئے بامر مجبوری ملازمت کرنا جائز ہے، شریعت میں اس قدر تنگی نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔'' ❺

☆ ملازمت کے دوران جو خدمات سرانجام دیتی ہے، وہ شرعاً جائز ہوں، کوئی ایسا کام نہ ہو جس کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو۔

---

❶ صحیح بخاری، الاجارۃ: ۲۲۸۲۔
❷ صحیح بخاری، البیوع: ۲۲۳۷۔
❸ صحیح بخاری، الاجارۃ: ۲۲۸۴۔
❹ بیہقی ص ۳۳۹ ج ۵۔
❺ البقرۃ: ۲۸۵۔

☆ شرعی پردے کا اہتمام کیا جائے، مردوں سے حسب ضرورت واسطہ رکھا جائے، ضرورت سے زیادہ ان سے تعلقات قائم کرنا حرام اور ناجائز ہیں۔

☆ کوشش کی جائے کہ ایسے شعبہ میں ملازمت کی جائے جہاں زیادہ تعلق خواتین سے ہو اور خواتین کی ضروریات تک اپنی خدمات کو محدود رکھا جائے۔

☆ مخلوط ماحول میں کم از کم وقت دیا جائے اگر چند گھنٹوں کی خدمت سے گزر اوقات ہو جاتی ہے تو اسی پر اکتفا کیا جائے، زیادہ طمع اور لالچ نہ کی جائے۔

☆ کسی متبادل جگہ کی تلاش جاری رکھی جائے جہاں مرد و زن کا اختلاط نہ ہو، پھر کوئی معقول جگہ مل جائے تو اسے اختیار کر لیا جائے اگرچہ تنخواہ کم ہی کیوں نہ ہو۔

آخر میں ہم سائلہ کو یہ مشہور بھی دیں گے کہ اگر مناسب ہمدرد رشتہ مل جائے تو عقد ثانی کر لیا جائے، اللہ تعالیٰ ہی کارساز ہے اور وہی بہتر مددگار ہے۔ (واللہ اعلم)

بھوک ہڑتال

سوال ہمارے ہاں یہ معمول ہے کہ اگر کسی کی بات نہیں سنی جاتی یا کسی کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ہو جائے تو وہ اپنی بات منوانے یا اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لئے بھوک ہڑتال کرتا ہے، اس طرح وہ اپنا احتجاج ریکارڈ کراتا ہے، اس بھوک ہڑتال کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں سے ایک اس کا اپنا وجود ہے جس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔ پھر اس کی توانائی کو برقرار رکھنے کے لئے غذا کا استعمال ضروری قرار دیا گیا ہے اور ہر اس کام سے منع کیا گیا ہے جس کے انجام دینے سے انسانی وجود کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ساری رات کا قیام اور مسلسل روزے رکھا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی اطلاع ملی تو آپ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''ایسا مت کرو، کیونکہ یہ عمل آنکھوں کے ضعف اور بدن کی کمزوری کا باعث ہے۔'' [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کوئی بھی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو اس کے بدن کی کمزوری کا باعث ہو۔ لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے بھوک ہڑتال ایک غیر اسلامی حرکت ہے جو کسی بھی مسلمان کے شایان شان نہیں۔ متعدد فقہاء نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ غذا پر قدرت کے باوجود اگر کوئی کھاتا پیتا نہیں تا آنکہ اس کی موت واقع ہو جائے تو ایسا کرنا گناہ اور باعث عذاب ہے۔ کیونکہ اسے ایک قسم کی خودکشی کہا جاتا ہے جبکہ احادیث میں خودکشی کرنے پر بہت وعید آئی ہے اور خودکشی کرنے والے کو جہنمی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''جس نے کسی چیز کے ذریعے اپنے آپ کو قتل کیا، اسے اسی چیز کے ساتھ قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا۔'' [2]

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۷۹۔ [2] صحیح بخاری، الادب: ٦٠٤٧۔

ایک روایت میں ہے کہ جہنم میں وہ اسی قسم کی سزا سے دوچار کیا جائے گا۔ ❶

ایک روایت میں اس کی مزید تفصیل ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خودکو ہلاک کیا وہ جہنم میں اسی طرح بلندی سے چھلانگ لگا کر مرتا رہے گا اور جس نے زہر پی کر خود کو ختم کر لیا وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے زہر پی کر مرتا رہے گا اور جس نے کسی ہتھیار سے خودکشی کی وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے اسی ہتھیار سے خود کو مارتا رہے گا۔ ❷

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خوکشی ایک حرام فعل ہے اور بھوک ہڑتال بھی خودکشی کا پیش خیمہ ہے، لہٰذا اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ قرآن کریم میں بھی ایسے اقدام سے منع کیا گیا ہے جو اس کی موت کا باعث ہو۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں مت ڈالو۔'' ❸

دوسرے مقام پر فرمایا کہ تم خود کو قتل نہ کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بہت شفقت کرنے والا ہے۔'' ❹

ان قرآن آیات اور احادیث کے پیش نظر ہمارا موقف ہے کہ اپنے حقوق کے حصول اور اپنی صحیح بات منوانے کے لئے بھوک ہڑتال کے بجائے تنقید و احتجاج کا کوئی جائز طریقہ اختیار کیا جائے، اپنے مقدمہ کو عدالت میں یا مسلمانوں کی پنچایت میں پیش کرنا چاہیے۔ پرامن اور جائز طریقہ سے اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا مباح ہے لیکن اس کے لئے بھوک ہڑتال کا سہارا لینا غیر اسلامی اور غیر اخلاقی عمل ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد و مدرسہ سے جامعہ اور مرکز تک

سوال ہمارے ہاں جب کسی کو خدمتِ اسلام کا شوق پیدا ہوتا ہے تو ابتدائی طور پر وہ ایک مدرسہ یا مسجد قائم کرتا ہے، جب عمارت بن جاتی ہے تو اسے جامعہ کا نام دے دیا جاتا ہے پھر جب بیرونی سرمائے سے پرشکوہ جدید عمارت کھڑی ہو جاتی ہے تو اسے مرکز کے نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ''مراکز اسلام'' کی بھرمار ہے، براہ کرم اس کی شرعی حیثیت واضح کریں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب ہر ملک کی دو سرحدیں ہوتی ہیں، ایک جغرافیائی اور دوسری نظریاتی۔ جغرافیائی حدود کی حفاظت و نگرانی اس ملک کی فوج کرتی ہے جبکہ نظریاتی سرحدوں کے پاسباں اور نگران دینی مدارس اور مساجد ہیں۔ جو اسباب و ذرائع نایاب یا کمیاب ہونے کے باوجود بھی اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ اس حوالہ سے دینی مدارس اور مساجد کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اسلام کی سربلندی اور باطل نظریات کی سرکوبی کے لئے یہ مدارس و مساجد دن رات مصروف عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی جہود و مساعی کو شرف قبولیت سے نوازے۔

لیکن سوال میں دینی مدارس و مساجد کے حوالہ سے جو بات بیان کی گئی ہے وہ انتہائی باعث افسوس بلکہ جگ ہنسائی کا موجب

---

❶ صحیح بخاری، الادب: ٦١٠٥۔ ❷ صحیح بخاری، اللباس: ٥٧٧٨۔

❸ البقرة: ١٩٥۔ ❹ النساء: ٢٩۔

ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ماہ رمضان کے آتے ہی سفیر حضرات کا ریلا شہروں اور دیہاتوں کا رخ کر لیتا ہے جومختلف مدارس کے لئے چندہ اکٹھا کرنے میں بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ حضرات اس سلسلہ میں اپنی عزت نفس اور خودداری کو بھی مجروح کر دیتے ہیں، اگرچہ مرکز اہل حدیث ۱۰۶ راوی روڈ نے اس ریلے کے سامنے بند باندھنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے لیکن پھر بھی کچھ لوگ اس مضبوط بند کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی طور پر ایک مسجد یا مدرسہ ہوتا ہے اور عمارت بننے کے بعد اسے جامعہ کا درجہ دے دیا جاتا ہے پھر بلند و بالا عمارت کے قیام کے بعد اسے ''مرکز'' سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ عربی زبان میں جامعہ یونیورسٹی کو کہتے ہیں جس کے زیر نگرانی متعدد شعبہ جات ہوتے ہیں، پھر مرکز تو اس سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک ایسا کرنا بدترین خیانت ہے کہ جس مدرسہ میں چند بچے اور بچیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں اسے جامعہ یا مرکز سے تعبیر کیا جائے۔ کسی منچلے نے اس کی وضاحت یوں کی تھی کہ ایسے مدارس کو جامعات اس لئے کہتے ہیں کہ وہ چھوٹے بچے اور بچیوں کو اپنے اندر جمع رکھتے ہیں: لا نها تجمع البنين والبنات، اس سلسلہ میں مرکز اہل حدیث ۱۰۶ راوی روڈ کو آگے بڑھ کر اہل حدیث کے مدارس و مساجد کی جماعتی درجہ بندی کر دینی چاہیے۔ اگرچہ وفاق المدارس السلفیہ نے اس سلسلہ میں کامیاب کوشش کی ہے لیکن ابھی کام باقی ہے۔ ایسے مدارس کی سطح پر حوصلہ شکنی ہونی چاہیے جو مدرسہ ہونے کے باوجود خود کو جامعہ یا مرکز کا نام دیئے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذمہ داران کو ہدایت دے اور وہ خود ہی اس کی اصلاح کر لیں تو بہتر ہے۔

بالخصوص لفظ مسجد جامع ہے، روز بروز توسیع کے باوجود مسجد حرام، مسجد نبوی مسجد اقصیٰ مساجد ہی کہلاتی ہیں اور قرآن پاک نے انہیں مساجد سے ہی تعبیر کیا ہے۔

والدہ کا ناراض فوت ہونا

سوال میں بچپن میں اپنی والدہ سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی، جب وہ فوت ہوئی تو مجھ سے ناراض تھی، مجھے اس بات کا بہت افسوس رہتا ہے، اب مجھے اس گناہ کی تلافی کے لئے کیا کرنا چاہیے۔

جواب بچپن میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ بچے اپنے والدین سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، کیونکہ اس عمر میں بچوں کو شعور نہیں ہوتا، وہ کم عمری کی وجہ سے کم عقلی اور جہالت کا شکار رہتے ہیں۔ امید ہے کہ اس عمر میں ایسی کوتاہی قابل مؤاخذہ نہیں ہوگی۔ ہاں صاحب شعور ہونے کے بعد والدین کو ناراض کرنا بہت بڑا جرم اور گناہ ہے۔ ماؤں کے متعلق خصوصی طور پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ماں کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے۔ اگر والدہ ناراض فوت ہوئی تو اس کے لئے دو کام کرنے سے اس گناہ کی تلافی ہو سکتی ہے:

① اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی معافی طلب کی جائے اور اس کے حضور توبہ و استغفار کا نذرانہ پیش کیا جائے، توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ امید ہے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ یہ گناہ بھی معاف کرے گا۔

④ والدہ کی طرف سے صدقہ وخیرات کیا جائے اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کی جائے، یہ ایسے کام ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے گناہوں کی تلافی کردیتا ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مذکورہ گناہ بھی معاف کردے گا۔

انسان کو والدین کے سلسلہ میں بہت حساس رہنا چاہیے، ان کی اطاعت وفرمانبرداری کو حرز جاں بنانا چاہیے اور ان کی نافرمانی سے حتی الوسع اجتناب کیا جائے، والدین اگر کافر بھی ہوں تو بھی ان کا حق الخدمت ساقط نہیں ہوتا۔ قرآن میں اس کی صراحت ہے۔ (واللہ اعلم)

خدمت گزاری میں ماں کا حق

سوال قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کی خدمت گزاری کو بہت پسند کیا ہے بلکہ باپ پر اسے ترجیح دی ہے، اس کی کیا وجہ ہے۔ کیا قرآن وحدیث میں اس کی صراحت ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کی خدمت کو انسان کی سعادت اور خوش بختی کی علامت قرار دیا ہے کیونکہ ماں، اولاد کے سلسلہ میں بہت تکلیف برداشت کرتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں اس کا ارشاد موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾ [1]

''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا، اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں اٹھائے رکھا اور تکلیف سے اسے جنم دیا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں نے حمل، وضع حمل، دودھ پلانے، دودھ چھڑانے اور پرورش وتربیت کے سلسلہ میں بہت سی مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خدمت کے بارے میں ماں کے حق کو تین بار بیان کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: ''میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے عرض کیا: ''پھر کون'' آپ نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے عرض کیا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے پھر عرض کیا، اس کے بعد کون حقدار ہے تو آپ نے فرمایا: ''تیرا باپ'' [2]

اس حدیث میں صراحت ہے کہ خدمت کے سلسلہ میں والدہ کا حق زیادہ ہے، کیونکہ اس نے اولاد کے متعلق تکلیف زیادہ برداشت کی جیسا کہ قرآن کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

لے پالک کی حقیقت

سوال میں اولاد سے محروم ہوں، میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے اپنی بہن کے بچے کی پرورش کی ہے، اس کے ''ب فارم'' میں بطور والد اپنا نام اور بطور والدہ اپنی بیوی کا نام لکھوایا ہے، شرعی طور پر ہمیں اس کی حقیقت سے آگاہ کریں؟

---

[1] الاحقاف: ١٥۔ [2] صحیح مسلم، البر: ٢٥٤٨۔

جواب دور جاہلیت میں غلط دستور رائج تھا کہ لے پالک بیٹے کو حقیقی بیٹے کا درجہ دیا جاتا تھا اور اسے نقلی باپ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اس کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آیات نازل کی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے نہیں بنایا، یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔'' ❶

یہ آیت اس وقت اتری جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا لے پالک بیٹا قرار دیا اور لوگ انہیں زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس غلط رسم کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا: ''تم ان منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو، اللہ کے ہاں یہی انصاف کی بات ہے۔'' ❷

جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے زید بن حارثہ کہنا شروع کر دیا تھا، ہاں اگر کوئی دوسرے برخوردار کو پیار و محبت سے بیٹا کہہ دے تو اس میں چنداں حرج کی بات نہیں۔ حرج اس وقت ہے جب کسی لے پالک کو حقیقی بیٹے کے حقوق دیے دیئے جائیں جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے کہ سائل نے لے پالک کے والد کی جگہ اپنا نام اور اس کی والدہ کی جگہ اپنی بیوی کا نام لکھوایا ہے حالانکہ وہ اس کا حقیقی باپ اور اس کی بیوی اس کی حقیقی ماں نہیں۔ ایسا کرنا قرآن کریم کے ایک صریح حکم کی خلاف ورزی ہے، ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ دانستہ طور پر اللہ کے حکم کی پروا نہ کرے۔ باپ وہی ہے جس کے نطفہ سے لے پالک پیدا ہوا ہے اور ماں وہی ہے جس نے اسے جنم دیا ہے، اس کے علاوہ نہ کوئی اس کا حقیقی باپ بن سکتا ہے اور نہ کوئی دوسری عورت اس کی ماں بن سکتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہی حکم دیا گیا ہے کہ ہم ہر شخص کو اس کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کریں، کسی دوسرے شخص کی طرف اس کی نسبت نہ کریں۔ اسی طرح لے پالک کو بھی حکم ہے کہ وہ اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت نہ کرے۔ چنانچہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دوسرے شخص کو دانستہ طور پر اپنا باپ بنایا وہ کافر ہو گیا۔'' ❸

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنے حقیقی باپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرے۔'' ❹

مذکورہ آیت اور درج بالا احادیث کی روشنی میں سائل کو اپنے اس اقدام پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کس قدر سنگین جرم کا مرتکب ہے۔ (واللہ اعلم)

حیوانات کو کھلانا پلانا

سوال کچھ لوگ پرندوں کے لئے دانے ڈالنے کا بہت اہتمام کرتے ہیں، کیا حیوانات کو کھلانے پلانے میں بھی اجر و ثواب ملتا ہے، کیا ایسا کرنا صدقہ ہے؟

جواب حیوانات اور پرندوں کو کھلانے پلانے میں اللہ کے ہاں اجر و ثواب ملتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک

---

❶ الاحزاب: ٤۔ ❷ الاحزاب: ٥۔

❸ صحیح بخاری، المناقب: ٣٥٠٨۔ ❹ صحیح بخاری، المناقب: ٣٥٠٩۔

آدمی نے کتے کو دیکھا جو پیاس کی وجہ سے ہانپ رہا تھا، اس نے کنوئیں سے پانی نکالا اور اسے پلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس عمل کی وجہ سے معاف کر دیا۔ ❶

ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم ان حیوانات کو کھلاتے پلاتے ہیں، کیا ہمیں اجر ملے گا تو آپ نے فرمایا: ''ہر تازہ اور زندہ جگر رکھنے والے کو کھلانے پلانے میں اجر ملتا ہے۔'' ❷

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بلی کو باندھ دیا اور اس کی خوراک کا بندوبست نہ کیا حتیٰ کہ وہ مر گئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس جرم کی پاداش میں جہنم میں داخل کر دیا۔ ❸

حیوانات کو کھلانا پلانا صدقہ بھی ہے جیسا کہ متعدد احادیث میں اس عمل کو صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

''جو مسلمان درخت لگاتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اس سے کوئی جانور یا پرندہ کھالے تو وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' ❹

ایک روایت میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان درخت لگاتا ہے اور اس سے انسان، جانور یا کوئی پرندہ کھالیتا ہے تو وہ اس انسان کے لئے قیامت تک کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔ ❺

ان احادیث کے پیش نظر حیوانات، پرندوں اور جانوروں کھلانے پلانے میں اجر وثواب ملتا ہے اور ایسا کرنا اللہ کے ہاں صدقہ لکھا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

اگر کسی حلال جانور کو ذبح کرنا مشکل ہو

سوال اگر کوئی جانور ذبح کرتے وقت بھاگ نکلے اور کسی گہری کھائی میں گر جائے، جہاں سے نکال کر ذبح کرنا مشکل ہو تو اسے کیا کیا جائے، شرعی طور پر اس کے لئے کیا ہدایات ہیں؟

جواب جب کسی جانور کو کسی بھی وجہ سے ذبح کرنا مشکل ہو جائے تو اسے تیر یا نیزے یا گولی سے حلال کرنا جائز ہے، اسے بسم اللہ پڑھ کر مارا جائے، ایسا کرنا ذبح کرنے کی طرح ہوگا، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جب کسی قوم کا کوئی اونٹ بدک جائے اور ان میں سے کوئی شخص خیر خواہی کی نیت سے اسے تیر کا نشانہ لگا کر مار ڈالے تو ایسا کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے معلوم ہوتا ہے انہوں نے اس حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے۔ ❻

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث درج ذیل ہے: ''وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے، لشکر میں سے ایک اونٹ بدک کر بھاگ نکلا، ہم میں سے ایک آدمی نے اسے تیر مارا اور وہ رک گیا، جب رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کا ذکر ہوا تو آپؐ نے فرمایا: یہ اونٹ بھی بعض اوقات جنگلی جانوروں کی طرح بدکتے ہیں، اس طرح اگر وہ تمہارے قابو

---

❶ صحیح بخاری، الوضوء: ۱۷۳۔
❷ صحیح بخاری المساقاۃ: ۲۳۶۳۔
❸ صحیح بخاری، المساقاۃ: ۲۳۶۵۔
❹ صحیح مسلم، المساقاۃ: ۳۹۶۸۔
❺ صحیح مسلم، المساقاۃ: ۳۹۷۱۔
❻ صحیح بخاری، الذبائح: باب نمبر ۳۷۔

سے باہر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرو۔ ❶

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی حلال جانور، وحشی جانوروں کی طرح حرکتیں کرنے لگے اور قابو سے باہر ہو جائے تو بسم اللہ پڑھ کر جسم کے کسی بھی حصہ کو زخمی کر دیا جائے تو اسے کھانا جائز ہے بشرطیکہ وہ وحشی جانوروں کی طرح حرکتیں کرنے لگے اور بے قابو ہو جائے۔ صورت مسئولہ کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی حلال جانور گہری کھائی میں گر جائے، جہاں سے نکال کر اسے ذبح کرنا مشکل ہو تو بسم اللہ پڑھ کر گولی، تیر یا نیزہ مارا جائے اور اسے کسی بھی جگہ سے زخمی کر دیا جائے تو وہ حلال ہے اور اسے کھانا درست ہے۔ (واللہ اعلم)

گری پڑی معمولی چیز اٹھانا

سوال بعض دفعہ بازار یا گلی میں کوئی معمولی سی چیز گری ہوتی ہے، مثلاً بٹن، سوئی وغیرہ۔ کیا اسے اٹھانا جائز ہے؟ یا اس کے لئے اعلان کرنے کی ضرورت ہے جبکہ ایسی اشیاء کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کے متعلق راہنمائی فرمائیں؟

جواب بازار یا گلی کوچہ میں گری پڑی چیز اعلان کی نیت سے اٹھائی جا سکتی ہے البتہ معمولی اشیاء جن کے گم ہونے سے مالک کو اس کی چنداں پروا نہیں ہوتی، انہیں اٹھایا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں چھڑی، رسی، کوڑا اور اس قسم کی معمولی چیزیں اٹھا لینے کی اجازت دی تھی کہ انسان ان سے فائدہ اٹھا لے۔'' ❷

یہ روایات اگرچہ ضعیف ہے لیکن دوسری روایات سے اس کے معنی کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جب کوئی شخص سمندر میں بہتی ہوئی لکڑی، چابک یا اس جیسی (کوئی انتہائی کم قیمت) چیز پائے (صحیح بخاری اللقطہ) امام بخاری کے اس انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوداود کے حوالے سے بیان کردہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس میں جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ دیگر دلائل کی بنا پر صحیح ہے۔ حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی معمولی چیز کا اعلان بھی تین دن تک کرنا چاہیے، ممکن ہے کہ مالک کو اس کی ضرورت ہو۔ ❸

بہر حال اگر گری پڑی معمولی چیز کھانے سے متعلق ہے تو اسے اٹھا کر کھایا جا سکتا ہے، اس کے متعلق اعلان کی ضرورت نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک گری ہوئی کھجور دیکھی تو اسے اٹھا کر کھا لیا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔'' ❹

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اسے نظر انداز کر دیتیں اور اسے دوسرا بھی کوئی نہ اٹھاتا تو وہاں پڑی پڑی خراب ہو جاتی، اس لئے انہوں نے اسے اٹھا کر کھا لیا، بہر حال ایسی معمولی اشیا، جن کی مالک کو ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی انکی پروا کی جاتی ہے انہیں اٹھا کر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح بخاری، الذبائح: ٥٥٤٤۔
❷ ابو داود، اللقطه: ١٧١٧۔
❸ مسند امام احمد ص ١٧٣ ج ٤۔
❹ مصنف ابن ابی شیبه ص ٤١٦ ج ٤۔

کعبہ کی قسم کھانا

سوال قرآن وحدیث کی رو سے کعبہ کی قسم کھائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب اللہ تعالیٰ کا گھر کعبہ شریف بھی اس کی مخلوق ہے اور مخلوق کی قسم اٹھانا جائز نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''صرف اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھاؤ، وہ بھی صرف اس وقت جب تم سچے ہو۔'' [1]

بالوں کی پیوندکاری

سوال آج کل جدید سرجری کے ذریعے نئے بال اُگائے جاتے ہیں جن کو قدرتی بالوں کا نام دیا جاتا ہے، کیا شرعی طور پر ایسا کرنا جائز ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں کچھ علماء سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں؟

جواب بالوں کی پیوندکاری کی دو اقسام ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اپنے بالوں کے ساتھ مصنوعی بال ملانا اس کی شرعاً اجازت نہیں کیونکہ اس میں ملمع سازی اور دھوکہ دہی ہے، نیز اس میں اللہ کی تخلیق کو بدلنے کا شائبہ ہے، جو ایک شیطانی حرکت ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورتوں پر لعنت کی جو اپنے بالوں کے ساتھ مصنوعی بال جوڑیں اور جڑوائیں۔ [2]

وِگ کا استعمال بھی اسی وعید کی زد میں آتا ہے جیسا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے منبر سے اپنے محافظ کے ہاتھ سے بالوں کا ایک گچھا پکڑا اور کہا: اے اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ اس طرح کی چیزوں سے منع فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل اس لئے ہلاک ہوئے کہ ان کی عورتوں نے ان کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ [3]

دوسری پیوندکاری کی قسم یہ ہے کہ جدید طب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی آدمی کو اس کے اپنے ہی بال لگائے جاتے ہیں جو کانوں کے درمیان سے یا سر کی پچھلی جانب سے لئے جاتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق جڑوں سمیت پٹی نکال لی جاتی ہے پھر ان بالوں کو ایک ایک بال کیا جاتا ہے پھر ان کو پہلے سے بنائے ہوئے انتہائی باریک سوراخوں میں لگا دیا جاتا ہے۔ پھر ان سوراخوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ بال لگانے کے بعد تقریباً تین ہفتوں کی مدت میں وہ لگائے گئے بال گر جاتے ہیں پھر جب ان جڑوں کو سر سے خون کے ذریعے غذا ملنا شروع ہوتی ہے تو وہ تین سے چھ ماہ میں دوبارہ اُگ آتے ہیں جو عام بالوں کی طرح بڑھتے رہتے ہیں۔ یہ ایک جدید طریقہ علاج ہے جس میں گنجے انسان کے اپنے بال جدید سرجری کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جس طرح جسم کے ایک حصے کا گوشت نکال کر دوسرے حصے کو بھرا جاتا ہے جو کسی حادثہ کی وجہ سے ضائع ہو چکا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح بالوں کو بھی دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں اس گنجے انسان کا بھی ذکر ملتا ہے جس کے سر پر فرشتے نے ہاتھ پھیرا تھا تو اس کے خوبصورت بال معجزاتی طور پر اُگ آئے تھے۔ [4]

فرشتے نے یہ کام اس کی خواہش کے پیش نظر کیا تھا، اگر ایسا کرنا ناجائز ہوتا تو فرشتہ یہ کام نہ کرتا۔ کچھ اہل علم اس طریقہ علاج کو

---

[1] ابو داود، الایمان والنذور: ۳۲۴۸۔
[2] ابو داود، الرجل: ٤١٦٨۔
[3] صحیح بخاری، احادیث الانبیاء: ٣٤٦٨۔
[4] صحیح بخاری، احادیث الانبیاء: ٣٢٦٤۔

ناجائز کہتے ہیں، ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں جسم کو گودنے اور گدوانے پر لعنت کی گئی ہے۔ [1]

اس حدیث کے پیش نظر ان حضرات نے نئے بال اُگانے سے منع کیا ہے، لیکن حدیث سے اس طرح کی ممانعت کشید کرنا محل نظر ہے۔ بہر حال احادیث کی رو سے دوسرے شخص یا عورت کے بال اپنے بالوں کے ساتھ ملانے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح مصنوعی یا اصلی بالوں سے تیار کردہ وِگ بھی اس وعید کی زد میں آتی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔ البتہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے جدید تحقیق سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور گنجے سر میں نئے بال اُگانے میں کوئی حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

ایک مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا

سوال میں ہسپتال میں بطور منتظم تعینات ہوں، ملازمین نے اپنی سہولت کے لئے میں گیٹ کے سامنے ایک کمرہ برائے ادائیگی نماز تعمیر کیا۔ اب ہم ایک وسیع جگہ پر برلب سڑک مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اب وہ کمرہ جو ادائیگی نماز کی غرض سے تعمیر کیا تھا، اسے منہدم کیا جا سکتا ہے یا نہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب شرعی طور پر مساجد کی تین اقسام ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے لئے تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا گیا ہے، جہاں بھی دوران سفر نماز کا وقت ہو جائے وہاں نماز ادا کر لی جائے۔ [2]

اس حدیث کے مطابق تمام روئے زمین کو حکمی طور پر مسجد قرار دیا گیا ہے، اس کے وہ احکام نہیں جو عام مساجد کے ہوتے ہیں۔

② ایک مسجد وہ ہوتی ہے جو گھر کے کسی کونے یا زرعی زمین کے کسی حصہ کو سہولت کے پیش نظر مسجد قرار دے لیا جاتا ہے جیسا کہ ایک صحابی رسول ﷺ نے اپنے گھر کے ایک کونے کو نماز پڑھنے کے لئے مسجد قرار دے لیا تھا۔ [3]

اس قسم کی مساجد کو بھی گھر یا زمین کا مالک جب چاہے ختم کر سکتا ہے اور اسے اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔

③ وہ مساجد جن میں اذان و جماعت اور جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے اور اس کی زمین بھی باقاعدہ وقف ہوتی ہے۔ اس قسم کی مساجد میں بیع، وراثت اور ہبہ نہیں چل سکتا۔ نیز یہ مساجد بھی جب آبادی کے اُٹھ جانے سے ویران یا بے آباد ہو جائیں یا اس سے وہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہوں جو تعمیر مسجد کے پیش نظر ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں اس مسجد کو دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں پہلی مسجد کے ساز و سامان کو دوسری مسجد میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کے متعلق بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے، آپ فرماتے ہیں: وقف، جب وقف رہے تو دو وجہ سے اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے:

---

[1] صحیح بخاری، اللباس: ۵۹۶۲۔ [2] صحیح بخاری، التیمم: ۳۳۵۔

[3] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۲۵۔

① کسی اہم ضرورت کے پیش نظر اسے ایک مقام سے دوسرے مقام پر تبدیل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی ایک مسجد کو دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا۔ ❶

② کسی خاص مصلحت کی بناء پر اسے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شارع عام تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کا کچھ حصہ راستہ میں شامل کر دیا تھا۔ ❷

صورت مسئولہ میں مسجد کی دوسری قسم معلوم ہوتی ہے، اسے انتظامیہ جب چاہے تبدیل کر سکتی ہے اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ اگر تیسری قسم ہو تو بھی اس میں تبدیلی کی گنجائش موجود ہے، خاص طور پر جب مریضوں کے آنے جانے میں وہ رکاوٹ کا باعث ہو۔ بہتر ہے کہ یہ مسئلہ افہام و تفہیم سے حل کیا جائے تاکہ وہاں کوئی فتنہ وفساد کھڑا نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

حیلہ اسقاط

سوال ہمارے علاقہ میں ایک رسم رائج ہے کہ جب میت کو جنازہ گاہ لے جاتے ہیں تو ساتھ کچھ سامان اور رقم بھی لے جاتے ہیں، جنازے کے بعد دائرہ بنا کر اس سامان اور رقم کے اردگرد بیٹھ جاتے ہیں اور اس پر قرآن مجید رکھ کر ایک دوسرے کو بخشتے رہتے ہیں پھر رقم اور سامان لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اس عمل سے وہ سمجھتے ہیں کہ میت بخشی گئی ہے، اسے حیلہ اسقاط کہا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب قرآن و حدیث اور اسلاف سے اس حیلہ اسقاط کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ ایسا کرنا بدعت ہے۔ کیونکہ جو کام خیر القرون میں نہیں ہوا (حالانکہ اس وقت بھی اس کے اسباب موجود تھے۔ حتیٰ کہ ائمہ اربعہ بلکہ ان کے گرامی قدر شاگردوں سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس حیلے سے یہ خیال کرنا کہ میت کے ذمے جو نمازیں ہیں وہ معاف ہو جائیں گی یہ بھی بلا دلیل ایک مفروضہ ہے۔ حالانکہ اگر کوئی زندہ شخص، میت کی طرف سے نمازیں پڑھنا چاہے تاکہ اس سے معاف ہو جائیں تو اس کی بھی اجازت نہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ آیا کوئی دوسرے کی طرف سے نماز ادا کر سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''کوئی آدمی دوسرے کی طرف سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔'' ❸

اسی طرح میت کی طرف سے روزے بھی نہیں رکھے جا سکتے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا روایت میں س بات کی صراحت ہے کہ کوئی آدمی دوسرے شخص کی طرف سے روزہ نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ جو شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمے ماہ رمضان کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔'' ❹

جس حدیث میں میت کی طرف سے روزہ رکھنے کا ذکر ہے۔ ❺

اس سے مراد نذر کے روزے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

❶ فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۲۱۶ ج ۳۱۔ ❷ فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۲۶۵ ج ۳۱۔

❸ موطاامام مالك، الصيام: ٦٧٥۔ ❹ ترمذی، الصوم: ۷۱۸۔ ❺ صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۲۔

''جب کوئی شخص رمضان میں بیمار ہوا اور پھر فوت ہو گیا لیکن رمضان کے روزے نہ رکھ سکا تو اس کی طرف سے کھانا کھلا دیا جائے اس پر قضا نہیں، اگر اس نے نذر مانی تھی تو اس کا وارث قضا دے۔'' ❶

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حوالے سے یہی بات نقل کی ہے۔ ❷

بہر حال حیلہ اسقاط ایک ناجائز عمل ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ مرنے کے بعد صدقہ وخیرات کرنے سے گناہوں کے معاف ہونے کی امید کی جاسکتی ہے، اس کی طرف سے نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی ایسا کرنا جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

حیوانات کے خوبصورت مجسمے

سوال ہمارے ہاں اکثر یہ ہوتا ہے کہ مختلف دھاتوں سے حیوانات کے مجسمے بنا کر انہیں پالش اور رنگ روغن کر کے اپنے گھروں، گاڑیوں میں لٹکایا جاتا ہے، اس سے مراد صرف خوبصورتی اور زیب وزینت ہوتا ہے، اس عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب عربی زبان میں اس قسم کے مجسمے کو تماثیل کہا جاتا ہے۔ یہ تماثیل اور مجسمے شرک کا راستہ ہیں، اس لئے شریعت نے اسے بند کیا ہے۔ لوگ اپنے لیڈروں اور محبوب لوگوں کے مختلف چیزوں سے مجسمے بنا کر بڑے بڑے راستوں اور چوکوں میں نصب کرتے ہیں۔ اسی طرح مختلف دھاتوں سے حیوانات کے مجسمے بنا کر ڈرائنگ روم یا گاڑی میں سجا دیتے ہیں، چونکہ شرک کے لئے یہ ایک چور دروازہ ہے اس لئے شریعت نے اس سے منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فرشتے اس گھر میں نہیں جاتے جس میں کتا اور مجسمے پڑے ہوں۔'' ❸

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بھی ابتدائی طور پر اسی قسم کے مجسموں کی محبت میں گرفتار تھی، کچھ دیر بعد وہ اللہ کے مقابلہ میں ان کی عبادت کرنے لگے، نوح علیہ السلام نے اس عمل کی پرزور انداز میں تردید فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تو قرآن کی صراحت ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: ''یہ مورتیاں اور مجسمے کیا ہیں جن کے سامنے تم بندگی کے لئے بیٹھے رہتے ہو؟'' ❹

بہر حال ہمارے ہاں بڑے بڑے لیڈروں کے مجسمے بنا کر چوراہوں میں انہیں نصب کیا جاتا ہے بعض اوقات تو پریڈ کے ذریعے انہیں ''سلامی'' بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف جانوروں اور حیوانات کی مورتیاں بنا کر انہیں پالش اور روغن کر کے اپنی گاڑیوں اور گھروں کی زینت بنایا جاتا ہے۔ شریعت کی نظر میں ایسا کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہیاج اسدی کو ایک مہم پر بھیجتے وقت فرمایا کہ میں تمہیں اس کام کے لئے بھیج رہا ہوں جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا کہ کسی مورتی اور مجسمے کو نہ چھوڑوں مگر اسے مٹا ڈالوں۔'' ❺

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل تو یہ ہے جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے لیکن ہم ان سے محبت کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ اس قسم کی موتیوں کو اپنے گھروں یا گاڑیوں میں آویزاں کرے۔

❶ ابو داود، الصیام: ۲۴۰۱۔ ❷ ابو داود، الصیام: ۲۴۰۰۔ ❸ صحیح بخاری، بدء الخلق: ۳۲۲۵۔
❹ الانبیاء: ۵۲۔ ❺ صحیح مسلم، الجنائز: ۹۶۹۔

شیاطین کی مختلف حرکات

سوال اکثر اوقات ہمارے گھر کے دروازے بجتے رہتے ہیں اور گھر سے رات کے وقت مختلف آوازیں بھی آتی ہیں، بعض اوقات بستروں کو آگ بھی لگ جاتی ہے۔ ہمیں کسی عالم دین نے ایک طویل دعا لکھ کر دی ہے جس کا نام ''حرز ابی دجانہ'' ہے اور سورۃ الاخلاص کا ایک تعویذ دیا ہے، جو اس کے کہنے کے مطابق شیطانی حرکات کا توڑ ہے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب قرآن کریم کی صراحت کے مطابق شیطان اور اس کے پیروکار انسانوں کے دشمن ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لئے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی خیال کرو۔'' [1]

ان شیاطین کا کام یہ ہے کہ وہ اولاد کو صراط مستقیم سے ہٹانے کے لئے مختلف کام اور حرکات کرتے رہتے ہیں۔ سوال میں ذکر کردہ حرکات بھی شیطانی ہیں، اس سے مقصود اولادِ آدم کو خوفزدہ اور پریشان کرنا ہے۔ ہمارے گھروں میں خونی چھینٹے پڑنا، مختلف آوازیں آنا، دروازے بجنا، آگ لگنا، بالوں اور کپڑوں کا کٹ جانا، قیمتی چیزوں کا گم ہو جانا اور اس طرح کی کئی دوسری حرکات شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ پھر اس کے علاج کے لئے جو ''روحانی بابے'' کام کرتے ہیں وہ بھی شیطانی علاج ہے۔ ان کے استعمال سے ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ سوال میں ''حرز ابی دجانہ'' کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ ایک لمبی کہانی ہے جو حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے نام سے گھڑی گئی ہے جسے محدثین کرام نے موضوع اور خود ساختہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابوبکر بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حرز ابی دجانہ کے متعلق ایک طویل حدیث مروی ہے جو من گھڑت اور خود ساختہ ہے، اسے بیان کرنا بھی جائز نہیں۔'' [2]

حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ بھی اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بے اصل اور موضوع ہے۔ [3]

اس کے متعلق علامہ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حرز ابی دجانہ ایسی چیز ہے جو صحیح نہیں، مجھے معلوم نہیں کہ اسے کس نے تراشا ہے۔ [4]

باقی رہا سورۃ اخلاص کا نقش اور تعویذ تو شریعت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں، مذکورہ شیطانی حرکات کے توڑ کے لئے درج ذیل کام کریں:

☆ اپنے گھر میں اسلامی فضا ساز گار کریں اور دینی ماحول بنائیں۔

☆ گھر کے تمام افراد نماز پنجگانہ کی پابندی کریں اور بالغ افراد مسجد میں باجماعت نماز ادا کریں۔

☆ صبح و شام کے اذکار کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں اور ان کے پڑھنے کا اہتمام کریں۔

☆ سورۃ البقرۃ اور آیۃ الکرسی نیز سورۃ اخلاص اور معوذتین با آواز بلند پڑھیں۔

☆ گھر میں جو شیطانی کاموں کے لئے آلات اور ذرائع استعمال ہوتے ہیں انہیں یکسر ختم کریں۔

نوٹ: قرآن پاک کی تلاوت کیسٹ چلا دینا اور موبائل یا کمپیوٹر سے سننا کافی نہیں، امید ہے کہ ایسا کرنے سے مذکورہ شیطانی حرکات ختم ہو جائیں۔ ان شاء اللہ الرحمٰن

[1] فاطر: ٦۔ [2] دلائل النبوۃ ص ١١٨ ج ٧۔ [3] الموضوعات ص ١٦٩ ج ٣۔
[4] سیر اعلام النبلاء ص ٢٤٥ ج ١۔

رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنا

سوال کیا دور حاضر میں رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنا ممکن ہے، ایک حدیث یں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ مجھے بیداری میں بھی دیکھے گا'' اس حدیث کا حوالہ اور مطلب بتا دیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنا بہت بڑی سعادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میرا روپ نہیں دھار سکتا۔'' [1]

لیکن رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی شکل وصورت سے آگاہ ہو اور آپ کے حلیہ مبارک کی پوری پوری معلومات رکھتا ہو۔ اس کے لئے ایک کتاب '' آئینہ جمال نبوت'' کا مطالعہ مفید رہے گا جو ایک عربی کتاب '' الرسول کانك تراہ '' کا اردو ترجمہ ہے۔ جسے راقم نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور دارالسلام لاہور نے بڑے خوبصورت انداز میں اسے شائع کیا ہے۔ حدیث بالا کے پیش نظر دور حاضر میں بھی رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن خواب میں زیارت نبوی کا دعویٰ کرنے والے بعض ایسے لوگ بھی سامنے آتے ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت و صورت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ کے حسن جمال کی جھلک دیکھنے والوں نے آپ کے خنداں رخ انور، حسین وجمیل قدو قامت، بے مثال خدوخال، بے نظیر چال ڈھال، باوقار و پرکشش وجاہت وشخصیت کا عکس الفاظ کے پیرایہ میں ہم تک پہنچایا ہے۔ اس عکس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے تاکہ شیطان کسی کو دھوکہ نہ دے سکے۔ سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے وہ بخاری، کتاب التعبیر حدیث نمبر ۶۹۹۳ ہے۔ محدثین کرام نے اس حدیث کے دو مفہوم بیان کئے ہیں:

☆ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں دیکھا ہے یعنی جس نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا وہ آپ کو بیداری میں بھی دیکھنے کی سعادت حاصل کرے گا۔

☆ دوسرا مفہوم عام ہے کہ جس شخص نے بھی رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا وہ قیامت کے دن آپ کی زیارت سے ضرور شرف یاب ہوگا۔

بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمال نبوت سے پوری طرح آگاہ ہو، بصورت دیگر شیطان، انسان کو گمراہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن سیرین رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ زیارت نبوی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کی اصل شکل وصورت میں دیکھے۔ (واللہ اعلم)

فتاویٰ

اصحاب الحدیث